بسم الله الرحمن الرحيم

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ
وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ
كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ

قرآن کریم، سورہ انعام، آیات ۱۲۵، ۱۲۶

راہ اسلام

اسلامی علوم ومعارف اور علمی وثقافتی افکار وعقائد کا ترجمان

شمارہ ۲۰۳-۲۰۴، جنوری تا جون ۲۰۰۷

ہندستان میں سنت عزاداری محرم

چیف ایڈیٹر

محمد حسین مظفری

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون: ۴۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷

newdelhi@icro.ir

http://newdelhi.icro.ir

راہِ اسلام

شمارہ ۲۰۳-۲۰۴، جنوری تا جون ۲۰۰۷

چیف ایڈیٹر: محمد حسین مظفری

ایڈیٹر اعزازی: مخمور سعیدی

مشاورین علمی

سید امیر حسن عابدی، اوصاف علی، سید اختر مہدی رضوی، شاہ محمد وسیم
عبدالودود اظہر دہلوی، سید عزیز الدین حسین ہمدانی
سید علی محمد نقوی

مدیر اجرائی: علی غفاری

تزئین جلد: عائشہ فوزیہ
صفحہ آرائی و کمپوزنگ: علی رضا

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مضمون کے لئے مقالہ نگار خود ذمہ دار ہے۔
مقالہ نویس کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔
راہ اسلام مقالات و مضامین کے انتخاب و اصلاح و ایڈیٹنگ اشاعت کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہے۔
اور اس سلسلے میں ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ آخری ہوگا۔
اشاعت کی غرض سے ارسال شدہ مقالہ کا خوشخط ہونا لازمی ہے۔ عبارت کاغذ کے ایک طرف ہی لکھی جائے
اور کاغذ A-4 سائز کا ہو تو بہتر ہے۔
صرف غیر مطبوعہ مقالات ہی ارسال کئے جائیں۔
تحقیقی مقالات کی آمادگی میں جن مآخذ و مدارک کا استعمال کیا گیا ہو۔ ان کا ذکر لازمی ہے۔
مقالہ کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی ضرور ارسال کیا جائے۔
راہ اسلام میں شائع شدہ مقالات کی نقل یا ان کے ترجمہ و اقتباس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے
بشرطیکہ مآخذ کا ذکر کر دیا جائے۔

پریس: الفا آرٹ، نوئیڈا، یو۔پی

فہرست

اداریہ:		۹
گفتگو:		
ہندستان میں عزاداری کی روایت پر دو روزہ سیمنار		۱۴
کربلا شناسی عشرہ محرم الحرام	مولانا ابو الکلام آزاد	۲۲
ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت ابتداء، فروغ اور دور انحطاط	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین	۲۹
ضلع اعظم گڑھ میں عزاداری کی روایت	ڈاکٹر علاء الدین خاں	۴۹
ہندوستان میں تعزیہ داری	پروفیسر سید جعفر رضا	۶۷
گورکھپور کے صوفی میاں صاحب کے یہاں محرم کی عزاداری	ڈاکٹر فرحت نسرین	۸۳
کربلا: اس کے سماجی و معاشی اثرات	پروفیسر ایس۔ ایم۔ وسیم	۸۸
عزاداریٔ حسینؑ اور خواتین	پروفیسر طلعت عزیز	۱۰۱
چشتی صوفیاء کی تعلیمات اور عزاداری حسینؑ	ڈاکٹر محمد تعظیم	۱۰۸
صحفِ مقاتل، ایک ابتدائی تلاش و مطالعہ، ان کے متون کی نوع بندی	محمد رضا فخر روحانی	۱۱۶
خانقاہ نیازیہ میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت	ڈاکٹر عراق رضا زیدی	۱۲۶
ہولکر حکمران اور محرم	ڈاکٹر جے۔ سی۔ اپادھیائے	۱۴۳
شہیدان کربلا کے فدائی ہندو	شاہ نذیر ہاشمی غازی پوری	۱۴۹
ہندوستان میں امام باڑے کی طرز تعمیر کا ارتقاء	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین و طیبہ منور	۱۵۷
یمن میں عزاداری	سید اسد حیدر زیدی	۱۶۰
ضلع مظفر نگر میں محرم کی عزاداری کی روایت	ڈاکٹر مسز عابد رضا زیدی	۱۷۰
جونپور میں عزاداری کی روایات: تاریخی جائزہ	ڈاکٹر سید محمد عامر	۱۷۹

میوات کے میووں میں محرم کی رسمیں	ڈاکٹر جی ڈی گلانی	۱۸۸
داؤدی بوہرہ فرقے میں عزاداری	ڈاکٹر سریش مشرا	۲۰۰
شناخت بنیاد کی تحریک اور نو آبادیت مخالف جدوجہد بہار میں شیعہ عزاداری جلوس	ڈاکٹر محمد سجاد	۲۰۷
بیکانیر میں محرم کے سلسلے کے انتظامات	ڈاکٹر مینا گوڑ	۲۱۲
زنگی پور ضلع غازی پور میں محرم کچھ اہم یاد داشتیں	سید وحید ظفر عابدی	۲۱۶
حیدرآباد میں عزاداری محرم کی روایت	پروفیسر سید ایوب علی	۲۱۹
کیرالہ میں نو آبادیاتی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں کربلا کے اثرات	پروفیسر کنھ علی	۲۲۲
راجستھان میں عزاداری اور تعزیہ داری کی روایت	رنبیر سنگھ	۲۲۸
جموں و کشمیر میں محرم کی عزاداری کی روایت	پروفیسر جگر محمد	۲۳۳
میواڑ میں عزاداری کی روایت	ڈاکٹر کرشن ناتھ	۲۴۰
آندھرا پردیش میں عزاداری کی روایت۔ ماضی اور حال	ڈاکٹر رحمت علی خاں	۲۴۵
انسانیت پر کربلا کے احسانات	انوار محمد عظیم آبادی	۲۶۰
امروہہ میں عزاداری: تاریخی پس منظر اور صورت حال	سید غلام حیدر	۲۷۱
سادات گرویزی خدام و گدی نشینان حضرت سیدنا خواجہ معین الدین کے معمولاتِ عزاداری محرم الحرام	صاحبزادہ سید لیاقت حسین معینی	۲۸۸
عزاداری محرم اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی	پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین	۲۹۷
ہندوستان میں عزاداری کی روایت اور مسلکی تنازعے سیوان (بہار) کا ایک خصوصی مطالعہ	پرویز نذیر	۳۰۱
سیتامئو ریاست میں محرم کی عزاداری	ڈاکٹر منوہر سنگھ راناوت	۳۱۰
جنوبی راجستھان میں داؤدی بوہرہ فرقے میں عزاداری محرم	ڈاکٹر ملکہ بوہرہ	۳۱۵
عزاداری محرم کی روایت اور اس کے صوری پہلو	ڈاکٹر پشپا دلّار	۳۲۵
عزاداری کی روایت مسز میر حسن علی کے بیانات کی روشنی میں	سید علی کاظم	۳۳۰
اتر پردیش کے ضلع غازی پور میں عزاداری کی روایت	ڈاکٹر عذرا عابدی	۳۳۶
امام حسین گاندھی جی کی نظر میں	حامد رضا نیا	۳۵۲
نوحہ در ماتم فرزند رسول (حجۃ الاسلام مولانا سید مکرم حسین صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہ)	پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی	۳۵۶

کتابوں کا تعارف : نقد وتبصرہ	تبصرہ نگار	
دستاویزات غدر ۱۸۵۷	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۳۶۳
Excavation of truth-Unsung Heroes of 1857 war if Independence Muslims in India:1952-2004	مہدی باقر	۳۶۷
احوال و آثار میر غلام علی آزاد بلگرامی	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۳۷۰

ثقافتی سرگرمیاں:

دو روزہ بین الاقوامی سیمنار پر خصوصی رپورٹ ''مذاکرات بین اسلام اور ہندو ازم''	ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی	۳۷۴
سہ روزہ کل ہند مسابقۂ حفظ و قرأت قرآن کریم وجشن عید میلاد النبی	ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی	۳۸۳
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مستول خانۂ فرہنگ کا جلسۂ الوداعیہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	۳۸۸

اداریہ

اپنی حکومت کو قائم و دائم کرنے کے لئے ظلم و جبر، اور تشدد کو بروئے کار لانے والے اپنی دنیا میں آپ ڈوبے ہوئے حریص حکمرانوں نے تاریخ سے سبق حاصل نہ کیا کہ نہ نمرود دوراں بچا، نہ شداد زمانہ اور نہ یزید وقت کہ تاریخ نے انہیں حرف غلط کی طرح نیست و نابود کرڈالا۔ اس کے برعکس ایمان کے سایے میں حق و عدل پر قائم رہنے والوں اور اعمال صالح انجام دینے والوں کا ذکر اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ صفحۂ تاریخ پر حرف روشن کی طرح عیاں اور زندہ و پائندہ ہے کہ وہ اپنے عقیدہ وعمل سے انسانیت کو اصل پیغام زندگی دے رہے ہیں۔

ظلم تو ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے، ظالم اپنا کام خود تمام کرلیتا ہے۔ مظلوم کی آواز ضمیروں کو جھنجھوڑتی ہے اور مقتولین کا خون ایک نئے انقلاب کی سرخی بن کر ابھرتا ہے۔ ان کا نالہ و گریہ نعرۂ انقلاب بن جاتا ہے۔

یاد کیجیے تاریخ کا وہ دور کہ جب یزید نے ۶۰ ھ میں رسول اسلام محمد مصطفیٰؐ کے نواسہ حسینؑ ابن علیؑ سے سوال بیعت کیا، اس لیے کہ وہ فرزند رسولؐ تھے، ان کی بیعت یزید نے اس لیے بھی طلب کی تھی کہ اس طرح اس کے ہر قدم پر حسینؑ کی 'ہاں' ثبت ہوجاتی۔ مگر امام حسینؑ نے اپناموقف یہ کہہ کر بیان کردیا کہ:

''میری زندگی کی قسم! امام بس وہی ہے جو از روئے کتاب الٰہی فیصلہ کرنے والا، انصاف قائم کرنے والا، خدا کے دین کا پابند اور اپنے نفس کامحاسبہ کرنے والا ہو''۔[1]

ہر ظالم اور بلا استحقاق حکومت کرنے والوں کی طرح، یزید جبر و استبداد کو بروئے کار لانے لگا۔ لیکن اس کے سوال بیعت کے جواب میں حسینؑ کا جواب وہی تھا جو امام برحق کا ہونا چاہئے یعنی انکار بیعت۔ حسینؑ نے مدینہ چھوڑا، حج کا زمانہ قریب تھا، مکہ تشریف لے گئے۔ لیکن فرزند رسولؐ کو مکہ میں بھی امان نہیں! حاجیوں کے بھیس میں قاتل روانہ کیے گئے تھے۔ حسینؑ نے حرمت خانۂ کعبہ کے خیال سے حج کو عمرہ میں بدلا اور کوفہ کا رخ کیا جہاں سے اہل کوفہ کی طرف سے خطوط روانہ کیے

۱- بلاغت الحسینؑ، ص ۲۱۵

گئے تھے کہ حسین علیہ السلام آئیں اور ان کی پیشوائی و رہبری فرمائیں۔ لیکن راستہ میں گھیر کر حسینؑ کو کربلا لایا گیا۔

فرات کے کنارے خیمہ نصب کیے گئے مگر یزیدی لشکر نے انہیں وہاں سے ہٹوادیا۔ اس طرح ۳ محرم سے پانی کی دستیابی ایک امر مشکل قرار پائی۔ پھر ۷ محرم سے نواسۂ رسولؐ، حسینؑ ابن علیؑ، عورتوں، بچوں اور ان کے اعزاء و اقرباء اور انصاران باوفا پر پانی بند کردیا گیا۔ دس محرم کو حسینؑ، ان کے بیٹے حضرت علی اکبرؑ اور چھ ماہ کے علی اصغر، ان کے بھائی حضرت عباسؑ، اور بھتیجے حضرت قاسمؑ ابن حسنؑ اور ان کے اعزاء و اقرباء اور انصاران باوفا سمیت سب کو ۳ دن کا بھوکا پیاسا شہید کرڈالا۔ امام عالی مقام کی بوقت عصر شہادت کے بعد خیموں میں آگ لگادی گئی۔ ۱۰ اور ۱۱ محرم کی یہ درمیانی رات اس قافلہ حق و رضا نے جلی ہوئی قناتوں پر گذاری، علی ابن الحسینؑ نے یہ رات صرف ایک سجدۂ شکر میں گذار دی، اس طرح کہ زبان پر جاری تھا ''شکراً للہ شکراً للہ'' بقول جعفر حسین لکھنوی:

شہیدانِ وفا کے حوصلے تھے دید کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا

قارئین! ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ معلم انسانیت، رہبر اعظم، خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ دین کرکے اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی سند لے کر گئے تھے۔ اس عرصے میں اسلام والوں کو کیا ہوگیا تھا؟ زمانہ سکوت اور بے بسی کا شکار کیوں تھا؟

دس محرم ۶۱ ھ کے دن لاشوں پر لاشے اٹھاتے ہوئے حسین علیہ السلام نے اپنے فصیح و بلیغ خطبے میں ارشاد فرمایا کہ:

''اے دین محمدؐ! اگر تیری استقامت اسی میں ہے تو اے شام کی خوں آشام تلوارو آؤ اور میرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کردو''۔

کربلا میں ظلم و استبداد اپنی حدوں کو پار کرگیا مگر صبر و عزم حسینؑ اس سے بالاتر تھا۔ عاشورہ کے دن حسینؑ، ان کی اولادیں، اعزاء و اقرباء اور انصاران باوفا حتی کہ حسینؑ کا چھ ماہ کا لال علی اصغرؑ سب تین دن کے بھوکے پیاسے شہید کرڈالے گئے لیکن صبر حسینؑ اور ان کے ایقان و یقین اور خدا پر اعتماد کو ذرہ برابر جنبش نہ ہوئی!

بابا شیخ فرید گنج شکر اپنے شاگرد اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء سے واقعات کربلا کے بارے میں

کہتے ہیں: ''اے نظام الدین! تم جانتے ہو کہ عاشور کے دن [دس محرم] پیغمبرؐ خدا کے کنبہ پر کیسے کیسے مصائب ٹوٹے، اس کے لخت دل کس بے دردی سے قتل کردیے گئے۔ ظالموں نے انہیں پیاسا مارڈالا۔ حیف ان سنگدلوں پر، حیف ان کافروں پر، حیف روز جزا سے غافل رہنے والوں پر، حیف ان بدنصیبوں پر، ان ظالموں پر۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ بچے زمین آسمان کے بادشاہ کے بچے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی انہوں نے ان سب کو بے رحمی سے مارڈالا، ان کے گھر تاراج کرڈالے، انہیں برباد کرڈالا'' ۔[1]

۱۱ محرم ۶۱ ھ کو بچوں، عورتوں اور حسینؑ کے بیمار فرزند حضرت سید سجاد علی ابن الحسینؑ کو قیدی بنا کر پہلے کوفہ [عراق] اور پھر دمشق [سوریا] روانہ کیا گیا۔ اس مظلوم قافلہ کی سربراہی حسینؑ کی بہن زینب(س) نے کی۔ دمشق میں انہیں دربار یزید میں پیش کیا گیا۔ یزید تخت نشین تھا اور نیچے فرزند رسولؐ حسین علیہ السلام کا سر طشت میں رکھا ہوا تھا اور یزید ان کے لب و دندان کی چھڑی سے بے ادبی کر رہا تھا۔ اس نے تکذیب رسولؐ و قرآن و وحی یہ کہہ کر کی کہ:

لعبتُ بنوھاشمٍ بالملک فلا   فلکٌ جاء و لا وحیٌ نزل

سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے جان نثاروں کی قربانی جو 'فی الحقیقت......حق و صداقت' آزادی و حریت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان قربانی تھی، صرف اس لیے ہوئی کہ پیروان اسلام کے لیے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لیے ایک کامل ترین مثال قائم رہے'' ۔[2]

حقیقتاً واقعۂ کربلا ایک بہترین اخلاقی و سیاسی و روحانی زندگی کا عملی پیغام ہے۔ اس کا تعلق ہر مذہب کے انسان دوست افراد سے ہے۔ یقیناً 'یزید کی عیارانہ اور انسانیت سوز زندگی نے ایک بڑی گتھی پیدا کردی تھی۔ معرکۂ کربلا حق و باطل، کفر و اسلام، سرمایہ پرستی اور مزدوری، حریت و جبر و استبداد وغیرہ کے مابین ایک فیصلہ کن جنگ تھی'۔[3] حسینؑ نے اپنے عمل سے حق و صداقت اور خدا پرستی کو ایک دوامی زندگی بخش دی۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبالؔ:

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

اور یہ کہ

۱- مجموعۂ ملفوظات، راحت القلوب، ص ۲۲۲ ۲- مولانا ابوالکلام آزاد ۳- ممتاز حسین جونپوری

تا قیامت قطعِ استبداد کرد موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

عاشورہ ہر انسان دوست اور دردمند دل کی آواز ہے۔ اس کا پیغام ابدی ہے، یہ ظالم کے خلاف تازیانۂ عبرت اور مظلوم کی پذیرائی اور اس کے ساتھ ہمدردی کی آواز دوام ہے۔ واقعات کربلا کی یاد ہر ہر ملک میں جگہ جگہ، قریہ قریہ بلکہ پورے کرۂ ارض پر منائی جاتی ہے۔ نوحہ و مجالس کا انعقاد کیا جاتا ہے جس کا سلسلہ بیشتر جگہوں پر پہلی محرم سے ۸ ربیع الاول تک جاری رہتا ہے۔ کربلا اور اس کے سماجی و معاشی اثرات کو اردو و ہندی ادب و شاعری میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

کربلا کے پیغام اور اس کے اثرات کے پیش نظر ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی نے بعنوان ''ہندوستان میں عزاداری'' ایک دو روزہ نیشنل سیمنار ۱۸-۱۹ نومبر ۲۰۰۶ء کا انعقاد کیا جس کے مختلف اجلاسوں میں ہندوستان کی مختلف دانشگاہوں، کالجوں، سماجی و فلاحی اداروں سے آنے والے مندوبین نے شرکت کی اور اپنے اپنے گراں قدر مقالے پیش فرمائے۔ جہاں تک خیالات و افکار کا تعلق ہے اس جہت میں یہ یاد رہے کہ مقالہ نگاروں کا تعلق دانشگاہوں کے مختلف شعبوں، شہروں اور عقائد سے تھا اس وجہ سے تصورات و خیالات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا جس سے سیمنار کی افادیت دوبالا ہوگئی۔ بقول مہدی نظمی:

در حسینؑ پہ ملتے ہیں ہر خیال کے لوگ
یہ اتحاد کا مرکز ہے آدمی کے لیے

سیمنار میں مقالے پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر سریش مترا، پروفیسر جگر محمد، ڈاکٹر رحمت علی خاں، ڈاکٹر علی، ڈاکٹر مینا گوڑ، محترمہ طیبہ منور، پروفیسر عزیز الدین حسین، ڈاکٹر فرحت نسرین، ڈاکٹر منوہر سنگھ راناوت، ڈاکٹر لیاقت حسین معینی، پروفیسر سید جعفر رضا، ڈاکٹر گریش ناتھ ماتھر، قم یونیورسٹی سے آئے ہوئے ڈاکٹر محمد رضا فخر روحانی، ڈاکٹر سید محمد عامر، پروفیسر شاہ وسیم، سید علی کاظم، ڈاکٹر بی۔سی۔ اپادھیائے، ڈاکٹر محمد سجاد، پروفیسر سید ایوب علی، ڈاکٹر جی ڈی گلاٹھی، ڈاکٹر عذرا عابدی، ڈاکٹر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر محمد تنظیم، ڈاکٹر علاؤالدین خان، ڈاکٹر پشپا ڈللر، پروفیسر مہندر پال شرما اور پروفیسر چندر شیکھر وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔

یہ مقالات اپنی اہمیت کے آپ حامل ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی کہ ہندوستان کے مختلف شہروں اور سبھی صوبوں میں آج ہی نہیں بلکہ ہر دور میں مجالس و جلوسہاے عزاء کا اہتمام کیا

جاتا رہا ہے جو اب بھی جاری ہے اور یہ کہ امام و اصحاب امام کے معتقدین چاہے وہ کسی بھی فرقہ یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں سانحۂ کربلا کو یاد رکھتے ہیں اور کربلا والوں کا غم مناتے ہیں۔ آزادی ہندوستان کے بعد بھی نہ یہ کہ ماسابق ہندو و مسلمان راجوں کی طرف سے بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے عزاء خانوں میں مجالس کا انعقاد کیا جاتا ہے اور جلوسہائے عزاء برآمد ہوتے ہیں، خاص کر پہلی محرم، پانچ محرم، سات محرم، آٹھ محرم اور شب عاشور، یوم عاشور اور چہلم اور آٹھ ربیع الاول کو۔ ان جلوسوں اور مجالسِ عزاء میں ہر فرقہ کے معتقدین شامل ہوتے ہیں اور غم حسینؑ مناتے ہیں۔ اس طرح یہ انسانیت نواز قافلہ آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ جے پور، بنارس [وارانسی] اور گوالیار کی ماسابق ریاستیں عزائے حسینؑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں کہ امام عالی مقام سب کے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسم عزا نے نہ یہ کہ صرف تہذیب و ثقافت کو ایک بڑی حد تک جلاء بخشی ہے اور توانائی عطا کی ہے بلکہ اس کا اثر ہندوستان سمیت سارے عالم پر نمایاں ہے۔ کربلا کے سماجی اثرات کے علاوہ معاشی و ادبی اثرات بھی ہیں۔ ہندوستان کی 'پروی' جماعت ہو یا حسینی برہمنوں کا فرقہ سب حسینؑ کی یاد مناتے ہیں۔ کربلا نے ہندوستان کی آزادی اور قومی یکجہتی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح کربلا ایران کی آزادی کی روح رواں ہے۔

اس سیمنار کے انعقاد کی تجویز پروفیسر عزیزالدین حسین نے پیش کی تھی۔ میں ان کا اور تمام مقالہ نگاروں، شرکاء و سامعین اور کلچر ہاؤس کے رفقائے کار کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں خصوصاً ان مقالہ نگاروں اور شرکاء کا کہ جو دور دراز علاقوں سے سفر اختیار کر کے تشریف لائے اور اپنے اپنے علاقوں میں رسم عزاداری کا بھرپور مطالعہ کر کے انہوں نے جو مقالے تیار کیے تھے، انہیں سیمنار میں پیش کیا۔

ہمیں امید ہے کہ راہ اسلام کا یہ خصوصی شمارہ قارئین کو پسند آئے گا۔ اپنے نظریات اور رائے سے ہمیں نوازیں، ہم آپ کے تہہ دل سے مشکور رہیں گے۔ فقط والسلام

ہندستان میں عزاداری کی روایت پر

دو روزہ سیمینار

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران نئی دہلی میں ۲۸-۲۹ آبان ۱۳۸۵ مطابق با ۱۸-۱۹ نومبر ۲۰۰۶ کو ''ہندستان میں عزاداری کی روایت'' پر دو روزہ عظیم سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار میں ہندو، مسلمان اور سکھ فضلا اور اہم شخصیتوں نے نہ صرف شرکت کی بلکہ سیمینار کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ اسی طرح مسلمان اور غیر مسلمان اسکالرز نے اس سیمینار میں دلچسپی سے شرکت کی اور اہم مقالات پیش کیے۔

اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ عزاداری کی روایت خاص طور پر محرم کی دسویں تاریخ کو ہمارے ملک میں قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ عزاداری کی یہ روایت صرف شیعہ مذہب کے پیروکاروں میں ہی رائج نہیں بلکہ ہندو اور سکھوں میں بھی عزاداری کا رواج ہے اور اس کی اصل وجہ ان لوگوں کی امام حسینؑ سے پرخلوص ارادت ہے۔ ہندستان میں شیعہ صرف پانچ فی صد ہیں اس کے باوجود عاشورہ کی یہاں سرکاری چھٹی ہوتی ہے۔ ہندستان میں عزاداری کی اسی اہمیت کے پیش نظر خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نے دہلی میں دو روزہ سیمینار کا اہتمام کیا تا کہ اس برصغیر میں عزاداری کی اہمیت اور اس کی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالی جاسکے۔

اس سیمینار کا افتتاحی جلسہ ۸ نومبر کو صبح ۱۰ بجے خانۂ فرہنگ کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔

پروفیسر عزیزالدین حسین، شعبۂ تاریخ جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے اس افتتاحی جلسے کی نظامت کی۔ آپ نے تمام شرکا اور دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ان اسکالرز کا شکریہ ادا کیا جو اس سیمینار میں اپنے اپنے مقالات پیش کریں گے۔ آپ نے ہندستان میں عاشورہ اور عزاداری کی مختصر تاریخ پیش کی اور ہندستانی تہذیب اور یہاں کے ادب پر اس کے مثبت اثرات کا ذکر کیا۔ آپ نے کہا: ''چونکہ ہندستان میں عزاداری کے موضوع پر یہ پہلا سیمینار ہے، اس لئے یقینی طور پر اس میں پیش کیے جانے والے مقالات میں جو اطلاعات اس موضوع کے بارے میں فراہم کی جائیں گی، ان کی

اپنی خاص اہمیت ہوگی‘‘۔

افتتاحی جلسہ میں سب پہلے نئی دہلی میں خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے مسؤل محترم جناب محمد حسین مظفری نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہند ایران تہذیبی رشتے بہت قدیمی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن پر مثبت اثرات ڈالے ہیں۔ برزویہ کا آب حیات کی تلاش میں ہندستان آنا، کلیلہ و دمنہ کا فارسی میں ترجمہ کرنا وغیرہ ہند ایران قدیم تعلقات کی ایک اہم کڑی ہے۔

آپ نے مزید کہا کہ فارسی زبان ان دوملکوں کے باہمی رشتوں کو استوار کرنے میں ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان میں آسمانی تعلیمات اور معنوی وفکری اقدار کا ایک خزانہ محفوظ ہے۔ ایران نے فارسی زبان کے ذریعہ اس خزانے کے دروازے ہندستان پر کھول دیئے۔ صوفیا نے اخلاقی اور انسانی اقدار کی تبلیغ اسی زبان میں کی ہے۔ انہوں نے انسان دوستی، ایثار، محبت، برابری اور برادری کی تعلیم دی۔ کہاجاتا ہے کہ ابوالحسن خرقانی کی خانقاہ کے دروازے پر یہ تحریر تھا کہ: ’’جو بھی اس خانقاہ میں آئے، اسے کھانا پیش کیا جائے اور اس کے عقیدے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے چوں کہ جو بارگاہ الٰہی میں زندگی حاصل کرنے کے قابل ہے وہ ابوالحسن کی درگاہ میں روٹی کے قابل بھی ہے‘‘۔

مظفری صاحب نے مزید کہا کہ صوفیا نے جس ایک دوسرے اہم اصول کی تبلیغ کی وہ پیغمبر اسلامؐ کے اہل بیت سے محبت تھی۔ اسی کے نتیجے میں ہندستان میں محرم کی عزاداری کچھ اس انداز سے رائج ہوئی کہ مسلمان اور غیر مسلمان سب اس میں شرکت کرنے لگے۔ حالانکہ ہندستان کی آبادی میں شیعہ فرقے کا تناسب کم ہے، اس کے باوجود عاشورہ پر یہاں سرکاری چھٹی ہوتی ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ہندستان کے معروف ومحترم صوفی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں فارسی میں یہ اشعار نظم کئے ہیں:

شاہ است حسینؑ و پادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ و دیں پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دست یزید حقا کہ بنای لاالہ است حسینؑ

اس بنیاد پر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا پیغام ہندستانی قوم کی جان و روح میں گھر کر گیا۔ اس کے علاوہ اسی احساس نے سامراجی طاقت کے خلاف ہندستانیوں کی جد و جہد کو قوت بخشی۔ ہندستان

عظیم رہنما مہاتما گاندھی نے اعلان کیا: ''امام حسینؑ نے ہمیں آزادی سے ہم کنار ہونے ا لئے عدم تشدد کا راستہ دکھایا ہے''۔ ہندستان ااس محترم رہبر نے سامراجی طاقت اخلاف اپنی جد و جہد ااولین مرحلے میں امام حسینؑ ا ۲۷ ساتھیوں کی طرح ۷۲ افراد اساتھ ایک جلوس کی راہنمائی کی۔

محترم مظفری صاحب ا بعد پروفیسر جمناداس نے جو اس جلسے میں مہمان خصوصی تھے، اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

جناب شاہد مہدی صاحب نائب صدر انڈین کاؤنسل فور کلچرل ریلیشنز (ICCR) بھی اس جلسے ا مہمان خصوصی تھے۔ آپ نے ہندستان میں عاشورہ ارواج اور عوام میں اس کی محبوبیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ عاشورہ کا رواج اوائل ادب میں نظر آتا ہے لیکن پھر بتدریج ہندستانی عوام میں اس کا چلن ہوا۔ آپ نے عاشورہ اعام ہونے کا سبب بھی بیان کیا اور کہا کہ اصل میں کربلا اوردناک واقعات محض رزمیہ رویداد نہیں کہ جس کا تعلق صرف شیعہ مذہب اپیروکاروں سے رہا ہو۔ اس کا جو اثر مختلف قوموں، ملتوں اور مختلف مذاہب میں نظر آتا ہے، اس کی وجہ سے ہم اس کو بنی نوع انسان سے متعلق رزمیہ کہہ سکتے ہیں۔ اس واقعہ میں بین الاقوامی جذابیت کا ثبوت جامعہ ملیہ اسلامیہ اسب سے پہلے وائس چانسلر مولانا محمد علی جوہر ااس شعر سے ملتا ہے:

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا ا بعد

میری نظر میں اسلام ایک دکھاوے کا مذہب نہیں۔ کربلا میں رونما ہونے والے واقعات بھی پاکبازی اور جاں نثاری کی ایک کبھی نہ فراموش ہونے والی سرگذشت ہیں۔

یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ عاشورہ ا پیام ابرخلاف، عزاداری اور اس سے متعلق مراسم اب تک جس طرح عالمگیر ہونے چاہئے تھے، نہیں ہوسکے۔ بیشتر اسلامی ممالک میں یہ جس طرح رائج ہونا چاہئے تھے، نہیں ہوسکے۔ میں کئی برس یمن میں رہا ہوں۔ وہاں پہلی محرم سے دسویں محرم تک اور تمام ماہ محرم میں شادیاں ہوتی ہیں حالاں کہ یمن میں آٹھ صدیوں سے زیادہ عرصے تک زیدی شیعہ حاکم رہے ہیں اور وہاں ان کا غلبہ رہا ہے۔ اسی طرح شمالی افریقہ اکئی مسلمان ملکوں میں محرم کی عزاداری ازمانے میں شادیوں کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔

ہندستان میں تعزیہ اور عزاداری امراسم یہاں امشائخ نے شروع کئے تھے۔ ان صوفیوں میں

ہم حضرت نظام الدین اولیا کا نام لے سکتے ہیں جو اہل بیت سے محبت کرتے تھے۔ آپ کی ذات محرم کے دس دنوں میں عزاداری کے رواج کا باعث بنی ہے۔ہمیں اسی وجہ سے ہندستان میں اسلام کی اشاعت کے لئے صوفیوں کی کوششوں کا مرہون منت ہونا چاہئے۔

ہمیں ہندستان میں تعزیہ اور عزاداری کے مراسم کو ایک تہذیبی نشان سمجھنا چاہئے۔ جنوبی ہند (دکن) میں اردو کی نشو ونما ہوئی۔ وہاں مرثیہ سرائی میں دو اسلوب رائج ہیں۔ہمیں دو مشہور ہندستانی مرثیہ کہنے والے شعرا انیس و دبیر کو بھولنا نہیں چاہئے۔ ان کے مراثی نے شمال ہند میں گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اگرچہ ہندستان نے عزاداری کے سلسلے میں ایران سے کچھ سیکھا ہے، اس کے باوجود اس میدان میں ہماری روایات اپنا ایک مخصوص رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔

ہماری تاریخ میں ادب اور مذہب کے میدانوں میں تحقیقی کام، عزاداری کے مراسم کی سماجی مناسبت کے نقطۂ نظر سے انجام دیا جانا چاہئے۔ محض تاریخ کے زاویے سے نہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بھائی ایک دور افتادہ کھیتی باڑی کے علاقے میں انجینئر تھے۔ وہ محرم کے موقع پر پریشان تھے کہ اس ماہ میں عزاداری کیسے ہوگی۔ انہوں نے دیکھا کہ دسویں محرم کی شام کو قبائل کے لوگ تعزیہ نکال رہے ہیں۔وہ مطمئن ہوگئے کہ اس علاقے میں بھی امام حسینؑ کا نام و کارنامہ زندہ ہے۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اوائل میں عزاداری کی روایت کیا رہی ہے اور دہلی اور لکھنؤ میں اس کو رواج دینے والے کون لوگ تھے۔ اردو کے علاوہ ہندستان کی دوسری زبانوں جیسے اودھی، تیلگو وغیرہ نظم و نثر میں امام حسینؑ کی عزاداری کا رواج ہے ہمیں یہ تجزیہ کرنا چاہئے کہ ان زبانوں میں یہ فریضہ کس انداز سے انجام دیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک دوسرا موضوع تحت اللفظ سوزخوانی اور مرثیہ خوانی ہے۔ اس کے بھی دو اسلوب ہیں ایک میر انیس کا اور دوسرا میرزا دبیر کا۔

خواجہ میر درد کے ایک پوتے میر علی نے فرمایا ہے کہ سوز خوانی کا سب سے بہتر طریقہ اودھی اسلوب ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اودھ کے نوابوں کے دور حکومت میں عزاداری کو بہت عروج ہوا۔ آج سوزخوانی زیادہ تر کلاسیکی ہندستانی موسیقی کے انداز میں پیش کی جاتی ہے مثلاً جونپوری، اسواری، بھیروی وغیرہ۔ یہ سب ہندستان کی تہذیبی وراثت ہے۔ اس کی حفاظت کرنی چاہئے۔ یہ سیمنار اسی موضوع پر منعقد ہو رہا ہے۔ یہ عزاداری کی روایت کو اجاگر کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ امید ہے کہ یہ

کانفرنس اسی موضوع پر مزید کانفرنسوں اانعقاد کا سبب بنے گی۔

محترم جناب مرتضیٰ شفیعی شکیب رایزن فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے افتتاحی جلسے کو سب سے آخر میں خطاب کیا۔ آپ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس کانفرنس انتظمین، خاص طور پر پروفیسر عزیز الدین حسین اور خانۂ فرہنگ ایران نئی دہلی کا شکریہ بھی ادا کیا اور سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا:

ایک نظری بحث اطور پر اس سمینار کا ایک مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم یہ سوال کریں کہ ہم اصولاً عزاداری امراسم کیوں انجام دیتے ہیں؟ ہندستان مختلف علاقوں میں عزاداری امختلف طریقوں اور واقعۂ کربلا کی یاد میں مراسم میں اختلاف اباوجود، ہم امام حسینؑ اور عاشورہ ادن شہید ہونے والوں الئے نوحہ خوانی کیوں کرتے ہیں؟ آنسو کیوں بہاتے ہیں؟ اصلی عزاداری ا قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا معنی ہیں؟ آپ نے مولوی روم اان اشعار پر اپنی تقریر ختم کی:

عاشقان را ہر زمانی مردنی است — مردن عشاق خود یک نوع نیست
او دو صد جان دارد از نور ہدی — وان دو صد را می کند ہر دو فدا
ہر یکی جان را ستاند دہ بہا — از نبی خوان عشرہ امثالہا
گر بریزد خون من آن خوبرو — پای کوبان جان بر افشانم بر او
آزمودم مرگ من در زندگی است — چون رہم زین زندگی پایندگی

سمینار ادوسرے دن علمی جلسے منعقد ہوئے۔ یہ جلسہ صبح ۱۰ بجے سے شروع ہوا۔ ان میں دہلی سے باہر کی یونیورسٹیوں ااساتذہ، اور دیگر اہل علم نے مقالات پیش کئے جو بیشتر تحقیقی اور علمی نوعیت اتھے۔ چونکہ یہ سمینار اپنے موضوع الحاظ سے اپنی نوعیت کا پہلا سمینار تھا، اس لئے اس میں پیش کئے گئے مقالات اپنے مطالب و اطلاعات الحاظ سے بہت اہم اور قابل توجہ تھے۔

حالاں کہ یہ ایک ملّی کانفرنس تھی اس اباوجود اس میں دانشگاہ قم ااستاد ڈاکٹر محمد رضا فخر روحانی نے بھی شرکت کی اور ''تحقیق پایہ ای گونہ شناسی زبان مقتل'' عنوان سے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا جسے حاضرین جلسہ نے بہت پسند کیا۔ سمینار میں تقریباً ۲۶ مقالات پڑھے گئے جو علمی و ادبی و تحقیقی لحاظ سے قابل توجہ تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی ااستاد پروفیسر سید جعفر رضا صاحب کا مقالہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ یہ ایک طویل، تحقیقی اور مستند تحریر تھی جس کا عنوان ہے ''ہندستان میں عزاداری''

اسے سمینار میں پیش تو نہیں کیا گیا لیکن یہ فیصلہ ہوا کہ اسے ایک کتابی صورت میں شائع کیا جائے تا کہ اپنے موضوع پر یہ ایک مستند دستاویز کے طور پر مزید کام کرنے والوں کی توجہ مبذول کرا سکے۔

سمینار کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس میں عزاداری کے موضوع پر مفید اظہار رائے کیا گیا۔ بیشتر شرکا نے اس موضوع پر بحث و مباحثے میں حصہ لیا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس سمینار کے تمام مقالات ''راہ اسلام'' کے ایک خصوصی شمارہ میں شائع کیے جائیں۔ راہ اسلام بڑی تعداد میں ہندستانی علمی مراکز، دانشگاہوں، علمی مدارس، کتابخانوں اور علمی اشخاص کو ۱۵ ریاستوں میں ارسال کیا جاتا ہے۔

پروفیسر جمنا داس اختر نے اپنی تقریر میں کہا:

جب میں کسی سے یہ کہتا ہوں کہ میں حسینی برہمن ہوں تو ایک خوش آیند احساس مجھ میں جاگ جاتا ہے۔ حالاں کہ حسینی برہمنوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اس کے باوجود عام طور پر لوگ نہیں جانتے کہ حسینی برہمن کسے کہتے ہیں۔ حسینی برہمن وہ ہیں کہ جو امام حسینؑ کے جذبۂ ایثار کا بھرم رکھتے ہیں اور جب تک یہ دنیا قائم ہے وہ امام حسینؑ کا ذکر اور محرم کی مجالس عزاداری کا اہتمام کرتے رہیں گے۔

آپ جانتے ہیں کہ امام حسینؑ نے حکومت حاصل کرنے کے لئے جنگ نہیں کی تھی آپ نے گمراہی اور ظلم کے خلاف جد وجہد کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کربلا میں حضرت امام کے لئے پانی لانے والوں میں ایک شخص رام بھی تھا۔ ہاں اس کا نام رام نہیں تھا لیکن اس میں رام کی خصوصیات تھیں۔ اس کا اصلی نام سدھو تھا۔ اس کے سات لڑکے تھے۔ یہ سب امام حسینؑ پر قربان ہوگئے۔ ہمارے گھروں میں عزاداری کے دنوں میں چند لوگ کربلا کے مصائب کو منظوم پیش کرتے ہیں۔ راولپنڈی میں ایک شخص بخشی کانشی رام دت تھے۔ یہ ایک رسالہ نکالتے تھے جس میں محرم کے مہینے میں کربلا کے واقعات لکھے جاتے تھے۔ یہ حسینی برہمن تھے۔ میں جب راولپنڈی میں تھا تو میری ماں محرم میں کالے کپڑے پہنتی تھیں جہلم کے علاقے میں مہتا شمبر داس، مہتا گوکل داس وغیرہ بھی حسینی برہمن تھے اور عزاداری کی مجالس منعقد کرتے تھے۔ ایران میں اسلامی انقلاب کامیاب ہوا۔ سب لوگ اس سے خوش ہوئے۔ اس ایرانی انقلاب نے امام حسینؑ کے انقلاب کا احیا کیا ہے۔

ڈاکٹر رنبیر سنگھ صاحب نے بھی اس جلسے کو خطاب کیا اور کہا:

میں عزاداری کے مراسم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں یہاں خالی ہاتھ آیا تھا، لیکن جلسے

میں شرکت ا بعد میرے دونوں ہاتھ عزاداری کی روایت ا بارے میں اطلاعات سے بھرے ہوئے ہیں اور کہنا چاہئے کہ میں ایک انسان کی حیثیت سے واپس ہوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ انسانیت کا سبق سیکھوں، اس کی وجہ یہ کہ آج دنیا میں سب سے بڑا خطرہ انسانیت کو ہے۔ میں نے اس سمینار میں شرکت ابعد عاشورہ امفہوم کو سمجھا ہے۔

اس جلسہ میں ڈاکٹر منوہر سنگھ صاحب نے فرمایا:

میں خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کلچرل سوسائٹی کا ممنون ہوں کہ مجھے اس سمینار میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے اس سمینار میں پیش کرنے الئے مقالہ کی تیاری الئے منابع کی تلاش میں کئی کتابخانوں کا رخ کیا۔لیکن مجھے مآخذ دستیاب نہیں ہوسکے، لیکن اس سمینار میں عزاداری اموضوع پر مجھے اہم، نئی اور مفید اطلاعات ملی ہیں۔ میں نے متعدد سمیناروں میں شرکت کی ہے،لیکن یہ سمینار اپنے موضوع الحاظ سے بالکل انوکھا ہے۔

محترمہ ڈاکٹر مینا گاور نے بھی سمینار کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس موضوع پر زیادہ اطلاعات موجود نہیں اس لئے اس سمینار میں پیش کئے گئے مقالات درحقیقت عزاداری اموضوع پر بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سمینار اآخری جلسہ میں سمینار اسکریٹری پروفیسر عزیزالدین حسین صاحب نے شرکا سے درخواست کی کہ وہ سمینار کی کارروائی پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ ڈاکٹر فیضان احمد صاحب نے کہا: مجھے خوشی ہے کہ اس اہم سمینار میں شرکت کا مجھے موقع ملا۔ اس میں اہم مقالات پیش کئے گئے۔ چوں کہ ان مقالات میں ہندستان اگوشے گوشے میں عزاداری کی روایت کو اجاگر کیا گیا ہے، اس لئے ان کی ایک تاریخی اور علمی حیثیت بھی ہے۔

جلسے اآخر میں جناب محمد حسین مظفری، مسئول خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی نے سمینار ااختتام کا اعلان کیا۔ آپ نے اس ضمن میں سب سے پہلے تمام شرکا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جو ہندستان امختلف شہروں اور ریاستوں سے اس میں شریک ہوئے۔ آپ نے پروفیسر عزیزالدین حسین صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا جن کی مساعی جمیلہ سے یہ سمینار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ مظفری صاحب نے کربلا اسبق آموز واقعہ کا ذکر کیا اور امام حسینؑ کا یہ جملہ دہرایا جو آپ نے یزید الشکر سے کہا تھا کہ: ''اگر تمہارا کوئی دین نہیں تو کم از کم آزادمنشی کا ثبوت تو دو'' آپ نے

عاشورہ کے حادثے کو سارے عالم انسانیت کا حادثہ قرار دیا۔ آج جب دنیا خاص طور پر عراق، افغانستان، فلسطین، لبنان وغیرہ ظلم و استبداد کا شکار ہیں اور یہاں کی مظلوم آبادی انصاف کے لئے فریاد کررہی ہے، کربلا کا واقعہ ہمیں راہنمائی اور ہمت بخشتا ہے۔

محترم مظفری صاحب نے مزید فرمایا کہ اس سیمنار کا اصلی مقصد عزاداری کے مراسم کا گہری نظر سے مطالعہ اور ان کی اہمیت و مناسبت کا اندازہ لگانا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عاشورہ اور امام حسینؑ کا پیام تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ تو سعادت و خوش بختی کا پیام ہے اور بنی نوع بشر کی آزادی اور ظلم و ستم سے رہائی کا منشور ہے۔ یہ پیام کسی مخصوص وقت کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اور ہر ایک کے لئے ہے۔ آج کے حالات میں اس کی بہت ضرورت و مناسبت ہے۔ اس میں آج کی دنیا کے لئے بھی ایک درس ہے وہ دنیا جس میں ظلم، ستم اور زور و زبردستی کی حکومت ہے۔ یہ رویہ کسی مذہب میں قابل قبول نہیں۔

سمینار کے دوران ۱۹ نومبر ۲۰۰۶ کو خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی، نئی دہلی کے ہال میں سوزخوانی اور مرثیہ خوانی کی مجلس منعقد ہوئی۔ سید اسد رضا عابدی اور تنویر الحسن نے سوزخوانی اور مرثیہ خوانی میں حصہ لیا۔ اور میر انیس کے اشعار پیش کئے۔ میر انیس کو مرثیہ سرائی اور امام حسینؑ پر مصائب کے بیان کرنے کے سلسلے میں ''خدائے سخن'' کا درجہ حاصل ہے۔

یہ بتادینا ضروری ہے کہ ہندستان میں تحت اللفظ سوزخوانی امام حسینؑ کی عزاداری کے مراسم کا ایک لازمی حصہ ہے۔ عزاداری کے دنوں میں روضہ خوانی سے قبل مصائب کربلا کے لئے ماحول بنانے کی غرض سے سوزخوانی کی جاتی ہے۔ سوزخوانی میں بیشتر رباعیات یا میر انیس کے معروف مراثی کے کچھ حصے میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے مصائب کا ذکر ہوتا ہے، مخصوص انداز و آواز میں چند لوگ پڑھتے ہیں اس کے بعد ایک شخص تحت اللفظ میں ہیجان انگیز انداز سے عزاداری کی مجلس میں چند اشعار پڑھتا ہے۔ اس مجلس میں بھی یہی طریقۂ کار اختیار کیا گیا جس کی وجہ سے حاضرین پر ایک خاص اثر ہوا۔

کربلا شناسی

عشرہ محرم الحرام

مولانا ابو الکلام آزاد

عصر عاشور حسین مظلوم نے دین مبین اسلام کی بقا کی خاطر جو عظیم قربانیاں پیش کی تھیں وہ تاریخ بشریت کی عدیم المثال قربانیاں بن گئیں اور اسلام کا ایسا بیمہ کردیا کہ رہتی دنیا تک کسی یزید میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ حسین مظلوم کے سوگواروں سے بیعت کا مطالبہ کرسکے۔ ذکر شہادت حسین ہر اس موحد کا فریضہ ہے جس کے کانوں سے اذان کی آواز ٹکرارہی ہے کیونکہ حسین نے اسی آواز اور نماز نیز ''دین محمدی'' کی بقا کی خاطر تلوار کو گلے لگایا تھا۔ اسی وجہ سے کائنات کے ہر گوشہ میں ان کا ذکر ہوتا ہے اور انسانی شعور کی بیداری کے ساتھ ہی ساتھ حسینیت کے ذکر میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے اور بقول شاعر

انسان کو بیدار تو ہولینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

ذیل میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے حسین مظلوم کے ذکر کا مطالعہ کیجئے۔(ادارہ)

شمع ہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدہ خونابہ نشانم دادند

آیئے سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی صحبت ماتم کو پھر تازہ کریں۔

کتنے دن گزر گئے کہ راہ ورسم ماتم وشیون سے نا آشنا ہیں۔ نہ صدائے ماتم کی فغاں سنجی ہے اور نہ چشم خونبار کی اشک فشانی۔ کاروبار غم کی رونق افسردہ ہوچکی ہے اور بازار درد کی چہل پہل مدت سے موقوف ہے۔

نہ داغ تازہ می خواہد نہ زخم کہنہ می کارد
بدہ یارب دلی کین صورت بیجاں نمی خواہم

طرابلس کے خون آلود ریگستان کو اگر لوگوں نے بھلادیا، مشہد مقدس اور تبریز کا قصہ الم اگر ذہنوں سے محو ہوگیا۔ مقدونیہ اور البانیہ کے تازہ ترین افسانہ ہائے خونین اگر فکروں سے فراموش ہوگئے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ارباب درد وغم کے لئے ایک ایسی داستان الم صدیوں سے موجود ہے جو کبھی بھلائی نہیں جاسکتی، اور اگر لوگ اسے بھلا بھی دیں تو ہرسال چند ایسے ماتم آلود دن ہیں جو تازگی زخم کہن کے لئے آموجودہ ہوتے ہیں۔ جو از سر نو تیرہ سو برس پیشتر کے ایک حادثہ عظیم کی یاد پھر سے تازہ کردیتے ہیں۔ اس سے میرا اشارہ حادثہ وہائلہ کبریٰ یعنی شہادت حضرت سید الشہداء علیہ وعلی اجدادہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ہے۔ عظم الله اجورنا بمصائبنا۔

سچ یہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندگی کے لئے سوز تپش کی ضرورت ہو، جن ارباب درد کو روح کی راحت کے لئے جسم کے ماتم کی تلاش ہو، جن کی زبانیں آہ وفغاں کو محبوب، اور جن کی آنکھیں خون نا بہ فشانی کو اپنا مطلوب ومقصود سمجھتی ہوں، ان کی صحبت ماتم والم کی رونق کے لئے یہی افسانہ اتنا کچھ سامان غم اپنے اندر رکھتا ہے کہ اگر خون کے سیلاب سمندروں کی روانی سے بہہ جائیں اور بے شمار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات یکسر جنبش میں آجائیں، جب بھی ان کی نداء حال اس الہام سرائی سے قاصر رہے گی، جو اس کے ایک ایک لفظ کے اندر عبرت وبصیرت ہے۔

لیکن آہ! کتنے دل ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو اس حقیقی بصائر ومعارف کے اندر دیکھا ہے؟ اور کتنی آنکھیں ہیں جو حسین ابن علی شہید پر گریہ وبکا کرتے ہوئے اس اسوہ حسنہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں جو اس حادثہ عظمیٰ کے اندر موجود ہے؟

فی الحقیقت یہ آزادی وحریت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی جو صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروان اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے۔ اور اس طرح جہاد حق وعدالت اور اس ثبات اور استقامت کی ہمیشہ کے لئے کامل ترین مثال قائم کردے۔ کسی روح کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسین کی مدعی ہو جب تک اسوہ حسینی کی متابعت کا اپنے اندر ثبوت نہ دے۔

دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے مگر خون شہادت کے ان قطروں کے لئے جو اپنے اندر حیات الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں کبھی بھی فنا نہیں:

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثۂ عظیم سامنے لاتا ہے دعوت الی الحق اور حق وحریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرنا ہے۔ بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبرو شخصیت پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے اسلام کی روح حریت وجمہوریت کو غارت کیا۔ اور شوریٰ اور اجتماع امت کی جگہ غلبہ جابرانہ اور مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد پر رکھی۔ ان کا نظام حکومت شریعت الٰہیہ نہ تھا بلکہ محض اغراض نفسانی مقاصد سیاسیہ تھے ایسے میں ضرور تھا کہ ظلم وجبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق وحریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔ حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کرکے مظالم بنی امیہ کے مقابلہ میں جہاد حق کی بنیاد رکھی، اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی اس کی اطاعت ووفاداری سے انکار کردیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ظالمانہ وجابرانہ حکومت کا اعلانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت ووفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت وحقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام مستبدہ وجابرہ کی بنیاد، صداقت وعدالت کی جگہ جبر وظلم ہو۔

مقابلے کے لئے ضروری نہیں کہ تمہارے پاس قوت وشوکت مادی کا وہ سب سازوسامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے۔ کیونکہ حسین ابن علی کے ساتھ جمعیت قلیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت، نتائج کی فکر سے بے پرواہ ہے۔ نتائج کا مرتکب کرنا تمہارا کام نہیں، یہ اس قدرت قاہرہ عادلہ الٰہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف اور فقدان انصار کے، کامیاب وفتحمند کرتی ہے اور ظلم کو باوجود جمعیت وعظمت دینوی کے، نامراد ونگوں سار کرتی ہے۔

کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (۲۴۹:۱۲)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی عتوں پر حکم الٰہی سے غالب آگئیں۔

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مصلحت اندیشیوں کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ جوفی نفسہ اگر چہ عقل ودانائی میں آکر فرشتہ ہے، لیکن کبھی کبھی شیطان رجیم بھی اس کے بھیس میں آکر کام کرنے لگتا ہے۔ نفس خادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں کٹوادینے اور چند انسانوں کا خون بہا دینے سے کیا حاصل؟ توپ وتفنگ وتخت وسلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں؟

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔

تاریخ عالم کی صدہا امثال مقدسہ ومحترمہ جہاد سے قطع نظر، تمہارے سامنے خود مظلوم کربلا کی مثال

موجود ہے۔تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومت کی قوتوں اور سازوسامان کا مقابلہ کب کیا ہے کہ کبھی بھی کیا جائے؟میں کہتا ہوں کہ حسینؑ ابن علیؑ نے صرف (۷۲) یا باسٹھ بھوکے انسانوں کے ساتھ اس عظیم الشان حکومت قاہرہ وجابر کا مقابلہ کیا جس کے حدود سلطنت ملتان اور سرحد فرانس تک پھیلنے والے تھے۔ اور گو یہ سچ ہے کہ حسینؑ نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتا دیکھا، اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر وجود مقدس خاک وخون میں تڑپا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔اور یہ بھی سچ ہے کہ دشمنوں سے نہ تو پینے کے لئے پانی چھین سکے اور نہ زندہ رہنے کے لئے اپنی غذا حاصل کر سکے۔ اور اس میں بھی شک نہیں بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے چور چور ہوئے اور اس خلعت شہادت لالہ گوں سے آراستہ تیار ہوئے تا کہ اس کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچیں جو دوستوں کو خاک وخون میں تڑپاتا اور دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔

ارید وصلا و یرید قتلی

تاہم فتح اس کی تھی اور فیروز مندی اور کامرانی کا تاج صرف اس کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک وخون میں لوٹا، پر اپنے اس خون کے ہر ہر قطرے سے جو اس کے زخموں سے ریگ وسنگ پر بہا تھا، انقلاب وتغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیئے، جن کو جن نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی ، نہ حجاج کی بے امان خونخواری اور نہ عبد الملک کی تدبیر وسیاست۔ وہ بڑھتے اور بڑھتے ہی رہے۔ظلم وجبر کا پانی تیل بن کر ان شعلوں کی پرورش کرتا رہا۔حکومت کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک چنگاری کو آتش کدہ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آ گیا۔ اور جو کچھ ۶۱ ہجری میں کربلا میں ہوا تھا وہ سب کچھ سنہ ۱۳۲ ہجری میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم اسلام کے اندر ہوا۔ صاحبان تاج وتخت خاک وخون میں تڑپے، ان کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔فتحمندوں نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور مردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت اور حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا اور اس طرح: و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون (۲۶-۲۷) کا پورا ظہور ہوا۔ پھر یہ سب جو ہوا وہ ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابو مسلم خراسانی کی خفیہ دوانیوں ہی کا نتیجہ نہ تھا۔ کیا یہ اسی خون کا اعجاز نہ تھا جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا۔ پھر یہ فتح مندی تو برجستہ ظاہر ہے جس کے نتیجہ کے لئے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے اسی وقت اپنی فتحمندی حاصل کر لیتا ہے۔

بہر حال یہ تو حق وصداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے لیکن حضرت سید الشہداء کا اسوہ بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا پرواہ نہ کرو۔ اگر ظلم اور جابرانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے۔ اور اسے ہونا ہی چاہئے۔ تعداد کی قلت وکثرت یا سامان ووسائل کا فقدان اس پر موثر نہیں ہوسکتا۔ اور ظلم کا صاحب شوکت وعظمت ہونا اس کے لئے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اس کی اطاعت ہی کرلی جائے۔ ظلم خواہ ضعیف ہو، خواہ قوی ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہئے کیوں کہ وہ ظلم ہے اور حق وانصاف ہر حال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے۔

حق وعداوت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر حفظ جان وناموس اور محبت فرزند وعیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں لیکن یہ اسوۂ حسنہ مومنین مخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب وہمت کو اچھی طرح آزمالیں۔ ایسا نہ ہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے۔

جرم را این جا عقوبت استغفار نیست

اس قتیل جادۂ حق وصداقت کے چاروں طرف جو کچھ تھا اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی آزمائشوں کے متعدد درجے بیان کئے ہیں۔

ولنبلونکم بشیءٍ من الخوف و الجوع و نقص من الاموال و الانفس و الثمرٰت و بشر الصبرین الذین اذا اصابتھم مصیبة قالوا انا لله و انا الیه راجعون۔

اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائشوں میں ڈالے گا۔ وہ حالت خوف وہراس بھوک اور پیاس نقصان مال و جان اور ہلاکت اولاد اقارب میں مبتلا کرکے تمہارے صبر واستقامت کو آزمائے گا۔ پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے ان کے لئے جن کے ثبات واستقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اپنے تمام معاملات یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کردیتے ہیں کہ انا لله وانا الیه راجعون۔

خوف وہراس، بھوک اور پیاس، نقصان اموال ومتاع، قتل نفس واولاد یہی چیزیں انسان کے لئے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے ان ہی چیزوں کو راہ الٰہی کے لئے آزمائش قرار دیا گیا ہے۔

لیکن مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کرکے موجود تھے۔ وہ ان تمام مصائب سے

ایک لمحہ کے اندر نجات پاکر آرام وراحت اور شوکت وعظمت حاصل کرسکتا تھا۔ اگر حکومت ظالمہ کی وفاداری واطاعت کا عہد کرلیتا اور حق وصداقت سے روگردانی کے لئے مصلحت وقت کی تاویل کرتا، پر اس نے خدا کی مرضی پر ترجیح دی اور حق کا عشق، زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا۔ اس نے اپنا سردے دیا کہ انسان کے پاس حق کے لئے یہی کچھ ہے۔ یہی ایک آخری متاع ہے، پر اطاعت واقرار وفاداری کا ہاتھ نہ دیا جو صرف حق وعدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا۔

و من الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله والله رؤف العباد۔

اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں جانیں تک فروخ کردیتے ہیں اور اللہ بھی اپنے بندوں کے لئے شفقت ومہربانی رکھنے والا ہے۔

سب سے بڑا اسوہ حسنہ کہ اس حادثہ عظیم کی لسان حال اسکی ترجمانی کرتی ہے۔ راہ مصائب و جہاد حق میں صبر واستقامت اور عزم وثبات ہے کہ:

ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا

بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہی ہے اور پھر اس بات پر قائم رہے۔

دوسری جگہ کہا:

فاستقم کما امرت

پس چاہئے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے (اے نبیؐ) قائم رہو۔

(اپنی راہ میں) استوار ہوجاؤ۔

فی الحقیقت اس شہادت عظمیٰ کی سب سے بڑی رمزیت وخصوصیت یہ ہے کہ اپنے عزیز وقارب، اہل وعیال اور فرزند واحباب کے ساتھ دشت غربت ومصائب میں محصور ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش وجوع سے آہ وفغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھر ان سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا، حتیٰ کہ اپنے طفل شیر خوار کا بھی تیر ظلم وبربریت سے نجات پانا۔ مگر بایں ہمہ راہ حق وصداقت میں جو پیمان صبر واستقامت باندھا تھا اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشرہ ودقیقہ کے لئے بھی متزلزل نہ ہونا، اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب واندوہ پیش آئے سب کو شکر ومنت کے ساتھ برداشت کرنا۔ کہ

رضینا بقضاء الله وصبرنا علی بلائه

پیکان ترا بجان خریدار
من مرہم دیگران نخواہم

دوست کے ہاتھ سے جام زہر بھی ملتا ہے تو تشنہ کامان زلال محبت اسے غیروں کے جام شہد وشکر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اے جفاہای تو خوشتر از وفای دیگران

آج بھی اگر گوش حقیقت نیوش باز ہوتو خاک کربلا کا ایک ایک ذرہ توصیہ فرمائے صبر و استقامت ہے۔

شدیم خاک ولیکن ہوای تربت ما
تواں شناخت کزین خاک مردمی خیزد

افسوس کہ تفصیل مطالب کا ارادہ نہیں اور وقت وگنجائش مقتضی ایجاز۔اگر اس صبر واستقمات کے اسوہ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہوتو خدارا اسفار تاریخ کی طرف توجہ کرو۔

ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت
ابتداء، فروغ اور دور انحطاط

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی☆

ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت تیرہویں صدی عیسوی سے ملتی ہے۔ اس میں بعض صوفیائے کرام کا بھی حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے سے صوفیاء نے ہندوستان میں خانقاہیں تو قائم ہی کیں مگر بعض صوفیاء نے امام باڑے بھی تعمیر کیے۔ مندر اور مسجد، دونوں کے دروازے دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے لیے بند تھے۔ خانقاہ اور امام باڑے کا مزاج ان سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے دروازے دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ مزاج آج تک قائم ہے۔ یہاں ہونے والی مجالس میں بلاتفریق مذہب و ملت لوگ شریک ہوتے ہیں۔ عزاداری امام حسینؑ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور عہد سلطنت ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک، دوسرا دور ۱۵۲۶ء سے ۱۷۵۷ء تک، تیسرا دور ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ تک اور چوتھا دور ۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ۔

عزاداری امام حسینؑ کی بنیاد قرآن کے ۲۵ ویں پارے کی ۳۲ ویں آیت ہے: قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى۔ (کہہ دیجیے کہ میں تم سے اجر طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو۔) اہل سنت اور اہل تشیع کے متفقہ دینی پیشوا حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ نے تو اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا نام انہوں نے مودۃالقربی رکھا۔ اس آیت کی تفسیر وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے: اے لوگو! تم خدا کو دوست رکھو اس لیے کہ اس نے اپنی نعمتیں تم کو عطا فرمائیں اور محبتِ خدا کے لیے مجھ سے محبت رکھو اور میری محبت کے لیے میرے اہل بیت کو دوست رکھو۔ پس جب کہ آل نبیؐ کی دوستی کی بابت سوال کیا گیا ہے اور وہ ہم سے طلب کی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے حبیب عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ

☆ شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اپنی امت سے اپنے ذوی القربیٰ کی دوستی کے سوا اور کچھ طلب نہ کریں اور یہ دوستی ان کے لیے باعث نجاتِ آخرت ہے اور آں حضرتؐ اور ان کی آل اطہار سے توسل کا ذریعہ ہے۔ جو کوئی خدا تک پہنچے اور اس کی جناب میں مقبول ہونے کا طالب ہو اس پر واجب ہے کہ رسول خدا سے محبت رکھے اور اہل بیت رسول خدا سے محبت رکھے اور اہل بیت رسول کی دوستی اختیار کرے اور یہ بات آں حضرت کے آل اطہار کے فضائل کی معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی''۔

آخر میں میر سید علی ہمدانی فرماتے ہیں کہ:''میں نے اس کتاب کا نام مودۃ القربی [1] رکھا تاکہ مجھ کو اللہ تعالیٰ اور اس کو ان حضرات سے میرے ملاقی ہونے کا ذریعہ بنائے گا اور ان کے ذریعے سے مجھ کو نجات عطا فرمائے گا۔

ایک رباعی میں فرماتے ہیں:

گر حبِ علی و آلِ نبوت نبود　　امیدِ شفاعت ز رسولت نبود
ور طاعتِ حق جملہ بجا آری تو　　بی مہرِ علی ہیچ قبولت نبود

صوفیائے کرام اسلام پر قائم تھے۔ ایک قرآن، دوسرے سنت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور تیسرے محبت اہل بیت رسولؐ۔ امام جعفر صادق صوفی کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: "من عاشق فی باطن الرسول فهو صوفی" [2] جو شخص اخلاق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آراستہ ہوجائے اور اس امر کو اختیار کرے جو رسول خدا نے اختیار فرمایا اور رغبت کرے اس طرف جدھر رسولؐ نے رغبت فرمائی اور پرہیز کرے اس سے جسے رسول نے چھوڑا تو گویا اس نے صفائے قلب حاصل کرلیا۔ صوفیا نے کبھی اپنے آپ کو کسی فرقے سے منسلک نہیں کیا۔ کسی صوفی کے ملفوظات میں یہ نہیں ملتا کہ ان کا تعلق کسی خاص فرقے سے تھا۔ وہ فرقہ واریت کے اصولی طور سے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی خانقاہیں اسلامی اتحاد کا بڑا قوی و مستحکم حصار تھیں جہاں باہمی اخوت اور ہمدردی کی پائیدار بنیادیں پڑی تھیں۔

ہندوستان آکر صوفیاء نے اسلام کی تبلیغ کی۔ قرآن و سنت نبویؐ پر عمل کرنے کی ہدایت اور اہل

۱۔ میر سید علی ہمدانی، مودۃ القربیٰ، قلمی نسخہ، کتب خانہ سید شاہ خیرات علی، جلالی، ضلع علی گڑھ، تفصیل کے لیے حکیم سید محمد کمال الدین حسین صاحب، مودۃ القربیٰ

۲۔ حکیم سید محمد کمال الدین حسین، ذخیرہ جلالی کے چار اہم مخطوطات، خدابخش جرنل ۲۹ - ۴۷، ص ۱۲۷

بیت نبویؐ سے محبت۔ ان کی تبلیغ کے یہی دو محور تھے۔ صوفیا اپنے دور دراز وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبات اور گاؤں میں سکونت اختیار کر کے اپنی خانقاہوں کی بنیاد ڈالی اور اس طرح انہوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی روحانی ولایتیں قائم کیں۔ کئی صوفی سلسلے آئے جن میں چشتی اور سہروردی سلسلوں نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ چشتی صوفیاء نے پہلے اجمیر اور اس کے بعد دہلی کو اپنا مرکز بنایا۔ سہروردی صوفیاء نے ملتان کو اپنا مرکز بنایا۔ ان صوفیاء نے خاص طور سے قصبات اور گاؤں میں تبلیغ کا کام کیا۔ قصبات اور گاؤں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ان حالات میں وہاں جاکر رہنا خود ایک جہاد تھا اس لیے کہ صوفیاء صرف مسلمانوں میں ہی تبلیغ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ہندوؤں کے درمیان رہ کر بھی تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے خانقاہ کے دروازے ہندوؤں کے لیے کھول دیئے۔ صوفیاء کے اس تبلیغی مشن نے ہندوؤں کو کافی متاثر کیا اور اس طرح سے اسلام کی تعلیمات ہندوؤں تک پہنچیں۔

نہ جانے کیوں شیعہ حضرات میں صوفی تحریک اور صوفیاء کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوگیا یا پیدا کر دیا گیا کہ تصوف اور صوفیاء سے شیعوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی وجہ لاعلمی بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح اہل سنت حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ شیعوں کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ ۱۶ویں صدی عیسوی کے ایک شیعہ عالم قاضی سید نوراللہ شوشتری نے اپنی کتاب مجالس المؤمنین[۱] میں ایک باب تصوف پر بھی قائم کیا ہے اور اس کے متعلق مسائل سے بحث کی ہے اور اسی کے ساتھ کچھ صوفیاء کی سوانح بھی قلمبند کی ہیں اور تصوف کو مذہب حقہ کہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے زیادہ تر سادات اثناءعشری کے مورث اعلی صوفیا ہی تھے۔ سادات امروہہ ضلع مرادآباد کے سید شرف الدین شاہ ولایت، سادات میمن، ضلع بجنور کے سید اشرف، سادات سری نگر اور سادات جلالی ضلع علی گڑھ کے میر سید علی ہمدانی، سادات سرسی ضلع مرادآباد کے شاہ ولایت اور اسی طرح سے زیادہ تر دوسرے قصبات کے سادات اثناعشری بھی صوفیاء ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

انہی صوفیاء نے مودۃ القربی کے لیے عزاداری امام حسینؑ کو ایک ذریعہ بنایا۔ نذر و نیاز کے طریقے

۱۔ سید نور اللہ شوشتری، مجالس المؤمنین، قلمی نسخہ انڈیا آفس کلکشن، لندن، اس مخطوطے کے آخر میں قاضی سید نوراللہ شوشتری کی اپنے قلم سے تحریر موجود ہے۔

اور عزاداری کی رسومات صوفیاء نے قائم کیں۔ یہ سب توسل اہل بیت کے طریقے ہیں۔ عزاداری امام حسینؑ یا اس کی رسومات اور نذر و نیاز کے طریقے کہیں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ صوفیاء کے مزاج کے مطابق یہ طریقے سینہ بہ سینہ، پشت در پشت، ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے رہے۔ ۱۳ ویں صدی عیسوی سے لے کر ۲۰ ویں صدی کے اختتام تک عزاداری امام حسینؑ اور اس کی رسومات سے متعلق کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ حسین علی کربلائی نے تحفۃ العوام[۱-۲] لکھی جس پر زیادہ تر شیعہ علماء و مجتہدین توثیق کرتے رہے۔ اس پر آٹھ جید علمائے اثنا عشری کے دستخط موجود ہیں۔ صفحہ ۱۴۲ سے ۱۵۴ تک ۲۰ ویں باب میں ماہ محرم کے اعمال ہیں۔ یہ اعمال شب عاشورہ سے لے کر آخر روز عاشورہ تک کے ہیں۔ حالانکہ حصہ سوم و چہارم کا بعد میں اضافہ بھی کیا گیا لیکن اس اضافہ میں بھی عزاداری امام حسینؑ کے باب کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ مقدمہ میں چوتھی فصل میں امامت پر بیان ہے۔ اس میں بھی عزاداری امام حسینؑ یا نذر و نیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ اعمال شب عاشورہ سے لے کر آخر روز عاشورہ تک صرف پانچ گھنٹے میں ختم ہوجاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عزاداری امام حسینؑ کا جو سلسلہ پہلی محرم سے بارہ محرم تک ہوتا ہے یہ کس کی دین ہے؟ اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس کے بانی صوفیاء تھے اور اس کا ماخذ صوفیاء اور ان کی نسلوں کے سینے تھے جہاں عزاداری امام حسینؑ کی رسومات محفوظ تھیں جو نسل بعد نسل ایک کے بعد ایک دوسرے کو منتقل ہوتی رہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ عزاداری امام حسینؑ کی کچھ رسومات پر علماء کو اعتراض بھی ہے۔ اس دور میں عزاداری امام حسینؑ پہلی محرم سے بارہ محرم تک اور صرف بیس صفر کو چہلم شہدائے کربلا ہوتا تھا۔ عزاداری کو آٹھ ربیع الاول تک جاری رکھنا ۱۸ ویں صدی کا اضافہ ہے۔

مجالس کس طرح منعقد کریں، تعزیہ کس طرح بنائیں، علم کس طرح کا ہو وغیرہ وغیرہ یہ سب زبانی تھا۔ ۱۲ اپریل ۹۸ء کو اپنے دوست ڈاکٹر نسیم اختر، جناب حسیب احمد اور جناب اقبال کے ہمراہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی[۳] زیارت کے واسطے گیا۔ دیکھا کہ درگاہ کے ایک گنبد پر ایک علم

۱- حسین علی کربلائی، تحفۃ العوام، یہ سال بھر کے اعمال پر مشتمل کتاب ہے۔ کوئی گھر اہل تشیع کا شاید ہی ایسا ہو کہ جس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔

۲- عزاداری امام حسینؑ سے متعلق اس میں کوئی باب نہیں اور نہ ہی عزاداری امام حسینؑ سے متعلق رسومات کا اس میں کہیں ذکر ہے۔

۳- حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا تعلق صوفیاء کے چشتی سلسلے سے تھا۔ وہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ ان کی درگاہ دہلی میں مہرولی میں قطب مینار کے نزدیک واقع ہے۔

میر سید علی ہمدانی کے بزرگوں میں سے میر کمال الدین ہمدانی، مغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں سولہویں صدی عیسوی میں کشمیر سے جلائی تشریف ⇐

نصب ہے۔ یہ علم بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ دس محرم کو جلالی کے بڑے امام باڑے میں سوار ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان علموں کا تعلق صوفی فکر سے ہے اس لیے کہ جلالی میں بھی عزاداری امام حسینؑ صوفیا ہی کی قائم کی ہوئی ہے۔ جلالی میں محرم کی مجالس میں سب سے پہلے دہ مجلس خوانی ہوتی ہے جو آج تک جاری ہے۔[1] اس دہ مجلس میں پہلی مجلس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور باقی دوسری مجالس اہل بیت اور شہدائے کربلا سے متعلق ہیں۔ ان میں ان حضرات کے فضائل و مصائب بیان کیے جاتے ہیں۔

صوفیاء نے ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کے نظام کو اس طرح ترتیب دیا کہ فن کار، کاریگر اور مزدور کو نظام عزاداری میں اس کے ہنر کے ساتھ جوڑ دیا۔ حلوائی، بڑھئی، ہتھیلیا، درزی، کارچوبی والے، ڈھول تاشے والے، میراثی، تیلی، کہار، سقے، فقراء، مالی، نان بائی اور مجاور وغیرہ۔ اگر ایک کاریگر یا مزدور کو عزاداری امام حسینؑ کا فلسفہ سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ اسی لیے ان کو ان کے فن کے ساتھ عزاداری امام حسینؑ سے جوڑ دیا تاکہ وہ ان کی زندگی اور فکر کا حصہ بن جائے اور اس کے ہاں عزاداری امام حسینؑ سے دلی لگاؤ پیدا ہوجائے اور اس مشن میں صوفیاء کامیاب ہوگئے۔ ماہرین تعلیم نے تعلیم کو حرفے سے جوڑنے کا سبق تو بیسویں صدی میں دیا۔[2] صوفیا نے ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کو حرفے سے جوڑنے کا کام ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ہی کامیابی کے ساتھ انجام دے دیا تھا۔ اور یہ ان کی بین کرامت تھی۔

عزاداری امام حسینؑ کے مرکز کا نام امام باڑہ رکھا گیا۔ یہ قطعی طور پر ہندوستانی اس طرح تھا کہ اس سے پہلے عرب، ایران اور دوسرے مسلم ممالک میں اس نام کا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ اس میں امام

⇐

لائے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ سادات جلالی انہی کی نسل سے ہیں۔ جلالی میں عزاداری امام حسینؑ کا قیام اسی دور میں وجود میں آیا۔ نواب شجاع الدولہ نے اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ سید شاہ خیرات علی کو عزاداری امام حسینؑ کے مصارف کے لیے پانچ گاؤں ضلع ایٹہ میں دیے۔ جلالی کی عزاداری میں جن چیزوں میں صوفیاء کی جھلک ملتی ہے وہ ہیں امام باڑے، مجلس خوانی، ہندو اور مسلمانوں کا عزاداری امام حسینؑ میں شریک ہونا۔ جلالی میں عزائے حسینؑ کو لے کر آج تک کوئی جھگڑا نہیں ہوا جبکہ جلالی سے انیس کلومیٹر دوری پر علی گڑھ میں اکثر عزائے حسینؑ کو لے کر مسئلہ بنا۔ جلوس پر پابندی لگی اور کچھ برسوں تک جلوس نہ نکل سکا۔

۱۔ بیسویں صدی میں جرمنی کے ماہر تعلیم کرن میر نے تعلیم کو حرفے سے جوڑنے کی سب سے پہلے تھیوری پیش کی۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے آزادی کی تحریک میں بھی اس کا استعمال کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کو بنیادی تعلیم کے نصاب میں شامل کر کے قومی تعلیم کا ایک منصوبہ ۱۹۳۷ء میں واردھا میں پیش کیا۔

۲۔ درگاہ علی خاں، مرقعہ دہلی، فارسی مخطوطہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، ایف۔اے۔بی ۸، ۵۶، ۵۷ اور ۵۸

کے ساتھ ایک ہندی لفظ باڑہ ملا کر امام باڑہ بنادیا تا کہ اس سے اس کا ہندوستانی مزاج جھلکے۔ اس کا نام اس زبان میں نہیں رکھا گیا کہ جس میں قرآن نازل ہوا یا جس زبان کو امام حسینؑ بولتے تھے۔ نہ فارسی کا کوئی نام رکھا۔ جب کہ یہی دو زبانیں مذہب اسلام اور اسلامی ثقافت سے قریب تر تھیں۔ یہ صوفیائے کرام کی فکر کا نفسیاتی پہلو تھا۔ اگر باہر کے ناموں اور زبان سے ہندوستان میں کوئی مرکز بنایا جائے گا تو اس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں گہری نہ ہوسکیں گی۔ امام باڑے کے دروازے بھی بلا تفریق مذہب و ملت سب کے لیے کھول دیئے گئے۔ یہ ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا۔ نیچی ذات کے ہندو اگرچہ اپنے مندروں میں نہیں جاسکتے تھے لیکن وہ امام باڑوں میں ہونے والی عزاداری حسینؑ میں شرکت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ عزاداری حسینؑ ان کی زندگی کا جزو بن گئی۔ اور اس طرح ہندوستان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ عزاداری امام حسینؑ میں شرکت کے لیے تبدیلی مذہب کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ دس محرم کو ہندو بھی تعزیوں کی زیارت کرتے اور کربلا کے پیاسے شہیدوں کی یاد میں اپنے محلوں میں شربت کی سبیل لگاتے۔ لوگ اس تبرک کو پیتے وقت من ہی من میں گنگناتے:

بھارت میں اگر آ جاتا　　　یوں پیاسا نہ مارا جاتا

مرقعہ دہلی میں ۱۷۷۱ء سے متعلق ایک بیان ملتا ہے کہ: ''درگاہ شاہ مرداں میں بارہ محرم کو ایک مجلس عزا ہوتی ہے۔ دہلی کا کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو اس میں شرکت نہ کرتا ہو۔ تا حد نگاہ سواریاں ہی سواریاں نظر آتیں۔ مالدار، غریب، چھوٹے بڑے غرض کہ سب لوگ ہی شرکت کے لیے یہاں آتے''۔ ۱۷۷۱ء کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس وقت تک عزاداری امام حسینؑ میں دہلی کے تمام لوگ یعنی ہندو اور مسلمان شرکت کرتے۔[1]

تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں عیسوی تک عزاداری امام حسینؑ امام باڑوں میں ہوتی اور جلوس کا کوئی رواج نہ تھا۔ اس دور میں کچھ سلاطین کے دور میں عزاداری امام حسینؑ خفیہ طور پر ہوئی، اس لیے کہ خود صوفی تحریک کا قیام مسلمانوں میں موروثی ملوکیت کے خلاف احتجاج کی وجہ سے ہوا جس کے بانی حضرت معاویہ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید مولانا ضیاء الدین برنی اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں کہ: ''حضرت معاویہ اور امیرالمؤمنین عثمانؓ کے دوسرے

۱- ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۴۶

عزیزوں نے جو اپنے حصہ مملکت میں وسیع علاقوں کے مالک تھے اور قوت اور اقتدار حاصل کر چکے تھے علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے خلاف بغاوت و سرکشی کی، ان سے بیعت نہیں کی اور فساد شروع کردیا''۔[۱] امام حسینؑ نے اسی موروثی ملوکیت کی بیعت کرنے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں ان کی شہادت واقع ہوئی۔ عجیب سانحہ ہے کہ جس اسلامی سیاسی نظام کی بنیاد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ڈالی تھی اور جس کی پیروی خلفائے راشدین نے کی وہ تو ۶۶۱ء میں ختم ہوگیا لیکن جس موروثی ملوکیت کی بنیاد معاویہ نے ۶۶۱ء میں ڈالی وہ آج تک مسلم ممالک میں قائم ہے۔ سلاطین دہلی بھی بغداد کے موروثی ملوک ہی کی سرپرستی میں ہندوستان میں سلطان کی حیثیت سے حکومت کررہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت میں اعلانیہ طور پر عزاداری امام حسینؑ ممکن نہ تھی۔ اس لیے کہ حسینؑ کا نام ہی موروثی ملوکیت کے خلاف احتجاج تھا۔ محمد بن تغلق ابن تیمیہ کی فکر سے متاثر تھا۔ اس نے صوفی تحریک اور صوفیاء کے خلاف سخت اقدامات کیے اور اس طرح اس عہد کے مختلف ادوار میں صوفیاء سلطان کے عتاب کا شکار ہوئے۔ خلافت و ملوکیت کے مسئلے پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سیر حاصل بحث اسی عنوان پر اپنی کتاب میں کی ہے۔[۲]

عزاداری امام حسینؑ ایک مکمل ادارہ ہے جس کی باقاعدہ اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات نہ تو کسی عربی، فارسی یا اردو کی ڈکشنری میں ملیں گی اور نہ ہی شیعہ علماء کی کتابوں میں۔ عزاداری امام حسینؑ سے متعلق اصطلاحات صوفیاء ہی کی دین ہیں۔ نذر و نیاز، علم سے متعلق دو صورتیں ہیں، علم نصب کرنا اور علم سوار کرنا۔ یہ دونوں قطعی طور پر علیحدہ علیحدہ صورتیں ہیں اور انہیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس نے عزاداری کے نظام کو بچپن سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔ ان اصطلاحات کا استعمال اردو مرثیہ گو شعراء میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی میں ہوا ہے اور وہ اس لیے کہ یہ مرثیہ گو شعراء تصوف سے حد درجہ متاثر تھے۔ میر انیس کے مورث سید محمد گیسودراز بندہ نواز تھے۔

عزاداری حسینؑ کا دوسرا دور سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے جب مغل بادشاہ ہندوستان آئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ مغل بادشاہوں کو اہل بیت سے عقیدت تھی اسی لیے انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر کوئی پابندی نہیں لگائی لیکن تورانی علماء اور امراء کو اہل بیت سے ایسی کوئی خاص عقیدت نہ تھی اسی لیے بعض معاملات میں انہوں نے سختی رکھی۔ لیکن ہمایوں کی ایران سے واپسی پر

۱- سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۲- اقتدار عالم خاں، امرائے عہد اکبر اور اس کی مذہبی پالیسی کا ارتقاء، ص ۳۲-۳۶

ایرانی علماء اور امراء کا ہندوستان آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اکبر کے عہد کے پہلے دور میں یعنی ۱۵۵۶ء سے ۱۵۸۰ء تک ایرانی علماء، امراء اور تورانی علماء اور امراء میں درباری سیاست اور مذہبی عقائد کو لے کر کش مکش شروع ہوگئی۔ اکبر خود مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی جیسے علماء کے زیر اثر رہا[1] ان کے علاوہ بھی اکبر کے عہد میں دوسرے ایسے عناصر موجود تھے جو چشتی اور سہروردی صوفیاء کی ترکیبی حکمت عملی کے مخالف تھے۔ خود شیخ احمد نقشبندی سرہندی نہ صرف بین المذاہبی رواداری کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک غیر سنی مسلمان بھی کافروں کی حیثیت رکھتے تھے۔[2] اکبر نے ایسے عناصر کی پرواہ کیے بغیر ۱۶۸۰ء میں ہندوستان میں صلح کل کی پالیسی کی بنیاد ڈالی اور تمام مذاہب کے لوگوں کو مذہبی آزادی دی۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا اثر عزاداری امام حسینؑ کی نشر و اشاعت کے لیے مددگار ثابت ہوا۔ عہد وسطی کے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک ایرانی شیعہ عالم سید نوراللہ شوشتری کو لاہور کا قاضی بنایا گیا۔[3] ایسی حکومت میں جہاں حنفی فقہ کی پیروی ہوتی تھی، اس دور میں عزاداری امام حسینؑ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں بھی یہ آزادی رہی۔ جب اورنگزیب بادشاہ بنا تو اس کا رجحان مذہب کی طرف اپنے اجداد سے زیادہ تھا۔ اورنگزیب کو اہل بیت سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے رقعات اور احکامات اس کے رجحان کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں۔ اورنگزیب نے اپنے وصیت نامے میں تحریر کیا ہے کہ 'لازم السعادات' سادات بارہہ کے ساتھ احترام و رعایت میں کوئی فروگذاشت نہیں کرنی چاہیے اور قُلْ لَا اَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِـی الْقُرْبی کی آیت شریفہ کے بموجب عمل کرنا چاہئے کیوں کہ آیت کریمہ: ''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میرے عزیزوں سے محبت کرو'' کے مطابق یہ جماعت اجر نبوت ہے۔ اس میں ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہئے کہ دنیا و آخرت میں خیر و فلاح کا باعث ہے۔[4] یہ وصیت نامہ بارہ نکات پر مشتمل ہے۔ اس کے متعلق اورنگزیب نے لکھا ہے کہ: ''اثنا عشر کا عدد مبارک ہے اور وصیت کا اختتام بھی اثنا عشر پر کیا جاتا ہے''۔[5] ایک اور رقعے میں لکھتا ہے کہ: ''سادات سے محبت اور عزت کرنا ہمارے مذہب کا حصہ ہے اور ان سے نفرت اور دشمنی رکھنے والے کے لیے جہنم ہے''۔[6] اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب اورنگزیب کا سادات کے بارے میں یہ

۱- قاضی جاوید، ہندی مسلم تہذیب، لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۲۴ ۲- عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۳۸-۱۳۷

۳- سید محمد عزیز الدین حسین، قاضی نوراللہ شوشتری: ایک سوانحی خاکہ، اسلام ان دی چینجنگ ورلڈ، جلد ۲، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱-۲۹

۴- اورنگزیب، احکام عالمگیری، لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۳۶-۱۳۴ ۵- ایضاً، ص ۱۳۴ ۶- ایضاً، ص ۱۳۵

عقیدہ ہے تو اہل بیت سے اسے کس درجہ مودت ہوگی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مغل دور میں اس کے خلاف بھی ذہن موجود تھے۔ صادق خاں، طبقات عالمگیری میں عہد اورنگزیب کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ جب گول کنڈہ کا محاصرہ چل رہا تھا تو کچھ لوگوں نے صف شکن خاں تورانی سے جو کہ کمانڈر تھا کہا کہ قلعہ تو فتح ہو ہی جائے گا وہاں غذا اور پانی جانے میں زیادہ سختی نہ کریں اس لیے کہ قلعے کے اندر علماء اور سادات صحیح النسب بھی موجود ہیں۔ صف شکن خاں نے جواب دیا کہ: ''اگر امام حسینؑ بھی اس قلعے میں موجود ہوتے تو بھی سختی میں کوئی کمی نہ کرتا''۔[۱] جب اس واقعے کی اطلاع اورنگزیب کو ہوئی تو اس نے اس کو اس کے منصب سے برطرف کر کے جیل خانے میں ڈلوادیا۔
فرزند علی مونگیری ملخص التواریخ میں عہد اورنگزیب کا ہی واقعہ لکھتے ہیں کہ: ''میر جملہ عظیم آباد بہار کے گورنر بن کر گئے تو امراء ان کے پاس حاضری کے لیے آئے لیکن نعمت اللہ خاں ایام عاشورہ میں عزاداری امام حسینؑ میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان ایام کے بعد حاضر ہوئے۔ اس وقت محمد امین خاں بھی موجود تھے۔ میر جملہ نے کہا کہ آپ اتنے روز بعد کیوں آئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ماتم داری میں مشغول تھا اس لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ محمد امین خاں نے کہا کیا آپ کے گھر کسی کی موت ہوگئی تھی۔ نعمت اللہ خاں نے کہا کہ شہادت حسینؑ واقع ہوئی ہے۔ محمد امین خاں نے کہا کہ اس کے کیا معنی، یزید اور حسینؑ تو ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ عجیب بات ہے کہ آپ ایک بھائی کا تو ماتم کریں اور دوسرے کی خوشی میں شامل نہ ہوں۔ نعمت اللہ خاں نے جواب دیا کہ جن سے ہمارا تعلق ہے انہیں شہید کر دیا گیا اس لیے ہم ماتم کرتے ہیں۔ آپ کے بھائی کو فتح حاصل ہوئی آپ خوشیاں منائیے''۔[۲]

عہد اورنگزیب کے اختتام سے پہلے ہی کشیدگی اور حالات خراب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وحدت الوجودی رویّے نے مذہبی امتیازات کو ختم کرنے کی ترغیب دی۔ وحدت الشہودی رویّے نے تقسیم کو ہی اپنا نصب العین قرار دیا اور بالآخر اہل اسلام کے مختلف فرقوں میں بھی اتحاد و ابلاغ کے تمام وسیلے تباہ کردئے گئے۔ شیخ احمد سرہندی کے صاحبزادے شیخ محمد معصوم نقشبندی نے عالمگیر کو شیعوں کا قتل عام کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھا کہ: ''ابن عباس نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ

۱۔ محمد صادق، طبقات عالمگیری، مخطوطہ، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، ایف ۸۵ الف

۲۔ فرزند علی مونگیری، ملخص التواریخ، مخطوطہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی، ایف ۱۳۸ اے

ہوں گے جن کو روافض کہیں گے۔ یہ اسلام کی توہین کرنے والے اور مشرک ہونگے، ان کو قتل کر دینا"۔[۱]
اورنگزیب اس حد تک تو نہ جاسکا تاہم اس کے زمانے میں کچھ معاشی بحران کی بنا پر درباری سیاست اور کچھ مذہبی بنیادوں پر شیعہ سنی اختلافات نے خراب صورت اختیار کرلی۔ خود اورنگزیب کی تحلیلی حکمت عملی کا نتیجہ صرف یہ نہیں تھا کہ مغل حکومت کی غیر مسلم اکثریت مغائرت کا شکار ہوگئی اور اس کے مراکز تبدیل ہوگئے بلکہ خود مسلمانوں میں بھی فرقہ وارانہ رجحانات شدت اختیار کرگئے۔ امت کا اتحاد ختم ہونا شروع ہوگیا۔ ان تمام حالات کا اثر عزاداری امام حسینؑ پر پڑنا شروع ہوا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اول کے دور میں شیعہ سنی تنازعات نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کرلی۔[۲] اکبر نے اسلام کو انسان دوستی کے مساوی قرار دیا تھا اور اس سے نسل انسانی کی اجتماعی فلاح مراد لی تھی لیکن اٹھارویں صدی کے مغل ہندوستان میں اسلام کی وسیع تر توجیہہ کو نہ صرف مسترد کردیا گیا بلکہ نظری اور عملی دونوں سطحوں پر اسلام کو ایک فرقے کے عقائد میں ضم کردیا گیا۔

مغل حکومت زوال پذیر ہوئی اور علاقائی حکومتوں کا وجود عمل میں آیا۔ اودھ میں نواب شجاع الدولہ کا عروج ہوا۔ انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر خاص توجہ دی۔ امام باڑوں کو معافیاں دیں تاکہ لوگ عزاداری امام حسینؑ پورے اطمینان و انہماک سے انجام دیں۔ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ نے عزاداری محرم قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ میں کی اور نواب آصف الدولہ نے ۱۷۸۷ء میں سید شاہ خیرات علی کے امام باڑے کے لیے پانچ گاؤں دیئے جن کو انگریزوں نے ۱۸۰۴ء میں ضبط کرلیا۔ اس طرح نوابان اودھ نے کثیر تعداد میں عزاداری حسینؑ کے فروغ کے لیے معافیاں دیں۔ اسی وجہ سے بعض علماء اور دانشوروں کا خیال ہے کہ نوابان اودھ کے عہد میں عزاداری امام حسینؑ کو عروج حاصل ہوا۔ لیکن میری رائے اس سے مختلف ہے اس لیے کہ اٹھارویں صدی میں ہی عزاداری امام حسینؑ انحطاط کی طرف مائل ہوگئی۔ اگر ہم عزاداری امام حسینؑ کا جائزہ پورے شمالی ہندوستان میں لیں تو اب مسلمانوں میں اتحاد کی جگہ فرقہ واریت نے لے لی تھی اور عزاداری امام حسینؑ کی وسعت ختم ہورہی تھی۔ محرم میں سنیوں کے جلوس علیحدہ اور شیعوں کے جلوس علیحدہ نکلنا شروع ہوگئے۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی جس کی وجہ کچھ تو ان سے علیحدگی اور کچھ یہ تھی کہ ان کے یہاں خود اصلاحی تحریکیں شروع ہوچکی تھیں۔ فرقہ پرست دانشور اس مسئلے پر ایرانی، تورانی

۱- قاضی جاوید، ص ۲۴۰ ۲- ایضاً، ص ۲۴۱

حوالوں سے بحث کرتے تھے جس کے نتیجے میں شیعہ سنی اختلافات شدت اختیار کررہے تھے۔

اسی دور میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کے لیے تحریک شروع کی۔ شاہ ولی اللہ کا بھی نسب والدہ کی جانب سے امام موسیٰ کاظم تک پہونچتا ہے۔[۱] شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے اس تورانی تصور کی تردید کی کہ شیعہ مشرک ہیں لہٰذا واجب القتل ہیں۔[۲] اس دور میں نہ صرف فرقہ واریت پیدا ہوچکی تھی بلکہ لسانی عصبیت بھی اس حد تک پیدا ہوچکی تھی کہ جس وقت شاہ ولی اللہ قرآن کے فارسی ترجمے میں مشغول تھے تو کچھ علماء ان کے مخالف ہوگئے اور ترجمے کو بدعت قرار دیا۔ ایک دفعہ وہ مسجد فتح پوری میں نماز کے لیے گئے تو مسلمان ایک کثیر تعداد میں وہاں جمع ہوگئے اور ان کی جان کو خطرہ ہوگیا۔[۳] بقول شاہ عبدالعزیز: ''ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر ہونے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ آپ نے کہا کہ علمائے حنفیہ میں اس پر اختلاف ہے۔ جب دوسری مرتبہ یہی سوال ہوا اور یہی جواب ملا تو اس شخص نے کہا کہ یہ شخص شیعہ ہے''۔[۴] جہاں تک محبت اہل بیت کا تعلق ہے تو شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ: ''میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں''۔[۵] ان حالات سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دور میں عزاداری امام حسینؑ بھی متاثر ہوئی ہوگی۔

شاہ عبدالعزیز نے سیر الشہادتین لکھی۔ اس کتاب کی بنیاد پر بعض لوگ شاہ عبدالعزیز کو شیعہ تصور کرتے تھے۔[۶] ملفوظات کے مطابق: ''حافظ آفتاب میرے درس میں شامل ہوتے تھے ایک روز حضرت علی کا ذکر شروع ہوا۔ (میں نے) حضرت علیؑ کے مناقب بیان کرنے شروع کردیئے۔ اس روہیلہ پٹھان نے شیعہ سمجھ کر درس میں آنا موقوف کردیا''۔[۷] اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے ۹۰-۱۷۸۹ء میں تحفہ اثنا عشریہ لکھی جو شیعی عقائد کے رد میں تھی۔ اس کے دیباچے میں شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ: ''اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اور جس زمانے میں ہم زندگی گذار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلبہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ بہ مشکل کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں کوئی نہ کوئی شخص یہ مذہب اختیار نہ کرچکا ہو یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو''۔[۸]

۱- شیخ محمد اکرام، رودکوثر، لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۵۳۴ ۲- قاضی جاوید، ص ۲۴۱ ۳- ایضاً، ص ۲۴۳ ۴- ایضاً، ص ۲۴۲

۵- شیخ محمد اکرام، ص ۵۷۵ ۶- ڈاکٹر ثریا ڈار، شاہ عبدالعزیز اور ان کی علمی خدمات، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۴ ۷- ایضاً

۸- شاہ عبدالعزیز، تحفہ اثنا عشریہ، ص ۳، ۴

شاہ عبدالعزیز کا یہ جملہ دعوت فکر دیتا ہے کہ آخر ایسے کون سے محرکات تھے کہ جن کی وجہ سے شیعی عقائد کو اس درجہ فروغ حاصل ہوا۔ اس لیے کہ جس دور کی بات شاہ عبدالعزیز کررہے ہیں اس میں شیعہ مجتہدین کا وجود بھی نہ تھا۔ دراصل ان عقائد کی تبلیغ صوفیائے کرام نے کی تھی اور وہ یہی کہ محبت اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے ساتھ واقعات ان کے مذہبی رجحانات اور مناقب حضرت علیؑ بیان کرنے کے سلسلے میں پیش آئے۔ صوفیاء نے جس اسلام کی تبلیغ کی وہ قرآن، سنت نبویؐ اور محبت اہل بیت پر مبنی تھا۔ اسی کی تبلیغ حضرت معین الدین چشتی، حضرت بہاء الدین سہروردی، حضرت نظام الدین اولیا، میر سید علی ہمدانی، سید شرف الدین شاہ ولایت، سید شاہ اشرف، سید جہانگیر سمنانی، سید محمد گیسو دراز اور دوسرے صوفیائے کرام نے کی تھی۔ یہ شیعہ مجتہدین وعلماء کا کارنامہ نہیں اس لیے کہ یہ ان کے وجود سے بہت پہلے کی بات ہے۔

تحفہ اثنا عشریہ کے جواب میں حکیم مرزا محمد کامل، شہید رابع نے نزہۃ اثنا عشریہ لکھی اور مولوی سید دلدار علی شیعہ مجتہد اول نے ذوالفقار لکھی۔ بس اب کیا تھا کہ مناظرے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس مناظرے نے بھی عزاداری امام حسینؑ کو نقصان پہونچایا۔ حالات کو مزید سنگین بنانے کے لیے کچھ من گھڑت روایات لکھی گئیں تاکہ شیعہ سنی اختلافات میں مزید اضافہ ہو اور شدت اختیار کریں۔ امیر شاہ خاں امیرالرویات میں شاہ عبدالعزیز کے متعلق اس طرح روایت بیان کرتے ہیں کہ: ''اس زمانے میں روافض کا نہایت غلبہ تھا۔ چنانچہ دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا کر انہیں بے کار کردیا تھا تاکہ وہ کوئی کتاب نہ لکھ سکیں۔ شاہ عبدالعزیز کو دہلی سے نکلوادیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز جونپور پیدل گئے کیونکہ ان کو سوار ہونے کا حکم نہ تھا''۔[1] اس روایت کو اکابر سنی علماء مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد میاں اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے شاہ عبدالعزیز کی سوانح کے تحت اپنی کتابوں میں بھی نقل کیا ہے۔[2] دہلی پر نجف خان کا اقتدار ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۲ء تک رہا۔ شاہ ولی اللہ کا انتقال ۱۷۶۲ء میں ہو چکا تھا۔[3] دوسرے یہ کہ پہنچے اتروانے کا ذکر شاہ ولی اللہ کے کسی معاصر نے نہیں کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے تحفہ اثنا عشریہ ۹۰-۱۷۸۹ء میں تصنیف کی جب کہ نجف خاں کا انتقال ۱۷۸۲ء میں ہو چکا تھا۔[4] شاہ عبدالعزیز کے پیدل جونپور جانے کا تذکرہ بھی ان کے کسی اور معاصر نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جب لوگوں نے اس طرح کی روایات ان علماء کے بارے میں پڑھی

۱- ڈاکٹر ثریا ڈار، ص ۱۳۲ ۲- ایضاً، ص ۱۳۲ ۳- ایضاً، ص ۱۳۲ ۴- ایضاً، ص ۱۳۲

ہونگی تو ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہوا ہوگا جب کہ یہ روایات تاریخی شواہد کی روشنی میں قطعی بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔

فارسی ادب میں تو اہل بیت سے عقیدت بہت صاف صاف جھلکتی ہے۔ لیکن اس دور کے اردو ادب میں بھی اہل بیت نبیؑ سے عقیدت حد درجہ نظر آتی ہے۔ میر جعفر زٹلی حضرت علیؑ سے عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

کیوں نہ جعفر ہو ثنا خوان شہہ خیبر کا　　صدق باطن سے ہوا خاک وہ در خیبر کا
ہے نہ وسواس اسے بھوت و سیہ اژدر کا　　روز و شب یاد رکھے نام علیؑ حیدر کا

میر تقی میر ان الفاظ میں مدح سرائی کرتے ہیں:

ہادی علیؑ، رفیق علیؑ، رہنما علیؑ　　یاور علیؑ، محمد علیؑ، آشنا علیؑ
مرشد علیؑ، کفیل علیؑ، پیشوا علیؑ　　مقصد علیؑ، مراد علیؑ، مدعا علیؑ

مرزا غالب اپنے کلام میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

ارزندہ گوہری چون من اندر زمانہ نیست　　خود را بہ خاک رہگذر حیدر افگنم

ساغر پی صبوح لبالب کنم ز می　　چونان کہ لب ز زمزمہٴ یا ابوالحسن
چو برگ گل ز باد سحرگاہی ام زبان　　رقصد بنام حیدر کرار در دہن

چھنو لال دلگیر نے مراثی لکھے۔ ایک مرثیے کا مطلع ہے:

پہونچے امیر شام کی مجلس میں جب اسیر

اس مرثیے میں ان حالات کی بڑے دل سوز انداز میں عکاسی کی ہے جو اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس لٹے ہوئے قافلے کی پیشی کے وقت یزید کے دربار میں پیش آئے۔

علامہ اقبال ٹوٹے ہوئے خانقاہی نظام میں دوبارہ زندگی بیدار کرنے کے لیے اس طرح ترغیب دیتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

مولانا محمد علی ان الفاظ میں مسلمانوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے نعرہ بلند کرتے ہیں:

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک کتاب ''شہید کربلا'' لکھی۔ لیکن ان دونوں حضرات کے ہاں ایک مقام پر حد درجہ تضاد نظر آتا ہے۔ امام حسینؑ کا احتجاج اور اس کے نتیجے میں ان کی شہادت ملوکانہ موروثی نظام کے قیام کے خلاف تھی۔ یہ دونوں علماء یعنی مولانا محمد علی اور مولانا آزاد امام حسینؑ سے تو حد درجہ عقیدت رکھتے تھے لیکن ان دونوں حضرات نے غیر اسلامی ملوکانہ موروثی نظام کو نہ صرف خلافت کا نام دیا بلکہ اس کی حیات کو باقی رکھنے کے لیے ہندوستان میں خلافت تحریک چلائی۔ ان علماء کے یہ دونوں عمل قطعی طور پر متضاد تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے معرکتہ الآ راء کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھی۔

اب برٹش راج کا ہندوستان پر پوری طرح تسلط ہوگیا۔ صوفی تحریک میں ضعف و اضمحلال کے آثار پہلے ہی نمایاں ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم نفرت سترھویں صدی عیسوی کے اختتام سے شروع ہو چکی تھی۔ بقول سرسید احمد خاں: ''اس برادرانہ محبت سے جو آپس میں تھی ۱۷۰۹ء میں عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بہ سبب مقابلہ سرکشی قوم ہنود شیواجی مرہٹہ وغیرہ کے عالمگیر جملہ قوم ہنود سے ناراض ہوا اور اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ سخت گیری سے پیش آئیں اور ہر ایک سے جزیہ لیں پھر جو نفرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے''۔ اب اس کو برٹش سرکار کی سرپرستی میں مزید تقویت ملنا شروع ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان شیعہ سنی اختلافات اپنے عروج پر پہونچ گئے۔ انگریز اپنی حکومت کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے ہندو مسلم نفرت اور شیعہ سنی اختلافات سے سیاسی فائدے اٹھانے کی ایک جامع اسکیم تیار کر چکے تھے۔ انہوں نے تاریخ سے متعلق مفسدانہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں اور ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو طالب علم ان کتابوں کو پڑھتے ان میں ہندو مسلمانوں، سنیوں اور شیعوں میں نفرت کا احساس پیدا ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ یہ زہر پورے سماج میں سرایت کر گیا۔

اس فرقہ پرستی نے ہندوستانی سیاست، سماج اور ثقافت کو مزید کمزور بنادیا تھا۔ ہندوستانیوں کے سامنے ان مسائل کا کوئی حل نہ تھا اور نہ ہی ان کا کوئی راہبر یا رہنما تھا جو انہیں اس دلدل سے نکال کے لے جاتا۔ ان ابتر حالات کی وجہ سے عزاداری امام حسینؑ بھی متاثر ہوئی۔ صوفیاء نے اپنی کوشش سے یوم عاشورا کو ہندوستان میں تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک غم کا دن بنادیا تھا، اس دن ہر ہندو اور مسلمان اپنے کاروبار کو بند رکھتا اور امام حسینؑ کی شہادت کو یاد کرتا۔ لوگ تعزیوں کے جلوس نکالتے اور کربلا کے پیاسوں کی یاد میں شربت کی سبیلیں لگاتے۔ ابھی حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری،

لندن میں ایک مخطوطہ مرأت الاحوال جہاں نما کے مطالعے کا موقع ملا۔ ۱۸۰۶ء کے حوالے سے جمشید پور کے متعلق لکھا ہے کہ: ''تمام ہندو اور مسلمان تعزیہ داری کرتے اور ایام عشرۂ محرم میں کوئی بھی شخص چاہے مالدار ہو یا غریب شہر کے اندر سواری پر نہیں چل سکتا تھا۔ اگر کوئی بھی شخص سواری پر غلطی سے بھی چلتا تو ہندو اور مسلمان دونوں مل کر اس کو ذلیل کرتے اور اس کو مجبور کردیتے کہ وہ پیدل چل کر راستہ طے کرے''۔[۱] اب ایسا انقلاب آیا کہ اسی یوم عاشورا کو محرم کا جلوس ایک مسئلہ بن گیا۔ محرم کا جلوس لے کر ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ محرم کے جلوس کی بنا پر شیعہ سنی فسادات تک پہونچ گیا اور خود ہندوستان میں ہی عاشورہ پر کربلا جیسے واقعات پیش آنے لگے۔ جس طرح آج عراق میں ہورہا ہے۔ مدح صحابہ اور تبرّیٰ ایجی ٹیشن شروع ہوئے۔ ہزاروں سنی اور شیعہ جیل گئے اور اس طرح شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک خلیج قائم ہوگئی۔ تبرّیٰ ایجی ٹیشن کی حمایت سید علی ظہیر نے کی اور مدح صحابہ کا مسئلہ مولانا حسین احمد مدنی نے اٹھایا اور عجیب بات ہے کہ دونوں ایک ہی وقت میں یوپی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اس سے نہ صرف عزاداری امام حسینؑ متأثر ہوئی بلکہ آزادی کی تحریک بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے بعد سنیوں کے تعزیوں کے جلوس علیحدہ اور شیعوں کے جلوس علیحدہ علیحدہ نکلنا شروع ہوگئے اور ہندوؤں نے تو اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کرلی۔ کچھ مورخین اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ اختلافات سترھویں صدی کے اختتام سے ہی شروع ہوگئے تھے البتہ انگریزوں کے آنے کے بعد ان کی پالیسیوں کے نتیجے میں مزید شدت اختیار کرگئے۔ صوفیاء نے ترکیبی حکمت عملی سے عزاداری امام حسینؑ کو وسعت دی تھی جس میں بلاتفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانی شریک ہوتے تھے۔ صوفی تحریک کمزور ہوئی، صوفیاء کے اثرات کم ہونا شروع ہوئے اور اب عزاداری امام حسینؑ علماء کے ہاتھوں میں پہنچی۔ علماء نے عزاداری امام حسینؑ کے سلسلے سے تحلیلی رویہ اپنایا جس کے نتیجے میں عزاداری امام حسینؑ محدود ہوتی چلی گئی۔ علماء نے ایک خاص تبدیلی اس نظام کے سلسلے میں یہ کی کہ عزاداری امام حسینؑ کے مرکز کے نام کو امام باڑے سے تبدیل کرکے امام بارگاہ اور حسینیہ کردیا۔ اس نام کی وسعت اور ہندوستانیت کو ختم کرکے عربیت اور فارسیت لادی۔ اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ایسا نہ تھا کہ صوفیاء عربی و فارسی نہ جانتے تھے۔ انہوں نے اس کا نام امام باڑہ بڑی غور وفکر کے بعد رکھا تھا۔

۱۔ مولانا محمد تقی، مرأت الاحوال جہاں نما، فارسی مخطوطہ، انڈیا آفس کلکشن، لندن، ایف ۱۱۱۸ ے

اورنگ زیب نے ۱۶۹۴ء میں علماء صوفیاء اور سادات کو دی ہوئی مدد معاش کو موروثی زمینداری میں بدل دیا تھا جس کے نتیجے میں علماء صوفیا اور سادات کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے زمیندار بن گئے تھے، اور آہستہ آہستہ اپنے مورثوں کے راستے چھوڑ کر زمیندارانہ اقدار کے حامل ہوگئے۔ برٹش راج میں بھی مسلمان زمیندار بنے اور خاص طور سے سادات، سادات امروہہ، سادات جلالی، سادات سرسی، سادات مظفرنگر سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر سادات کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے اجداد زمیندار تھے۔ خود میرے ہی مورث سید شاہ خیرات علی کو ان کے قائم کردہ امام باڑے کے لیے نواب شجاع الدولہ نے معافی دی جس کو بعد میں زمینداری کی حیثیت میں منتقل کردیا گیا۔ علماء نے اس زمیندارانہ نظام پر کچھ توجہ نہ دی اور انہوں نے بھی اپنے آپ کو اسی زمیندارانہ نظام میں ضم کرلیا۔ انہوں نے بھی نوابان اودھ سے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کیں، بغیر اس مسئلے پر غور کیے ہوئے کہ یہ نوابی اور زمینداری ملوکیت ہی کا ایک اہم جزو ہے اور خود ملوکیت ایک غیر اسلامی ادارہ ہے۔ علماء اور سادات کا زمیندار بننا اتباع اہل بیت نہ تھا۔ امام حسینؑ کا احتجاج اسی ملوکانہ موروثی نظام کے خلاف تھا اور اسی احتجاج کے نتیجے میں شہادت پائی۔ اس زمینداری کو اپنے خاندانوں میں محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے جو وقف نامے وقف علی الاولاد کیے ان میں پسر اکبر کو اسی بنا پر متولی بنایا اور باقی تمام بیٹوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کردیا گیا اور اس طرح سے فقہ جعفری کی پیروی کے بجائے ملوکیت کے پیرو رہے۔ وقف فی سبیل اللہ جائدادوں کو آپس میں تقسیم کرلیا جب کہ وقف فی سبیل اللہ جائداد زمینداری کے تحت نہیں تھی اور اسی وجہ سے قابل تقسیم بھی نہ تھی۔ اس کے نتیجے میں بہت سے امام باڑے وقف فی سبیل اللہ جائدادوں سے محروم ہوگئے۔ سادات بھی مودۃ القربیٰ کے پیرو تھے اور عزاداری امام حسینؑ ان کے عقیدے کا ایک اہم جزو تھی۔ انہوں نے بڑے عالی شان امام باڑے تعمیر کرائے اور ان میں بیلجیم کے جھاڑ فانوس آویزاں کیے اور بڑی شان سے عاشورۂ محرم کی عزاداری منعقد کی اور اس طرح سے آہستہ آہستہ صوفیاء کی قائم کی ہوئی خلوص نیت اور سادگی پر منحصر عزاداری امام حسین کی معنویت کو سخت نقصان پہونچا۔ اس لیے کہ دونوں اداروں، عزاداری اور زمینداری کا مزاج ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھا بلکہ یہ دونوں ادارے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں شیعہ علماء و مجتہدین نے قوم کی سیاسی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اٹھارہویں صدی سے لے کر موجودہ انقلاب ایران تک جو آیۃ اللہ خمینی علیہ الرحمہ

کی رہبری میں وجود میں آیا، ہندوستانی شیعہ علماء اور مجتہدین نے سیاسی اصلاح اور اس سے متعلق فکر پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک کتاب بھی نہیں لکھی۔ ان علماء اور مجتہدین نے اپنے آپ کو نوابوں اور زمینداروں سے ہی وابستہ رکھا اور اسی نظام کا حصہ بن گئے۔ سیاسی اصلاح ان کی تقاریر کا بھی موضوع نہیں رہی، بلکہ ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے زیادہ تر شیعہ علماء اور مجتہدین ایران کے پہلوی بادشاہوں سے ہی مرعوب رہے۔ یہ تو اب ایران کے انقلاب کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی شیعہ علماء نے اسلامی جمہوریہ کی بات کرنی شروع کی ہے۔ بچپن میں مجالس میں میرے کان اس اصطلاح سے قطعی نا آشنا رہے۔ میں نے تو اپنے وطن جلالی میں کبھی کسی عالم دین کو اس موضوع پر تقریر کرتے نہیں سنا۔ بالکل ایسی ہی حالت اہل سنت کی بھی ہے کہ ان کی بھی ایک کثیر تعداد سعودی عرب کے موروثی شاہوں سے متاثر ہے۔ ہاں اس دور میں اس مسئلے پر ایک سنی عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قلم اٹھایا اور خلافت وملوکیت نام کی کتاب لکھی۔ میں اس کو ان کا ایک بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔

صوفیاء نے امام باڑوں کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت سب کے لیے کھول دیئے تھے اور ایک کثیر تعداد مجالس ایام عاشورۂ محرم میں شریک ہوتی۔ اب حسینیہ اور امام بارگاہ کے دروازے بھی سب کے لیے کھلے رہیں لیکن ہندوؤں اور سنیوں نے ان مجالس میں شرکت کرنی قطعاً بند کردی۔ یہاں یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ امام باڑے کے نام کو بڑے شہروں میں حسینیہ اور امام بارگاہ کردیا گیا، جیسے لکھنؤ میں امام باڑہ غفران مآب کو اب زیادہ تر حسینیہ غفران مآب لکھا جانے لگا ہے یا پاکستان میں کراچی جیسے شہر میں امام باڑے امام بارگاہ کہلانے لگے لیکن ان قصبات میں جن کے مورث اعلیٰ صوفیائے کرام تھے اور انہوں نے ہی وہاں بنائے عزاداری محرم ڈالی تھی، وہاں آج بھی ان کا نام امام باڑہ ہی ہے۔ خود میرے وطن جلالی میں کسی امام باڑے کو حسینیہ یا امام بارگاہ آج تک نہ تو کہا گیا اور نہ لکھا گیا۔ دوسرے ان قصبات میں عزاداری امام حسینؑ کو لے کر کسی بھی دور میں ہندو، مسلم یا شیعہ سنی فساد نہیں ہوا۔ زمینداروں کے امام باڑوں میں سفید چاندنی کا فرش ہوتا۔ اشراف اس فرش پر بیٹھتے اور دہلی پر دری کا فرش ہوتا جس پر مزدور وغیرہ بیٹھتے جو ان امام باڑوں میں نبیؐ کے نواسے کا پرسہ دینے کے لیے آتے تھے۔ صوفیاء نے ان مجالس کی بنیاد اسلامی مساوات و اخوت پر قائم کی تھی۔ اب تفریق پیدا کردی گئی۔ صوفیا عزائے حسینؑ کے ذریعے تبلیغ اسلام کررہے تھے اس لیے کہ اس ملوکانہ نظام نے مسلمانوں میں مساوات کو ختم کردیا تھا۔ مساوات صرف مساجد تک محدود ہوکر

رہ گئی تھی۔ بقول اقبال:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

محمود غزنوی اور اس کا غلام ایاز صرف نماز کے وقت برابر اور باقی زندگی میں وہ بندہ اور محمود بندہ نواز تھے۔ وہاں مساوات نہ تھی۔ صوفیاء ان خانقاہوں اور امام باڑوں میں لوگوں کو ایک جگہ بٹھا کر مسلمانوں میں تفریق کو ختم کر کے اسلامی مساوات کی جڑوں کو مضبوط کر رہے تھے جس کو مسلمانوں کے موروثی ملوکانہ نظام نے ختم کر دیا تھا۔

عزاداری امام حسینؑ نے ایک موڑ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور خاتمۂ زمینداری کے بعد لیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شیعہ علماء نے سیاسی رہنمائی یا اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ علمائے دیوبند نے تو قیام پاکستان کی بیانگ دہل مخالفت کی لیکن شیعہ علماء خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ اب کیا کرنا ہے؟ کس طرف جانا ہے؟ علماء و مجتہدین کی طرف سے کوئی رہ نمائی نہیں، نتیجتاً شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی اور آج وہ اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کو چھوڑ کر جانا صحیح فیصلہ نہ تھا۔ ان تمام حالات کا اثر عزاداری امام حسینؑ کے نظام پر بھی پڑا۔ بعض امام باڑے سونے ہوگئے اور ان کی عمارتیں شکستہ ہوگئیں۔ بعض امام باڑوں پر کسٹوڈین کا قبضہ ہوگیا۔ دوسرا مسئلہ خاتمۂ زمینداری نے پیدا کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ زمیندارانہ دور کی عزاداری کا نظام کیسے چلے گا، اس لیے کہ صوفیاء کی قائم کی ہوئی خلوص دل اور سادگی پر مبنی روایات کو تو زمیندارانہ کر وفر نے بہت پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ صوفیاء نے عزاداری امام حسینؑ کو مزدور، فن کار اور کاریگروں اور ان کے جذبات کے ساتھ جوڑ دیا تھا اور انھوں نے اپنے آپ کو اس نظام میں ضم کرلیا تھا۔ زمیندارانہ دور کی عزاداری داد و دہش اور بے گار پر مبنی تھی۔ خاتمۂ زمینداری کے بعد معاشی بحران شروع ہوا تو نہ تو داد و دہش رہی اور نہ ہی بے گار لینے کی قوت۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کہار کہاں سے ملیں گے۔ مراثیوں کو کہاں سے رقم دی جائے گی، مزدوروں کو مزدوری کون دے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس معاشی بدحالی کے دور میں کچھ دنوں تک تو دکھاوے پر پرانے نظام کو گھسیٹنے کی کوشش کی گئی، آخر میں سادگی پر اتر آئے۔ لیکن عزاداری امام حسینؑ حد درجہ محدود ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ثقافتی بحران کا دور شروع ہوا۔ زبان و ادب کا مسئلہ پیدا

ہوا۔ اردو کے مقابلے میں دوسری زبانوں کو معاش سے جوڑ دیا گیا لہٰذا زبان کی مجبوریاں پیدا ہوئیں۔ نوحہ جو اپنے معنی کے اعتبار سے نوحہ ہی ہونا چاہئے اس کی طرز کو گانے کی طرز سے ملا دیا گیا۔ پہلے نوحہ پڑھنے سے جو حزن و ملال پیدا ہوتا تھا اس کی جگہ فرحت کا احساس ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ جب نوحے کے معنی ہی نہیں جانتے تو اس کی روح کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ نئی نسل اور آنے والی نسلیں اس زبان و ادب سے قطعی طور پر ناواقف ہیں کہ جس میں عزاداری امام حسینؑ سے متعلق ذخیرے موجود ہیں۔

اب اکیسویں صدی پورے نظام زندگی کے لیے ایک چیلنج لے کر آرہی ہے۔ جہاں اور چیزیں متاثر ہوں گی وہاں نظام عزاداری بھی متاثر ہوگا۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ وقت کا ہوگا؟ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء، مجتہدین اور دانشور، اس آنے والی زندگی کے سوالات کے بارے میں غور و فکر کریں اور باقاعدہ طور پر اس ایجنڈے پر قومی کانفرنس منعقد کریں تاکہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش ابھی سے کی جاسکے۔ اس طرح کا رویہ نہ اپنائیں جو ہم نے تقسیم ہند اور خاتمۂ زمینداری کے مسائل سے متعلق اپنایا تھا۔ ابھی وہ نسل موجود ہے جس نے تقسیم ہند اور خاتمۂ زمینداری کے بعد کے معاشی بحران کو دیکھا تھا اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل کی وجہ سے صعوبتیں برداشت کی تھیں۔

ظاہر ہے کہ مذہبی عقیدہ تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ عزاداری امام حسینؑ تو ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ لیکن جب کوئی مذہبی عقیدہ کسی سماج کا حصہ بن جاتا ہے تو تاریخ اور سماجیات کے طالب علم کی حیثیت سے ہم اس کے مختلف مراحل، ابتداء، فروغ اور اس کے انحطاط کا مطالعہ ان تینوں حیثیتوں میں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کا قیام اور اس کا فروغ صوفیائے کرام کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اور جس طرح سے صوفیاء نے عزاداری امام حسینؑ کو ہندوستانی سماج میں وسعت بخشی اس حد تک اسے ہندوستانی سماج و ثقافت کا ایک جز و بنادیا، جس میں ہندو اور مسلمان خلوص دل سے شریک ہوئے۔ مسلمان تو رسول کے پیرو تھے اور محبت اہل بیت کو اجر رسالت سمجھ کر عزاداری میں شامل ہوتے لیکن ہندو تو اپنے دھرم پر قائم رہتے ہوئے حسینؑ کے پجاری بن گئے، یہ ان صوفیاء کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔ صوفی تحریک کمزور ہوئی، علماء کے درمیان مناظرہ شروع ہوا، عزاداری امام حسینؑ کو زمیندارانہ نظام کا حصہ بنادیا گیا، ہندو مسلمانوں اور شیعوں سنیوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس سب کا فائدہ برٹش حکمرانوں نے اٹھایا۔ ان تمام وجوہ سے عزاداری امام حسینؑ کو سخت نقصان پہنچا۔

آج شیعوں میں بھی تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ سیدوں کا امام باڑہ ہے، یہ جولاہوں کا امام باڑہ ہے اور یہ فقیروں کا امام باڑہ ہے۔ اس سے عزائے حسینؑ کو مزید نقصان پہنچ رہا ہے۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیرو رہیں گے اس وقت تک عزاداری امام حسینؑ قائم رہے گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اور دانشور اس عزاداری امام حسینؑ میں صوفیاء کی طرح اسلامی مساوات کے اصول کو قائم کریں تاکہ جملہ مسائل حل ہوسکیں اور عزاداری کے نظام کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ہوسکے اور عزاداری امام حسینؑ کی ہندوستان میں مزید ترویج و اشاعت ہوسکے۔

ضلع اعظم گڑھ میں عزاداری کی روایت

ڈاکٹر علاء الدین خاں☆

ماہِ محرم ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی اہمیت رکھتا تھا اور نبی کریمؐ کے زمانۂ مبارک میں بھی اہم تھا۔ حضورؐ کے بعد اسی مہینہ میں سانحۂ کربلا پیش آیا جو تا قیامت باعث رنج و غم رہے گا۔ سانحہ کربلا کی یاد ماہِ محرم کی چاند رات سے شدت کے ساتھ شروع ہوجاتی ہے۔ اس سانحہ پر جتنا غم کیا جائے وہ کم ہے، اس لیے کہ جن بزرگوں پر میدان کربلا میں مظالم و مصائب کے پہاڑ ٹوٹے وہ تمام لوگوں کے لیے قابل احترام اور واجب التعظیم ہیں۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محرم کی دسویں تاریخ یعنی یومِ عاشورا تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت و عظمت والا دن ہے۔

کربلا سے قبل و مابعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات جس انداز میں یاد کیے جاتے ہیں، ان کو مراسم عزاداری کہا گیا۔ امام حسینؑ سے محبت اور ان کے احترام کا جذبہ ہمیشہ مسلمانوں خصوصاً شیعوں میں واضح اور نمایاں رہا ہے۔ چنانچہ تعزیہ داری کا کلچر تیسرے امامؑ کی محبت میں معرض وجود میں آیا۔ تاریخ عزاداری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ معزالدولہ دیلمی نے ۳۵۲ھ میں دارالخلافت بغداد میں اعلانیہ عزائے حسینؑ برپا کرنے کا حکم دیا اور شہر کی رونق و آرائش کو کم کرنے اور اظہارِ غم کے لیے بازار اور دروازے بند کرادیے، باورچیوں کو اس دن کھانا پکانے سے منع کردیا اور شیعہ عورتیں بال کھولے ہوئیں نکلیں۔[۱] ۳۶۳ھ میں اسی طرح کا حکم المعز الدین اللہ الفاطمی نے مصر میں جاری کیا اور وہاں بھی عزائے حسینؑ اعلانیہ ہونے لگی۔[۲] سرزمین شام میں شہر حلب سے باہر عشرہ محرم میں اظہار حزن و اندوہ کیا جاتا تھا اور گریہ و زاری، نوحہ و ماتم کا شور بلند کیا جاتا تھا، جس کا ثبوت مثنوی مولانا روم کی جلد ششم کے ان اشعار سے ملتا ہے۔

☆ ریڈر شعبۂ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

۱- تاریخ ابوالفدا، جلد دوم، طبع حسینیہ مصر، ص ۱۰۴، بحوالہ سید سبط الحسن فاضل ہنسوی، عزاداری کی تاریخ، نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۴۰، ص ۱۰

۲- المقریزی، الخطط، جلد دوم، مطبع النیل، مصر، ۱۳۲۳ھ صفحات ۲۹۱-۲۸۹

روز عاشورا ہمہ اہلِ حلب   باب انطاکیہ اندر تا بہ شب
گرد آید مرد و زن جمعِ عظیم   ماتم آن خاندان دارد مقیم
تا بہ شب نوحہ کنند اندر بکا   شیعہ عاشورا برای کربلا [1]

عراق، مصر، یمن، ترکی وغیرہ میں بڑے اہتمام کے ساتھ مجالس کا انعقاد ہوتا ہے۔ افغانستان میں بھی عزاداری بڑے انہاک کے ساتھ کی جاتی ہے۔ کابل میں متعدد امام باڑے موجود ہیں جن میں باقاعدہ ماہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ کے محرم کے بارے میں علامہ شبلیؒ نے 'سفر نامۂ بلاد اسلامیہ' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مملکت ایران میں ابتدائے اسلام ہی سے تشیع کا غلبہ رہا، اس لیے ایرانیوں میں عزاءِ امامؑ کی کافی اہمیت رہی۔ جب داعی صغیر زید الحسنی نے ۲۵۰ھ میں طبرستان میں اپنی مستقل حکومت قائم کی تو مذہب امامیہ کو بہت عروج ہوا اور عزائے حسینؑ میں بھی کافی رونق ہوئی، انھی بزرگ کے صاحب زادے داعی صغیر محمد بن زید الحسنی تھے جنھوں نے سب سے پہلے مشہد امام مظلوم اور روضۂ جناب امیر علیہ السلام تعمیر کرایا۔[2] ہندوستان سے شیعیت کا تعارف عہدِ خلافت امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالبؑ ہی میں ہو چکا تھا، چنانچہ پہلا شیعی مسلمان جس نے سندھ کو فتح کیا، وہ امیرالمومنینؑ کے لشکر کا ایک جوانمرد سپاہی، حارث بن مرہ العبدی تھا جس نے ۳۹ھ کے اوائل میں سندھ کو بحکم امیرالمومنینؑ اسلامی فتوحات میں شامل کیا۔[3] امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقۂ درس میں جہاں فلسفۂ آل محمدؐ اور علوم قرآنی کی نشر و اشاعت کی جارہی تھی، چند ہندوستانی بھی ملتے ہیں۔ فرخ سندھی، خلاد سندھی، بزار، ابان بن محمد سندھی، طلحہ بن زید ابوالخزرج ہندی، یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار روات و اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں ہے۔[4] اسی طرح صباح بن نصر ہندی بھی قابلِ ذکر ہیں، جو احکام و مسائل امام رضا علیہ السلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں شیعیت کو متعارف کرنے والے ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''المقدسی'' کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شیعہ مذہب کا ہندوستان میں اثر و رسوخ تقریباً تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہو چکا تھا۔[5] اسی زمانے میں عزاداری حسینؑ کا قیام ہندوستان میں بھی ہوا ہوگا، یہ بھی

۱- مثنوی مولانا روم، جلد ششم بمبئی ۱۳۰۸ھ، ص ۵۷۰   ۲- سبط الحسن، عزاداری کی تاریخ، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳
۳- البلاذری، فتوح البلدان، ذکر فتوح السندھ، مصر، ص ۴۳۸   ۴- سبط الحسن، عزاداری کی تاریخ، ص ۲۸
۵- المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ۱۹۰۹ھ، ص ۴۸۱

ثبوت ملتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں شیعوں کا ایک تبلیغی مشن ہندوستان میں شیعیت کی اشاعت کر رہا تھا۔[۱] اسی زمانہ میں ملا علی نامی[۲] ایک فاضل شیعہ مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مذکورہ شواہد کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ ہندوستان میں موجود تھے، لیکن ''تعزیہ'' کا کوئی نشان نہیں ملتا حالانکہ اس زمانہ میں شیعہ سرگرمی کے ساتھ دوسرے مراسم عزا بجا لاتے تھے۔ ۱۴ ویں صدی کے عالم شہاب الدین دولت آبادی، کی کتاب ''ہدایۃ السعداء'' میں رسم عزاء کا ذکر ہے، جو اس زمانہ میں ہندوستان میں رائج تھی۔[۳]

تیرھویں صدی سے سولھویں صدی تک عزاداری امام حسینؑ امام باڑوں میں ہوتی تھی مگر جلوس کا کوئی رواج نہ تھا، اس عہد میں کچھ سلاطین ایسے تھے جن کے دور میں عزاداری امام حسینؑ خفیہ طور پر ہوئی۔ سلاطین دہلی بغداد کے موروثی ملوک کی سرپرستی میں ہندوستان میں سلطان کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ایسی حکومت میں اعلانیہ طور پر عزاداری امام حسینؑ ممکن نہ تھی۔[۴] مغل بادشاہوں کو اہلِ بیتؑ سے عقیدت تھی، اسی لیے انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ ہمایوں کی ایران سے واپسی پر ایرانی علماء اور امراء بھی اس کے ساتھ آئے اور ان کے لیے مغل حکومت کے دروازے کھول دیئے گئے، جس کی وجہ سے ایرانی علماء کا ہندوستان آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمایوں نے ہندوستان پر دوسری مرتبہ قابض ہونے کے بعد بیرم خاں کو کربلائے معلیٰ بھیج کر ایک ضریح بنوائی تھی، جو قیمتی جواہرات سے تیار کی گئی تھی اور جس کو شاہی محل میں لا کر رکھا گیا تھا۔[۵] اکبر کی 'صلح کل' کی پالیسی بھی عزاداری امام حسینؑ کی نشر و اشاعت میں مددگار ثابت ہوئی، اسی عہد میں شیعہ عالم قاضی نوراللہ شوستری کا بحیثیت قاضی تقرر ہوا۔[۶] جس کی وجہ سے عزاداری امام حسینؑ کو فروغ ملا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں بھی ملکی آزادی رہی۔ عہد جہانگیر میں نور جہاں نے تعزیہ داری کے لیے چند مواضعات بحیثیت معافی کے خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ کے لیے مخصوص کر دیئے تھے جس کا مقصد عشرہ محرم میں عزاداری کا اہتمام تھا۔[۷] اس کے لیے ایک شاہی فرمان بھی صادر کیا گیا

۱- محمد بن الحسن بن اسفندیار، تاریخ طبرستان، مترجم ای۔ جی۔ براؤن، ای۔ جی۔ ذبلوٹپ، ۱۹۰۵ء، ص ۶۸

۲- ان کا مزار کھبات میں ہے، بحوالہ سبط الحسن، عزاداری کی تاریخ، نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۳۱ء، ص ۲۹

۳- سید عزیز الدین حسین، تاریخ عہد وسطیٰ، ادارہ ہمدانیہ، علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۶ ۴- سبط الحسن، حوالہ مذکورہ، ص ۳۴

۵- شوکت علی فہمی، ہندوستان پر مغلیہ حکومت، دین دنیا پبلشنگ کمپنی، دہلی، ص ۳۹

۶- علی حسین رضوی، تاریخ شیعان علی، امامیہ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۴۵

۷- مولانا عبدالواحد نبیرہ مولانا عبدالعلی فرنگی محلی، ازالۃ الاوہام، بحوالہ سبط الحسن حوالہ مذکورہ، ص ۳۶

جس میں عزاداری کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ اس فرمان کے مطابق درگاہ میں تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ اور مجلسیں ہوتی تھیں، مغلیہ عہد میں اعلانیہ تعزیہ داری کا ثبوت درج ذیل عبارت سے ملتا ہے۔

''مراسمِ تعزیہ داری امام علیہ السلام از صدہا سال جاری و مروج است و در زمان سلاطین اہلِ اسلام و متشرع مانندِ جلال الدین اکبر، جہانگیر و عالمگیر اورنگ زیب وغیرہ کہ در تمام ملک خود نافذ الامر کلی بودند، لوازم تعزیہ داری بوجہ احسن بتقدیم رسد''۔[۱]

''مراسم تعزیہ داری صدہا سال سے جاری اور مروج ہیں۔، جلال الدین اکبر، جہانگیر اورنگ زیب کے زمانے میں بھی تعزیہ داری ہوتی تھی، یہ وہ بادشاہ تھے جو پورے ہندوستان پر قابو رکھتے تھے اور ان کے احکام نافذ تھے۔ اس زمانے میں تعزیہ داری کے رسوم بحسن وخوبی ادا کیے جاتے تھے''۔

دکن میں بہمنی سلطنت، خصوصاً احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں ایرانیوں کا زور تھا، وہ اپنے معتقدات میں پختہ تھے اور اور ایک جگہ بیٹھ کر واقعۂ شہادت سنتے تھے، گویا یہ مجالس کے انعقاد کا ابتدائی دور تھا۔[۲] جب عزاداری کا فروغ ہوا تو عزاخانوں کی تعمیر ہوئی اور علم نصب ہونے لگے اور علم کے جلوس نکلنے لگے۔

بہادر شاہ اول اور فرخ سیر کے عہد میں قلعۂ معلیٰ کے اندر عزاداری شروع ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ۱۷۳۸ء میں دہلی میں بیسوں عاشور خانے، مرثیہ گو، مرثیہ خواں، اور سوز خواں موجود تھے[۳] مرقع دہلی ۱۷۷۱ء میں مندرجہ ذیل بیان درج ہے۔

''درگاہ شاہ مرداں میں تیرہ محرم کو ایک مجلس عزا ہوتی ہے، اس مجلس میں دہلی کا کوئی شخص ایسا نہیں جو شرکت نہ کرتا ہو۔ تا حد نگاہ سواریاں ہی سواریاں نظر آتیں، مالدار، غریب، چھوٹے، بڑے غرض کہ سب لوگ ہی شرکت کے لیے یہاں آتے''۔[۴]

مذکورہ بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت عزاداری امام حسینؑ میں دہلی کے تمام لوگ (ہندو مسلم) شرکت کرتے تھے۔

عزاداری صرف شیعہ فرقے کے ساتھ مخصوص نہ تھی، امام حسینؑ کی حقانیت کے بارے میں سارے مسلمان متفق تھے، اس لیے جب ایرانی اثرات کے تحت عزاداری کا رواج ہوا تو تمام مسلمانوں نے

۱- ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، جون ۱۹۹۷ء، ص ۲۶ ۲- ایضاً
۳- درگاہ قلی خان، مرقع دہلی، فارسی مخطوطہ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، ایف اے بی ۵۶،۸، ۵۷، اور ۵۸
۴- مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، قومی کونسل، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲۳

اس میں حصہ لیا اور پھر جب اس نے ثقافتی قوت حاصل کرلی تو غیر مسلم بھی اچھی خاصی تعداد میں حصہ لینے لگے۔

ہندوستان میں تعزیہ کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ایک روایت زبان زد اور مشہور ہے جس کو تواتر کا مرتبہ دیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا موجد امیر تیمور صاحب قران ہے لیکن اس کا تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور ہر محرم میں امام حسینؑ کے مزار پر حاضر ہوکر سوگ نشیں ہوتا تھا۔ جب ہندوستان پر حملہ کرنے کے دوران ہی محرم کا چاند نظر آیا اور اس کے لیے مرقد مبارک پر پہنچنا ناممکن ہوگیا، تب اس نے اپنے مشیروں سے استصواب کیا اور ان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے روضۂ مطہر کی شبیہہ تیار کرائی اور اسی کے حضور گریہ کناں ہوکر اپنی عقیدت مندی کو آسودہ کیا، اس طرح تعزیہ داری کی بنیاد قائم ہوئی۔[1]

اودھ کے فرمانروا ایرانی النسل اور عقیدتاً شیعہ تھے، ان کو امام حسینؑ کی عزاداری سے بہت شغف تھا۔ جب ۱۷۲۴ء میں برہان الملک سعادت خاں نے اودھ کے صوبیدار کا چارج لیا تو اس زمانہ میں جونپور مشرقی ہندوستان کے شیعوں کا مرکز تھا اور یہاں سوزخوانی اور روضہ خوانی کا رواج عام تھا۔[2] آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو کچھ ہی مدت کے بعد درباری مذہب شیعت قرار پایا، اور بہت جلد میر دلدار علی جو بعد میں مجتہد ہوئے، مذہبی امور میں صاحب اقتدار ہوگئے۔ انہوں نے عزاداری کی ترویج ہی نہیں کی بلکہ اس میں اصلاحات بھی کیں۔[3] واجد علی شاہ کو محرم اور عزاداری سے اتنا انہماک تھا کہ وہ شب عاشورہ عوام کے گھروں میں جاکر تعزیہ خانوں کی زیارت کرتے اور ہر مقام پر کچھ چڑھاوا چڑھاتے۔ اس طرز عمل کی وجہ سے لکھنؤ میں گھر گھر تعزیہ داری کو فروغ ہوگیا تھا۔[4]

آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جون پور وظفر آباد کے علاقے میں مسلم نو آبادیوں نے وسعت پائی اور بعد میں خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جون پور کو اپنا مرکز بنایا،[5] خواجہ جہاں کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے خود مختاری کا اعلان کردیا اور اس طرح پورب کی آزاد و خودمختار سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مبارک شاہ کے انتقال کے بعد ابراہیم شاہ شرقی نے جونپور کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس نے جونپور میں چالیس برس

۱- ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ جون ۹۷ء، ص ۲۷ ۲- مرزا جعفر حسین حوالہ مذکورہ ۳۲۳ ۳- ایضاً ص ۳۲۴
۴- سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء، ص ۹ ۵- ایضاً ص ۵

حکومت کی اور اس کے زمانہ میں لاہور، ملتان اور دلی سے مرکز علم وفن منتقل ہوکر پورب کے اطراف میں آ گیا اور علم وفن کے چرچے روز بروز ترقی کرتے گئے۔ یوں تو سارے سلاطین شرقی اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے، لیکن سلطان ابراہیم شاہ اس میں ممتاز تھا۔

مغلوں کے عہد میں سرکاروں کی جو تقسیم تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار جونپور صوبہ الٰہ آباد کے تحت تھی جو اس زمانے میں ۴۱ محال (پرگنوں) پر منقسم تھی۔ ان پرگنوں کے قصبوں کے جو نام ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڑھ، ضلع بلیا کا پرگنہ سکندر پور، غازیپور کے پرگنے، شادی آباد اور فیض آباد کے پرگنے، چاندی پور، بڑہر، ٹانڈہ، سرہر پور وغیرہ سرکار جونپور میں شامل تھے۔[۱] جہاں تک اعظم گڑھ کا تعلق ہے تو یہ بعد کی بات ہے، البتہ اس کے اکثر مردم خیز قصبات پرانے ہیں جو پہلے جونپور میں شمار ہوتے تھے، اس لیے خطے کے زیادہ تر مشاہیر جونپوری مشہور ہوئے۔

اعظم گڑھ ۱۸ دسمبر ۱۸۳۲ء کو مستقل ضلع قرار پایا اور اس کے کلکٹر کا نام مسٹر ٹامس تھا جس کی نامزدگی ۱۸۳۲ء میں ہوئی تھی[۲] ضلع اعظم گڑھ اگرچہ انگریزی عہد کی پیداوار ہے لیکن اس کا نام تاریخ عہد مغلیہ سے ملتا ہے۔ اعظم گڑھ کے راجاؤں میں سے ایک راجہ اعظم تھے، انہوں نے اعظم گڑھ کے محلہ کوٹ میں ایک قلعہ بنوایا اور اسے اپنے نام سے منسوب کیا۔ چونکہ گڑھ کے معنی قلعہ کے ہوتے ہیں، اسی لیے اس کا نام اعظم گڑھ پڑ گیا، راجہ اعظم کے خاندان کا پہلا شخص جہانگیر کے عہد میں مسلمان ہوا تھا۔ ''روایت یہ ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ آگرہ جاکر مسلمان ہوگیا تھا، جہانگیر نے اس کی بڑی قدر کی اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا اور چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی، یہ چوبیس پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڑھ میں واقع تھے۔ تزک جہانگیری کے سال چہارم میں دولت خاں نام کے ایک امیر کا ذکر موجود ہے، شہنشاہ لکھتا ہے:

''دولت خاں بہ فوج داری صوبہ الٰہ آباد و سرکار جونپور تعین یافتہ بود، آمدہ ملازمت نمود بر منصب او کہ ہزاری بود، پانصدی افزودہ شد''[۳]

مذکورہ فرمان کی نقل انگریزوں کی ابتدائی عمل داری میں شامل کر ڈسٹرکٹ گزیٹر میں محفوظ ہے۔ راجہ دولت خاں لاولد فوت ہوئے، ان کے بعد ان کے بھتیجے ہربنس ریاست کے مالک بنے۔ آگے

۱- قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ علماء مبارک پور، دائرہ ملیہ، مبارک پور، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲

۲- سید سلیمان ندوی، حوالہ مذکورہ ص ۵۲ ۳- ایضاً ص ۵۳

چل کر اسی خاندان سے ایک نامور شخص بکرماجیت پیدا ہوا، اس نے بھی اسلام قبول کرلیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں اور عظمت خاں، اعظم خاں، نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڑھ بسایا۔[1] اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں اعظم گڑھ کو علمی، سیاسی اور تمدنی لحاظ سے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ موجودہ اعظم گڑھ کے مشہور قصبات میں ماہل، سرائے میر، نظام آباد، اور مبارک پور ہیں، جہاں شیعہ سنّی کے علاوہ ہندو مذہب کے ماننے والے بھی کثیر تعداد میں ہیں اعظم گڑھ میں کچھ ایسے گاؤں ہیں جہاں خالص شیعہ آبادی ہے۔ جیسے شیولی، پتاڑپور، برسرائمہ، پاری پٹی، خطیب پور، مٹھن پور، فتن پور، شاہ دیوئت، شیخ پورہ، غوث پور اور بجہر وغیرہ۔ ان کے علاوہ اعظم گڑھ کے اور گاؤں بھی ہیں جن میں شیعہ آباد ہیں اور یہاں شیعوں کے ساتھ اہلِ ہنود اور برادران اہل سنت عزاداریِ امامِ مظلوم میں بے حد عقیدت رکھتے ہیں، ان کی اس عقیدت کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ عزاداری کا تعلق کسی خاص فرقے یا طبقے سے ہے۔

عزاداری کے تعلق سے قصبہ مبارک پور، موضع برسرائمہ، شیخ پور، غور پور، کھپرا گاؤں، بجہر، شیولی، پتاڑپور، شاہ دیوئت، ناہر پور اور ڈوراں گاؤں قابل ذکر ہیں۔

قصبہ مبارک پور

کٹرا مانک پور (الہ آباد) کے راجہ سید مبارک شاہ نے مغل بادشاہ ہمایوں کے زمانہ میں مبارک پور آباد کیا، اور یہاں کے بعض خاندانوں کو مبارکپور لے جاکر مستقل طور پر بسایا۔ مبارک پور کو کٹرا مانک پور سے علمی، دینی روحانی تعلق کے ساتھ ساتھ صنعت پارچہ بافی کے تعلق سے بھی ایک نسبت رہی ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں مبارک پور کے ریشمی کپڑے، برطانیہ اور عرب ممالک تک جاتے تھے۔[2] مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ کے لیے قلب و روح کی حیثیت رکھتا ہے، صنعت و حرفت، صحافت، تصنیف و تالیف کے میدان میں اس قصبے کو اعظم گڑھ کے دیگر قصبات پر فوقیت حاصل ہے۔ حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، سوانح، ادب، مناظرہ ہیئت وغیرہ کے موضوعات پر یہاں کے اہل قلم نے عربی، فارسی اور اردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو کہ عالم اسلام میں مقبول ہوئیں،[3] قصبہ مبارک پور کی آبادی بہت پرانی ہے، یہاں پر عزاداری کی روایت بہت قدیم زمانے سے چلی

۱- قاضی اطہر مبارک پوری، حوالہ مذکورہ، ص ۲۹ ۲- ایضاً، ص ۵۲

۳- ڈاکٹر حبیب اللہ اعظم گڑھ کا علمی ادبی اور تاریخی پس منظر، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۷

آ رہی ہے۔

نوابانِ اودھ کے عہد میں اعظم گڑھ کے قریات و قصبات میں تعزیہ داری کو بہت فروغ حاصل ہوا، چونکہ نوابانِ اودھ عزاداری امام حسینؑ و دیگر شہداء کربلا کی یادگار قائم کرنے کی طرف خصوصاً توجہ دیتے تھے، اس لیے اس عہد میں بہت سے سنّی گھرانوں نے بھی جاگیر و معافی اور دوسری مراعات حاصل ہونے کی امید میں امام باڑے وغیرہ تعمیر کرا کے تعزیہ داری شروع کردی اور مجالس کے اثر سے مرثیہ خوانی، سوز خوانی اور نوحہ و سلام کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

نوابانِ اودھ کے زمانے میں مولانا رمضان علی شاہ پنجاب کے علاقہ سے مبارک پور آئے، وہ اثنا عشری مذہب کے عالم و مبلغ تھے، یہاں آ کر انہوں نے موجودہ مدرسہ باب العلم کے پاس ایک شاندار امام باڑہ، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں تعمیر کرایا اور پھر نواب سعادت علی خاں کے عہد میں اسی امام باڑے کے اندر چبوترہ اور پنجہ بنوایا ۲۹ء امام باڑے کے برآمدے میں محراب کے دائیں بائیں دونوں جانب مچھلی کی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور کلمہ شہادت کے بعد یہ عبارت درج ہے۔

علی ولی الله و محمد رسول الله، لا فتی الّا علی لا سیف الا ذو الفقار، لااله الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین، یا ابا عبدالله یا لیتنی کنت معکم فافوز فوزاً عظیماً

بلغ العلیٰ بکمالہٖ　　　کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ　　　صلّوا علیہ وآلہٖ

نادِ علیاً مظهر العجائب و الغرائب　　　انا مدینة العلم و علی بابها

محراب کے اوپر ۱۲۰۹ھ کندہ درج ہے اور اندر شمال مغرب کے گوشہ میں پنجہ اور اس کا چبوترہ ہے، جس پر ۱۲۱۶ھ اور مندرجۂ ذیل اشعار درج ہیں۔

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست　　　شیر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست
چہ دیر است اے شفیعِ روزِ محشر　　　ہمیں پنجہ ہمین است حوضِ کوثر

مبارک پور کے محلہ کٹرہ میں بھی ایک قدیم امام باڑہ ہے، مقامی باشندوں کی روایت کے مطابق نواب واجد علی شاہ کی ایماء پر ان کے کسی وزیر نے ۱۲۰۴ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ امام باڑے میں کل ۹ گنبد ہیں، مرکزی گنبد بڑا ہے، عمارت چونے اور اینٹ کی بنی ہے۔ اس پر ایک کتبہ بھی ہے جس پر

درج ذیل عبارت لکھی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم	سبحان اللہ العظیم
گفت تاریخ ہاشم مرقال	شد بنا روضۂ امام بحق
	۱۲۰۴ھ
ہست اللہ شاہد	خادم روضۂ بندہ واحد
۱۲۰۴ھ	

آج کل اس امام باڑے کے متولی کو لے کر تنازعہ ہے، اور مقدمہ اعظم گڑھ سول کورٹ میں زیرِ سماعت ہے۔ اس امام باڑہ میں عزاداری کی رسم ادا کرنے شیعہ سنی دونوں آتے تھے، لیکن مقدمہ شروع ہوجانے کے باعث ۲۲ سال تک شیعہ و سنی دونوں نے جلوس و عزاداری کو موقوف کیے رکھا۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ اب دونوں فرقوں کے لوگ امام باڑہ میں آنے لگے ہیں۔

جس زمانہ میں رمضان علی شاہ مبارک پور آئے تھے، اسی زمانے میں مسلک امامیہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے شیخ سیف علی بھی باہر سے آئے اور انہوں نے امام باڑہ رمضان علی شاہ کے بالمقابل جنوب میں ایک امام باڑہ تعمیر کیا، جو بعد میں منہدم ہوگیا۔ یہ وہی دور ہے جس میں چراغ علی مبارک پور میں سکونت پذیر ہوئے اور انہوں نے شیعہ عقائد کی ترویج کے لیے جدوجہد کی، ایام محرم کی مجالس و مراسم عزاداری کا سلسلہ جاری کیا۔

قصبہ مبارک پور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں سید کوئی نہیں ہے، جہاں تک عزاداری کی روایت کا معاملہ ہے تو یہاں کے سنی بھی تعزیہ اٹھاتے ہیں اور ان کے علاوہ جلوس بھی نکلتا ہے۔ محلّہ پرانی بستی (لال چوک) محلّہ پورہ رانی، اسلام پورہ سے ۸ محرم اور ۱۰ محرم کو سنّی علم اور تعزیہ اٹھاتے ہیں۔ سنّیوں کی ایک انجمن ''اظہار حسینی'' کے نام سے ہے، جس کے ممبران شیعوں کی طرح علَم اٹھاتے ہیں اور جلوس بھی نکالتے ہیں۔ ہندو عقیدت سے نذر و نیاز کراتے ہیں لیکن جلوس نہیں نکالتے۔

مذکورہ امام باڑوں کے علاوہ قصبہ مبارک پور کے دوسرے امام باڑے درج ذیل ہیں۔

محلّہ پورہ باغ	امام باڑہ دولھابابا
محلّہ پورہ دلہن	امام باڑہ محلّہ پورہ دلہن
پورہ صوفی	ایوان حسینی رعلمدار حسینی

حسینی باغ	عزاخانہ زہرا
محلّہ شاہ محمد پور	امام باڑہ سیف علی شاہ
پورہ خضر	بیت العزا
پورہ خواجہ	ایوان ابوطالب
محلّہ پورہ رانی	امام باڑہ چٹان
پورہ دیوان	امام باڑہ پھاٹک والا
پرانی بستی	امام باڑہ زینبیہ

پورے قصبے میں ہلال محرم نمودار ہوتے ہی مجالس کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور یہ سلسلہ ۸ ربیع الاول تک چلتا ہے۔

قصبہ مبارک پور میں بہت سی انجمنیں بھی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱- انجمن انصار حسینی (رجسٹرڈ) ۱۹۳۹ء محلّہ شاہ محمد پور، موجودہ سکریٹری حفاظت حسین

۲- انجمن معصومیہ، قائم شدہ ۱۳۶۱ھ، موجودہ سکریٹری غم خوار حسین

۳- انجمن انصار حسینی قدیم، محلّہ پورہ باغ موجودہ سکریٹری خورشید احمد پسر حاجی حماد

۴- انجمن عزادار حسینی، شاہ محمد پور، موجودہ سکریٹری حیدر علی

قصبہ مبارک پور کے بزرگ حضرات سے گفتگو کرنے پر یہ واضح ہوا کہ ۱۹۵۰ء تک مجلسوں میں نصف سے زائد سنّی رسوم عزاداری میں شرکت کرتے تھے اور مسلکی ہم آہنگی پائی جاتی تھی، سنّیوں میں بہ نسبت شیعوں کے نوحہ وغیرہ سننے کا ذوق زیادہ تھا اور محرم میں جو جلوس نکلتے تھے، ان میں بھی سنیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں، مجلسوں میں صرف دو چار سنّی آجاتے ہیں، اس کی وجہ مقامی لوگوں نے یہ بتائی کہ سنّی علما نے عزاداری کو بدعت قرار دیا ہے، جس کی وجہ سے ان میں دلچسپی کم ہوئی پھر بھی قصبہ مبارک پور کے تقریباً دس فیصد سنّی عزاداری کی روایت پر قائم ہیں۔

برسرا ائمہ

برسرا ائمہ ضلع اعظم گڑھ سے مغرب کی جانب ۱۵ کلومیٹر کی دوری پر سادات زمینداروں کا گاؤں ہے، اس گاؤں میں شیعہ سنّی اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی ہے۔ یہاں عزاداری کی روایت بہت زمانہ سے چلی آرہی ہے، اہل سنت بھی عزاداری میں حصہ لیتے ہیں، ان کے اپنے امام چوک ہیں، شب عاشور

اور روزِ عاشور ان کے دوتعزیئے پیش پیش ہوتے ہیں اور یہ دونوں برسراائمہ کے پولس تھانہ کپتان گنج کے ریکارڈ میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ منت کے لیے ہندوؤں کے چھوٹے چھوٹے تقریباً چالیس تعزیئے نکلتے ہیں، ان کا ریکارڈ بھی تھانے میں درج ہے۔ اس گاؤں کا بنسورام۔ ہریجن ۸ ویں محرم کو علم نکالتا ہے او رتقریباً مجلس کا انعقادبھی کرتا ہے۔ تبرک بھی تقسیم کراتا ہے۔ اس کے علاوہ پلٹورام، راجدیولوہار اور رام دھنی خودتعزیہ اٹھاتے ہیں۔

برسراائمہ کے شیعہ محرم کے مہینہ میں تمام رائج رسوم ادا کرتے ہیں اور مرکزی امام باڑے سے لکڑی کی ضریح نویں اور دسویں محرم کو باہر نکالتے ہیں۔اس کے علاوہ الاؤ پرعلم لے کر چلنے کی رسم بھی ادا ہوتی ہے، جس کی خاص بات یہ ہے کہ سنی لڑکے الاؤ پرعلم لے کر چلتے ہیں اور آگ کو راکھ کردیتے ہیں، برسراائمہ سے لگی ہوئی خالص سنیوں کی ایک بستی دیوریا ہے، یہاں سے بھی تعزیئے نکلتے ہیں اورحسینی باغ میں آتے ہیں، یہاں دیوریا کے سنی اور برسراائمہ کے شیعہ اکٹھا ہوتے ہیں اور مل جل کرنوحہ و ماتم کرتے ہیں، رواداری کی یہ عظیم مثال ہے۔

برسراائمہ میں بشمول صدر امام باڑہ کل پانچ امام باڑے ہیں۔ اس موضع کے مشہور لوگوں میں سید محمد صادق، سید تقی الحسن، سید ناصر رضا، سید حسن عباس، سید نظر حسن، سید علی اکبر رضوی، مقیم حال پاکستان، وغیرہ ہیں۔ آخرالذکر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور کبھی کبھی پاکستان سے اعظم گڑھ آتے ہیں۔ انہوں نے ہی برسراائمہ کی قدیم جامع مسجد کی تعمیرنو ۲۰۰۰ء میں اپنے پیسے سے کرائی۔

یہاں کے بزرگوں نے انجمن اصغریہ قائم کی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں انجمن تسکین فاطمہ قائم ہوئی جس کے سرپرست سید تقی الحسن ہیں۔ اس کے علاوہ اس گاؤں میں ایک باب الحوائج ہے جو سید نظر صاحب، سید محمد تقی اورسید ناظر حسن کی ملکیت ہے۔

بارگاہِ حسینی: یہ تقریباً دو سو سال پرانا امام باڑہ ہے۔جس کی تجدید ۹ فروری ۱۹۶۷ء کو ہوئی، اس کے متولی سید محمد صادق ہیں، اس کے صدر دروازے پر مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے:

یہ ارض پاک ہے سب احترام کرتے ہیں ۔۔۔ یہاں فرشتے بھی انجم سلام کرتے ہیں

اسکے ساتھ ہی امام باڑے کے اندر یہ قطعہ تحریر ہے:

وقار خانۂ کعبہ، بہار خلد بریں ۔۔۔ شریک مرضی رب، حامل کتاب مبیں
بقاءِ دینِ نبیؐ، فخرِ آسمان و زمیں ۔۔۔ مرے حسینؑ ترا مثل دو جہاں میں نہیں

بارگاہ حسینی کے اندر دیواروں پر کربلا کے ۷۲ شہداء کے اسمائے گرامی بھی درج ہیں۔ اس میں مجالس کا انعقاد بالالتزام ہوتا ہے۔

اس میں یہ شعر کندہ ہے۔

حسینیت کی، علم، تعزیہ کی بات کرو عزاء کے فرش پر آؤ، عزا کی بات کرو

شیخ پورہ، غوث پور

یہ موضع شہر اعظم گڑھ سے ۱۵ کلومیٹر مغرب اور قصبہ نظام آباد سے ۵ کلومیٹر جنوب مغرب میں ایک ندی کے کنارے واقع ہے۔ بستی کے متعلق یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ تین سو سال قبل آباد ہوئی اور اس کے بانی شیخ محمد حسام تھے، جو اس گاؤں کے زمیندار تھے۔ اس موضع میں شیعہ سنی کے علاوہ ہندوؤں کی مختلف ذاتی کے لوگ بھی آباد ہیں اور اس کی کل آبادی تقریباً ڈھائی تین ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ شیخ پورہ کے باہری حصے میں سادات کے گیارہ گھر اور غیر سید شیعوں کے ۶ گھر آباد ہیں اور ان لوگوں نے اپنی آبادی کا نام غوث پور رکھا ہے۔ اسی وجہ سے یہ موضع دوہرے نام سے جانا جاتا ہے۔[1] اس موضع میں شیخ محمد حسام نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، جس پر سن تعمیر ۱۱۱۱ھ کندہ ہے، مسجد بڑی خستہ حالت میں ہے۔ اس مسجد میں شیعہ سنی دونوں نماز ادا کرتے ہیں، مسجد کے صحن میں اس گاؤں کے بانی شیخ حسان صاحب مدفون ہیں اور یہاں ایک چوک امام حسین علیہ السلام سے منسوب ہے۔ اس بستی میں کل چار امام باڑے ہیں۔

۱- حکیم احسان حسین کا امام باڑہ: یہ امام باڑہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا، اب زمیں بوس ہو چکا ہے، صرف آثار باقی ہیں۔ اس امام باڑے کی عزاداری جھنکو حلال خور کرتے تھے۔

۲- حکیم احسان قصاب کا امام باڑہ: یہ امام باڑہ حکیم قصاب کے بزرگ جناب سدھو نے شیخ محمد حسام کے زمانہ میں تقریباً ڈھائی سو سال قبل تعمیر کرایا تھا۔

۳- سید شبیہ احسن کا امام باڑہ: اس کی تعمیر ۲۳ سال قبل ہوئی۔ اس کی تعمیر سید شاہ رضا نے کرائی۔ طرز تعمیر اور وسعت کے لحاظ سے ایک بڑا اور خوبصورت امام باڑہ ہے۔

اس بستی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی اراضی وقف نہیں ہے، عزاداری سے متعلق تمام امور جیسے مجلس، ماتم جلوس، تعزیہ داری وغیرہ عزادار مل جل کر خود اپنے وسائل سے کرتے ہیں۔

۱- شیعہ عزا نمبر لکھنؤ ۱۴۰۸ھ

ایام عزا میں میں مجالس ہوتی ہیں، علم، ذوالجناح اور تابوت کا جلوس بھی نکلتا ہے اور شام غریباں کی مجلسیں بھی امام باڑوں میں ہوتی ہیں، زنانی مجلس کا انعقاد مستورات کرتی ہیں اور ان مجالس کی ذاکری بھی انہیں سے متعلق ہے، نوحے کے لیے باہر سے خواتین بھی بلائی جاتی ہیں۔ اس موضع میں عزاداری بحسن وخوبی برپا کی جاتی ہے۔ اس موضع میں کوئی زیارت گاہ نہیں ہے۔ بستی میں کربلا کا نہ ہونا مومنین کی عدم دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اس موضع کی عزاداری کو بحسن وخوبی اختتام کو پہنچانے میں انجمن یادگار حسینی کے اراکین وعہدیداران کا اہم حصہ ہے۔

کھپرا گاؤں اور بجہر [1]

یہ دونوں گاؤں ریلوے اسٹیشن سرائے میر کے شمال میں واقع ہیں، یہاں بھی سادات کی آبادی ہے، کھپرا گاؤں کی مقتدر ہستی میر مرتضیٰ حسین، رئیس کھپرا گاؤں تھے یہ نہایت ہی متقی و پرہیز گار تھے، وہ عزاداری کا اہتمام کرتے تھے۔ یہاں عزاداری میں مسلمانوں کا ہر طبقہ شامل ہوتا ہے۔

کھپرا گاؤں سے آگے مرزاپور ہوتے ہوئے اور سرائے میر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ۱۱ کلومیٹر دور بجہر آباد ہے جہاں سادات کی آبادی ہے، یہ لوگ میر حسرت علی مرحوم کی اولاد میں ہیں۔ یہاں ۱۹۳۴ء میں خان بہادر سید ضامن حسین نے مسجد، امام باڑہ تعمیر کروایا، اس امام باڑے میں مجالس عزا برپا کی جاتی ہیں خاص کر ۴ محرم کو ہر سال شب بیداری ہوتی ہے، جس میں بیرونی انجمن ہائے ماتمی خصوصاً بنارس کی انجمنیں شرکت کرتی ہیں اور ماتم وگریہ کرتی ہیں۔ پانچویں کا جلوس بڑی دھوم سے اٹھایا جاتا ہے۔ خان بہادر کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری ان کے فرزندان سید محمد عباس پی سی ایس اور سید محمد حسینی نبھاتے رہے۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد اب ان کی اولادیں اور داماد عزائے حسین برپا کرتی ہیں۔

۵ محرم کی عزاء وجلوس کا انتظام سید حسن ولد سید حامد حسین مرحوم کرتے تھے۔ اب یہ ذمہ داری ان کے فرزندان میر حسن مہدی، سید سبط مہدی سید حیدر مہدی اور سید کلب مہدی انجام دے رہے ہیں۔ کلب مہدی اور سید تقدیر الحسن کلن سیٹھ نے گاؤں کے دوسرے افراد کے تعاون سے ایک درگاہ حضرت عباسؑ اور ایک امام باڑہ حسینیؑ مظلوم کی تعمیر بھی اسی گاؤں میں کروائی ہے، جہاں عقیدت مند زیارت ودعا کے لیے آتے ہیں۔ یہ دونوں درگاہیں ایک دوسرے کے مقابل تمام تر حسن تعمیر کے ساتھ

۱۔ بحوالہ پروفیسر شاہ محمد وسیم

ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد گھروں میں اپنے اپنے امام باڑے ہیں جو محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی سجا لیے جاتے ہیں اور عشرہ بھر ماتم ہوتا ہے۔ بارہ محرم کو بعد سوئم امام مظلوم سوگ اتارا جاتا ہے۔ سرائے میر کے پچھم میں موضع رسول پور واقع ہے۔ یہاں بھی سادات کی آبادی ہے۔ ایام عزاء میں یہاں بھی ماتم ومجلس کا انتظام خلوص وعقیدت کے ساتھ انجام پاتا ہے۔

موضع شیولی

اعظم گڑھ شہر کے مغرب میں ۵ کلومیٹر کی دوری پر شیولی واقع ہے، یہاں شیعہ سنی دونوں آباد ہیں۔ اس گاؤں میں تقریباً ۲۰۰ شیعہ گھر ہیں۔ اس گاؤں کے بانی سید محی الدین بن اوسط علی تھے۔ گاؤں میں ۲۲ امام باڑے ہیں، عشرہ محرم میں پورے دس دن ۲۴ گھنٹے مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، چاند رات سے جلوس کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے اور ۲۰ محرم تک بلاناغہ کسی نہ کسی امام باڑے سے جلوس برآمد ہوتا ہے۔

ہلال محرم کے نمودار ہوتے ہی عشرے کے استقبال کے لیے امام باڑہ محمد غفور مرحوم سے علم مبارک برآمد ہوتا ہے اور دوسری محرم کو یہاں سے تابوت برآمد ہوکر پورے گاؤں کی گشت کرتا ہوا، اسی امام باڑے پر آکر ختم ہوجاتا ہے۔ چار محرم کو تابوت، پانچ محرم کی شب میں ذوالجناح اور چھ محرم کی شب میں تابوت جناب قاسم برآمد ہوتا ہے اور الاؤ پر ماتم ہوتا ہے۔ اسی طرح چھ محرم کو امام باڑہ محمد قاسم سے علم مبارک برآمد ہوتا ہے، سات محرم کو محلہ راجہ پٹی سے علم مبارک برآمد ہوکر پورے گاؤں کی گشت کرتے ہوئے قریب ہی کے گاؤں بھدولی جاتا ہے اور واپس آکر راجہ پٹی میں ختم ہوتا ہے۔ آٹھ محرم کو دن میں جلوس علم مبارک بھدولی گاؤں سے شیولی آتا ہے اور راجہ پٹی کے امام باڑہ قصر حسینی سے تابوت جناب حضرت عباس برآمد ہوتا ہے، جس میں کربلا کی منظرکشی کی جاتی ہے، ۹ر محرم کو تابوت جناب علی اصغر، امام باڑہ قصر حسینی سے برآمد ہوکر کربلا لے جایا جاتا ہے اور شب عاشور ٹونس ندی کے کنارے ایک مجلس ہوتی ہے جس میں ذاکر بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد گاؤں کے لوگ خاموش ماتم کرتے ہیں اور پھر اس جلوس کو امام باڑہ محمد غفور پر لے جاکر ختم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یوم عاشورہ کا ایک مخصوص جلوس برآمد ہوتا ہے، جس میں گاؤں کے تمام لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۱۱، ۱۲، ۱۳ محرم کو بھی جلوس نکلتے رہتے ہیں۔

موضع شاہ دیوئت

شیعوں کا یہ گاؤں اعظم گڑھ شہر سے ۲۰ کلومیٹر کی دوری پر جنوب میں واقع ہے۔ یہ قرب و جوار میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں شیعوں کی کثیر آبادی ہے۔ یہ گاؤں جو عزاداری کی روایت سے متعلق کافی شہرت رکھتا ہے، یہاں مجلسوں اور جلوس کا سلسلہ پورے سال رہتا ہے اور ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو امام باڑہ جعفریہ سے نوچندی کا علم برآمد ہوتا ہے، جس کا اختتام ۸ بجے شب میں کربلا میں ہوتا ہے۔

ماہ محرم کا چاند نمودار ہونے کے ساتھ ہی ایک جلوس امام باڑہ جعفریہ سے برآمد ہوکر پورے گاؤں کا چکر لگاتا ہوا کربلا تک جاتا ہے، یکم محرم کو ہی موضع کے تمام امام باڑے علم وضریح، تابوت وتعزیہ سے سج جاتے ہیں اور مجلسیں شروع ہوجاتی ہیں، پورا عشرہ عزاداری میں گزرتا ہے۔

ساتویں محرم اور دسویں محرم کو بڑے جلوس بھی برآمد ہوتے ہیں، ساتویں محرم کا جلوس شہزادۂ قاسم کی یاد میں اتر محال کے امام باڑے سے برآمد ہوتا ہے، آگ کے انگاروں پر ماتم ہوتا ہے، جس کے دیدار کے لیے لوگ حاضر ہوتے ہیں، اس روز جگہ جگہ سبیل کا بھی انتظام ہوتا ہے، جلوس رات میں کربلا پہنچتا ہے، انجمن فروغ عزا اور انجمن فروغ عزا اصغریہ کے ممبران جلوس کے ساتھ نوحہ و ماتم کرتے ہیں۔

موضع پتار

اعظم گڑھ شہر سے چودہ کلومیٹر دور ''پورب و اتر'' کی جانب واقع ہے، سادات کا یہ گاؤں اپنے آباواجداد کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اطراف و جوانب میں عزاداری حسینؑ کے لیے مشہور ہے، چھ سات غیر سید گھرانوں کے علاوہ یہ موضع پچیس تیس سادات کے گھروں پر مشتمل ہے، اس کا تذکرہ ڈسٹرکٹ گزیٹر میں ملتا ہے۔

گاؤں کے بیچ میں ایک چھوٹی خوبصورت مسجد اور دو امام باڑے، جو بڑی پٹی اور چھوٹی پٹی کے نام سے موسوم ہیں، عزاداری کے اہم مراکز ہیں۔ اس گاؤں میں ایک پختہ امام چوک ہے۔ جہاں علم نصب کیے جاتے ہیں، تعزیے رکھے جاتے ہیں، نیز عشرۂ محرم کے دوران مومنین نذرونیاز کرتے ہیں۔

یکم محرم سے مستورات گھروں میں اور مومنین امام باڑوں میں مجالس عزا میں منہمک ہوجاتے ہیں۔ پانچ اور چھ محرم کی رات میں بڑی پٹی کے امام باڑے سے جھولا حضرت علی اصغر و تابوت حضرت علی اکبر علیہ السلام برآمد ہوکر ایک بڑے جلوس کی شکل میں پورے گاؤں میں گشت لگاتے

ہوئے چھوٹی پٹی کے امام باڑے تک رات میں تین بجے کے قریب پہنچتا ہے، رات کے آخری حصہ میں جھولا اور تابوت چھوٹی پٹی کے امام باڑہ میں رکھ دیا جاتا ہے اور مومنین کے یہاں سے ہٹ جانے کے بعد پردہ نشیں خواتین بند امام باڑے میں صبح تک ماتم حسینؑ کرتی ہیں۔[1]

آٹھویں محرم کو بڑی پٹی کے امام باڑہ میں ایک مجلس کا انعقاد ہوتا ہے، جس میں دوسرے موضع کے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں۔ چھوٹی پٹی کے مرکزی امام باڑہ کے صحن میں یوم عاشورہ پر تمام عزا خانوں سے تعزیے لائے جاتے ہیں اور یہاں سے نوحہ خوانی، سینہ زنی اور زنجیری ماتم کے ساتھ ایک بڑے جلوس کی شکل میں دفن گاہ تک پہنچائے جاتے ہیں اور آہ و فغاں و گریہ و زاری کے دوران دفن کردیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فاقہ شکنی کا اہتمام ہوتا ہے۔ شامِ غریباں کی مجلس کا خاص اہتمام ہوتا ہے، لوگ عزاخانے میں یوں بیٹھتے ہیں جیسے جنازے کو دفن کرکے آئے ہوں، سب اشک بار ہوتے ہیں، واعظ حالات کربلا بیان کرتا ہے، عزاخانہ میں شمع اور روشنی گل کردی جاتی ہے اور غضب کا گریہ ہوتا ہے۔

ناہر پور

ضلع اعظم گڑھ سے ۴۰ کیلومیٹر دور پورب میں قصبہ ماہل کے قریب ایک گاؤں ناہر پور ہے، یہاں شیعہ آباد ہیں اور عزاداری کے تمام مراسم ادا کرتے ہیں، ناہر پور میں ۱۹۹۷ء میں انجمن حسینیہ یووک دل کا قیام عمل میں آیا، اس انجمن کے ممبر ہندو اور مسلم دونوں ہیں۔ اس کے موجودہ سکریٹری کنہیا لال (کیوٹ) ہیں، اس انجمن کے ڈیڑھ سو سے زائد ممبر ہندو ہیں، یہ لوگ باقاعدہ عزاداری کرتے ہیں اور تعزیہ اٹھاتے ہیں، فاقہ بھی کرتے ہیں، یومِ عاشور اس انجمن کے ہندو ممبر فاقہ شکنی کے لیے لائی چنا کا انتظام کرتے ہیں، جبکہ سنی ممبر چائے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس انجمن کے بعض ہندو ممبر نوحہ خواں بھی ہیں، جن میں بلدیو پرساد، رام لعل (نائی) ماتا پرساد (بنیا) رام پلٹ (بنیا) گاما پرساد اور بنارسی رام وغیرہ شامل ہیں۔

ماتم کرنے والے لڑکوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جو ماتم کرنے کے لیے حیدرآباد، بنگلور، علی پور (بنگلور) احمد آباد، گجرات، بھاؤ نگر، رتلام، بہار، رام پور، بریلی لکھنؤ، گورکھپور، الہٰ آباد وغیرہ جیسے شہروں میں بوجہ روزگار آتے جاتے رہتے ہیں۔

۱۔ شیعہ عزا نمبر لکھنؤ ۱۴۰۷ھ ص ۱۰۴

ڈوراں گاؤں

اعظم گڑھ شہر کے مشرق میں تقریباً بیس کیلومیٹر کی دوری پر سگڑی تحصیل میں گاؤں ڈوراں آباد ہے، یہ خالص ہندو (چوہان) بستی ہے۔ ہر سال محرم کے مہینے میں یہاں کے لوگ تعزیہ اٹھاتے ہیں اور یہ بستی یا حسینؑ کی صدا سے گونج اٹھتی ہے۔اس بستی میں شان و شوکت سے محرم منانے کی ایک دلچسپ کہانی ہے: روایت یہ ہے کہ تین سو سال پہلے اس گاؤں میں دھرمو، بال گووند اور گنجن تین بھائی آپسی میل جول کے ساتھ رہتے تھے، ان تینوں کے والد کا نام ٹوکڑی چوہان تھا، یہ تینوں بھائی لاولد تھے، اولا دکی امید میں ان بھائیوں نے مندر، تیرتھ استھان اور مذہبی مقامات کی زیارت کی، مزاروں پر چادریں چڑھائیں اور منتیں مانیں، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس لیے تینوں بھائی اور ان کی عورتیں غمگین رہا کرتی تھیں۔ اسی دوران انہیں ایک بزرگ نے امام حسینؑ کی کرب ناک داستان اور واقعہ کربلا سنایا، اس دردناک واقعہ کو سن کر تینوں بھائیوں کی بیویاں رو پڑیں اور انہیں احساس ہوا کہ ان کا غم تو غم حسینؑ سے بہت کم ہے۔ اب انہوں نے پروردگار عالم سے دعا کی کہ اگر اللہ انہیں لڑکا دے تو وہ بھی محرم کے مہینہ میں امام حسینؑ کی یاد میں تعزیہ نکالیں گی۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی اور سال بھر کے اندر ہی دھرمو کے یہاں بچہ کی ولادت ہوئی اور اس کا نام 'سالم' رکھا گیا۔ اس کے بعد اور تین لڑکے ہوئے جن کے نام بالترتیب سالم، دینا اور رام دھین رکھے گئے۔ انہیں بھائیوں کی ساتویں پشت کے لوگ اس گاؤں میں آباد ہیں اور کل ۷۰ گھروں کی آبادی ہے۔

لڑکا ہونے کی خوشی میں دھرمو، بال گووند اور گنجن نے عقیدت کے ساتھ خود تعزیہ بنایا، اسے قرب و جوار کے گاؤں میں گشت کرا کر دفن کیا، اس کے بعد سے وہ ہر سال تعزیہ برآمد کرتے رہے۔ اس روایت کو ان کے لڑکوں نے بھی جاری رکھا، جو آج تک مسلسل جاری ہے۔

اس گاؤں کے لوگوں کی زبانی یہ دریافت ہوا کہ اولاً تعزیہ بنانے کا سامان برما اور عرب سے منگایا گیا تھا، سب سے چھوٹے بھائی رام دھین اور اس کے ایک ساتھی نے اپنے ہاتھوں سے ایک تبور تیار کیا جو تین سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی محفوظ ہے، تین سو سال قبل کے تعزیے میں جو چاندی کا علم اور سونے کا جھومر لگایا گیا تھا، وہ آج بھی موجود ہے۔ تعزیہ کو بنانے میں کپڑا، ستارہ، چادر، ڈنڈے، پتامبر، چوکی اور چاندی کا استعمال روایت کے مطابق کیا جاتا ہے، اس کو بنانے میں بیر کی

۱- شیعہ عزا نمبر لکھنؤ ۱۴۰۷ھ، ص ۱۰۴

لکڑی کا استعمال ہوتا ہے ۔ اس گاؤں کے وسط میں امام باڑہ بھی ہے اورتعزیہ رکھنے کے لیے چوک بھی موجود ہے۔محرم کی نویں تاریخ کوتعزیہ کے ساتھ جلوس نکالا جاتا ہے جسے پورے گاؤں کے علاوہ قرب و جوار کی آبادیوں جیسے، بلوسرائے، سندر سرائے اور املی پور میں گشت کرایا جاتا ہے۔ سندر سرائے کی پٹھان بستی اور املی پور کےتعزیوں کے ساتھ اس گاؤں کا تعزیہ بلو سرائے کی سرحد پر جمع ہوتا ہے اور یوم عاشور ان تینوں تعزیوں کو ایک ساتھ کربلا میں دفن کردیا جاتا ہے۔

عزاداری حسینؑ میں اس بستی کے جو لوگ بہت دلچسپی لیتے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

بدھو چوہان ولد گلچرن، راجیو ولد برج موہن، سیتا ولد سیوک، سہبلی ولدنوبت، دیپ چند، ستیہ دیو، لوٹن بہاری، منی لال، رام لال، مہیندر، راجکمار، راجا رام چوہان نجے، گلاب چوہان، دشرتھ چوہان، بجرنگی وغیرہ۔[1]

اعظم گڑھ میں عزاداری کی روایت کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی مذہب وفرقہ کی قید نہیں ہے،شیعوں کے دوش بدوش اہلِ سنت بھی عزائے امام حسینؑ میں حصہ لیتے ہیں اور غیر مسلم برادران وطن بھی نہایت خلوص اور جوش وخروش کے ساتھ امام مظلوم کی عزاداری کرتے ہیں، صرف پست اقوام کے ہندو ہی عزا دار نہیں بلکہ اونچی ذات کے ہندو بھی عزا داری کرتے ہیں۔ یہاں شیعہ سنی اور ہندو سبھی لوگ اپنے ذوق کے مطابق مجلسوں میں حصہ لیتے ہیں اور سب مل کر ایام عزا مناتے ہیں۔

ہندوستان میں تعزیہ داری

پروفیسر سید جعفر رضا☆

عزاداری اور تعزیہ داری کی اصطلاحیں حسینی انقلاب کے مختلف و متنوع پہلوؤں کی نشرواشاعت کے لئے مخصوص ہوگئی ہیں۔ ان کی بدولت آج تاریخ اسلام کا ادنیٰ سا طالب علم بھی حسینی انقلاب کے آثار و اثرات سے کچھ نہ کچھ واقف ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جہاں جہاں عزاداری ہوتی ہے، ان علاقوں، ملکوں اور قوموں کے ناخواندہ افراد بھی امام حسینؑ اور ان کے کارناموں سے کسی حد تک روشناس ہیں۔ عزاداری اور تعزیہ داری کی مختلف ممالک میں متنوع کیت و کیفیت ہے۔ مثلاً ذریعۂ عزاداری روضہ خوانی اور اس کی ڈرامائی پیش کش کو ایران میں تعزیہ کہتے ہیں جبکہ بحرین میں جلوس عزا کو تعزیہ کہتے ہیں۔ لبنان میں عزاداری کو تعزیہ یا ذکرہ کہتے ہیں۔ ہندوستان (بلکہ برصغیر ہند) میں عزاداری کی اصطلاح حسینی انقلاب کے تمام اہم پہلوؤں کی نشرواشاعت پر محیط ہے اور تعزیہ روضہ امام حسینؑ کی شبیہہ کے لیے مخصوص ہے، جو عام طور پر جلوس عزا میں برآمد کیا جاتا ہے۔ تعزیہ یا شبیہہ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ تعزیہ، تعزیہ دار کے ذوق و مزاج اور مقامی رسم و رواج کے اعتبار سے تیار کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی عزاداری کی اہم ترین انفرادیت اس کا سیکولر کردار ہے۔ یہ شیعوں تک محدود نہیں ہے۔ حالانکہ دنیا کے تمام شیعوں کی طرح ہندوستانی شیعوں کے لیے عزا داری مآل زندگی ہے۔ ہندوستانی عزاداری کی عوامی مقبولیت شیعوں کے پہلو بہ پہلو سنیوں کی بدولت ہے۔ تمام ملک میں بالخصوص شمالی ہند میں چھوٹے چھوٹے گاؤں، قصبوں اور شہروں میں مذہبی جوش و خروش سے عشرہ محرم کے درمیان جلوس عزا منعقد ہوتے ہیں، جن میں تعزیے برآمد کیے جاتے ہیں۔ دور دراز میں پھیلی ہوئی ان بستیوں میں خال خال ہی شیعہ آباد ہیں بلکہ ان میں اکثر بستیاں تو شیعوں سے خالی ہیں لیکن پوری بستیاں انتہائی اہتمام سے عزاداری کرتی ہیں۔ سال بھر اپنی جائز کمائی سے زیادہ سے زیادہ رقم لوگ یکجا کرتے ہیں اور عشرہ محرم میں صرف کرتے ہیں۔ شہر و ضلع الہ آباد کے متعلق پورے

☆ شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ عشرہ محرم و چہلم کی تعزیہ داری کی ۸۰ فیصد شان و شوکت اہل تسنن کی مساعی جمیلہ کی بدولت ہے۔ ہندوستانی عزاداری میں اردو مرثیے کلیدی کردار کے حامل ہیں۔ اردو مراثی کی ابتداء کی تاریخ پر نظر کریں تو اردو کا اولین مرثیہ نگار شیعہ نہیں ہے، بلکہ اولین شہادت نامہ سنی عقائد کے شاعر اشرف بیابانی کا نوسر ہار ہے، جو ۹۰۹ھ ۱۵۰۳ء کی تصنیف ہے۔ شمالی ہند کا اولین مرثیہ نگار روشن علی سہارنگ پوری ہے، جس کا 'عاشورنامہ' ۱۶۸۸ء کی تصنیف ہے۔ فقط مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں نے بھی مرثیہ نگاری میں بلند مرتبہ حاصل کیا ہے جس کی سب سے روشن مثال منشی چھنو لعل دلگیر ہیں۔ دیگر ہندو مرثیہ نگاروں میں کنور سین مضطر، راجہ الفت رائے الفت، لالہ نانک چند نانک، روپ کنواری اور نھو لال وحشی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

ہندوؤں کی عزاداری کے بیان میں حسینی برہمنوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ جنوری ۱۹۹۰ء میں ایک اخباری مباحثہ میں کسی نے حسینی برہمنوں کے وجود سے انکار کیا تھا۔ اس پر برہم ہو کر مشہور اردو صحافی جمنا داس اختر نے اپنا مندرجہ ذیل بیان جاری کیا تھا۔

''میرا تعلق موہیالوی کی (ست) ذات سے ہے اور ہمیں حسینی برہمن کہا جاتا ہے۔ عاشورہ کے روز ہم لوگ سوگ مناتے ہیں۔ کم از کم میرے خاندان میں اس دن کھانا نہیں کھایا جاتا ہے۔ سری نگر کے امام باڑہ میں حضرت امام حسینؓ کا موئے مبارک موجود ہے، جو کابل سے لایا گیا ہے۔ ایک حسینی برہمن اسے سو سال قبل کابل کے امام باڑے سے لایا تھا''۔[۱]

حسینی برہمنوں کا تفصیلی ذکر Sir Denzil Ibbepson نے اپنی کتاب A Glossary of Tribes and caste of Puriyas and north west frontier promices میں کیا ہے، جسے اس نے اپنے رفقاء کے ہمراہ ۱۸۸۸ء اور ۱۸۹۲ء کے درمیان مختلف دستاویزوں کی بنیاد پر تیار کیا تھا۔[۲]

تعزیہ داری کے متعلق مولوی سید احمد دہلوی رقمطراز ہیں:

''یہ دستور صرف ہندوستان میں ہے۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوئی تھی کہ جب تیمور گورگان اہل کوفہ کو قتل کرنے کے بعد کربلائے معلیٰ گیا تو وہاں سے کچھ تبرکات ایک پالکی میں رکھ کر نہایت ادب کے ساتھ لایا۔ جب سے لوگ اس طرح پر تعزیہ بنانے اور اسے اٹھانے لگے۔ ایک اور محقق نے تعزیہ کی ابتداء اس طرح بیان کی کہ تیمور لنگ صاحب قرآن حصرت سید الشہداء کا بڑا معتقد تھا، جب

۱- قومی آواز، دہلی ۲۸ جنوری ۱۹۹۵ء

2- Deenzil Ibbefson and other vol II

بایزید قیصر روم کو گرفتار کر چکا تو متبرک اور مقدس مقامات متعلقہ سلطنت روم جب اس کے قبضہ میں آ گئے تو وہ کربلائے معلیٰ گیا، حسب بشارت سید الشہداء کچھ تبرکات ملے۔ مثلاً ملبوس، رومال، اسے، تبرکاً ملے جنہیں محمل میں رکھ کر فوج کے آگے آگے لے کر چلا۔ خدا کی شان، جس طرف رخ کیا، ان تبرکات کی برکت سے وہیں فیض یاب ہوا۔ جب ہندوستان میں آیا تو محمل کے بجائے ہاتھی کی عماری پر رکھ کر اس ہاتھی کو سب سے آگے رکھنے لگا۔ ایک دفعہ اس کے وزیر نے بھی کسی جنگ کے موقع پر یہی عمل کیا اور فتح یاب ہوا۔ پس اس زمانہ سے رواج ہو گیا۔ چونکہ محرم کے موقع پر صاحب قرآن اس محمل کے پردے زیارت کے واسطے اٹھا دیتا تھا۔ پس تعزیہ داروں نے بھی وہی ترکیب و ترتیب اختیار کی۔ تبرکات کے بجائے سبز و سرخ تربتیں اندر رکھنے لگے'' ۔[۱] اس کی تائید شہزادہ مرزا حیدر شیخ کے بیان سے ہوتی ہے جنہوں نے ان توزک'' کے ترکی مخطوطہ کے حوالہ سے تیمور کا بیان لکھا ہے۔

'' جب میں کربلائے معلیٰ سے رخصت ہونے لگا تو غم و الم میں ڈوب گیا۔ اہلِ کربلا نے میری تسکینِ خاطر کے لئے ایک ضریح پیش کی جو روضۂ اقدس کی خاک پاک سے تیار کی تھی۔ میں نے کمالِ عقیدت مندی سے اسے قبول کیا اور ہمیشہ اپنے ساتھ ساتھ رکھا'' ۔[۲]

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی ان بیانوں سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی کے مغل شہزادے، جنہوں نے شیعیت اختیار کر لی تھی، انہوں نے ان تصورات کو پھیلایا کہ ان کے مورثِ اعلیٰ تیمور نے، جو خود بھی شیعہ تھے، ہندوستان میں تعزیہ داری کی ابتدا کی۔ اس کی تائید میں تاریخی شواہد نہیں ملتے۔[۳]

یہ خیال پوری طرح درست نہیں ہے، کیونکہ تیمور گورگان کے تعلق سے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ وہ کربلا کے تبرکات کے ساتھ ہندوستان وارد ہوا۔ البتہ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ اس نے ہندوستان میں تعزیہ داری کی ابتدا کی۔ کربلا کے تبرکات کا ذکر اورنگ زیب عالم گیر کے ایک فرمان میں ملتا ہے کہ تیمور گورگان نے ۱۳۹۳ء میں فتح بغداد کے بعد کربلائے معلیٰ جا کر روضۂ امام حسینؑ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ وہاں اس نے بعض تبرکات حاصل کئے۔ ان میں رومال فاطمہ زہرا(ع) کا ایک

1- A Glossary of the Tribes and castes of Punjab

۲- بحوالہ سید سبط الحسن فاضل ہنسوی عزاداری کی تاریخ ص ۴۸

3- Saiyed Athar Abbas Rizvi- A socio intellectual History of the other Ashain Shia's in India, VolI, p 295

پارچہ قبر حربن یزید ریاحی سے اپنے ساتھ ہندوستان لایا۔ روایت ہے کہ اس پارچہ رومال کو امام حسین(ع) نے روزِ عاشورہ حر کے زخمِ سر پر باندھ دیا تھا اور خون بہنا رک گیا تھا۔ اس کا موجودہ سائز ڈھائی انچ بائی ڈھائی انچ ہے۔ مغلوں سے یہ پارچہ رومال نظام دکن کو حاصل ہوگیا۔ آخری نظام دکن، میر عثمان علی خاں نے عاشور خانہ، خلوت مبارک، کے توشہ خانہ میں تبرک اور فرمان شاہی سے محفوظ کرادیا ہے۔ اورنگ زیب کے فرمان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''یہ عظیم تبرک حضرت فاطمہ زہرا کے قصابہ کا پارچہ ہے۔ حسینؑ نے اسے حر ابنِ یزید ریاحی کو کارزارِ کربلا میں عطا کیا تھا۔ امیر تیمور صاحب قرآن نے امام حسینؑ کی اجازت (بہ فیضانِ اعجاز) اور (مقامی) سادات کی منظوری کے بعد قبرِ حُر سے حاصل کیا۔ وہ (تیمور) اس تبرک کو ہندوستان لائے۔ سادات اور ان کے ورثاء جو اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ وہ موضع کردارہ کی مالگزاری کے بطور اس کے حقدار ہیں اور جب شہنشاہ جہانگیر (خلد مکانی) تخت نشین ہوئے تو اپنے بزرگوں کی طرح انہیں بھی اس تبرک سے اظہارِ عقیدت کی سعادت حاصل ہوگی۔ انہوں نے نگراں کی مددِ معاش میں اضافہ کیا۔

مابدولت (اورنگ زیب) نے قاضی الملک ملا احمد اور دیگر شہروں کے عالموں اور مفتیوں سے اس تبرک کے متعلق فتوے حاصل کیے۔ انہوں نے لکھا کہ تابوت سکینہ آلِ موسیٰ و ہارون کی روایت تھی۔ قرآنی آیت "اِنَّ اٰیَۃَ مُلْکِہٖ" (بے شک اس کے ملک کی نشانی......الخ) اس حکایت کو بیان کرتی ہے۔ جگر گوشہ رسولؐ حضرت فاطمہؑ زہرا کے قصابہ کا پارچہ روحانی مرتبہ میں تابوت سکینہ سے افضل ہے۔ اس تبرک کے حامل افراد کو اللہ کی رحمت خاص، ذریعہ برکت اور فتح و کامرانی کی نشانی سمجھنا چاہئے۔ اللہ کی رحمت بے پایاں اس تبرک کے مالک کو حاصل رہے گی۔ جب مابدولت (اورنگ زیب) سربرآرائے سلطنت ہوئے اپنی خاندانی روایت کے اعتبار سے اس کو اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے گئے۔ اس توفیق خاص کے لئے اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔ اس موقع پر ہم نے اس کے نگراں کے منصب میں پانسو کا اضافہ کردیا۔ بخشی الممالک کو تاکید کردی گئی ہے کہ وہ تجدید فرمان کو عذر بنا کر سید کو اس عطیہ سے فیض یاب ہونے سے روک کر گناہ کے مرتکب نہ ہوں''۔[1]

۱۔ موجودہ نگراں مکرم بہادر ہیں۔ تبرک اور فرمان حفاظت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ہر سال دو بار محرم اور چہلم میں زیارت کی اجازت ملتی ہے۔ ڈاکٹر صادق نقوی (شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) نے راقم کو بتایا کہ انہوں نے کئی بار زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ سید خورشید علی (شعبۂ مخطوطات) سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا کہ فخرالدین علی احمد اپنے زمانۂ صدارت میں حیدرآباد تشریف لائے تو ان تبرکات کی زیارت کے لیے خلوت مبارک بھی گئے۔ اندرون خلوت مبارک تبرکات کی زیارت سے ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنے

عزاداری کے اولین نقوش

ہندوستان میں عزاداری کی ابتداء کب ہوئی، کس نے کی، اور کس طرح کی، واضح تاریخی سراغ، شواہد نہیں ملتے اگرچہ یہ یقینی ہے کہ دور خلافت علی ابنِ ابی طالب (۴۱-۳۵ھ/۶۶۱-۶۵۶ء) سندھی قوم جاٹ کے شیعان ملاۃ نے ہندوستان میں محبت و مودت اہل بیت کی فضا تیار کر رکھی تھی[۱] حتی کہ عوامی روایت کے اعتبار سے سندھ کے قوم 'دت' کے افراد جو ملک عرب میں سکونت پذیر تھے، سانحہ کربلا میں امام حسینؑ کی رفاقت کرتے ہوئے شہید راہ خدا ہوئے۔ بعد میں حکومت بنی امیہ نے دت قوم کے باقی بچے افراد کو سرزمین عرب سے ایران میں ڈھکیل دیا۔[۲] اگرچہ موروثی علی، غوری حکمرانوں نے بنو امیہ کی دست درازیوں سے محفوظ رہتے ہوئے مودت اہل بیت کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔[۳] اگر اس امر کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ سندھی، مسلم علماء ائمۂ اہلِ بیت خصوصاً امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ کی خدمت میں باریاب تھے[۴] تو کس طرح ممکن ہے کہ انہوں نے عزائے امام حسینؑ میں شرکت نہ کی ہو؟ مزید یہ کہ سندھ و پنجاب کے علاقوں میں اہلِ تشیع کی نو آبادیوں کا قائم ہونا، سندھ کے گورنروں کا بنی فاطمہ کی حکومت قائم کرنے میں اپنی جانوں کو قربان کرنا، اہلِ پنجاب و سندھ کی شیعی نوآبادیوں کا فاطمین مصر سے براہِ راست تعلق، اس حد تک کہ ہر امر میں خلفائے فاطمین کی منظوری حاصل کریں، اس امر پر گواہ ہیں۔[۵] خلفائے فاطمین کو دیگر اہلِ تشیع کی طرح عزاداری سے بے حد انہماک تھا۔ پھر اسماعیلیوں کی تبلیغی کوششیں جو عشرہ محرم کے دوران اپنے مواعظ میں امام حسینؑ اور ان کے اعوان و انصار کے ایثار و قربانی کے واقعات لازمی طور پر بیان کرتے ہوں گے۔[۶] افسوس ہے کہ ان حقائق کی جانب مورخین کرام نے توجہ نہیں فرمائی جس کی وجہ سے ہندوستان میں عزاداری کے ابتدائی نقوش دھندلا گئے اور ہند آریائی مشترکہ تہذیب و تمدن کے ان اہم مباحث پر وقت کی گرد پڑ گئی۔ البتہ عوامی مقبولیت کی بناپر بعض ابتدائی نقوش بکھرے ہوئے ملتے ہیں، جن کی

⇨ مقررہ وقت سے تقریباً ایک گھنٹہ زیادہ دیر تک محویت کے عالم میں تبرکات کے پاس مودب بیٹھے رہے۔ باہر انتظامیہ کے لوگ بدحواس تھے کہ صدر جمہوریہ باہر تشریف کیوں نہیں لائے۔

۱- کامل تاریخ، ج ۲، ص ۳۶-۴۵-۳۸۱

۲- سرحسان الحیدری: بلوچوں کی تاریخ، قبائل کے آئینہ میں، ج ا ص ۱۵۰

۳- منہاج سراج جوزجانی: طبقات ناصری

۴- محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ: تاریخ فرشتہ اردو، ج ا، ص ۴۷

۵- مقدسی: احسن التقاسیم، لیڈن ۱۹۰۶ء، ص ۴۸۵

۶- محمد بن الحسن بن اسفند یار، تاریخ دابرستان Tr. E.G. Brown طبقات ناصری، ص ۹۰

روشنی میں عزاداری کی ابتدا کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں عزاداری کے ابتدائی نقوش سرائیکی مراثی کی شکل میں محفوظ ہیں، جن کو سندھی و سرائیکی علاقوں میں قوم 'چارن' ترنم سے پیش کر کے لوگوں سے انعام واکرام حاصل کرتی ہے۔ ان میں ایک کبت میں قوم دت کے واقعہ کربلا کے حوالے سے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کا زمانہ بکرماجیت کے عہد کے قریب یعنی ۶۸۱ء قرار دیا گیا ہے۔[۱] اب تک کی تلاش کے مطابق ہندوستان میں عزاداری کی یہ قدیم ترین منظوم علامت ہوسکتی ہے۔ ہندوستان میں عزاداری کا اولین راوی ملّا منہاج الدین سراج جرجانی ہے جو اپنے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ شعبان ۶۲۹ھ (مئی ۱۲۳۱ء) کو گوالیار پہنچا، جہاں سلطان شمس الدین التتمش (م:۱۲۳۶ء) محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس محاصرہ نے طول کھینچا۔ سلطان نے جرجانی کے فوجیوں کو مذہبی تبلیغ کے فرائض پر مامور کیا، جسے انہوں نے سات ماہ تک انجام دیا۔ اس طرح کہ پورے ماہ رمضان المبارک میں ہفتہ میں تین بار، ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں تک اور یکم محرم سے عشرہ محرم تک جرجانی ان تبلیغی مواعظ کو 'تذکیر' کہتا ہے۔[۲] واضح رہے کہ رمضان المبارک کی تذکیر کا موضوع بیان زہد نفس اور تقویٰ رہا ہوگا۔ ذی الحجہ میں حضرت ابراہیم کی قربانی بیان کی گئی ہوگی اور یکم محرم سے عشرے تک واقعات کربلا کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع نہیں ہوسکتا۔ یہ موضوع فوجیوں میں جذبۂ ایثار وقربانی بیدار کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوا ہوگا۔ اس طرح سلاطین خلجی (۱۲۹۰-۱۳۲۰) کا ایک مصدقہ فرمان سادات بہرسر (بھرتپور) کے پاس محفوظ ہے جس کے ذریعہ موضع بہرسر عزاداری کے لیے وقف ہوا، بعد میں دیگر سلاطین تا عہد شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ تا ۱۸۰۶) تجدید فرمان کرتے رہے۔ اسی فرمان کی بنیاد پر ہندو راجگان بھرتپور بھی عزاداری کے لیے سادات کی دوامی معافی تسلیم کرتے رہے۔[۳] چودھویں صدی عیسوی کے سنی عالم دین ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی اپنے دور کے ان اکابرین میں سے تھے جنہیں عزاداری سے خصوصی دلچسپی تھی، جس کا ثبوت ان کی کتاب ہدایۃ السعدہ سے ملتا ہے، جس میں انہوں نے اپنی تائید کے ساتھ محرم کے مراسم عزا کا ذکر کیا ہے، جو اس زمانے میں رائج تھے۔ انہوں نے قبل کے دیگر ہندوستانی سنی علماء کی ان کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں جو اب ناپید

۱- اختر وحید: درگوہر (ملتانی زبان کے قواعد اور فرہنگ)، ص ۹ ۔ ۲- طبقات ناصری، ص ۷۵-۱۷۴-۲۴۹
۳- عزاداری کی تاریخ، ص ۳۱

ہو چکے ہیں۔ لیکن انہوں نے تعزیے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبًا اس وقت تک تعزیے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ البتہ اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ عزاداری پر شیعہ و سنی دونوں کو اتفاق تھا اور دونوں عزاداری کرتے تھے۔ اسی طرح سلطان محمد تغلق (م:۱۳۵۱ء) کے دورِ حکومت میں عزاداری کا ذکر اس دور کے مصنف استخوان دہلوی نے کیا ہے کہ محرم میں اعلانیہ عزاداری ہوتی تھی لیکن اس کی مزید تفصیلات درج نہیں کی ہیں۔[۱] ممکن ہے یہ عزاداری انعقادِ مجالس تک محدود رہی ہو کیونکہ اس وقت تک جلوس کی صورت میں تبرکاتِ عزا برآمد کرنے کا امکان نہیں ہے۔

شمالی ہند میں تبرکاتِ عزاء کے طور پر علَم حسینی برآمد کرنے کا سلسلہ حضرت سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی (م:۱۴۰۵ھ) سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے پہلی بار محرم کے موقع پر علَم حسینی برآمد کیا اور اس کے زیرِ سایہ قیام کیا۔ ان کا دستور تھا کہ سبزوار کے طریقہ پر علم اور زنبیل تیار کرتے۔ زنبیل کے ساتھ صحیح النسب سادات اور متقی و پرہیزگار لوگوں کو اطراف و جوانب میں بھیجتے۔ بسا اوقات یہ ذمہ داری اپنے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ سید علی قلندر کے سپرد کرتے۔[۲] حضرت شاہ سمنانی ۱۳۸۰ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ اس طرح علم برآمد کرنے کا سلسلہ اسی کے گردوپیش شروع ہوا ہوگا۔ ان کے ملفوظات میں درج ہے[۳] کہ موصوف درمیانِ عشرۂ محرم اچھا لباس زیب تن نہیں کرتے تھے، کسی تقریب مسرت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ آٹھویں اور دسویں محرم کے درمیان کی تاریخوں میں آرام ترک کر دیتے تھے۔ تیس برس تک، خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں کبھی غمِ حسینؑ سے غافل نہیں ہوئے۔ ایک بار ایامِ عاشورہ میں ان کا قیام جون پور کی مسجد میں تھا، وہیں فرائض عزاء ادا کر رہے تھے، بعض علمائے اہلِ سنت زیارت علم اور ان سے ملاقات کی غرض سے مسجد میں حاضر ہوئے تو ان میں سے کسی مولانا محمود نے ان سے سوال کیا کہ یزید پر لعنت بھیجنے کے لیے کیا شرعی جواز ہے؟ حضرت شاہ سمنانی نے جواب دیا کہ اگرچہ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے مگر یزید پر وہ اس بناء پر لعنت بھیجتے ہیں کہ ممتاز علمائے کرام، بزرگانِ دین، صوفیائے عظام صحابۂ رسولؐ اور ائمہ اہل بیت کی یہی سیرت رہی ہے۔ پھر حاضرین سے سوال کیا کہ اس دشمنِ دین اسلام پر لعنت بھیجنے میں کس کو اعتراض ہوسکتا ہے، جس نے جگر گوشۂ رسولؐ کو ذبح کر ڈالا، پھر نص قرآنی کے طور پر درج ذیل آیت کی تلاوت فرمائی:

۱- استخوان دہلوی: بساتین الانس   ۲- لطائف اشرفی، ج ۲، ص ۲۶۸   ۳- ایضاً

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَ اَعَدَّ لَہُمْ عَذَاباً مُّہِیْناً۔[1]

''یقیناً جولوگ خدا اور اس کے رسول کو ستاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت ہے اور خدا نے ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے''۔

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کے بانی سلطان المشائخ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (۵-۱۲۳۴) کی درج ذیل رباعی زبان زد خاص و عام ہے۔

شاہ است حسینؑ و پادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ و دین پناہ است حسینؑ
سرداد نداد دست در دست یزید حقا کہ بنای لاالہ است حسینؑ

عصر حاضر کے بعض محققین، مذکورہ بالا رباعی کو ملا معین مسکین ہروی کی جانب منسوب کرتے ہیں لیکن اپنے قول کی صداقت میں معقول سند پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ صدیوں سے تواتر کے ساتھ اسے خواجہ اجمیری کی رباعی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ تیس سال قبل راقم نے خواجہ اجمیری کے روضہ پر حاضری دی تھی اور زیارت کی تھی۔ اس وقت ایک واقف کار کے متوجہ کرنے پر اس رباعی کا کتبہ (جو بہت قدیم تھا) قبر کے داہنے سرہانے پر درج دیکھا تھا۔ قبر کا یہ حصہ غلاف سے ڈھکا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ روضہ کے باہری دروازے پر بھی یہ رباعی درج تھی، جو بعد کی تحریر معلوم ہوتی تھی۔ خواجہ اجمیری کو خواجہ سید ہجویری داتا گنج بخش سے خصوصی عقیدت تھی۔ موصوف کے مزار کی غلام گردش میں بھی یہ رباعی درج ہے۔ راقم نے دیکھا ہے۔ صوفیہ کو عزاداری سے خصوصی رغبت تھی، جس کے حوالے ان کے ملفوضات میں ملتے ہیں۔ لیکن عزاداری سے متعلق ان کے زیادہ تر احوال و آثار استبداد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں۔ سلسلۂ چشتیہ کے بلند پایہ بزرگ حضرت بندہ نواز گیسو دراز (م...... ۱۴۴۲ء) کی محفل سماع میں عزائے حسینی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ واقعہ ۱۰ محرم ۸۰۳ھ (مطابق ۳۱ اگست ۱۴۰۰ء) کا ہے۔ یعنی اس وقت تک موصوف دہلی میں قیام پذیر تھے۔ دکن تشریف نہیں لے گئے تھے۔ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ روزِ عاشورہ حضرت خواجہ کے جماعت خانہ پر معتقدین بڑی تعداد میں یکجا ہوئے، قوال آئے اور ستار کے تاروں کو چھیڑنا شروع کیا، بعض مریدین موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز نے ارشاد فرمایا: آج ہر شخص کو عاشورۂ محرم کی یاد منانا ہے۔ آج کی سماع حضرات حسینؑ کی یاد میں ہوگی اور لوگوں کو گریہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ غم و الم کے مواقع

۱- سورہ احزاب، آیہ ۵۷

پر صوفیہ سماع کرتے ہیں۔ مریدوں کو مرشد کی تقلید کرنا چاہئے۔[1]

شمالی ہند میں عزاداری کو شاہی سرپرستی حاصل نہ تھی البتہ اہلِ تشیع اور صوفیہ کی دلچسپی کی بناء پر عزاداری کو عوامی مقبولیت حاصل تھی۔ اہلِ تشیع اپنے مکانوں میں مجلس عزاء منعقد کرتے جس میں ان کے ہم عقیدہ اور دیگر مسلمان گریہ و زاری کرتے۔ صوفیہ کی خانقاہوں میں علم استادہ کرنے، محفل سماع میں غم انگیز کلام سننے، فاتحہ خوانی وغیرہ کا رواج تھا۔ مغلیہ دور حکومت میں ہمایوں کے عہد ثانی (۱۵۵۵-۵۶ء) سے عزاداری کو خصوصی فروغ حاصل ہوا، کیونکہ اس کی فوج میں شیعوں کی کثرت تھی جو عزاداری کو حرز جاں سمجھتے ہیں۔ خود ہمایوں نے ۹۵۶ھ (۱۵۵۱ء) میں اپنے یاروفادار بہرام خاں کو کربلائے معلی بھیج کر ضریح بنوائی تھی جو قیمتی جواہرات سے تیار کی گئی تھی، جس کو شاہی محل میں استادہ کیا گیا تھا۔[2]

اسی طرح دور اکبر اعظم (۱۶۰۵ء-۱۵۵۶ء) میں روضہ امام رضاء پر علم نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے،[3] اس دور میں مجالس عزا کو مبارک کہا جاتا تھا۔ بعد مجلس انگاروں پر ماتم بھی ہوتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے حیدر توتیائی کے تذکرے میں لکھا ہے۔

''واین مطلع او دارد کہ در تعزیہ حضرت امام شہید مقبول و مقتول فلذہ کہ رسول مقبول علیہ السلام نقش بستہ درایام عاشورہ درمبارک سیٹھ آنند۔ ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین گریستن خون بیادلب تشنۂ امام حسین۔[4]

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس وقت تک شمالی ہند میں عزاداری کا رواج ہوچکا تھا، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ عزاداری کے ذکر میں تمام مآثر شاہان مغلیہ خاموش ہیں، بابرنامہ ہی نہیں، توزک جہاں گیری میں بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔

عیسائی مبلغین اور سیاحوں کی ہرزہ سرائی

عزاداری سے متعلق پہلا بیان عیسائی مبلغ انٹولی مان سریٹ کا سفر نامہ ہے جو اپنے سہ رکنی مشن کے ہمراہ گوا سے روانہ ہوکر ۲۸ فروری ۱۵۸۰ء کو فتح پور سیکری پہنچا۔ ۱۵ فروری کو یسوعی مشن گوالیار کے

۱- جوامع الکلم، ص ۳۰۶ ۲- عزاداری کی تاریخ، ص ۳۴

3- A socio Intellectual History of Isna 'Ashari Shia's in India vol II, A 297

۴- عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، لکھنؤ ص ۱۳۰

نزدیک نروار میں تھا، کہ وہیں اس نے محرم کا چاند دیکھا۔ اب اسی کی زبانی سنئے:

''ماہ فروری کی ۱۵ تاریخ کو یہ مشن اس جگہ (نردار) پہنچا، جب کہ مسلمانوں کا نو دنوں کا تیوہار شروع ہوا۔ اس موقع پر ہندوؤں کا ہولی تیوہار بھی پڑا۔ اول الذکر محمد کی بیٹی فاطمہ کے بیٹوں، اسن و اسین (حسن اور حسین) کے عزاء میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے جد کے دین کو قائم کرنا اور پھیلانا چاہتے تھے، لیکن ان پر عیسائیوں نے فتح حاصل کر لی۔ ان پر کافروں نے (جیسا کہ مسلمان ہمیں کہتے اور سمجھتے ہیں) بہت ظلم و ستم ڈھا کر ننگے پاؤں جلتے ہوئے انگاروں پر چلنے پر مجبور کیا۔ اس بنا پر مسلمان نو دنوں تک فاقہ کرتے ہیں۔ صرف دال کھاتے ہیں اور ان میں بعض دنوں میں کچھ لوگ ایک بلند مقام سے اُسن اور اُسین کے دکھ کی کہانی کھل کر بیان کرتے ہیں اور ان کے بیانات کا مجمع پر زبردست اثر ہوتا ہے کہ سب اشک بار ہو اٹھتے ہیں۔ تیوہار کے آخری دن میں چتا بناتے ہیں اور ایک کے بعد ایک لوگ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آگ کے شعلوں کو اپنے پیروں سے کچل ڈالتے ہیں۔ اس درمیان ''اسن اُسین'' کی دل دوز صدائیں بلند کرتے رہتے ہیں''۔[1]

فادر مانسٹریٹ کے بیان میں صلیبی جنگوں کی پیدا کردہ نفرتیں بے نقاب ہوگئی ہیں، اس میں کہا گیا ہے کہ امام حسنؑ و امام حسینؑ نے عیسائیوں سے جنگ کی تھی۔ اس نے کسی غیر معتبر ذریعہ سے معلومات حاصل کیں اور بغیر کسی زحمتِ تحقیق کے یقین کر لیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ نردار (گوالیار) میں شیعہ آبادی کا امکان نہیں ہے۔ اس جلوس عزاء میں تابوت غالباً شیعوں کے علاوہ کسی دوسرے فرقہ کے لوگوں نے برآمد کیا ہوگا جس کو بعد میں جلا دیا گیا۔ شیعوں میں تبرکات عزاء کے جلانے کا رواج کسی دور میں نہیں رہا ہے۔ شیعہ انہیں دفن کرتے ہیں۔ محرم کے متعلق ایک دوسرا اہم بیان ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرانسسکو پلسرٹ کا ہے جو ۱۶۲۰-۲۷ء کے درمیان آگرہ میں رہا۔ اس نے آگرہ کے اطراف و جوانب میں عشرہ محرم دیکھا تھا اس کا بیان ملاحظہ ہو:

بہرحال جب ان (مسلمانوں) کو طاقت حاصل ہوگئی اور ان کے بازو جنگ کرنے کے لائق ہوئے تو انہوں نے اپنے مذہب کو طاقت کے ذریعہ پھیلانا شروع کیا اور ان کے خلاف جنگ شروع کر دی جو ان کے عقائد کو نہیں مانتے تھے اور ایک کافر حکمراں راجہ بیکان ہار سے جنگ کرتے ہوئے حسن اور حسینؑ قتل ہوگئے۔ اس قتل کی یاد میں وہ (مسلمان) دس دنوں تک رات بھر چیختے رہتے ہیں۔

1- J.S. Hoyland and others (tr): the commentary of father Monserrate Oxford 1922, pp 74-5

مرد اپنی بیویوں سے الگ رہتے ہیں اور دن بھر فاقہ کرتے ہیں، عورتیں بین کرتی ہیں اور اظہارِ غم کرتی ہیں۔ شہر کی عام شاہ راہ پر مرد دو تربتیں بناتے ہیں، جن کو خوب سجاتے ہیں، شام کو بے حد روشنیوں میں انہیں اٹھاتے ہیں۔ بے حد مجمع ہوتا ہے۔ وہ لوگ بہت زور و شور سے غم مناتے ہیں۔ اصل تقریب آخری رات کو ہوتی ہے جس کی خوفناکی سے احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے دوبارہ فرعون کے دور میں لوٹا دیا ہے کہ تمام نوزائیدہ بچے ایک دن میں قتل کر دیئے گئے۔ یہ شور و شغف دن چڑھے تک رہتا ہے کہ تابوت دریا پر لائے جاتے ہیں۔ تابوت بردار دو گروہوں میں تقسیم ہوکر باہمی طور پر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں اس وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کرسکتے ہیں، گویا میدان جنگ میں دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ پاگلوں کی طرح ننگی تلواریں لیے بھاگتے رہتے ہیں۔ کوئی ہندو دوپہر سے قبل مکان کے باہر نہیں آسکتا ورنہ جان کی خیر نہیں، کم از کم ہاتھ پیر ضرور توڑ دیئے جائیں گے۔ یہ فضا اس وقت تک رہتی ہے، جب تک ان تابوتوں کو دریا میں گرا نہیں دیتے۔ پھر وہیں نہا دھوکر باہر نکلتے ہیں اور اچھے کپڑے پہنتے ہیں"۔[1]

اس لغو بیانی سے قطع نظر کہ امام حسینؑ نے طاقت کے ذریعہ تبلیغ اسلام کی یا ایک کافر راجہ بیکان ہار سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے، اس سے اطراف آگرہ میں محرم کے جلوسوں کے بارے میں غلط بیانی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عزاداری کے نام پر کس طرح درندگی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مسلمان حکمراں طبقہ کے فرد ہونے کی بنا پر اپنی طاقت کا اظہار کرتے تھے جس سے مقامی باشندے (ہندو) خوف و ہراس میں مبتلا ہوجاتے تھے۔ تربتیں لے جانے کے بیان سے یہ صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے کہ تابوت برآمد کیے جاتے تھے یا تعزیئے بنائے جاتے تھے۔ لیکن تعزیے بنانے کا امکان زیادہ ہے کیونکہ ان کو آراستہ کرنے کا ذکر ہے۔ اس طرح کے جلوسوں کی نوعیت پر نظر رکھی جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ جلوس ہائے عزاء دیگر عقائد کے مسلمان برآمد کرتے ہوں گے۔ شیعوں کی شمولیت کا امکان نظر نہیں آتا۔ اس وقت تک ہندوؤں میں عزاداری کا رواج نہیں ہوا تھا اس لیے ان کی شمولیت کا بھی امکان نہیں ہے۔ شمالی ہند کی عزاداری کا ذکر بخارا کے ایک سیاح محمد بن امیر ولی نے بھی کیا ہے جو ۱۰۴۵ھ (۳۶-۱۶۳۵ء) میں لاہور وارد ہوا، اس کا بیان ہے کہ سنی عقائد کے مسلمان عوامی سطح پر عزاداری کرتے تھے، اور اہلِ تشیع اپنے ذاتی مکانوں میں فرائض عزاداری ادا کرتے تھے۔ سنیوں کی

1- W.H. Mozeland & P Geyl (tr) Jalangir's India pp 74-5 New Delhi 1972

عزاداری کے متعلق اس کا بیان ملاحظہ ہو:

''تمام سلاطین اور امراء و رؤسا دو طرح کی تختیاں تیار کرتے ، ایک میں اماموں کی خوبصورت شبیہیں ہوتیں ،دوسری طرح کی تختیوں پر ابن ملجم کی قبیح شکلیں بنائی جاتیں۔ محرم کے ابتدائی پانچ دنوں کو اماموں کی پرمسرت زندگی کی علامت کے طور پر منایا جاتا، جن میں شادیاں ہوتیں اور شادیانے بجتے۔ دکانوں اور مکانوں کو بے حد آراستہ کیا جاتا،قوال، سازندے اور رقاصائیں کمالِ فن کا اظہار کرتیں۔ چھٹی محرم سے وہی موسیقار ماتمی نغمے پیش کرنے لگتے اور سیاہ پوش ہوجاتے۔ اپنی اپنی تختیوں کے ساتھ جلوس نکالتے ، ماتمی نغمے پیش کرتے اور اماموں کے دشمنوں پر سب وشتم کرتے۔ دسویں محرم کو شیعہ اور ہندو اپنی دکانوں اور مکانوں میں تالے ڈال دیتے اور کہیں محفوظ مقام پر روپوش ہوجاتے۔ اس کے بعد تختیوں والے نخاس (مویشی بازار) پہنچتے، جہاں اپنی اپنی تختیوں کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم ہوکے مجمع میں شامل ہوجاتے۔ دونوں گروہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوجاتے اور ایک دوسرے پر گھونسوں کی بارش کرنے لگتے، اس کے نتیجہ میں کافی جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ سیاح کے قیام لاہور کے دوران محرم میں پچاس شیعہ اور پچیس ہندو تختیوں کی جنگ کے شکار ہوئے اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے کی املاک کا نقصان ہوا''۔ [1]

شیعوں اور ہندوؤں کے روپوش ہوجانے کے بعد بھی اتنے بھاری جانی و مالی نقصان سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان میں بعضے پکڑ لئے جاتے ہونگے اور تختیوں والوں کے شکار بنتے ہونگے۔ ان جلوس ہائے محرم کو عزاداری کی بجائے ملک کے فاتحین اپنے مفتوحین پر قوت و استقامت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اپنے بے محابہ جوش میں اپنے برادرانِ ایمانی کا خون کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالات مزید بدتر ہوئے اور بعد کے ادوار میں محرم کے جلوس مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی باہمی کشمکش اور رشک وحسد کے اظہار کا ذریعہ بن گئے۔ ایک دوسرے کے دشمن مسلمان محرم کے موقع پر اپنا اپنا حساب بے باق کرنے لگے۔ محمد ہاشم خافی خاں نے برہان پور کے مشہور جلوس میں تابوت کی تفصیلات درج کی ہیں کہ کس طرح شر پسندوں نے جلوس محرم کے نام پر اپنی اپنی ذاتی دشمنی نپٹانے کی کوشش کی۔ ملاحظہ ہو یہ بیان:

''برہان پور میں احدی پورہ اور خرخی پورہ کے باشندوں میں پرانی رقابت اور جانی دشمنی تھی۔

۱۔ بحرالاسرار فی مناقب الاخیار

سالانہ جلوس پر احدی پورہ والوں کا قبضہ تھا۔ دو سو اسلحہ بند جنگ جو اور بڑی تعداد میں بندوقچی احدی پورہ کے جلوس میں شامل ہوئے ایک رات خرخی پورہ کا جلوسِ تابوت احدی پورہ کے سامنے آ گیا۔ خرخی پورہ کے لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا تاکہ تصادم ٹل جائے لیکن احدی پورہ کے فسادی و جنگ جو اپنی کثرت تعداد پر نازاں تھے، انہوں نے راستہ روک دیا۔ جامع مسجد کے قریب دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ جلوس کے عام شرکاء کی بہت بڑی تعداد خرخی پورہ والوں کی امداد کے لیے ٹوٹ پڑی۔ ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ لوگ مکانوں کے دروازوں اور چھتوں پر چڑھ گئے۔ احدی پورہ والوں میں پچاس سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً سو افراد زخمی ہوئے۔ احدی پورہ کے تابوت اور علم پر آراستہ تقریباً پچاس ہزار روپے کے لعل و جواہر ضائع ہوگئے''۔[۱]

اورنگ زیب کا تعزیری حکم

برہان پور کے ان فسادات کا قضیہ بادشاہ اورنگ زیب (م: ۱۷۰۷ء) کے سامنے پیش ہوا تو اس نے تعزیہ داروں کے حق میں فیصلہ دیا۔[۲] لیکن جلوس عزاء میں یہ فسادات محض برہان پور یا کسی مخصوص علاقہ تک محدود نہ تھے، بلکہ عزاداری کو عذر بنا کر فریقین ذاتی دشمنیاں نکالتے رہتے۔ ان حالات سے مجبور ہوکر اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے بارہویں سال (۱۶۶۹ء) میں عزاداری پر پابندی عائد کردی، جس کی بنا پر اورنگ زیب کو مطعون کیا جاتا ہے لیکن از روئے انصاف دیکھا جائے تو اورنگ زیب کے بجائے عزاداری پر پابندی کے ذمہ دار وہ لوگ نظر آئیں گے جو عزاداری کے پردے میں ذاتی دشمنیاں نکالتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر خوش عقیدہ مسلمانوں کی طرح اورنگ زیب بھی اہلِ بیتؑ اطہار اور خصوصاً امام حسینؑ کا عقیدت مند تھا۔ عظیم متبرک پارچہ قصابہ حضرت فاطمہ زہرا(س) سے متعلق اورنگ زیب کے فرمان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ اس کے 'وصایا در وقت آخر' کے ان الفاظ سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ''ایں عاصی غرق معاصی را تلخیف وتشریف تربت مطہرہ مقدسہ حسینیہ علیہ السلام نمایندہ کہ مغرقان بحارِ عصیاں رابغیر التجابان درگاہ رحمت غفران پناہ نیست''۔[۳]

عزاداری سے متعلق ایک واقعہ خود اورنگ زیب کے بارے میں یہ ہے کہ اس نے روز عاشورہ ایک ضعیفہ کو دیکھا کہ اپنے سر پر تعزیہ رکھے قلعہ کی جانب جارہی ہے۔ اسے دیکھتے ہی اورنگ زیب پر

۱۔ محمد ہاشم خافی خان: منتخب اللباب، ج ۲، ص ۱۴-۲۱۳ ۲- ایضاً ۳- نبی احمد سندیلوی، وقائع عالم گیری (عنوان وصایا در وقت آخر) علی گڑھ، ۱۹۳۰

جذب و استغراق کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ سروپا برہنہ ضعیفہ کے پیچھے دوڑا اور تعزیہ کو اس سے لے کر اپنے سر پر رکھ لیا اور اس طرح قلعہ آگرہ تک آیا اور ہر سال تعزیہ برآمد کرنے لگا۔[1] اورنگ زیب کے اسباب و لوازم عزاداری قلعہ آگرہ میں ہنوز محفوظ ہیں۔ آج بھی ایک تعزیہ قلعہ آگرہ سے برآمد کیا جاتا ہے اور شہر آگرہ میں گشت کرتا ہے۔[2]

اورنگ زیب کی طرف سے جلوس عزا پر پابندی عائد کیے جانے پر اس کے دربار کے شیعی امراء نے کسی طرح کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا جس پر Travernier نے اظہار حیرت کیا ہے کہ اورنگ زیب کے دربار میں اہلِ ایران کا مجمع تھا لیکن پابندی کس طرح عاید ہوسکی۔[3] شیعی امراء کے ردعمل ظاہر نہ کرنے کا سبب واضح ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے قیام دکن سے وفات تک کسی شیعی امیر پر عزاداری کرنے کی بناء پر کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی۔ اہلِ تشیع اور صوفیہ اپنے اپنے طور پر عزاداری کرتے رہے، ان کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی گئی، حتیٰ کہ دہلی میں شاہ مردان، کو شیعی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، جہاں بڑے ذوق و شوق سے عزاداری ہوتی تھی۔ بعد میں شاہ مردان کو مہابت خاں نے اپنے مدفن کے لیے منتخب کیا تو اسے مذہبی اہمیت کے پہلو بہ پہلو سیاسی اہمیت بھی حاصل ہوئی۔ ۱۷ویں صدی کے اواخر تک درگاہ پنجہ شریف کی عام شہرت ہوئی۔ شاہ مردان میں حضرت علیؑ کے قدم مبارک کا نقش رکھا گیا اور پنجہ شریف میں دست مبارک کا نقش۔ انہیں رفتہ رفتہ زیارت گاہوں کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ وفات اورنگ زیب تک دہلی میں عزاداری کے لیے شاہ مردان اور پنجہ شریف مرکز بن گئے۔ وہیں تعزیے دفن کیے جاتے۔ اہلِ تشیع کا قبرستان بھی قرار پایا۔ اورنگ زیب کا جانشین محمد معظم الملقب بہ شاہ عالم بہادر شاہ اول (م:۱۷۱۲ء) شیعی عقائد کا حامل تھا اور اس میں شدت رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے حکم جاری کیا تھا کہ خطبہ میں علیاً ولی اللہ وصی رسول اللہ کے الفاظ اضافہ کئے جائیں۔ اس نے عزاداری میں خصوصی دلچسپی لی اور اس کے عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں تعاون کیا۔[4]

۱۸ ویں صدی کے اواخر میں مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی تو شیعہ مخالف طاقتوں میں دم خم باقی نہ رہا۔ عزاداری پر پابندی ختم ہوگئی۔ بادشاہ محمد شاہ کے دور حکومت (۱۷۱۹-۴۸ء) میں شیعیت کی خصوصی

۱- سنیل چند: تاریخ عالم گیری، ص ۴۳ ۔ ۲- تاریخ عزاداری، ص ۳۲ ۔ 3- Traerneer's Travel Vol.II p. 177

۴- منتخب اللباب، ج ۲ ص ۶۰۳

ترقی ہوئی۔ اس کی ملکہ بیگم صاحبہ کو اہلِ بیت اطہارؑ سے خصوصی عقیدت تھی۔ اس کے جانشین احمد شاہ (۵۴-۱۷۴۸ء) کے دورِ حکومت میں شیعی عقائد اور خصوصاً عزاداری کو مقبول کرنے میں جاوید خاں نواب بہادر کا ذکر ضروری ہے، جو شاہی محل کے مدارالمہام تھے۔ ان کی کوششوں سے بادشاہ اور اس کی ماں اودھم بائی دونوں درگاہ شاہ مرداں سے جذباتی طور پر وابستہ ہوگئے۔ لیکن عالم گیر ثانی (۶۰-۱۷۴۰ء) اپنی تمام تر بزدلی اور ناکارہ پن کے باوجود عزاداری کو ممنوع قرار دینے کا مرتکب ہوا۔ بہادر شاہ اول کے دور آخر تک شاہی پابندیاں ایک بار پھر ختم ہوگئیں۔ قندھار سے محمد شاہ اول کی بیوہ ملکہ صاحبہ کی واپسی کے بعد قلعہ معلیٰ اور دارالسلطنت دہلی میں عزاداری کو اتنی غیر معمولی ترقی ہوئی کہ شاہ عالم کو مداخلت کرنا پڑی۔ اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ شاہزادے اور دیگر افرادِ محل شاہی اپنا آبائی مذہب ترک کر کے شیعیت نہ اختیار کرلیں۔ کیونکہ محرم کے موقع پر صرف ایک دن (۱۲۸ کتوبر ۱۷۹۳) کو ۲۰ شہزادے اور اور دیگر افرادِ محل شاہی اور سات سو ساٹھ زن وشو نواب صاحب کے محل میں زیارت تعزیہ کے لیے گئے۔ اس کے پیوستہ سال میں تعزیوں کی تعداد صرف پانچ یا چھ تھی جو بڑھ کر سو تعزیے اور پچاس منبر ہوگئی۔ ۱۴ مئی ۱۸۰۱ء کو بادشاہ نے مرزا اکبر شاہ کو ایک سو پچیس روپے اور بیگمات کو سات سو روپے محرم کے اخراجات کے لیے ادا کیے۔[1] آخری مغل تاج دار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کو امام حسینؑ اور دیگر اہل بیت اطہارؑ سے خصوصی عقیدت تھی۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے لکھنؤ کی درگاہ حضرت عباسؑ پر نذر گزاری تو بعضوں نے مشہور کردیا کہ بادشاہ شیعہ ہوگیا ہے۔[2] مخالفت کے خوف سے بادشاہ کو صفائی دینا پڑی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ایک چشم دید گواہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اکثر سلاطین (شاہی خاندان کے افراد) قلعہ میں تعزیہ داری کرتے تھے، صغیر پیک بنتے تھے۔ کوئی نشانچی، کوئی نقیب بنتا تھا، کوئی تاشہ، کوئی ڈھول کوئی جھانجھ تعزیوں کے آگے بجاتا تھا۔ کوئی مرثیے پڑھتا تھا۔ مرثیہ خوانوں کو درگاہ میں چار چار طشتریاں، چکنی ڈلی، بھنے ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنیے کی ملا کرتی تھیں، بڑی دھوم سے علم اٹھاتے تھے۔ یہ حال تو مغل شہزادوں کا تھا، باقی خود بادشاہ سلامت...... فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے، گلے میں سبز کفنی جھولی ڈالتے، ...... بادشاہ کے گلے

1-A socio- Intellectual History of India Ashsari shia's in India, Vol I, p 305

۲- عزاداری کی تاریخ ۴۲

میں زنجیریں ڈال کر سید کھینچتے تھے اور حضرت عباس علمدار کے سقے بنتے تھے۔ لال کھاروے کی ایک لنگی باندھے، شربت بھری ہوئی ایک مشک کندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلایا کرتے تھے۔ الغرض عشرہ محرم میں جو کچھ شیعوں کے یہاں ہوتا تھا، قلعہ کے سنی بادشاہوں کے یہاں بھی ہر ایک کی نقل ہوتی تھی۔[۱]

۱۔ مناظر عاشق See original

گورکھپور کے صوفی میاں صاحب کے یہاں محرم کی عزاداری

ڈاکٹر فرحت نسرین☆

گورکھپور میں میاں صاحب کا امام باڑہ شہر کی بہت جانی پہچانی جگہ ہے۔ اس کی تاریخ گورکھپور میں ۱۷۷۴ء میں سید روشن علی شاہ کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت روشن علی کے والد سید غلام اشرف، جو بخارا کے رہنے والے تھے، محمد شاہ کے دور میں دہلی آئے تھے، پھر یہ احمد شاہ ابدالی کے ایک حملے کے بعد دہلی چھوڑ کر سہارنپور میں مقیم ہوگئے۔ بعد میں انہوں نے گورکھپور آ کر محلّہ داؤد چاک میں، جواب 'میاں بازار' کہلاتا ہے سکونت اختیار کی۔ گورکھپور میں انہوں اپنے ماموں کی طرف سے کافی بڑی جائداد ورثے میں ملی تھی۔ روشن علی صوفی تھے اور بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت عبادت یا مراقبے میں گزرتا تھا۔ حضرت علی کے خاندان سے خصوصی عقیدت و احترام کی وجہ سے انہوں نے ۱۷۸۰ء میں مسجد سمیت ایک امام باڑہ بنوایا۔ اس وقت امام باڑے کے اردگرد بہت کم آبادی تھی۔ اپنے زمانے میں ہی روشن علی قابل احترام صوفی مانے جاتے تھے۔ ان کی روحانیت غیر معمولی تھی اور بہت ممتاز وکراماتی طاقتیں ان سے منسوب تھیں۔

ایک مشہور روایت کے مطابق روشن علی پاس کے جنگل میں مراقبے میں غرق تھے کہ نواب اودھ آصف الدولہ کا اتفاقاً ادھر سے گزر ہوا جو شکار کی غرض سے جنگلوں میں گھوم رہے تھے۔ موسم بے حد ٹھنڈا تھا اور صوفی صاحب کے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے آگ کے الاؤ کے پاس، یادِ خدا میں غرق بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب کو ان پر رحم آیا اور اُس نے اپنی چادر انہیں دی جو سونے چاندی کے تاروں اور قیمتی موتیوں سے سجی ہوئی تھی۔ روشن علی نے فوراً اسے 'دھونی' پر رکھ دیا اور وہ جل کر راکھ ہوگئی۔ اس حرکت پر نواب ناراض ہوئے، اُن سے پوچھا کہ انہوں نے یہ حرکت کیوں کی اور اپنی شال واپس طلب کی۔ روشن علی نے کہا کہ انہوں نے نواب کے تحفے کو اپنی دانست میں محفوظ ترین جگہ پر رکھ دیا۔ بہرحال، انہوں نے اپنے چمٹے سے وہی شال نکال کر نواب کو دے دی اور پھر اس وقت تک ویسی ہی شالیں یکے بعد دیگرے اس میں سے نکالتے رہے جب تک وہاں

☆ شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شالوں کا ڈھیر نہ لگ گیا۔ نواب کو بڑی حیرت اور شرمندگی ہوئی اور انہوں نے ان سے معافی مانگی۔ نواب اُن کے امام باڑے گئے اور انہیں دس ہزار روپے کی نذر اور محصول معاف سولہ گاؤں دیئے۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے دو تعزیے ایک سونے اور ایک چاندی کا علم اور چاندی کا پنجہ بھجوایا۔ ۱۷۹۷ء میں نواب کی ہدایت پر موجودہ امام باڑے کی بیرونی دیواریں اور بیرونی دروازے تعمیر کیے گئے اور ان کی تزئین کاری کی گئی۔ امام باڑے کے اندرونی حصے میں ایک چوبی محراب پر ایک فارسی شعر کندہ ہے جس کا مطلب ہے: ''یہ مذہبی عمارت ۱۲۱۲ ہجری میں نواب آصف الدولہ کے وزیرالملک، صوبے دار یحیٰی خاں بہادر نے تعمیر کروائی''۔

ایک اور مشہور روایت کے مطابق ۱۷۷۹ء کی تعمیر کے دوران چھت میں لگایا جانے والا لکڑی کا ایک لٹھا (شہتیر) کچھ چھوٹا پڑ گیا۔ جب روشن علی کو اطلاع ملی تو وہ اس کمرے میں گئے اور اللہ سے دعا کی: ''تو ایسی طاقت کا مالک ہے کہ جو چاہے کرسکتا ہے، اور حالانکہ یہ لٹھا اب جنگل کا کوئی پیڑ نہیں ہے، مگر تو اپنی شانِ عظیم سے اسے بڑھنے دے''۔ اگلے دن وہ شہتیر ضرورت سے زیادہ لمبا نظر آیا۔ یہ ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا شہتیر ابھی تک امام باڑے میں محفوظ ہے۔

وقت کے ساتھ روشن علی بہت مشہور و مقبول ہوگئے۔ آس پاس کی ریاستوں جیسے رودر پور، بہرائچ اور ستاسی کے راجا اور حکمراں ان سے ملنے آئے اور انہیں امام باڑے کی دیکھ ریکھ وغیرہ کے لئے نقد اور زمینی نذرانے دیئے، کوشامی کی رانی لال کنواری دیوی نے روشن علی کو امام باڑے اور 'صوفی کی دھونی' کے لیے اپنے علاقے کے آدھے جنگل دے دیئے۔ ان عطیات کی اصلی دستاویزات موجودہ میاں صاحب کے پاس موجود ہیں۔

روشن علی کی زندگی میں ہی اس امام باڑے کی محرم کی عزاداری نے مقبولیت حاصل کرنی شروع کردی تھی۔ لیکن اس کا عروج ان کے جانشین احمد علی شاہ میاں صاحب کے دور میں ہوا۔ روشن علی صاحب کا انتقال ۱۲ مئی ۱۸۱۸ ہجری کو ہوا۔ ہندوگور کھشک پیٹھ کے وقائع کے ریکارڈ سے اندازہ ہوتا ہے کہ روشن علی کے تعلقات خاکی بابا سے دوستانہ قسم کے تھے اور ان کے مذہبی عقائد اُن کے آپسی اُنس و محبت میں کبھی حائل نہیں ہوتے تھے، اُن میں یہ بھی ہے کہ روشن علی شاہ اپنی روحانی طاقت سے شیروں کو قابو میں کرسکتے تھے، یہ خیال لوگوں میں آج تک موجود ہے۔

سید احمد علی شاہ نے امام باڑے کے متولی کی حیثیت سے ۱۲ مئی ۱۸۱۸ء سے ۲۷ نومبر ۱۸۹۵ء

تک فرائض انجام دیئے۔ ان کے زمانے میں اس امام باڑے اور میاں صاحب کے محرم کے جلوس کی مقبولیت اور شان و شوکت جیسی رہی اس سے پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔ میاں صاحب کا محرم کا جلوس پانچویں، نویں اور دسویں محرم کو نکلتا تھا۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ امام باڑے میں راتوں میں ایک لاکھ چراغ روشن رہتے تھے اور امام باڑے کے منتظمین بہت شاندار جلوس نکالتے تھے جو کبھی کبھی سات کلومیٹر تک لمبا ہوجاتا تھا۔ عام طور پر غریبوں کو پورے مہینے کھچڑا بانٹا جاتا تھا۔ لیکن خود میاں صاحب بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے بارے میں روایات مشہور ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر میاں صاحب جب جلوس میں سب سے آگے چلتے تھے تو اُن کا لباس پانچ کلیوں کا کرتا، ساڑھے چار میٹر لمبا سفید صافہ، کرتے پر وہ ڈھائی میٹر لمبی ایک سفید سادی سی شال ڈالے رہتے۔ موجودہ میاں صاحب، عدنان فرخ شاہ بھی یہی لباس پہنتے ہیں۔ پہلے میاں صاحبان محرم کے علاوہ عام طور پر عوام میں نہیں دیکھے جاتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ امام باڑے میں عبادت اور مراقبے میں مصروف رہتے تھے۔ جب محرم کے جلوس کے لیے ہاتھی یا گھوڑے خریدنے ہوتے تھے، تب بھی یہ لوگ امام باڑے سے باہر نہیں آتے تھے جانوروں کو خود ان کے پاس لایا جاتا تھا۔ بہرحال بعد میں بعض مجبوریوں کے باعث میاں صاحبان کی اتنی خلوت نشینی ممکن نہ رہ سکی۔ جس دن سے یہ لوگ امام باڑے کے متولی کی حیثیت سے کام سنبھالتے تھے اپنے بال نہیں کٹواتے تھے۔ پہلے میاں صاحب جنھوں نے اس فریضے کو ادا کرتے ہوئے بال کٹوائے وہ سید جواد علی شاہ تھے۔

یہ بات کہ ۱۸۵۷ء تک اس امام باڑے میں بہت لوگ شریک ہوتے تھے، اور پولیس کی نگہداشت کی ضرورت ہوتی تھی، اس کا ثبوت شاہ احمد علی کی کتاب ''کاشف البغاوت گورکھپور' میں اُس بیان سے ملتا ہے کہ انہوں نے حکومتِ برطانیہ کے افسروں کو لکھا تھا کہ '' گورکھپور میں بغاوت کی وجہ سے سیاسی ہلچل کے باوجود امام باڑے کے جلوس میں ساتھ رہنے کے لئے، جس طرح پہلے انتظام کیا جاتا رہا ہے، اب بھی مسلح سپاہیوں کا انتظام کرنا ضروری ہے''۔ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل حقیقت ہے کہ باغی 'ناظم' محمد حسن کی سربراہی میں ہی امام باڑے کو لوٹا گیا تھا۔ گورکھپور میں برطانوی حکومت کے دوبارہ قیام پر حکومت نے احمد شاہ کو امام باڑے کی تلف شدہ املاک کو دوبارہ جمانے کے لیے پانچ ہزار روپے نقد اور چوالیس گاؤں دیئے تھے۔ سونے اور چاندی کے تعزیوں کو لٹیروں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا اور وہ آج تک محفوظ ہیں۔ حکومت برطانیہ کی دی ہوئی مالی اعانت کی سند اب بھی میاں صاحب

کے پاس موجود ہے۔ امام باڑے کے لوٹے جانے کی تفصیلات جو احمد علی نے دی ہیں وہ بہت تکلیف دہ ہیں۔ جس دن امام باڑے کو لوٹا گیا وہ ۱۷ محرم تھی، (کاشف البغاوت گورکھپور) انہوں نے لکھا ہے کہ غریبوں میں تقسیم کے لیے جو کھانا پکایا جارہا تھا وہ برتنوں میں ویسا ہی بچا رہ گیا کیونکہ لوٹ مار کی افراتفری میں ہر شخص مبہوت سا ہوگیا تھا۔ انہوں نے لوٹے ہوئے سامان کی مکمل فہرست دی ہے اور اس کی قیمت کا تخمینہ تقریباً ۳۴۰۰۰ روپے لگایا ہے (سابقہ حوالہ صفحہ ٦٧) مقامی ہندوستانی لوگوں کے علاوہ اس حادثے سے انگریزوں کو بھی رنج ہوا تھا کیونکہ امام باڑے کو ہر شخص بہت محترم و مقدس سمجھتا تھا۔ احمد علی نے محمد حسن کی بہت تنقید کی ہے۔ اس کے متعلق احمد علی نے کہا ہے کہ وہ اپنے نجیب الطرفین سید ہونے کا دعویٰ کرتا ہے پھر بھی اس نے امام باڑے کی املاک کو برباد کرنے میں حصہ لیا۔ احمد علی مطابق لٹیروں نے سونے اور چاندی کے تعزیوں پر اس لیے ہاتھ نہیں ڈالا کہ انہیں اُن لوگوں کے غم و غصے کا خوف تھا جو بغاوت میں شریک نہیں تھے۔ اگر ایسا کرتے تو خون خرابہ ہوتا اور بڑا زبردست فساد ہوتا۔ ان تاریخی تعزیوں کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی جان دینے کو تیار ہوجاتے۔ (سابقہ حوالہ صفحات ۹۳۔۹۲) حقیقت میں ہندو میاں صاحب کا جو احترام کرتے تھے وہ دوطرفہ معاملہ تھا کیونکہ انہوں نے اپنی ایک کتاب 'نورالحقیقت' (صفحہ ۴۲) میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں تمہارے دوست ہونے چاہئیں۔

''نورالحقیقت'' میں احمد علی نے حضرت علیؑ کے لیے متعدد حصے مختص کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ دائمی سکونِ قلب اور روحانی انبساط کے لیے محرم ضرور منانا چاہیے۔ حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے محبت انسان کی سب سے قیمتی چیزوں میں سے ایک ہے۔ یہ ہماری اس دنیا میں بھی مددگارومعاون ہوگی اور اس زندگی کے بعد ہمیں جنت بھی بخشے گی۔ علیؑ کی محبت کسی گناہ گار کو نیک انسان بناسکتی ہے۔ اپنی ایک اور کتاب 'محبوب التواریخ' (صفحہ ۹۴) میں انہوں نے لکھا ہے کہ انسان کو حسینؑ کو صرف محرم میں ہی نہیں ہر روز اور ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ یہ چیز ہمیں بہت سے گناہوں سے محفوظ رکھے گی اور ہمیں ایک بہتر انسان بنادے گی۔

احمد علی کا انتقال ۲۷ نومبر ۱۸۹۵ء کو ہوا۔ ان کے جانشین سید واجد علی شاہ ہوئے اور انہوں نے متولی کی حیثیت سے ۲۹ر اگست ۱۹۱۵ء تک یہ فرض انجام دیا۔ ان کی جانشینی سید جواد علی شاہ کو ملی جو ۱۹۷۰ تک متولی رہے۔ ان کے بعد عدنان فرخ شاہ متولی ہوئے جو اب بھی یہ فرائض انجام دے

رہے ہیں اور 'میاں صاحب' کہلاتے ہیں۔ اس امام باڑے کی سماجی حیثیت اور قدر زبردست ہے۔

نیچے ان تعلیمی اداروں کی فہرست دی جارہی ہے جو میاں صاحب کے امام باڑے کی مالی اعانت سے وجود میں آئے ہیں۔

۱- امام باڑہ مسلم گرلز انٹر کالج۔ ۱۹۲۶
۲- میاں صاحب امام باڑہ پرائمری اسکول ۱۹۲۶
۳- میاں صاحب امام باڑہ اسلامک کالج ۱۹۳۱
۴- ورنا کیولر مڈل اسکول ۱۹۳۲
۵- امام باڑہ ہائی اسکول ۱۹۴۸
۶- امام باڑہ انٹر کالج ۱۹۵۵
۷- امام باڑہ پوسٹ گریجویٹ کالج ۱۹۷۳
۸- میاں صاحب امام باڑہ جونیئر ہائی اسکول، کُسمی ۱۹۹۰
۹- میاں صاحب امام باڑہ کاس نکیتن، کُسمی ۱۹۹۰
۱۰- اسلامیہ کالج آف کامرس، گورکھپور ۱۹۹۴

امام باڑہ ٹرسٹ سے چلائے جانے والے مدرسے یہ ہیں۔

۱- عزیزیہ مظہرالعلوم۔ گورکھپور، ۱۹۶۰
۲- بِکول کا مدرسہ ۱۹۶۵
۳- بہرائچ کا مدرسہ ۱۹۶۵
۴- کُسمی کا مدرسہ ۱۹۸۱

گورکھپور میں میاں صاحب کا امام باڑہ ایک ایسا ادارہ ہے جس میں مسلم اور غیر مسلم، امیر و غریب سب گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ پانچویں، نویں اور دسویں محرم کے جلوس پورے شہر کے اہم پروگرام ہیں۔ یہ شہریوں کو اپنی ذمہ داریوں کی یاد دلاتے ہیں، جن میں جذباتی اور جسمانی دونوں قسم کی ذمہ داریاں شامل ہیں اور اس مقصد میں صبر و سکون سے جمے رہنے کی تعلیم دیتے ہیں خواہ اس کا نتیجہ اس دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ صاحبان یقین و ایمان کے لیے اس ظاہرہ اور موجودہ دنیا سے زیادہ طویل تو اس کے بعد کی زندگی ہے۔

کربلا: اس کے سماجی و معاشی اثرات

پروفیسر ایس۔ایم۔وسیم☆

کربلا کے سماجی اور معاشی اثرات کو سمجھنے کے لیے خود سانحہ کربلا کے واقع ہونے کے اسباب وعوامل کو واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے، اور ان اعلیٰ اقدار کو بھی جنہیں امام حسینؑ اپنے ورثے میں پایا تھا، جن کی پرورش رسول خدا حضرت محمدؐ، اپنے والد علی ابن ابی طالبؑ اور والدہ فاطمہ زہرہؑ بنت رسولؐ کی آغوش میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بھائی امام حسنؑ کو بھی دیکھا تھا جو اعلیٰ الوہی اقدار، عدل و انصاف، امن و آشتی اور معاملات میں حق پرستی پر ثابت قدمی سے قائم رہے اور حیاتِ انسانی اور اس کی نشو و نما کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی تجزیہ نگار کو اس ماحول کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے جس میں یزید پلا بڑھا تھا۔ وہ معاویہ کا بیٹا اور ابوسفیان کا پوتا تھا۔

''جو صفات وخصوصیات حسینؑ نے ورثہ میں پائی تھیں، انہیں کے زیر اثر وہ کہا کرتے تھے: ''صبر ایک زینہ ہے، وفاداری مردانگی ہے، غرور خام خیالی اور کمزوری ہے اور بدکردار سے تعلق انسان میں تذبذب اور وسوسہ پیدا کرتا ہے''۔

''ان چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو جن کا تمہیں استحقاق ہو۔ ظالموں کے ساتھ جینا خود اپنی تحقیر اور گراوٹ ہے۔ حق، عزت و وقار ہے اور ناحق، تنگی'' ۔۲

واقعۂ کربلا کی تفصیلات کا اگر آج کے عالمی تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو اس مصیبت زدہ انسانیت کی نجات کے لیے عملی سبق حاصل کئے جاسکتے ہیں اور اسے روسیاہی کے ان بندھنوں سے آزاد کیا جاسکتا ہے جو متواتر اخلاقی، معاشی، سیاسی اور سماجی وثقافتی (سوشیو کلچرل) گراوٹ کی وجہ سے اسے قعر مذلت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کربلا نے حق اور رضائے الٰہی پر سر تسلیم خم کرنے کے

☆ شعبۂ کامرس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۔ حسینؑ...... نے اپنے والد کے عزم راسخ، ثابت قدمی، عدل، مظلوموں سے ہمدردی اور ظالم کے خلاف غیض وغضب اور دشمنوں کے ساتھ بھی اچھے اور ہمدردانہ سلوک کو دیکھا ...'' جارج جرداق (George Jordac) صوت العدالۃ الانسانیہ، (ندائے عدالت انسانی) ترجمہ ایم۔فضل حق، ایڈیٹر، امیر علی یمنی، انصاریان پبلیکیشنس، اسلامک ریپبلک آف ایران، ۱۹۹۰ء، ص ۲۹۶

۲۔ ایضاً، ص ۹۹-۲۹۸

تصور کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔

اسلام نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے جو بھی روحانی اور اخلاقی و معنوی معیار پیش کیے تھے، اموی حکومت انہیں روندتی چلی جارہی تھی۔ جو لوگ پایۂ تخت کے قریب تھے وہ اس امتیاز کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عیش کر رہے تھے، جب کہ عام انسان ناانصافیوں اور زیادتیوں کا شکار تھا۔ قانون الٰہی کے استحکام کے لیے امام حسینؑ نے ظالم یزید سے ٹکر لی۔ ''ایک طرف حسینؑ نیکیوں اور حسنِ اخلاق کا عملی نمونہ [پیش کررہے] تھے تو دوسری طرف یزید [اپنے کردار میں] موروثی برائیوں کا بدترین نمونہ تھا۔ اگر حسین لوگوں سے اسی طرح ہمدردی رکھتے تھے جس طرح کہ دنیا میں عظیم المرتبت لوگ عام طور پر رکھتے ہیں، تو یزید انسانی جذبات سے بالکل عاری اور شرم و حیا سے مبرّا تھا''۔[1]

کربلا حق و باطل کے درمیان جنگ کا مظہر ہے۔ امام حسینؑ کی فتح پر 'فتح' خود نازاں ہے۔ ان کے ان لفظوں (ظالموں کے ساتھ جینا ذلت و رسوائی ہے) کی گرج ان کے عمل سے ثابت ہوگئی جو ہر جگہ اور ہر دور کے انسانوں کو آواز دے رہی ہے کہ زندگی کو بامقصد و بامطلب بنانا چاہتے ہو تو عزت و وقار کے ساتھ جیو۔ اس لیے ''کربلا..... ظلم و جور کے خلاف ایک روشن مشعل، انقلابیوں کے لیے ایک علامت اور غم اور گریہ کرنے والوں کے لیے ایک اساس ہے۔ حسینؑ ہر شریف النفس اور حریت پسند انسان کے دل میں محبت اور وفاداری کی ایک کسوٹی ہیں''۔

''وہ خودشناس، اٹل انقلابی کے لیے ایک نمونۂ عمل ہیں، جنھوں نے مظلوموں کے حقوق کی بات کی۔ وہ پیغمبرؐ کے ان قریب ترین عزیزوں میں سے ایک ہیں جن سے محبت کا حکم ہمیں اللہ نے دیا ہے''۔[2]

امام حسینؑ نے یزید کی حکومت میں سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی صورتحال کو بگڑتے ہوئے دیکھا، یہ سب کچھ اسلامی قانون اور احادیث و روایت رسولؐ کے خلاف ہورہا تھا۔ عام آدمی پس رہا تھا، اسلامی اقدار روندی جارہی تھیں اور تقسیم زر میں مساوات و انصاف معدوم تھے۔ جو لوگ اثر و رسوخ رکھتے تھے یا سازشوں اور ترکیبوں کا سہارا لے سکتے تھے، وہ پھل پھول رہے تھے اور امیر سے امیر تر ہوتے جارہے تھے اور جو لوگ اپنی سیدھی سچی محنت و مشقت کے ساتھ جی رہے تھے وہ

۱- ایضاً، ص ۲۹۹ ۲- امام حسین اینڈ دی ڈے آف عاشورہ، البلاغ فاؤنڈیشن، اسلامک ریپبلک آف ایران ۱۹۹۲ء، ص ۱۴

محرومیوں اور صعوبتوں کا شکار تھے۔ ''یہ وہی یزید تھا...... جس نے کعبہ کا محاصرہ کیا اور منجنیقوں سے اس پر پتھر برسوائے، مدینہ والوں کے خون اور املاک کو اپنے سپاہیوں کے لیے جائز قرار دیا، وہ عیش و عشرت اور شہوت پرستی کی زندگی گزار رہا تھا، اپنے آخری وقت تک بندروں اور کتّوں سے کھیلتا رہا، اور اس کے بعد اموی خاندان کے لوگوں نے اس کی جانشینی کی۔ انہوں نے عوام کے بیت المال کو اپنے عزیز و اقارب میں بانٹ لیا۔علیؑ نے حق و انصاف کو جس مقام پر مستحکم کیا تھا وہ ان کے ہاتھوں تباہ ہوگیا اور ناحق و ناانصاف ٹولے نے حکومت کی باگ ڈور پر قبضہ کرلیا، لوگوں کا ایک گروہ بے حد مالدار ہوگیا اور دوسرا انتہائی مفلس و نادار۔ جس وقت ہزاروں لوگ بھوکے مر رہے تھے اس وقت بنوامیّہ کے خلیفہ نے معبد نام کے مغنّی کو بارہ ہزار دینار بخش دیے، کیونکہ اس نے اپنی موسیقی سے خلیفہ کو خوش کردیا تھا۔حکومت کے امراء لاتعداد غلام اور کنیزیں رکھتے تھے۔ صرف عبدالملک کے بیٹے، سلیمان نے ان میں سے ستر ہزار کو آزاد کیا تھا۔نسل، خاندان اور پارٹی کی بنیادوں پر طرف داری اور تعصب بنوامیّہ کے دور خلافت میں عام بات تھی، ۱؎ حالانکہ اسلام نے اس تعصب کو ختم کردیا تھا اور امام علیؑ نے اس کی کوئی اجازت نہیں دی تھی''۔۲؎

اب مزید تفصیل بیان کیے بغیر یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اس معاشرے میں دو طبقے تھے۔ ایک وہ جو ''متموّل'' تھا اور دوسرا وہ جو ''محروم'' تھا۔ نتیجتاً کشمکش تھی جو اس طرح کے معاشرے میں ناگزیر ہوتی ہے، جہاں مفلس اور محروم لوگ اچھے دنوں کی توقع کررہے ہوں اور بے ایمان رؤسا اپنے مال و دولت سے عیش کررہے ہوں، اور اپنی دولت میں متواتر اضافہ کر رہے ہوں۔ غلط بنیادوں پر مبنی

۱- مورخین نے مثال کے طور پر بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص مصر میں معاویہ کے گورنر کے پاس دولت میں ۳,۲۵,۰۰۰ دینار، ۱,۰۰۰ درہم، ۲,۰۰,۰۰۰ کے بقدر فصلیں، اور مصر میں ہی ایک مشہور علاقہ جسے الوہت کہا جاتا تھا جس کی مالیت ۱۰,۰۰۰ دینار تھی، موجود تھے۔ ایک اور، عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے ورثے کو ۱۶ حصوں میں تقسیم کیا تھا ایک حصہ جو ان کی ہر عورت کو دیا جاتا تھا، وہ ۸۰,۰۰۰ درہم کا تھا۔ (مسعودی، مروج الذہب، ج ۳، ص ۳) مروان بن الحکم کو افریقہ کے ٹیکسوں سے ۵,۰۰,۰۰۰ دینار ملے [ابن اثیر، تاریخ کامل، ج ۳، ص۹]۔ ابن العاص کو ۱,۰۰,۰۰۰ درہم کا تحفہ ملا (ابن قتیبہ الدینوری، المعارف، ص ۸۴)۔ عبداللہ بن خالد کو ۳,۰۰,۰۰۰ درہم کا تحفہ ملا [ابن قتیبہ الدینوری، المعارف، ص ۸۴] یعلٰی بن امیہ کی دولت کا تخمینہ ۵,۰۰,۰۰۰ دینار تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے افراد پر واجب الادا قرضوں اور وراثت میں حاصل ہونے والی چیزوں کی مالیت ۳,۰۰,۰۰۰ دینار تھی۔ (مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۴) سعد بن ابی وقاص نے اپنی موت کے بعد ۲,۵۰,۰۰۰ درہم چھوڑے (طبقات بن سعد ج ۳، حصہ اول، ص ۱۰۵) سعد بن المسیب نے زید بن ثابت کے بارے میں بیان کیا کہ ان کی موت کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے سونے اور چاندی کو کلہاڑی سے توڑا جاسکتا تھا، اس کے علاوہ رقم اور اثاثہ کی قیمت ۱,۰۰,۰۰۰ دینار تھی۔ [ابن اثیر، تاریخ کامل، ج ۲، ص ۳۳۳] (یہ اقتباسات امام حسینؑ اینڈ دی ڈے آف عاشورہ، البلاغ فاؤنڈیشن، اسلامک ریپبلک آف ایران ۱۹۹۲ء، سے اخذ کیے گئے ہیں۔)

۲- جارج جرداق، سابقہ حوالہ، ص ۲۴۶

معاشی نظام جب ایک غیر منصفانہ سماجی ڈھانچہ ابھارتا ہے تو اس کا اظہار ایک انتہائی غیر متناسب اور لاحاصل معاشی نظام کی صورت میں ہوتا ہے، جس میں آبادی کے کمزور طبقے اور زیادہ محرومی اور مفلسی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یزید کے گورنر اور عمال حکومت اس کی بدعنوانیوں سے متاثر ہوئے تھے۔ اس کے دور میں تمام مکہ اور مدینہ میں گانا بجانا عام ہوگیا، موسیقی کے ساز و سامان عام طور پر استعمال ہونے لگے، لوگوں نے کھلے بندوں شراب پینی شروع کردی۔ یزید کا ایک ابی قیس نام کا بندر تھا۔ وہ اسے اس محفل میں اپنے ساتھ ضرور لاتا تھا جہاں وہ اور اس کے ساتھی شراب پیتے تھے۔ وہ اس خبیث بندر کے لیے ایک تکیہ رکھواتا تھا، کبھی ایک جنگلی گدھی پر جسے پالتو بنالیا گیا تھا، زین کسوا کر اور لگام لگا کر بندر کو بٹھا کر گھماتا تھا۔ مقررہ دن پر ابی قیس گھوڑ دوڑ میں گھوڑوں سے مقابلہ کرتا تھا۔ ایک دن بندر دوڑ میں جیت گیا، اس نے گھوڑ دوڑ کے راستہ کے آخر میں رکھی چھڑی کو اٹھا لیا اور گھوڑوں کے سروں پر سوار ہوکر کمرے میں داخل ہوا۔ یہ بندر ایک سرخ اور پیلے ریشم کا لباس پہنے رہتا تھا اس کے سر پر رنگین ریشمی ٹوپی ہوتی تھی جس پر مخصوص طرز کے گلاب (anemone-rose) کا کام ہوتا تھا۔ گھوڑے پر سرخ ریشم کی زین ہوتی تھی جس پر مختلف رنگوں کی چھاپ ہوتی تھی''۔[1]

ولید کی طرف سے یزید کی بیعت کے سوال پر حسینؑ کو مدینہ چھوڑنا پڑا، جس سے ضمیر کی آزادی اور عقیدے کے تحفظ کا پیغام ملتا ہے، جس سے ایک منصفانہ معاشی نظام کے قیام اور بقاء کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ امام حسینؑ مکہ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن وہاں بھی کسی طرح امان نہ پاکر اور اس مقدس مقام کی حرمت کے تحفظ کے پیش نظر انہوں نے مکّہ کو چھوڑا اور کوفہ [عراق] کا سفر اختیار کیا۔ حر بن یزید ریاحی سدّ راہ ہوا، لیکن اس کے باوجود امام حسینؑ نے حُر اور اس کے پیاسے رسالے کو پانی پلادیا۔ اس طرح انہوں نے انسانیت کو یہ سبق دیا کہ اگر دشمن پر بھی وقت آپڑے تو ہمیں ایک باوقار اور شریفانہ انداز اپنانا چاہیے۔

حُر نے امامؑ کو کوفہ کی طرف نہ جانے دیا، چنانچہ امامؑ نے کربلا کا راستہ اختیار کیا، یہیں یہ المیہ واقع ہوا۔ کربلا میں امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگ اپنے دنیاوی مفادات کے غلام ہوچکے ہیں، اور دین و ایمان ان کی زبانوں پر صرف ایک

۱- مسعودی، مروج الذہب، ج ۳، ص ۶۸-۶۷

کم حیثیت تصور بن کر رہ گیا ہے، یہ دین کے اردگرد اسی وقت تک منڈلاتے رہتے ہیں جب تک یہ ان کے ذریعۂ معاش میں وافر منفعت پہنچاتا ہے، مگر جب تکلیف و مصیبت میں ان کا امتحان لیا جاتا ہے تو بہت تھوڑے لوگ ثابت قدم رہتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں.....''

''تم دیکھ رہے ہو کہ ہم پر کیا افتاد آن پڑی ہے، دنیا کیسی منقلب ہوگئی ہے، اور یہ تغیر بدی کے لیے ہے، اس کی اچھائی یا نیکی پلٹ گئی اور جو کچھ تھوڑا بہت بچ رہا ہے وہ آخری قطرہ ہے، معاش کی قلت تو ساتھی جیسی چیز ہے اور ناخوشگوار (سوکھی) چراگاہ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق کا چلن اب ختم ہوگیا ہے اور ناحق اور جھوٹ لامتناہی ہے۔ ارے! کس طرح ایمان والے اللہ سے ملاقات کی تمنا کرتے ہیں؟ (جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے) میں تو موت (شہادت) کو ایک برکت و سعادت سمجھتا ہوں، اور ظالموں اور بدکاروں کے درمیان جینے کو ایک کرب و اذیت سے زیادہ کچھ نہیں جانتا''۔[۱]

تھوڑی دیر کے لیے اپنی ذات، نسل، قومیت اور عقائد سے قطع نظر کرکے ہر انسان کو اس پیغام کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیا یہ پیغام ہمیں اپنے عمل کو اپنے قول سے ہم آہنگ کرنے کی ہدایت نہیں کرتا، اور کیا ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہمارے قول و عمل لازمی طور پر اقدار و نیک نیتی پر مبنی ہونے چاہئیں اور ہمیں ایک ایسے متحرک سماجی، معاشی نظام کی تعمیر کے لیے کوشاں رہنا چاہئے، جس کا مقصد بنی نوع انسان کی زیادہ سے زیادہ بھلائی اور فلاح و بہبود ہو؟

عاشورہ کے دن نیکی اور بدی، حق اور ناحق، شیطانی اور رحمانی طاقتوں کے درمیان معرکہ شروع ہوا۔ امام حسینؑ اور ان کے رفقا بھوکے پیاسے قتل کرڈالے گئے۔

فرات کا پانی ان پر، ان کے رفقاء پر، یہاں تک کہ ان کے بچوں اور عورتوں پر بند کردیا گیا تھا۔ عورتیں، بچے اور بیمار سید سجادؑ علیؑ ابن الحسینؑ قیدی بنالیے گئے اور انہیں پہلے کوفہ (عراق) اور پھر دمشق (شام) میں لے جاکر قید میں ڈال دیا گیا۔ حضرت زینب(س)، حضرت ام کلثوم(س)، امام حسینؑ کی بہنوں اور صاحبزادہ علیؑ ابن الحسینؑ نے اپنے خطبوں میں کربلا کے جگر خراش واقعات کی تفصیل بتائی اور وہ اسباب بتائے جن کے نتیجہ میں واقعہ کربلا ظہور پذیر ہوا۔ ظالم اور شقی اچھی طرح پہچان لیے گئے۔ کوفہ اور دمشق کے راستوں اور ابنِ زیاد اور یزید کے درباروں میں، بالترتیب دیئے گئے بیحد مؤثر خطبوں نے کردار میں ہلچل اور خیالات میں تبدیلی پیدا کردی اور طرز حکومت کے بارے میں بھی

۱۔ الارشاد اور عبدالرزاق، المکرم الموسوی، ص ۹۴-۱۹۳

لوگوں کے تصورات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔

مدینہ کے واقعات اور پھر مکہ اور کربلا کے سفر اور خود کربلا میں رونما ہونے والے واقعات، اور شہادت کے بعد قیدیوں کے قافلہ کے کوفہ اور دمشق کے سفر کے دوران اور خود دمشق میں رونما ہونے والے حوادث میں کتنے ہی مؤثر سماجی، سیاسی اور کلچرل سبق موجود ہیں۔[۱] جو اس دور کی صورتِ حال پر بھی اثر انداز ہوئے اور اس کے بعد بھی۔ اس طرح امام حسینؑ نے:

۱۔ ایک ایسی حکومت کی تصدیق اخلاقی و ایمانی درستگی کی رو سے کرنے سے انکار کر دیا، جو بداطوار، معاشی اور سماجی طور پر بگڑی ہوئی تھی۔

۲۔ خونریزی سے بچانے کی خاطر مدینہ چھوڑا اور اس مقدس مقام کی حرمت کو بچانے اور آبادی کی حفاظت کی خاطر باہر نکل کر دشمن سے دوچار ہونے کو پسند کیا۔

۳۔ مظلوموں اور مجبوروں کو جو ظالموں سے مقابلہ کی ہمت و جرأت کھو چکے تھے ایک رہنمائی اور روحانی سربراہی عطا کی۔

۴۔ فوج میں کرائے کے سپاہی یا منفعت کی خاطر لوگوں کو بھرتی کرنے کے خلاف پیغام دیا کیونکہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ جہاد کیا وہ اپنی مرضی سے از خود لڑے۔[۲]

۵۔ حکومتِ جبر، جس کے بنوامیہ خواہاں تھے اور نئی نئی حکمتِ عملیاں اختیار کر رہے تھے، اسے مسترد کیا اور اس کو حقیر کر کے رکھ دیا۔ ان کا یہ قول کہ ''مجھے کہیں اور (بعض لوگوں کے مطابق ہندوستان) جانے دیا جائے'' امن اور تبلیغ حق کی خاطر ہجرت کے تصور کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔

۶۔ شہادت کے تصور کو بالکل صاف اور واضح طور پر بیان کر دیا، یہاں تک کہ کربلا کا ہر شہید شوق شہادت میں ایک دوسرے سے پہلے میدان جنگ میں جانے کا خواستگار نظر آیا۔

۷۔ ایک باعزت اور انصاف پر مبنی زندگی گزارنے کے حق کو مستحکم کر دیا، جب انہوں نے [حسینؑ نے] کہا کہ ''قسم خدا کی میں اپنا ہاتھ تمہیں [یزید کو] ایک ایسے شخص کی طرح بیعت کے لیے نہیں

۱۔ ملاحظہ ہو اردو اور ہندی میں شاعرانہ اظہارات میں کربلا بطور استعارہ پر راقم الحروف کا انگریزی مقالہ جو انٹرنیشنل کانفرنس آن کربلا اینڈ اٹس کلچرل رول، لندن، (نومبر ۱۱-۱۲، ۱۹۹۵ء) انگلستان، کے لیے لکھا گیا۔ مضمون زیرِ طبع تھا کہ پروفیسر روحانی قم، ایران، نے لکھ بھیجا کہ اس مقالہ کا انہوں نے عالمی انگریزی سروس کے لیے اپنی تقریر میں استعمال کیا۔

۲۔ شب عاشور امام حسینؑ نے اپنے رفقاء سے فرمایا: ''انہیں صرف میرا سر درکار ہے میں اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، تم جا سکتے ہو''۔ ان کا جواب تھا: ''نہیں، نہیں، امامؑ! ہمیں آپ کے ساتھ شہید ہونا زیادہ پسند ہے''۔

دوں گا جس کی عزت نفس چھین لی گئی ہو اور نہ ایک غلام کی طرح راہِ فرار اختیار کروں گا''۔[۱]

۸۔ ظالم کے ہاتھوں انتہائی ظلم و جور کے باوجود انسان کو ایک دوسرے کی عزت و وقار کو سمجھنے کا سبق سکھایا۔غور کیجیے ان حالات میں ان کی اولاد، اعزاء و اقرباء اور ان کے رفقاء میں سے ہر ہر فرد امام کے حکم کو کس طرح بجالایا۔

اب ہم خود اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ:

وہ کون ہے جو مظلوموں کے لیے مثالی کردار ہے؟

وہ کون ہے جس نے چمن انسانیت کو اپنے خون سے سینچ کر اس میں توانائی پیدا کی؟

وہ کون ہے جو اپنے انوکھے انداز میں ظالموں اور جابروں کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوگیا کہ وہ خود انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال سے باز آ جائیں؟

وہ کون ہے جس نے انسان کو اتنے اعلیٰ درجے پر لاکھڑا کیا کہ ہر بدکاراور فاسق اللہ کے حق شناس اور نیکوکار بندوں سے خوف کھانے پر مجبور ہوگیا؟

وہ کون ہے جس نے علی الاعلان کہا کہ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں، بلکہ یہ با مقصد اور باعزت جینے سے عبارت ہے۔

گونج اٹھتی ہے اور پھر گونج اٹھتی ہے
ہر ہر گوشے سے، ہر ہر کونے سے
ایک مسرور اور فاتحانہ آواز، حق کی نقیب، عہد ساز ایک آواز
انسان کے سچے ضمیر کی ترجماں آواز
اب تک ظلم وستم سہنے والے انسان کی عظمت کا اعلان کرتی
شہادت کے اعلیٰ مقاصد کی ہمنوا آواز
وہی صدائے تیز و واضح -کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے-نمازوں کے درمیان
یہ اسی کی ہے آواز جس کی گردن سے انقلاب کا مژدہ لیے فوارہ خون کا اُبلا
وہ کون ہے کہ وجود جس کا ہے ایک معتبر اساس بقائے ضمیر انسان؟

وہ کون ہے جو اپنے اور اپنے رفقاء کے سروں کی دے کے قربانی انقلاب کا اعلان کررہا ہے الٰہی

۱۔ شیخ مفید، کتاب الارشاد، ترجمہ آئی۔ کے۔ اے۔ ہاورڈ، محمدی ٹرسٹ، لندن، انگلستان، ص ۳۵۲

مقصد کے لیے، الوہیت کی قربانگاہ پر
کیوں کج کلاہ جابر شہنشاہوں کے تاج ہیں لرزتے؟
کس نے پیغام حق، امن و آشتی کو اک حیات نوبخشی!
کس نے یہ بانگ دہل کہا: اے یزید! تو ناحق کا نمائندہ، پجاری ہے اس کا
تیرا سوال بیعت اب ہے فرسودہ، شکست خوردہ
وہ کون ہے فتح یاب خود اپنے خون میں نہایا کھڑا، مات دیتا
جابروں اور ظالموں کو آج، کل اور ہمیشہ ہمیشہ

کربلا کے سماجی، معاشی، سیاسی، اخلاقی اور مختصراً مذہبی اثرات کو اسی وقت صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب تجزیہ نگار کے ذہن میں بنی امیہ کے بیس سال کے دورِ حکومت میں پیدا کردہ فاسد اثرات پوری طرح اجاگر ہوں۔ ان میں ہر طرح کا ظلم و جور اور طاقت و ثروت کی تمام تر اجارہ داری، استحصال کرنے والے ایک ایسے طبقے کی پرورش جو صرف قبائلی نظام کے تحت ہوتا ہے، انتظامیہ میں تمام کلیدی اسامیوں اور دولت پر مکمل تسلط، صرف اپنی مرضی سے عوام کا خون بہانے کے جواز کے لیے ترکیبوں اور فریبی چالوں کا جال پھیلا دینا، عوام کی صعوبتوں اور محرومیوں کی پرواہ کئے بغیر بیت المال کو بیدردی سے اپنے ذاتی عیش وعشرت کے لیے لٹانا، عام زندگی کے معاشی اور سماجی معاملات میں ہر درجے پر، بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں پھیلانا، یہ سب کچھ موجود تھا۔ اپنی بدعملیوں کو جائز قرار دینے کے لیے شریعت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، جس کے نتیجے میں نظریۂ تقدیر گرائی (Fatalism) کا حامل گروہ وجود میں آیا، اور اس پر یقین رکھنے والوں نے حکمراں کی تمام غلط کاریوں کی تصدیق 'تقدیر' یا 'جبر' کہہ کر کی، حالانکہ یہ سب کچھ قرآن و حدیث کی ہدایات وتعلیمات کے برعکس ہے، اس لیے اب یہ امام برحق کی ذمہ داری تھی کہ وہ سوال بیعت کا جواب اپنی بھرپور 'نہیں' کے ساتھ دیں اور پھر اس ظالم اور اس کے لالچی گرگوں کا مقابلہ ایک ناقابل تسخیر عزم و استقلال کے ساتھ کریں۔

نواسۂ رسولؐ کے اعلان ''ایک باعزت موت ذلّت کی زندگی سے بہتر ہے'' نے انسان کے عزم و وقار کے ساتھ جینے اور روئے زمین پر اس کے خلیفۃ اللہ ہونے کے پیغام کو اس کی تمام تر معنویت کے ساتھ دوہرایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مطابق ''کربلا...... بنیادی طور پر انسانی وقار کی کہانی،...... انسان کی حقیقی شرافت، عظمت کی اعلیٰ ترین چوٹی تک انسانی سفر کی داستان ہے۔ یہ فرد واحد اور

اجتماعی زندگی کے اعلیٰ ترین اصولوں کو پیش کرتی ہے۔ یہ وحشیانہ غلامی سے آزادی تک کے سفر میں سنگ میل ہے۔ یہ اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ اس (آزادی) کا بنی نوع انسان میں قائم ہونا عین ممکن ہے، یہ [کربلا] روشنی کا وہ مینار ہے جو انسانیت کی رہنمائی کمال کی طرف کرتا ہے۔ جب کبھی بدی کی طاقتیں اس نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کے لیے اٹھتی ہیں، تو حسینؑ کا کارنامۂ عظیم اس کی درخشانی کو دوبالا کردیتا ہے، جس وقت انسانیت کے قدم راہ حق وحریت میں ڈگمگانے لگتے ہیں تو حسینؑ اس کا سہارا بن کر اسے بچالیتا ہے۔ جب جب جابر و آمر اپنے مال و زر اور اپنی طاقت و ہیبت کے نشے میں بدمست ہو کر سیدھے سادے، بے یار و مددگار حق کے پرستاروں کو ہراساں کرنے لگتے ہیں، اور جب جب مذہب اور حق پرستوں کی [بظاہر] ناکامیاں خود حق کی حقانیت پر شبہات اور وسوسوں کا سایہ ڈالنے لگتی ہیں تو تحفظ حق کے مقصد کے لیے حسینؑ کا دلیرانہ ثبات عزم، صبر و استقامت کا ناقابل فراموش سبق دیتا ہے اور انہیں نا امیدی اور دست نگری سے بچالیتا ہے۔ جب ظالموں کی طاقت کا طوفان چڑھ کر کسی فرد کو خوفزدہ اور دل شکستہ کردیتا ہے، اس وقت حسینؑ کی شخصیت کی مثال اسے یاد دلاتی ہے کہ وحشیانہ طاقت و جبر کی متحرک مدافعت کی مسؤلیت خود اس پر عائد ہوتی ہے...... حسینؑ دنیا والوں پر یہ سچ آشکار کرتے ہیں کہ زندگی کا مطلب جیسے بھی بن پڑے صرف جیتے رہنا ہی نہیں ہے''۔[۱]

کربلا بربریت کے خلاف انسانیت کے اعلیٰ نظام کو آشکار کرتی ہے۔ باغیانہ طرز فکر کے خلاف رضائے الٰہی کے سامنے خود کو پوری طرح سونپ دینے اور ناحق کے مقابلہ میں حق کے جمے رہنے کا نام کربلا ہے۔ سخت ترین امتحان کی گھڑی میں امام حسینؑ نے جس یقین محکم کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ انسانی میں یکتا اور لامثال ہے۔ یہ اللہ پر لامتناہی یقین کا مظہر ہے۔

کربلا کے سماجی و معاشی اثرات کو، روزانہ زندگی میں انسان کا ضمیر جو کردار ادا کرتا ہے، اس کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ امام حسینؑ ''...... کے اس عمل کو شیعہ مصنفین نے ایسی قربانی سے تعبیر کیا ہے جس کے ذریعے ملت اسلامی میں محمدؐ کے پیدا کردہ اس ماحول اور تصور کو جسے بنوامیہ کے دنیاپرستی میں ڈوب جانے کی وجہ سے، خطرہ لاحق ہوگیا تھا، مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر ایک بار پھر متحرک کردیا جائے''۔[۲]

۱- دی مارٹرڈم آف کربلا، ترجمہ محمد اقبال صدیقی، نور پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ہندوستان ۱۹۸۵ء، ص ۶۱

۲- موجان مومن، این انٹروڈکشن ٹو شیعی اسلام، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۵ء، ص ۶۳

خود حکمرانوں کے طرزِ عمل کو بھی سمجھنا ضروری ہے کیونکہ وہی اپنے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ عام آدمی عام طور پر اپنے حکمرانوں کی منشاء اور احکامات سے متاثر ہوتا ہے۔ کربلا نے اپنی شہادتوں کے ذریعہ نیک و بد، فیض رسانی اور لاپرواہی، اسلامی معاملات کی پابندی اور اس کی متضاد صورت کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا۔

''...... اس میں شک نہیں کہ یزید کے بعد بھی بادشاہت باقی رہی اور یزید کے بعد مقرر ہونے والے بادشاہوں کے کردار، رویّے اور ذاتی زندگی کے کاروبار یزید سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن حسینؑ کی اس قربانی کے نتیجے میں سب سے بڑا فرق سوچ اور انداز فکر میں آیا کہ اس نے اسلامی اصول و معیار اور حکمرانوں کے ذاتی کردار دونوں کے درمیان ایک واضح حدِ فاصل اور خط امتیاز کھینچ دیا''۔[۱]

ہماری روز مرہ کی زندگی میں پانی، جو مسلم معاشرے میں ''کربلا کی پیاس کی علامت بن گیا'' کہیں بھی مانگا جاسکتا ہے اور بلا تفریق سن و سال، کوئی بھی کسی دوسرے شخص کو پیش کر سکتا ہے۔ اس طرح کوئی بزرگ کسی چھوٹے کو پانی دینے اور اسی طرح کسی سے اسے مانگنے پر کوئی رکاوٹ یا ہتک محسوس نہیں کرتا۔ عام جگہوں اور عام راستوں پر کربلا کے شہیدوں کی یاد میں سبیلیں لگائی جاتی ہیں، جو تین دن کی بھوک پیاس میں بے دردی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ اسی طرح بھوکوں اور ضرورت مند بچوں خصوصاً یتیموں اور عورتوں کو کربلا کے شہیدوں کی یاد میں، امداد پہنچائی جاتی ہے۔ انجیل میں بھی شہیدوں کے بارے میں اس طرح کہا گیا ہے: ''بابرکت ہیں وہ لوگ جو نیکیوں کی وجہ سے بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں، کیونکہ انہیں [اجر سے] مالا مال کیا جائے گا''۔[۲]

محرم اور غم کے دوسرے مواقع پر فراخ دلی سے تبرک تقسیم ہوتا ہے جس سے غریبوں اور مفلسوں سمیت بہت سے لوگوں کو کھانے کا سامان ملتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا معاشی عمل ہے جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو آمدنی کے ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح محرم کے مہینہ اور اس سے پہلے اور بعد لاکھوں تعزیوں اور ضریحوں کی تیاری کے سلسلے میں بہت بڑی تعداد میں کاریگروں کو روزی روٹی ملتی ہے۔ اس کے لیے خام مال فراہم کرنے والوں کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ماہر فن قسم کے کاریگروں کو اپنے فن کے مظاہرے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ان فنکاروں اور ان کے آباء و

۱- ایس۔ایم۔ایچ۔جعفری، اوریجنس اینڈ ارلی ڈولپمنٹ آف شیعہ اسلام، لانگ مین، لندن اور نیویارک ۱۹۷۹، ص ۲۹۳

۲- سینٹ میتھیوز [St. Mathewss] ۶ : ۲

اجداد کی سرپرستی ہندوستان کے راجے رجواڑے اور رؤساء ایک عرصے سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ موم کی ضریح جو لکھنؤ کے چھوٹے امام باڑے میں رکھی ہوئی ہے، جسے اودھ کے حکمراں، محمد علی شاہ نے اولاً بنوایا تھا وہ خود بہترین شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے۔[1]

اسی طرح طغروں کی تیاری (جس میں خوبصورت آرائشی کھدائی اور نقش کا کام ہوتا ہے) جن میں کربلا کو مختلف جہت سے اور قرآنی آیات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں، جو لوہے اور چاندی دونوں سے بنائی جاتی ہیں، اور جنہیں منّت کے طور پر پہنایا جاتا ہے، کربلا کے ان مظلوموں کی یاد دلاتی ہیں جو قید کیے گئے تھے، خصوصاً بیمار کربلا علی ابن الحسینؑ کی، علم اور اس کے پٹکے (زری، کامدانی یا کلابتو کے کام سے سجایا ہوا کپڑا جو علم میں لٹکایا جاتا ہے) اور پھریرے (جو علم کی چھڑ یا بانس میں اس کے اوپری سرے سے لپیٹے جاتے ہیں) یہ سب چیزیں مختلف قسم کی دستکاری کے نمونے ہوتے ہیں۔ اسی طرح المیۂ کربلا بیان کرنے کے لیے (ذاکروں کے) منبر، لکڑی پر کام کی فنکاری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

''کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی قربانیوں نے نہ صرف مسلم دنیا پر گہرا اثر چھوڑا بلکہ بنی نوع انسان کے ان تمام گروہوں پر بھی جو حق مطلق اور اعمال صالحہ سے محبت کرتے ہیں''۔[2]

''کربلا کے سانحہ کو سن کر افغانستان کے بدھ مذہب والوں نے دہشت گردی اور ظلم و جور کے خلاف احتجاج کیا اور حسینؑ کی یاد میں جھنڈے پھیرائے۔ عراق میں رہنے والے بہت سے ہندوستانی نژاد لوگ سدھ بھوگ دتا کی رہنمائی میں (جنہیں عام طور پر حسینی برہمنوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) امیر مختار ثقفی کے ساتھ خون حسینؑ کی انتقامی مہم میں میں شریک ہوئے۔ ...... سندھ کے ہندو

۱- مزید تحقیق اور حوالے کے لیے مصدقہ مواد جمع کیا جانا چاہئے۔

۲- جنوبی ہندوستان میں ایک قبیلہ 'پاروی' پرندوں کے شکار اور جنگلی پھلوں کی فروخت پر زندگی گزارتا ہے۔ ان کے قبائلی گیتوں میں کربلا اور محرم اس طرح شامل ہوگئے ہیں:

چھوٹا بھائی: آؤ بڑے بھائی! ہم چڑیاں پکڑیں، اس بار میں پکڑوں گا...... بہت سے طوطے اور فاختائیں، مینا، جو لااوبالی لڑکیوں کی طرح پھدکتی پھرتی ہیں۔

بڑا بھائی: نہیں پیارے بھائی، نہیں! ہم شکار کے لیے نہیں جاسکتے۔ تم جانتے ہو کہ یہ محرم کا مہینہ ہے۔

چھوٹا بھائی: محرم کا مہینہ! محرم آگیا؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں کفن کی طرح کالا کپڑا پہنوں گا، علم بنانے کے لیے کھجور کا ایک لمبا سا پتا تلاش کروں گا، اور غم [و ماتم] میں چھاتی پیٹوں گا۔

ذیشان حیدر، پتا پتا، بوٹا بوٹا، الجواد، ج ۱۳، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۹۵، ص ۲۷

راجا داہر کا حسینؑ کی اولاد میں سے دو معصوم بچوں کی جان بچانے کی کوشش میں اپنی زندگی اور حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے باوجود مثالی جذبۂ فداکاری کو دنیا میں حق و انصاف سے محبت کرنے والوں کی تاریخ میں سنہرے لفظوں سے لکھا جانا چاہئے۔" صدیوں سے محرم ایک مشترکہ کلچرل کا حصّہ بن چکا ہے۔ امام حسینؑ کے بہت سے ہندو معتقد تھے۔ ہندوستان کے سابق رجواڑوں میں جے پور، گوالیار اور دوسری متعدد جگہوں پر ہندو عظیم الشان تعزیہ رکھتے تھے......"۔ [۱] (السٹریٹیڈ ویکلی، [انگریزی] ہندوستان، ۱۴ دسمبر ۱۹۶۰)

ہمیں جو امام حسینؑ کے معتقد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں خود کو اس اعتماد کے لائق بنانا چاہیے، جس کا ہم سے تقاضہ ہے۔ ہمیں امام کے اس استغاثے "هل من ناصر ينصرنا" اور "هل من مغيث يغيثنا" (کوئی ہے جو میری مدد کو آئے، کوئی ہے جو میری محافظت کو آئے؟) کا اپنے عمل سے خاطر خواہ جواب دینا چاہئے۔

ہم پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ:

کوئی پیاسا نہ رہے
کوئی بھوکا نہ رہے
کہیں کوئی ظلم نہ ہو
کہیں کوئی جبر و زیادتی نہ ہو
کسی کمزور کی اپنی بیچارگی پر آہ نہ نکلے
کسی کو اذیت نہ دی جائے
کسی کی حق تلفی نہ ہو
طاقتور کمزوروں کے حقوق کو پامال نہ کریں
بچوں اور عورتوں سمیت کسی کے ساتھ نا انصافی نہ ہو۔
کسی کے معصوم رخساروں پر آنسو نہ بہیں

ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسے سماجی و معاشی نظام کو قائم کرنے اور اسے قائم و

۱۔ ایس۔این بیاہوت: حسین، دی سمبل آف ٹروتھ اینڈ ورچو، یادگاری مجلہ، حضرت امام حسین: چودھویں صدی تقریبات، پٹنہ، ہندوستان ۱۹۸۴، ص ۵۳ سے ماخوذ: ترجمہ انگریزی مضمون Socio-economic Impact of Karbala

دائم رکھنے کی کوشش کرے، جو ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے استحصال سے پاک ہو۔ ایسے انسان دوست نظام کی موجودگی ایک ایسے سماج کی بقا کی ضامن ہوگی جو امن و انصاف سے پُر ہوگا، جس میں ہر فرد مکمل آزادی کے ساتھ سانس لے سکے گا اور جس میں ہر فرد پورے اعتماد و یقین کے ساتھ سر اٹھا کر چلے گا۔ کربلا نے ہمیں انصاف اور امن سے محبت کرنا سکھایا ہے اور خالق کی مکمل فرمانبرداری کرتے ہوئے زندگی گزارنے کا سبق دیا ہے۔

امام حسینؑ کے مایۂ نازعمل سے واقفیت کو بنی نوع انسان میں عام ہو لینے دیجیے، اسے غنودگی کی کیفیت سے نکل لینے دیجیے تو پھر پوری دنیائے انسانیت اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کا یہ شعر دہرائے گی:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

عزاداریٔ حسینؑ اور خواتین

پروفیسر طلعت عزیز☆

رکھی جاتی ہے بنیادِ عزا صبحِ قیامت تک
کہ زینب شام میں بھی ماتمِ شبیرؑ کرتی ہے

تاریخِ اسلام میں واقعات کربلا کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ عالمِ انسانی کا ہر ذی ہوش فرد حق و باطل کی اس جنگ کی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا ہے۔ اسلام کی بقا کے لئے حضرت فاطمہ زہراؑ بنتِ رسول اللہؐ کے چھوٹے صاحبزادے حسینؑ نے میدانِ کربلا میں ہر انسانی رشتہ کی قربانی دے کر ثابت کردیا کہ اسلام کی راہ میں قربانی کے لئے کسی رشتہ، جنس یا عمر کی قید نہیں ہوتی، بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے دوست و احباب سب نے اس جنگ میں حسینؑ کا ساتھ دیا اور شہید ہوئے۔ کربلا کی زمین پر دس محرم کو شہید ہونے والوں میں پیرو جواں، نوجوانوں اور کمسن بچوں نے حسینؑ کا ساتھ دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ ہر قربانی کے بعد خود امام حسینؑ نے اپنا سر نچھاور کرکے اسلام کو سر بلند کیا۔

سر کٹے، کنبہ مرے، سب کچھ لٹے
دامنِ احمد نہ ہاتھوں سے چھٹے

۱۰ رمحرم کی اس خونیں شام کو کربلا کی سرزمین پر بکھرے سر بُریدہ بے کفن لاشوں پر ماتم کرنے والا کوئی نہ تھا سوائے چند عورتوں اور بچوں کے جو حسینؑ کے صاحبزادے زین العابدین کی امامت کے سائے میں گریہ کناں قید ہوکر شام لے جائے گئے۔ تمام راستے حضرت زینب اپنے بھائی اور فاطمہ بنت حسین اپنے باپ اور شہیدوں کا ماتم کرتی رہیں۔ قید خانے میں بھی اہلِ خانہ شہیدوں کا نوحہ اور ماتم کرتے رہے۔ قید خانے سے رہائی نصیب ہونے پر حضرت زینب کی فرمائش صرف یہی تھی کہ ہمیں ایک مکان فراہم کیا جائے جہاں ہم اپنے شہیدوں کا ماتم کرسکیں۔

شہدائے کربلا کے ماتم کے لئے پہلی مجلس عزا حضرت زینب نے ایک مکان 'دارالجارۂ' میں برپا کی جہاں قریش اور ہاشمی خاندان کی عورتوں نے حضرت زینب، حضرت کلثوم اور دیگر خواتین کو امام

☆ فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

حسینؑ اور ان کے ساتھ شہید ہونے والوں کا پُرسہ دیا۔ یہ پہلی باقاعدہ مجلس جو بلا شبہ ایک زنانی مجلس تھی دمشق میں تین دن تک جاری رہی۔ ۲۰ر صفر ۶۲ ھ کو قافلہ جب وارد کربلا ہوا تو اسی دن سیدانیوں نے صفِ ماتم بچھائی اور شہدائے کربلا کے چہلم کی مجلس بپا کی۔

مدینے میں داخلے کے بعد امام زین العابدینؑ نے ایک مجلس کی جس میں مدینہ کے مردوں نے شرکت کر کے امام کو حسینؑ اور ان کے رفقاء کا پُرسہ دیا۔ یہ پہلی مردانی مجلس تھی۔ ان ابتدائی مجالس کے بعد سال بہ سال قربانی حسینؑ کی یاد تازہ کرنے کے لئے ماہِ محرم میں مجالس کے ذریعہ نوحہ اور ماتم کی روایت شروع ہوئی۔

ہندوستان میں عزاداری کی روایت صوفیا کے ذریعہ بارھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ صوفیا نے ۱۰ محرم کو یومِ غم مقرر کیا اور عزاوری کی روایت قائم کی۔ وہ مقام جہاں عزاداری کا اہتمام کیا جاتا ہے امام باڑہ کہلاتا ہے۔ صوفیا کے ذریعہ شروع کی گئی عزاداری رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ ابتدا مجالس میں صرف مرد حضرات ہی شریک ہوتے تھے۔ انتظام بھی وہی کرتے تھے، رفتہ رفتہ ان مجالس میں عورتوں نے بھی شریک ہونا شروع کیا۔ یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ زنانی مجالس کا باقاعدہ سلسلہ کب شروع ہوا۔ شمالی ہندوستان میں زنانی مجالس کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملتا ہے۔

عورتوں میں قائم مجالس نہ صرف واقعاتِ کربلا کی یاد تازہ کرتی ہیں اور ام الائمہ طاہرین بی بی فاطمہ سلام اللہ علیہا کو پرسہ دینے کا ایک ذریعہ ہیں بلکہ یہ دینی تعلیم کا بھی ایک اہم ذریعہ ہیں۔ مجلس کی ابتدا سوزخوانی سے ہوتی ہے جس کے بعد مرثیہ خواں شہدائے کربلا کا مرثیہ پڑھتے ہیں جو خالصاً واقعاتِ کربلا اور اس سے وابستہ جذبات و تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجلس کا دوسرا حصہ جسے عرفِ عام میں 'حدیث' کہا جاتا ہے جس میں فضائل و مصائب اہل بیت بیان کیے جاتے ہیں۔ فضائل میں قرآنی آیات، اقوال و اعمال آئمہ طاہرین کے حوالے سے اسلامی طرزِ زندگی پر گفتگو ہوتی ہے۔ اسی گفتگو سے گزرتے ہوئے حدیث خواں روزِ عاشور کے مصائب پر آجاتی ہیں۔ مصائب اہل بیت اور شہادت کے بعد حدیث تمام ہوتی ہے۔ اس کے بعد نوحہ خوانی اور زیارت کا سلسلہ چلتا ہے۔ زیارت کے بعد مجلس تمام ہوتی ہے۔

تعلیمی اعتبار سے، خاص طور پر عورتوں کے لئے حدیث کا پہلا حصہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اس حصہ میں ہر دور کے مسائل کے حل تلاش کر لیے جاتے ہیں۔ اس میں راہِ مستقیم کی ہدایت بھی ہوتی ہے۔

رسول اللہ اور آئمہ طاہرین کے حالات زندگی سے نئی نسل کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ عزاداری دینی تعلیم کا بھی ذریعہ ہوتی ہے جو کسی مدرسہ، اسکول یا کالج میں حاصل نہیں ہوتی۔ مسلمان عورتوں میں رسمی تعلیم کی کمی کے باوجود دینی معلومات، ان مجالس کی بدولت حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی بچیوں کے کانوں میں واقعات کربلا کے توصل سے صبر و قناعت، ایثار، قربانی، ثابت قدمی، حق گوئی دوسروں کے ساتھ نرم رویہ وغیرہ کی روشن مثالیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ کردار زینب وکلثوم انکے لئے مشعلِ راہ ہوتی ہیں۔ مصائب سکینہ سے وہ صبر کا سبق لیتی ہیں۔ ان مجالس سے وہ خواتین زیادہ بہرہ ور ہوتی ہیں جن کی زندگی گھر کی چہار دیواری میں مسائل سے جوجھتی ہوئی گزرتی ہے۔ رسمی تعلیم کا فقدان ان کے مسائل میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ خواتین صرف عزاداری حسینؑ، ذکرِ حسینؑ ذکرِ واقعات کربلا اور اماموں کے اقوال و اعمال کا ذکر سن کر ہی اتنا علم حاصل کر لیتی ہیں جو ان کی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ واقعات کا تسلسل، جذبات کی عکاسی جن الفاظ کے ذریعہ ادا کی جاتی ہے وہ خود بخود ان کے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرتی ہے۔

ایسی خواتین کی مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں جنھوں نے رسمی تعلیم کے بغیر ہی نوحے اور مرثیے تصنیف کیے ہیں۔ تقریباً پچاس سال قبل مظفر نگر کی بی بی سردار فاطمہ (مرحومہ) کے قلمبند کئے مرثیہ کا ایک بند بطور نمونہ پیش ہے جو ان کی علمی سمجھ کا مظہر ہے۔

جس کا پسر مرا ہو اسی ماں سے پوچھئے ۔۔۔ بانو سے اور شاہِ شہیداں سے پوچھئے
پرسہ کو کون آیا، بیاباں سے پوچھئے ۔۔۔ گر ہو غلط، تو صاحبِ ایماں سے پوچھئے
آنسو رواں ہیں احمد ثانی کے واسطے
روتی تھی موت، جس کی جوانی کے واسطے

ایک دوسرا بند ملاحظہ ہو:

جب ہوگئے فرش پہ شبیہہ نبی سوار ۔۔۔ چہرے پہ رعب داب سے وہ آ گیا نکھار
ہو چودھویں کا چاند کبھی جیسے آشکار ۔۔۔ دی ہاتھ میں جو شاہ نے شمشیرِ آبدار
جوشِ جلال میں وہ جری جھومنے لگا
تھرا گئی زمیں فلک گھومنے لگا

آج کل زنانی مجالس کا اہتمام ہر چھوٹے بڑے شہر، قصبہ، دیہات وغیرہ میں ہوتا ہے۔ بقرعید کے مہینہ سے ہی فضا سوگوار ہونے لگتی ہے اور محرم کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ عزاداری کی تیاری امام باڑوں

کی صفائی، رنگ و روغن وغیرہ کے ساتھ ہی عَلَم، تعزیے، ضریح اور تابوت وغیرہ کی از سرنو تیاری ہوتی ہے۔ مرثیہ اور نوحوں کے بستے نکل آتے ہیں۔ ہر جگہ عزاداری کے اپنے مخصوص قواعدو رسومات اور پابندیاں ہوتی ہیں۔منّتی دسترخواں،منّتی عَلَم شربت اور چائے کی سبیل سقائے سکینہ کے نام پر بچوں کا منّتی سقّہ بننا، حضرت قاسم کی مہندی، تابوت جلوس عزا کے اہم جُز ہیں۔ جوعورتیں اپنے گھروں یا امام باڑوں میں باقاعدہ مجالس کا اہتمام نہیں کرپاتیں وہ بھی چاند رات کو اپنے گھر کے ایک کمرے، کونے یا الماری میں عَلَم سجاکر دس دن تک بعد مغرب نوحہ خوانی کرتیں ہیں۔ جس میں گھر کی عورتیں یا چند پڑوس کی عورتیں شامل ہوجاتی ہیں۔لکھنؤ میں یہ رواج عام ہے لیکن دوسری جگہوں پر ہر گھر میں ماتم نہیں ہوتا۔

جامعہ نگر میں مجلسوں کا سلسلہ صالحہ عابد حسین نے ۱۹۳۵ یا ۱۹۳۷ سے شروع کیا صالحہ عابد حسین خواجہ غلام السیدین کی بہن اور ڈاکٹر عابد حسین کی زوجہ تھیں۔محرم کی پہلی تاریخ سے ۱۰ محرم تک انہوں نے اپنے گھر پر مجلس عزا کی شروعات کی جس میں گھر کے مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے سوزوسلام کے بعد میر انیس کے مرثیے پڑھے جاتے اس کے بعد نوحے پڑھے جاتے۔ ان کے گھر ہونے والی مجالس میں ماتم نہیں ہوتا تھا اوراس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ جامعہ جو اس وقت ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں چند گھرانے ہی تھے ان کی عورتیں بھی مجلس میں شریک ہوسکیں جامعہ کی آبادی بڑھتی گئی لیکن ان کی مجلسوں کا انداز وہی رہا۔ جب عورتوں کی تعداد بڑھی تو یہ مجالس صرف زنانی مجالس ہوگئیں۔ ان کی مجالس کی دوسری خاص بات یہ تھی کہ خواتینِ کربلا، حضرت زینب، حضرت کلثوم، حضرت رباب، حضرت سکینہ کے حالاتِ زندگی پر تفصیلی ذکر ہوتا، عورتوں کی اہمیت اور ان کی ذمہ داریوں کا ذکر ہوتا۔ اسلام نے عورت کی جو تصویر پیش کی ہے وہ عملی طور پر خواتینِ کربلا میں نظر آتی ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا جو ایک عام عورت کے لئے مشعلِ راہ بن جائے۔ان کی وفات کے بعد ان مجالس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ جامعہ نگر میں ہی دوسری زنانی مجالس سید کاظم حسین زیدی مرحوم کے گھر ۱۹۵۱ء میں شروع ہوئیں۔ ان کے گھر زنانی اور مردانی دونوں مجالس علٰحیدہ وقفہ میں شروع ہوئیں۔ زنانی مجلس تین بجے دوپہر اور مردانی مجلس ۸ بجے رات میں شروع ہوتی ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد جامعہ کے آس پاس کی زمینوں پر تیزی سے بستیاں بسنی شروع ہوئیں۔ نور نگر سینئر سیکنڈری اسکول کے برابر ہی ۱۹۹۲ء میں 'باب العلم سوسائٹی' نے ایک مسجد تعمیر کی جس کے بیسمنٹ میں مجالس کا سلسلہ شروع ہوا۔ شروع میں یہاں صرف مردانی مجالس ہوتی تھیں لیکن چونکہ بڑھتی ہوئی آبادی میں عورتیں بھی شامل ہیں لہٰذا ۱۹۹۷ء سے اس امام باڑے میں زنانی مجالس کی

شروعات ہوئی۔ پہلی محرم سے ۱۰ محرم تک مجالس کا انتظام محلّہ کی ہی چند عورتیں مالی تعاون پیش کر کے کرتی ہیں۔ اس کے بعد ربیع الاول تک یہاں مجالس کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ جو انفرادی مجالس ہوتی ہیں۔ ان دو امام باڑوں کے علاوہ ایک تیسرا امام باڑہ سعیدہ سیدین صاحبہ جو غلام السیدین صاحب مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ اپنے گھر، پہلی محرم کو سجاتی ہیں۔ دس محرم تک ان کے گھر پر بعد مغرب زنانی مجلس ہوتی ہے۔ دس محرم کے بعد دس دس دن کے لئے مجالس کا سلسلہ جامعہ نگر کے آس پاس کی بستیوں میں چلتا رہتا ہے۔ ان مجالس کا اہتمام خواتین اپنے گھروں پر ہی کرتی ہیں۔

شمالی ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے مختلف شہروں، ضلعوں، تحصیلوں، دیہاتوں میں عزاداری کا اہتمام بہت جوش و خروش سے کیا جاتا ہے۔ جتنی بڑی آبادی اور جتنی سہولیات فراہم ہوتی ہیں اسی حساب سے عزاداری بھی ہوتی ہے۔ ضلع بجنور کی تحصیل نجیب آباد میں ایک چھوٹی سی سادات کی بستی، میمن سادات ہے۔ یہ بستی علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے اور اس بستی کے لوگ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، سرجن، سائنٹسٹ، ادیب، شاعر، سب ہی اس بستی نے دیئے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے میمن سادات میں سادات کے کُل سات خاندان تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد زیادہ تر لوگ پاکستان چلے گئے ان میں سے دو خاندانوں کے عزا خانے آج بھی موجود ہیں جن میں صرف زنانی مجالس ہی ہوتی ہیں۔ ایک خاندان، 'حکیموں والوں کا خاندان کہلاتا ہے۔ جس سے میرا تعلق ہے دوسرا خاندان، حاطہ والوں، کا خاندان کہلاتا ہے۔ میرے پَر دادا سید آغا حسنؒ کی والدہ سیدہ راضیہ بیگم بنتِ سید عنایت حسین نے اپنی ایک منت پوری ہونے پر زنانی مجالس کی شروعات ۱۹۰۹ء میں کی تھی۔ امام باڑہ جو کوٹھی کہلاتا ہے، اس کی تعمیر سید آغا حسن نے کروائی تھی اور مجالس کے اہتمام کے لیے دو باغ لگوائے تھے جن کی آمدنی سے مجالس کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اس امام باڑے میں مجالس کا اہتمام میری والدہ سیدہ ذاکیہ بیگم کرتی ہیں۔ یہاں محرم کی چاند رات کو نوحہ خوانی کے ساتھ عزاداری شروع ہوتی ہے۔ تاریخی نوحہ ''پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے'' پڑھا جاتا ہے جسے میں اپنے بچپن سے سُن رہی ہوں۔ مجلس صبح نو اور دس بجے کے درمیان شروع ہوتی ہے جو ایک بجے کے قریب ختم ہوتی ہے۔ پہلی محرم کو مرثیہ ''محرم آیا ہے محبوِ رسول روتے ہیں، کربلا میں'' ہوتا ہے۔ دوسری محرم کو بی بی فاطمہ کی شہادت، تیسری محرم کو حضرت علی کا حال چوتھی محرم کو حضرت مسلم کی شہادت، پانچویں محرم کو حضرت مسلم کے بیٹوں کی شہادت اور چھٹی محرم کو حضرت عون و محمد کی

شہادت پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد منتیں دستر خوان اور نذر ہوتی ہے۔ ساتویں محرم کو حضرت قاسم کی شہادت پڑھی جاتی ہے اور رات کو مہندی اٹھتی ہے۔ آٹھ محرم کو حضرت عباس کی شہادت پڑھی جاتی ہے۔ بچے ملتی سقہ بنتے ہیں سبیل اور نذر ہوتی ہے۔ آٹھ محرم کو جلوس و ذوالجناح نکلتا ہے جو حضرت عباس کی شہادت سے متعلق ہوتا ہے۔ نویں محرم کو حضرت علی اکبر کی شہادت پڑھی جاتی ہے دس محرم کو امام حسین کی شہادت صبح کی مجلس میں پڑھی جاتی ہے۔ جو بہت مختصر ہوتی ہے۔ اس کے بعد علم اور تعزیے جلوس میں شرکت کے لئے جاتے جلوس پوری بستی کا گشت کرتے ہوئے کربلا پہنچتا ہے۔ روزِ عاشورہ شام کو شامِ غریباں کی مجلس ہوتی ہے۔

میمن سادات کا دوسرا امام باڑہ 'حاطہ' کہلاتا ہے۔ جہاں مجالس کا سلسلہ ۱۹۰۱ء میں شروع ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں نجیب آباد کے ایک مومن نے تعزیے کی شکل کا چوکور امام باڑہ بنوایا جو 'بنگلہ' کہلاتا ہے۔ یہاں زنانی مجالس شام ۴ بجے سے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی تاریخی مرثیے اسی انداز میں پڑھے جاتے ہیں جو کوٹھی میں پڑھے جاتے ہیں۔

میمن کی زنانی مجالس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعد مغرب کوٹھی میں صرف لڑکیوں کی مجلس ہوتی ہے۔ جس میں ہر عمر کی غیر شادی شدہ لڑکیاں شریک ہوتی ہیں۔ یہاں مرثیہ اور حدیث روز نہیں ہوتی بلکہ خاص خاص تاریخوں میں ہوتی ہیں البتہ نوحہ خوانی روز ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی ایک انجمن 'سوگوارِ سکینہ' کے نام سے ہے جو 'جوگی پورہ' کی مجالس میں اپنا الگ جلوس نکالتی ہیں۔ اور آگ کا ماتم کرتی ہیں۔ درگاہ جوگی پورہ میمن سادات سے ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ لڑکیوں کی انجمن جوگی پورہ اور آس پاس کی بستیوں میں ایامِ عزا کے بعد بھی شریک رہتی ہے۔

عزاداری میں عورتوں کو شمولیت کا ذکر جاری ہے تو اصغر آباد کی بی بی صغرا بیگم کا بھی ذکر کرتی چلوں جو ضلع علی گڑھ میں واقع ہے۔ بی بی صغرا بیگم رئیسہ اصغر آباد نے ۱۹۰۶ء میں عزاداری قائم کی۔ ماہِ محرم کی دس اور ماہِ صفر کی تین مجالس بڑے پیمانے پر کرتی تھیں جس میں باہر سے شرکت کے لئے مومنین آتے، جن کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام ریاست کی طرف سے ہوتا۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے -/12,000 روپے عزاداری کے لئے وقف کئے۔ بعد میں یہ رقم ان کے صاحبزادوں راجہ سید محمود الحسن اور راجہ سید مسعود الحسن میں تقسیم ہوئی جس کی رو سے ہر بیٹا اپنی طرف سے -/6,000 روپے مجالس کے لئے صرف کرے گا۔ ۱۹۵۴ء میں یہ عزاداری علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس وقت تک

علی گڑھ میں صرف دو مردانی مجالس ہی ہوتی تھیں۔محمود منزل میں زنانی مجالس سہ پہر کے وقت ہونا طے پائی۔ ۱۹۳۸ء میں راجہ محمود الحسن کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے سید محمد حسن نے انتظام سنبھالا۔محمد حسن کی بیگم نے جو'رانی دلہن' کہلاتی تھیں علی گڑھ میں زنانی مجالس کی شروعات کی۔ 'رانی دلہن' نہ صرف اپنے امام باڑے کا انتظام دیکھتی تھیں بلکہ دوسرے امام باڑوں میں بھی عزاداری کا سامان ہدیہ کرتی تھیں،علی گڑھ میں پڑھنے والی لڑکیاں جو ہوسٹل میں رہتی تھیں ماہِ محرم میں رانی دلہن کے گھر مجلس میں آتی تھیں۔ عاشورہ کے اعمال اور فاقہ شکنی بھی انھیں کے گھر ہوتی۔ شامِ غریباں کی مجلس واحد رانی دلہن کے امام باڑے میں ہوتی ہے۔مجالس میں شرکت کے لئے آس پاس کی بستیوں سے بھی عورتیں رانی دلہن کے امام باڑے میں آتی ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں رانی دلہن کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادگان اور ان کی شریک حیات مجالس کا انتظام کرتی ہیں۔

علی گڑھ کے قریب ہی قصبہ جلالی ہے جہاں محلہ گڑھی میں بی بی محمدی بیگم بنتِ سید زائر حسین زوجہ سید ہاشم علی نے اپنے مکان میں امام باڑے کی بنا کی اور عشرۂ محرم کی عزاداری کی شروعات کی آپ کی دختر بی بی انتظام فاطمہ نے امام باڑہ بی بی محمدی بیگم کے مصارف کے لئے ۲۰ ستمبر ۱۹۱۹ء میں کچھ آراضی وقف فرمائی اور متولی اپنے نواسے مولوی سید معزالدین حسین کو مقرر کیا۔

امروہہ میں ۲۰ راگست ۱۸۷۰ء میں مسماۃ نظام النساء بنتِ بشارت حسین نے ۱۶۸ بیگھ چار بسوہ خام اراضی زرعی تعزیہ داری اور مجالس عزا کے اخراجات کے لئے وقف کی۔

ذکرِ حسین اور حسینی مشن کو قائم رکھنے اور اس کی تبلیغ میں خواتین اہم کردار نبھا رہی ہیں۔ ان مجالس کے ذریعہ جس میں شرکت کے لئے مذہب اور جماعت کی کوئی قید نہیں ہے، نہ صرف حسینؑ کے پیغام کو دور دور تک پہنچایا جاتا ہے بلکہ عام زندگی میں بھی ہم ان کے کردار سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ عزاداری حسینؑ صرف ایام عزا تک ہی محدود نہیں رہتی۔ خاص طور پر خواتین حسینؑ اور اہلِ بیت حسینؑ کا ماتم پورے سال کسی نہ کسی شکل میں کرتی ہیں۔خواہ وہ ہر ماہ کی پہلی جمعرات، نوچندی، جمعرات ہو کسی کی موت ہو یا شادی، ہر موقع پر بی بی فاطمہ،حسینؑ اور زینب کو یاد کیا جاتا ہے۔ عباس و علی مرتضیٰؑ سے مدد مانگی جاتی ہے۔

دنیا میں انسانیت کا پیغام دینے اور اسلام میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لئے ہر سال ماہِ محرم آتا ہے اور ہم اس کا انتظار کرتے رہیں گے۔

چشتی صوفیاء کی تعلیمات اور عزاداری حسینؑ

ڈاکٹر محمد تعظیم☆

صوفیاء کی اصلی راہ اعمال نفس کا محاسبہ ہے اور ذوق وشوق کی ان وجدانی کیفیات سے گفتگو ہے، جو مجاہدات سے حاصل ہوتی ہیں۔ بقول شیخ علی ہجویری ''تصوف نفسانی لذتوں کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے جس سے بندہ بقا پاتا ہے۔ تصوف نیک خصلت کا نام ہے۔ جو شخص جس قدر بھی اچھے اخلاق رکھتا ہے وہ سب سے بہتر صوفی ہے''۔[۱] امام جعفر صادقؑ کے بقول ''جو شخص اخلاق رسولؐ سے آراستہ ہوجائے اور اس امر کو اختیار کرے جو رسولؐ نے اختیار فرمایا اور رغبت کرے اس طرف جدھر رسولؐ نے فرمائی اور پرہیز کرے اس سے جسے رسولؐ نے چھوڑا تو گویا اس نے صفائے قلب حاصل کیا''۔[۲] اور قرآن کریم کا ارشاد ہے ''خاص بندگان الٰہی وہ ہیں جو زمیں پر جھک کر چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں چھیڑیں تو وہ بجائے جواب کے ان سے کہہ دیتے ہیں کہ اچھا خوش رہو''۔[۳]

دراصل محبت ہی راز حیات ہے اور اس کی آگ اگر دل میں نہ ہو تو وہ گوشت کا ایک بے جان ٹکڑا ہے۔ محبت کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی سمٹ کر ایک نقطہ پر آجائے اور خدا کے لئے جینا مقصد حیات ہو۔ فکر وعمل کی بلندی، راست بازی، خدمت خلق، سچائی اور صبر وشکر جیسی خوبیاں اسی جذبہ کا نتیجہ ہیں، جو دل انسانی میں خدا کی محبت پیدا ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر مطمح نظر یہ ہوجاتا ہے کہ انسان خود اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور دیگر لوگوں کو بھی مادی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف کرے اور یہ کام بقول خلیق احمد نظامی ''صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کا مذہبی وجدان پوری طرح نشوونما پاچکا ہو، جس کی روح پر اسلامی رنگ چڑھ چکا ہو اور جس کی نگاہ حق و باطل میں امتیاز کرنے میں کبھی دھوکہ نہ کھائے''۔[۴] واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے حصول علم کو فرض

☆ لیکچرر تاریخ، جامعہ سینڈری اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۱۔ شیخ علی ہجویری، کشف المحجوب، مترجم مولوی فیروز الدین، لاہور ۲۰۰۳، ص ۴۹ ۲۔ سید محمد عزیز الدین حسین، تاریخ عہد وسطیٰ، دہلی ۲۰۰۴، ص ۲۰۱ ۳۔ القران، سورہ الفرقان، آیت ۶۳ ۴۔ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی ۱۹۸۵ء، ص ۲۳

قرار دیا ہے لیکن علم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مزید محنت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی محنت و ریاضت کے بعد علم کی تفسیر و تعبیر کی مثال ہمیں صوفیاء کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ صوفیاء کے تمام سلسلے حضرت علیؑ کو شیخ طریقت مانتے ہیں۔

مسلمانوں میں تصوف کا رجحان اسی وقت سے شروع ہوگیا تھا جب اسلام ایک منضبط دین کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ مگر جب اسلامی حکومت موروثی ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور مسلم معاشرہ مادّی آسائشوں کا شکار ہوگیا تب تصوّف اس کے خلاف خاموش احتجاج کی شکل میں ایک مسلک کے طور پر اسلام کے دفاع میں سامنے آیا۔

جنگ جمل، جنگ صفین، جنگ نہروان اور بعدۂ حادثہ کربلا نے اسلامی نظام اور معاشرے کا نہ صرف شیرازہ بکھیر دیا بلکہ حکومت اور معاشرے میں ایک ناقابل عبور خلیج بھی پیدا کردی جس کو پاٹنے کی اشد ضرورت تھی اور یہ کام صرف صوفیاء ہی کرسکتے تھے کیونکہ اسلام کی ترویج و اشاعت مختلف النوع جغرافیائی معاشروں میں ہورہی تھی۔

حادثہ کربلا جو محرام الحرام کے مہینہ میں پیش آیا، جس میں خانوادۂ رسولؐ کے افراد کو انتہائی بے رحمی و سفاکی کے ساتھ تپتی ریت پر شہید کردیا گیا تھا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کے سنجیدہ و متین افراد کو اس نظام سیاست و ملک گیری سے الگ رہنے پر مجبور کردیا تھا، انھوں نے اس ملوکانہ نظام کے خلاف اپنی جانوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خاموش احتجاج جاری رکھا جس کے خلاف سب سے بلند آواز حضرت امام حسینؑ نے اٹھائی تھی اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ جانوں کی قربانی دے کر اسلامی روح کو زندہ رکھا تھا۔ صوفیاء نے ان کی قربانیوں اور تعلیمات کو زندہ رکھنے کے لیے نہ صرف ان کی اشاعت و ترویج کی بلکہ اس قربانی کو عزاداری کے ذریعہ زندہ رکھا اور لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔

عزاداری امام حسینؑ کی بنیاد قرآن کریم کی آیت: "**قل لااسئلکم علیه اَجراً اِلا الْمَودّة فی القربیٰ**"[۱] (کہہ دیجیے کہ میں تم سے اجر طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میرے قرابت داروں سے مودّت کرو پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ بیتؑ اور اقارب نبی کریمؐ کی محبت و تعظیم اور حقوق شناسی امت پر لازم و واجب ہے اور جزو ایمان ہے۔ ان سے محبت رکھنا حقیقت میں حضورؐ کی محبت پر

۱۔ القرآن، سورہ شوریٰ، آیت ۲۳

مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ائمہ اہلِ بیت، علماء و مشائخ کبار اور اولیاء کے گروہ ابرار نے محرم میں امام حسینؑ کی مظلومانہ اور جگر خراش شہادت کے ذکر اور ان کے مصائب کے بیان کو خلاصۂ اعمال خیر مانا ہے اور اسے برتا بھی ہے۔ شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے۔

گر حب علی و آل بتولت نبود ‏ ‏ ‏ امید شفاعت ز رسولت نبود

در طاعت حق جملہ بجا آوری تو ‏ ‏ ‏ بے مہر علی ہیچ قبولت نبود[1]

کیونکہ بقول شخصے، محرم شمشیر پر خون کی فتح کا مہینہ ہے۔ ''محرم وہ مہینہ ہے جبکہ عدالت ظلم کے سامنے اور حق باطل کے مقابل اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اس نے یہ بات ثابت کردی کہ تاریخ کے پورے دور میں ہمیشہ باطل پر حق کی فتح ہوئی ہے''۔[2] کشف المحجوب میں شیخ علی ہجویری نے صوفیانہ نظر سے صحابہ میں خلفاء راشدین کے بعد اہل بیت میں حضرت امام حسنؑ، امام حسینؑ، امام زین العابدینؑ، امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے احوال و اقوال و مناقب صوفیا کے امام کے بطور ذکر کیے ہیں۔ آپ امام حسینؑ کے ضمن میں رقمطراز ہیں: ''آپ (امام حسینؑ) محقق اولیاء میں سے اور اہلِ صفائے باطن کے قبلہ، کربلا کے شہید اور اہل طریقت آپ کے حال و سیرت کی درستی پر متفق ہیں۔ اس لیے کہ جب تک حق ظاہر تھا آپ حق کے تابع رہے اور امر حق مغلوب ہو کر گم ہونے لگا تو آپ نے تلوار سونت لی اور جب تک اپنی جان عزیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان نہ کردی آرام نہ کیا۔ رسول اسلامؐ کی بہت سی علامات آپ میں موجود تھیں جن میں آپ مخصوص تھے''۔[3] سیر اولاولیاء میں امیر خسرو مناقب حسینؑ کا ذکر یوں کرتے ہیں ''صلوٰۃ و سلام ہو امیر المومنین حضرت حسین بن علی بن ابی طالب پر کہ وہ آل محمدؐ کی شمع ہیں۔ تمام علائق سے چھٹکارا حاصل کیے ہوئے اور دشت کربلا کے شہید ہیں اور عالم ولا کے بادشاہ ہیں۔ وہ حق کے تابع تھے، جب تک حق ظاہر تھا لیکن جب حق پوشیدہ ہوگیا تو آپ نے تلوار کھینچی۔ یہاں تک کہ جب تک جان عزیز حق تعالیٰ کی راہ میں فدا نہ کردی، آپ چین سے نہیں بیٹھے''۔ آپ کے ارشادات میں ہے'' میں ڈراتا ہوں بھائیو! اپنے دین کو لازم پکڑو'' اس کے بعد وہ حکیم سنائی کا مدح حسینؑ میں لکھا قصیدہ نقل کرتے ہیں۔[4] اہلِ تصوف امام حسینؑ کی ولا میں پوری طرح سرشار ہیں۔ صوفیاء نے کبھی اپنے آپ کو کسی فرقہ مخصوص سے وابستہ نہیں کیا۔ کسی صوفی کے

۱- تاریخ عہدِ وسطیٰ ص ۲۰۱ ‏ ‏ ۲- حسن عباس فطرت، گرزنامہ آفتاب، پونہ ۲۰۰۰ء، ص ۶۷-۶۹

۳- کشف المحجوب، ص ۷۵-۶۹ ‏ ‏ ۴- امیر خسرو، سیر الاولیاء مترجم اعجاز الحق قدسی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۸۴-۸۲

ملفوظات میں یہ نہیں ملتا کہ ان کا تعلق کسی خاص فرقہ سے تھا۔ وہ اصولی طور پر فرقہ واریت کے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی خانقاہیں اسلامی اتحاد کا بڑا قوی و مستحکم حصار تھیں جہاں باہمی اخوت اور ہمدردی کی پائیدار بنیادیں قائم ہوئی تھیں۔[۱]

علماء اسلام کا تعلق قرآن و حدیث، منطق اور شریعت و فقہ کی تعلیم و ترویج و اشاعت کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ان کا رابطہ صرف مسلم معاشرہ کے ساتھ ہی سابقہ پڑتا تھا اور وہ عام اہلِ ہند سے رابطہ نہ رکھتے تھے، لیکن صوفیا چونکہ مبلغین اسلام تھے نیز انھیں کسی کی تکفیر و تفسیق سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے وہ کسی کو برا نہ کہتے بلکہ سب اہل عالم کو بلا امتیاز مذہب و ملت خدا کا کنبہ سمجھتے تھے اور باہم اختلافات کو بڑھاوا دینے کی بجائے مشترک مالوفات کی تلاش میں رہتے تھے۔ سب کو عرفانِ الٰہی کی تعلیم دینے کے واسطے ان کے دروازے ہر کس و ناکس کے لئے کھلے تھے۔ ان کے یہاں اونچ نیچ اور چھوا چھوت کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ امن و آشتی اور مساوات انسانی کی تلقین کر کے اسلام کے اساسی اصولوں کو تقویت پہنچاتے تھے، ان کی مقدس زندگیوں کے اثر سے عوام کو اسلام کی طرف کشش و رغبت پیدا ہوتی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر صوفیاء ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ ان صوفیاء کو ذاتی اغراض سے کوئی سروکار نہ تھا اس لیے عموماً امراء و ملوک بھی ان کی عزت و توقیر کرتے تھے اور ان کے لنگروں کے مصارف کے لیے اکثر روپیہ پیسے بھی دیتے تھے۔[۲]

بقول پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہندوستان میں عزاداری حسینؑ کی روایت ۱۳ ویں صدی عیسوی سے ملتی ہے۔ اس کے قیام میں بعض صوفیاء کرام کا ہاتھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ سے صوفیاء نے ہندوستان میں خانقاہیں تو قائم ہی کیں مگر بعض صوفیا نے امام باڑے بھی تعمیر کیے۔ مندر اور مسجد دونوں کے دروازے دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے لیے بند تھے، اس کے برعکس خانقاہ اور امام باڑے کا مزاج ان سے مختلف تھا اور ان کے دروازے دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے کھلے ہوتے تھے۔ اور وہ مزاج آج تک قائم ہے۔[۳]

ہندوستان میں مشائخ چشت کو اہل بیت سے عقیدت و احترام تھا، اس کا اندازہ خواجہ معین الدین چشتی کی اس رباعی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسینؑ   دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ

۱- تاریخ عہد وسطیٰ، ص ۲۰۲   ۲- عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، لاہور ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۶   ۳- تاریخ عہد وسطیٰ، ص ۲۰۰

سرداد نداد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لاالہٰ است حسینؑ

اور خواجہ بختیار کاکی کی خانقاہ میں امام باڑے کی موجودگی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مشائخ چشت اہلِ بیت اطہار سے کس قدر جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔ دیوان شیخ جمال الدین ہانسوی میں موجود امام حسینؑ کی عزاداری میں لکھے مراثی پڑھے جاتے تھے۔ ایام عاشور میں مجالس کا انعقاد ہوا کرتا تھا اور ''مقتل حسینؑ'' نامی کتاب کی ان ایام میں زبردست مانگ تھی۔ ایک دفعہ امیر خسرو نے اپنے ایک دوست کو ماہ محرم میں اس کتاب کا اپنا ذاتی بوسیدہ نسخہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف امیر خسرو ہی نہیں بلکہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں بھی ایام عاشور میں حضرت حسینؑ سے متعلق مواعظ اور مناقب بیان کیے جاتے ہوں گے۔ قاضی منہاج السراج بھی ایام عاشورہ میں مناقب اہلِ بیت بیان کیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حلقۂ ارادت میں میر سید حسین فنگ سوار موجود تھے، جو شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے جن کا مزار آج بھی اجمیر کے قریب تاراگڑھ میں مرجع خلائق ہے۔ خواجہ معین الدین کی دوسری شادی ان ہی کے خاندان میں ہوئی تھی۔ میر سید حسین خنگ سوار اکثر خواجہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور محرمانہ صحبتیں برپا ہوتی تھیں۔[2] اگر مشائخ چشت کی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مشائخ چشت کا اہل بیت سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

مشائخ چشت کے اصلاحی پروگرام کا مرکزی نقطہ اور محور تعلیم اخلاق تھا۔ وہ اس کو سنت نبوی سمجھتے تھے اور دن رات اس کوشش میں رہتے تھے کہ انسان کے اخلاق ذمیمہ کو دور کر کے اس کی شخصیت کو جلا دی جائے۔ اخلاقی تعلیم کے سلسلہ میں مشائخ چشت کا اصرار خصوصاً اصلاح نیت، استقامت، توکل، عفو، ایثار دیانت داری، عیب جوئی سے پرہیز، تحمل، علم، ترک دنیا، تعمیر شخصیت پر مخصوص تھا۔[3] واقعۂ کربلا کے پس منظر میں اگر ان تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ امام حسینؑ کی زندگی کا مرقع اور ان کی تعلیمات سے مستعار لی ہوئی نظر آئیں گی۔ کیونکہ تمام تر اخلاقی خوبیوں کے مجموعے کا نام امام حسینؑ ہے۔ مشائخ چشت کے نزدیک اچھا کردار، تلوار اور زبان سے زیادہ موثر تھا کیونکہ اس کی مقناطیسی قوت، اعتقاد و عمل میں انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے خود مسلمان بنا

۱- خلیق احمد نظامی، سم آسپیکٹس آف ریلیجن اینڈ پولیٹکس ان انڈیا ڈیورنگ تھرٹینتھ سنچری، علی گڑھ ۱۹۶۱ء، ص ۲۹۸

۲- شیخ محمد اکرام، آب کوثر، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۹　　۳- تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۰۱

ضروری ہے۔ ایسے فرد کی محبت میں جو آئے گا، وہ خود مسلمان ہوجائے گا۔ اس تربیت کے لیے خانقاہ میں عزاداری حسینؑ سے بہتر اور کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ خانقاہ میں آنے والے دبے کچلے، پیشہ ور اور دستکار افراد کے سامنے جنھیں ضیاء الدین برنی کی زبان میں ارذال کہا جاتا تھا، اہلِ کربلا کے فضائل و مصائب بیان کیے جائیں اور انھیں اسلام کا فلسفہ عملی طور پر سمجھایا جائے کیونکہ عزا کے لغوی معنی صبر اور تعزیت ہیں۔ اسی لیے چشتی صوفیاء نے اپنی خانقاہوں میں کھچڑے یا میٹھے چاول کا استعمال بطور تبرک کیا اور یہ صرف اس لئے نہیں کیا کہ ان کی خانقاہوں میں ہندو یا غیر مسلم افراد بھی آتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ اس سے یہاں آنے والے لوگوں میں عزاء کا احساس بھی پیدا ہو۔ صوفیا کی ایسی ہی کاوشوں اور اعمال کے پیش نظر قاضی سید نوراللہ شوشتری نے اپنی تصنیف 'مجالس المومنین' میں تمام صوفیا کا مسلک شیعت قرار دیا ہے۔ کشمیر کے نامور صوفی میر سید علی ہمدانی کا مسلک اسی بنا پر طے کر پانا کافی مشکل امر ہے۔

اگر ہم امام حسینؑ کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے مشائخ چشت کی اصلاحی کاوشوں کو دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ مشائخ چشت اپنے خلفاء و مریدین میں مکارم اخلاق پیدا کرنے کی بڑی کوشش کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے خلفاء و مرید، مہر و محبت، عجز و انکسار، ہمدردی و خلوص کی جیتی جاگتی تصویر ہوں۔ خلیق احمد نظامی کے لفظوں میں مصیبت زدہ غریب اس کی طرف دیکھے تو اس کے دل پر پھایہ سا لگ جائے، بات کرنے لگے تو ایسا محسوس ہو گویا پھولوں پر شبنم کی بارش ہو رہی ہے۔ لیکن اگر کسی جابر کا مقابلہ کرنا پڑے تو عجز و انکسار کا یہی مجسمہ پہاڑوں سے زیادہ مضبوط بن جائے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو خوف زدہ نہ کرسکے۔[۱] ظاہر ہے ایسے مثالی کردار کے نمونے امام حسینؑ اور اہلِ بیت سے بہتر اور کون ہوسکتے تھے۔ لہٰذا ان کے مناقب و فضائل کو نوزائیدہ مسلم سماج کے سامنے بیان کرنا ضروری تھا تا کہ اس سماج کی عملی و روحانی تربیت ممکن ہوسکے۔

واقعتاً صوفیاء اور مشائخ چشت کے اصلاح کے طریقے بڑے نفسیاتی تھے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کو عوام الناس میں نفسیاتی طریقہ سے رواج دینے کی کوشش کی۔ ہندوستانی سماج میں مذہبی میلوں اور رسم و رواج کی ایک طویل روایت ہے جو ہندوستانی خمیر میں رچی بسی ہوئی ہے، لہٰذا صوفیاء نے بھی ان کے رسم و رواج کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ عوام الناس میں تزکیہ نفس کی

۱- تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۰۱

تعلیم ایام عاشورہ میں پیغام حسینؑ ابن علیؑ کے ذریعہ دی اور عوام الناس کو اس بھوک پیاس اور ان اذیتوں کا احساس دلایا جو میدان کربلا میں اہلِ بیت و امام حسینؑ کے احباب پر گزری تھیں۔ یہ صوفیاء اور مشائخ چشت کا ہی کارنامہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان میں دبے کچلے افراد کی تربیت اپنی خانقاہوں میں امام حسینؑ و اہل بیت کے حوالے سے اس زمانے میں کی جب حکومت کا کردار داغدار ہو چکا تھا۔ انھوں نے ان افراد کی تعلیم و تربیت اس طرح کی کہ یہی وہ تربیت یافتہ فراد تھے جو محمد بن تغلق کے عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز نظر آتے ہیں۔ خانقاہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں بلاتفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل کوئی بھی آ سکتا تھا اور فیض حاصل کرسکتا تھا۔ بقول پروفیسر عزیز الدین حسین عزاداری امام حسینؑ کے مرکز کا نام امام باڑہ رکھا گیا، یہ قطعی طور پر ہندوستانی تھا کہ اس سے پہلے ایران اور دوسرے مسلم ممالک میں اس نام کا کوئی ادارہ نہ تھا۔ اس میں امامؑ کے ساتھ ایک ہندی لفظ باڑہ ملاکر امام باڑہ بنایا گیا تاکہ اس سے اس کا ہندوستانی مزاج جھلکے۔ اس کا نام اس زبان میں نہیں رکھا گیا کہ جس میں قرآن نازل ہوا یا جس زبان کو امام حسینؑ بولتے تھے، نہ فارسی نام رکھا گیا جبکہ یہی دو زبانیں مذہب اسلام اور اسلامی ثقافت سے قریب تر تھیں۔ یہ صوفیاء کی فکر کا نفسیاتی پہلو تھا، اگر باہر کے ناموں اور زبان سے ہندوستان میں کوئی مرکز بنایا جائے گا تو اس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں گہری نہ ہوسکیں گی۔ خانقاہوں کی امام باڑوں کے دروازے بھی بلاتفریق مذہب و ملت سب کے لیے کھول دیے گئے یہ ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ صوفیاء عزاداری حسینؑ کے ذریعہ تبلیغ اسلام کر رہے تھے اس لیے کہ موروثی ملوکانہ نظام نے مسلمانوں میں حقیقی مساوات کو ختم کر دیا تھا۔ مساوات صرف مساجد میں دوران نماز ہی محدود ہوکر رہ گئی تھی، جبکہ صوفیاء نے ان خانقاہوں اور امام باڑوں میں لوگوں کو ایک جگہ بٹھا کر مسلمانوں میں تفریق کو ختم کر کے اسلامی مساوات و تعلیمات کی جڑوں کو مضبوط کیا جس کو مسلمانوں کے موروثی ملوکانہ نظام نے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔[2] بقول مولانا ابوالکلام آزاد ''بدعات و محدثات'' بنو امیہ کے مقابلہ میں سرفروشانہ اقدام عزیمت و فتح یاب مقامت و ثبات فی الحق والعدل کا جو ایک مخصوص مقام تھا، وہ بجز امام حسینؑ کے اور کسی کے حصے میں نہ آیا''۔[3] صوفیاء نے اپنے مجلس خانوں میں اہلِ بیت اطہار کے مناقب اور ان کی قربانیوں کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ اپنی زندگی کو عملی طور پر ان کے طرز پر

۱۔ تاریخ عہد وسطی، ص ۲۰۵ ۲۔ ایضاً، ص ۲۱۹ ۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ، مرتبہ مالک رام، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۲

ڈھالا بھی۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ مشائخ چشت نے سلاطین وقت سے عموماً اپنا تعلق جوڑنے سے احتراز کیا۔

سید حسن عسکری رقمطراز ہیں ''احناف، اہلِ سنت اور صوفیائے کرام کو اہل بیت اطہار اور بالخصوص، امام حسینؑ سے بے حد اور سچی عقیدت تھی، حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی مصنف تحفۂ اثنا عشریہ جیسے نقشبندی سلسلہ کے جلیل المرتبت بزرگ کے قلم کو بھی اس موضوع پر جنبش ہوئی اور ''سرالشہادتین'' لکھ کر آپ نے آنسو بہائے اور دوسروں کو بھی غمناک کیا۔[۱]

یہ واقعۂ کربلا کا عالمگیر اثر ہی تھا کہ صوفیاء نے عوام الناس میں شکنجۂ ظلم سے آزادی حاصل کرنے کی اخلاقی قدروں کو پروان چڑھانے نیز دلوں پر حکومت کرنے اور ذلت کی زندگی سے عزت کی موت کو گلے لگا کر سرخ رو ہونے کا جذبہ پیدا کیا، کیونکہ بقول مولانا محمد علی جوہر:

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

۱- سید حسن عسکری، ہندوستان کے عہد وسطیٰ پر مقالات، پٹنہ ۱۹۹۵ء ص ۳۴۸

صنفِ مقاتل

ایک ابتدائی تلاش و مطالعہ، ان کے متون کی نوع بندی

محمد رضا فخر روحانی☆

خلاصہ

عزاداری کی روایت میں 'مقتل' کا متن بنیادی طور پر یک موضوعی رسالہ (کتابچہ) یا تحریری بیان پیش کرتا ہے جو صرف امام حسینؑ کی شہادت پر ہی نہیں ہوتا (اس میں کچھ اور بھی شامل ہوتا ہے)۔ اس طرح مقتل کے متون ایک الگ صنف کی تشکیل کرتے ہیں گوکہ ابھی تک اس طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ متون (درج ذیل) دونوں تقاضے پورے کرتے ہیں یعنی بار بار بیان کیے جانے کی حیثیت میں اور تاریخ نگاری کے مواد کی حیثیت میں، گوکہ ان کی صداقت اور فوکس کے معیار مختلف ہوسکتے ہیں۔ حالانکہ شروع کے مقاتل کے متن بنیادی طور پر عربی میں لکھے گئے تھے۔ یہ اب مختلف زمرۂ عمر اور مختلف ادبی ہیئتوں میں دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ بہرحال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقاتل کے متون کی کسی خاص انداز میں تقسیم یا درجہ بندی نہیں ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مضمون اس خلاء کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے جس کے ذریعے ان متون کی ابتدائی نوع بندی (ٹائپالوجی) تجویز کی گئی ہے۔

عربی لفظ 'مقتل' (جس کی جمع مقاتل ہے) منجملہ اور معنوں کے مقتل یا سزائے قتل پر عمل کا مقام، موت کی حقیقی جگہ، یعنی جسم کا وہ حصہ جس پر زخم لگنے سے موت واقع ہوجائے۔" (اسٹینگاز ۱۹۸۴ء/۱۹۹۲ء زیرِ عنوان، مقتل۔[1]) اس کے ایک اور معنی ان سالانہ یادگاری اجتماع (یعنی 'مجالس) کے بھی لیے جاتے ہیں جو ۶۱ھ/۶۸۰ء میں امام حسینؑ کی شہادت اور عاشورہ کے دلخراش المیہ کی یاد کے لیے برپا کیے جاتے ہیں۔ اس لفظ کا مندرجہ بالا آخری استعمال گوکہ زیادہ تر عربی، فارسی، انگریزی، لغتوں میں درج نہیں کیا گیا۔ بہرحال اس کا تعلق بیان شہادت (ملاحظہ ہو ایوب ۱۹۸۷، ص ۱۵۳)

☆ یونیورسٹی آف قم، ایران

۱۔ عربی قاعدے سے 'مقتل' کی جمع 'مقاتل' ہے۔ ترجمے میں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے

خصوصاً شہادتِ امام حسینؑ کے تحریری بیانوں سے ہوتا ہے۔۱ عام طور پر، ایک نمونے کے مقتل میں، امام حسینؑ کی حیاتِ طیبہ اور ان کے وفادار ساتھیوں کا ذکر ہوتا ہے جنھوں نے روزِ عاشورہ ان کے ساتھ اپنی جانوں کی قربانی پیش کی۔۲-۳

مقاتل کی اہمیت کو دورخوں یا دوزاویہ نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کا ایک رخ ان کا تاریخی کردار یا اہمیت ہے ۔ یہ ان مظالم اور زیادتیوں کا تحریری ریکارڈ ہے جو یزید کے عاملوں نے معرکۂ کربلا کے دوران روا رکھے۔ امام حسینؑ کے چھوٹے سے گروہ نے جو صعوبتیں اورظلم وستم برداشت کیے ۔ اس کے ریکارڈ میں کسی حد تک قابلِ قدر مذہبی عنصر یا رنگ شامل ہوجانے کے نتیجے میں اس میں شیعہ فرقے کی یادگاری رسوم اور معمولوں (رچولس) کا ایک جزو شامل ہوجاتا ہے۔ اس رخ کو پیش نگارہ رکھتے ہوئے، سنّی شیعہ دونوں فرقوں کے علماء اور مولفوں کی ایک بڑی تعداد نے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔۴ گوکہ کلاسیکی یا بنیادی اور اہم مقاتل عربی میں لکھے گئے، اور اب بھی کم وبیش یہی رجحان ہے، دوسری زبانوں میں بھی مقاتل لکھے گئے ہیں۔ ۵-۶

ثانیاً، کچھ خصوصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے مقاتل کی تالیف بذاتِ خود ایک صنف (ادب) کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کا ہدف یا فوکس تقریباً پوری طرح المیۂ کربلا ہی رہتا ہے، اور اس میں بھی اہم ترین کردار امام حسینؑ کا ہوتا ہے، بہرحال ان میں کچھ ضمنی اور جزوی واقعات وتفصیلات انداز بیان میں معاون کے طور پر شامل کیے جاسکتے ہیں جبکہ سوانح میں بیانات کو امام حسینؑ کی پیدائش سے شروع کیا جاتا ہے مقاتل کا مرکزی نقطہ یا فوکس عاشورہ میں ہونے والے واقعات پر ہوتا ہے۔ اِن دونوں میں شہادتِ امام کے بنیادی نقطے کو کبھی فراموش نہیں کیا جاتا۔ ان میں کچھ انحراف یا تبدیلی کوئی غیر معمولی بات نہیں مانی جانی چاہئے۔ چنانچہ بیان کی ساخت یا اس کا تانا بانا فارسی میں انگریزی سے

۱- 'مقتل' کے ساتھ امام حسینؑ کا نام ضرور بتایا جاتا ہے۔ عربی میں 'مقتلِ الحسین' اور فارسی میں 'مقتلِ امام حسین' کہتے ہیں۔

۲- گوکہ کربلا کے شہدا بہتر کہے جاتے ہیں لیکن ان سنہری تختیوں پر جو امام حسینؑ کے روضے کے پائینتی کی جانب دفن ہیں کل سو شہداء کے نام درج ہیں (ذاتی مشاہدہ)

۳- عربوں، خصوصاً عراقیوں میں 'مقتلِ خوانی' کی روایت ہے۔ ہندوستانی میں شیعوں میں 'کتاب خوانی' کہی جاتی ہے (ملاحظہ ہو ہوورتھ Howerth گلاسری زیرِ عنوان کتاب خوانی)

۴- عرب مقاتل کی فہرست (جزوی اور نسبتاً مختصر) کے لیے ملاحظہ ہو، مثال کے طور پر الطبری (۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳، صفحات ۹ تا ۲۰) اور الطباطبائی (۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء) 'یا بہم' (حوالوں وغیرہ کے بارے میں ہدایت)

۵- فارسی مقاتل کی کتابوں کی فہرست (کتابیات) کے لیے ملاحظہ ہو۔ پورامئی ({2002/382SH بلیوگرافی)

۶- خالص ایرانی 'روضہ خوانی' کے عمل پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے ملاحظہ ہو G.Thaiss 'روضہ خوانی' آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ، ج ۳ (۴ جلدیں)۔ ایڈیٹ جے ایل ایسپوسیٹو، نیویارک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۵ء، ص ۱۳-۴۱۲

پوری طرح مختلف ہے۔ فارسی اور عربی کے بیانات کی ساخت اتنی براہِ راست نہیں ہوتی جتنی انگریزی میں ہوتی ہے۔

مقاتل اظہارِ عقیدت یا عبادت کے طور پر بھی لکھے جاتے ہیں اور محرم میں سوگ کے دنوں میں پڑھے جانے کے لیے بھی ا-۲ جبکہ عربی بولنے والے، خصوصاً عراقی، عزاداروں کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص مقتل پڑھتا ہے اور سوگوار اُسے سنتے ہیں اور روتے ہیں، ایرانیوں میں یہ طریقہ رائج نہیں ہے۔ ایرانی اس کی جگہ 'روضۂ خوانی' کو ترجیح دیتے ہیں جسکا عروج مصیبت خوانی ہوتا ہے 'مصیبت خوانی' یا مصیبت ان مذہبی اور یادگاری معمولوں یا رسوم (رچولس) میں مرکزی نقطہ ہونے کے باوجود کچھ علماء (اسکالرس) جیسے نقاش (۱۹۹۳) نے اسے نظرانداز کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ (ان کی لائقِ ستائش اور حیرتناک تحقیق وتلاش اور گہری علمیت کے باوجود نقاش (ملاحظہ ہو ص ۱۶۳) نے ان پانچ معمولوں (رچولس) جو معرکۂ کربلا کے مرکز یا محور پر (ابھارے گئے) ہیں۔' مصیبت یا مصیبت خوانی کو شامل نہیں کیا ہے)۔

صنفِ مقاتل کو خالص لسانی تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ 'عملِ تخاطب' (اسپیچ ایکٹ) کے تناظر میں انھیں ایک وسیع عملِ تخاطب (میکرو اسپیچ ایکٹ) کا متن مانا جاسکتا ہے، جو خود بہت سے چھوٹے عملِ تخاطب (مائیکرو اسپیچ ایکٹس) پر مشتمل ہوتا ہے۔ مقاتل کے ان اثرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو (پرسوز) جذبات اور احساسِ ہمدردی پیدا کرتے ہیں انہیں (مقاتل کو) زبان کے متاثر کن عمل (ایفیکٹیو لینگویج ایکٹس) کی ایک قسم مانا جا سکتا ہے (فیلمین ۱۹۸۳/۱۹۸۰) آسٹن کے 'تصدیقی' (Constative) اور شخصی فنکارانہ (Performative) نظریات کی روشنی میں (ملاحظہ ہو آسٹن ۱۹۷۵ء) اندازہ ہوگا کہ مقاتل کی کتابوں کے 'تصدیقی' کردار یا خصوصیات کے باوجود۔ جو گزرے ہوئے واقعات کی کچھ روداد پیش کرتے ہیں۔ یہ 'شخصی فنکارانہ' خصوصیات کے حقیقی مظہر ہیں کیونکہ ان کا دوہرانا ''خود کرنے یا کسی چیز کو کر کے دکھانے کا حصہ ہوتا ہے۔'' (ناگاراجن ۔۲۰۰۶ ص ۲۶۳)۔

۱- یقیناً محرم اور صفر کے مہینے مجالس کے لیے مخصوص ہیں زیادہ جذباتی مجالس ساتویں سے دس محرم (یعنی عاشورہ) کو، صفر کی ۲۰ (اربعین) اور ۲۸ صفر کو ہوتی ہیں جو حضرت محمدؐ اور امام حسنؑ کی وفات کی تاریخ ہے، منعقد ہوتی ہیں۔

۲- فارسی لفظ 'مصیبت' (عربی کے کی کاٹی) سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ''بدنصیبی، تباہی، آفت، منحوس، تکلیف، برائی، پریشانی، برگشتگی نصیب، ایذا'' اسٹینگازر۔ (پرشین، انگلش، ڈکشنری) بہرحال عزاداری کے سیاق میں مصیبت سے مراد، امام حسینؑ اور اُن کے رفقاء پر کیے جانے والے مظالم کا پردرد بیان، لیا جاتا ہے۔

اس تصور کے استدلال کو اپناتے ہوئے کہ ''وہ سب کچھ جسے ہم ادب کا نام دیتے ہیں شخصی فنکارانہ، ہوتا ہے۔'' (ملاحظہ ہو نٹراجن) یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ جس تحریر کو 'مقتل' یا 'مصیبت' کہا جاتا ہے وہ بھی 'شخصی فنکارانہ' ہوتی ہے۔ اس طرح یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ یہ متون کچھ اُس مواد کی تشکیل کرتے ہیں جنہیں ہم بلاشبہ 'مذہبی یا رسومی شخصی فنکارانہ یا عملِ تخاطب' (religious or ritval performatives or speech-acts) مان سکتے ہیں۔ جن میں وہ شخص بھی جو انہیں دوہراتا ہے اور وہ بھی جو سنتا ہے، دونوں کوئی مذہبی یا رسومی عملِ تخاطب' (religious or ritual speech act) انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے عملوں کو آسٹن کے مطابق 'متعلق بہ عادت' (behatives) کہا جاسکتا ہے چونکہ ان سے ''رویہ اور سماجی برتاؤ'' (attitudes and social behaviour) کا اظہار ہوتا ہے (آسٹن ۱۹۷۵ صفحہ ۱۵۲)، سیرلے کی اصلاح میں انہیں 'اظہاری' (expressive) مانا جاتا ہے کیونکہ یہ ''کچھ صورت حالات کو...... (بیان کرنے کی) نفسیاتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ Scarle، ۱۹۷۹ ص ۱۵) اور پھر چونکہ ''(زبان کا) کھیل'' ایک طرح کا سماجی عمل، زندگی کی ایک شکل ہے۔'' (1984 Souza Filho ص ۲) عزاداری یا 'مصیبت خوانی' بھی ایک طرح 'زبان کے کھیل' کا مظاہرہ ہے، اور ایک 'سماجی عمل' اور 'زندگی کی ایک شکل' ہے۔

طرزِ ادا (Stylistically) کے اعتبار سے 'مصیبت خوانی' مقتل کے ایک حصے کو پڑھ کر سنانا ہے، جبکہ مقتل ایک کتاب یا کم سے کم ایک رسالے کی طوالت رکھتا ہے اور 'مصیبت' عام طور پر مختصر اور ''زبانی متن ہوتی ہے، جس میں ایک دو واقعات یا مناظر کے بیان پر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور اس کا مقصد سامعین میں شدید جذباتی ہلچل پیدا کرکے زیادہ سے زیادہ گریہ و بکا کو ابھارنا ہوتا ہے۔ ویسے دونوں ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان دونوں کا ایک ہی ''موضوع مواد'' اور ایک ہی 'بیانیہ دائرہ' ہوتا ہے[۱]۔ اور یہ کچھ ''مجموعہ روایات اور توقعات کو پورا کرتے ہیں [۲] اور اس لیے ''ایک قسم کی صورتحال کے موافق و مطابق'' ہوتے ہیں۔ [۳]

''مصیبت'' کا ایک ''شخصیاتی مدارج'' اور اس کا دائرہ کار (range of foci persona) ہوتا ہے۔ یہ دائرہ کار یا 'رینج' اصل میں معصوم اور غیر معصوں کے درمیان منقسم ہوتی ہے۔ یہاں جس واحد

۱- ملاحظہ ہو فرو (Frow) ۲۰۰۶، ص ۶۴ اور ۷۲) ۲- ملاحظہ ہو کلر (Culler) ۱۹۹۷، ص ۷۲)

۳- ملاحظہ ہو فرو (Frow) ۱۹۸۱ ص ۷۸)

معصوم پر توجہ مرکوز ہوتی ہے وہ صرف امام حسین کی ذات ہے، جنھیں سیدالشہداء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ باقی غیر معصوم ہستیاں جن کے لیے گریہ و ماتم کیا جاتا ہے، آگے بڑھ کر اُن کی درجہ بندی میں ایک زمرہ اُن کا ہے جنھوں نے روز عاشورہ شہادت پائی اور ان کے مقابلے میں وہ زمرہ ہے جنھوں نے بعد میں انتقال کیا۔ ان میں خواتین زیادہ ہیں۔ پہلے زمرے میں سقائے قافلہ اور امام حسین کی مختصر سی فوج کے علمبردار عباس، علی اکبر، علی اصغر ہیں اور دوسرے زمرے میں زینب اور امام حسینؑ کی چھوٹی (تین یا چار برس کی) بیٹی ہیں جن کا انتقال دمشق میں ہوا اور وہیں دفن ہوئیں۔ ان کے علاوہ امام حسینؑ کے چچیرے بھائی اور سفیر مسلم بن عقیل، اور ان کے دو کم سن بچے، جن کے سر کاٹے گئے، اُن کا بھی ماتم کیا جاتا ہے، یہ سب غیر معصوم تھے۔ امام حسینؑ کے رفقاء میں ایک اور انداز سے بھی تقسیم کی جاتی ہے۔ ہاشمی بمقابلہ غیر ہاشمی، ان میں مزید تقسیم مرد اور خواتین کے درمیان بھی ہے۔ ہاشمی شہداء میں علی اکبر مثالی کردار ہیں اور غیر ہاشمی رفقاء میں حُر ایسے کردار کے مالک ہیں جنھوں نے (خاص المیہ ابتدا) آخری لمحوں میں توبہ کی اور نجات کی راہ پائی۔ یہ بھی قابلِ ذکر حقیقت ہے کہ ان میں کچھ عیسائی کردار بھی ہیں۔ مثال کے طور پر وہب اور اُن کی والدہ۔ ویسے تو عاشورہ کے تمام شہداء کا عزت و احترام ہوتا ہے، مگر ہاشمی شہداء کو زیادہ بلند درجہ اور احترام حاصل ہے اور یہ 'مصیبت خوانی' اور مقاتل کے مولفوں کے یہاں زیادہ مرکزِ توجہ رہے ہیں۔

مقاتل کے متون کی متعدد طریقوں سے درجہ بندی یا تقسیم کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ گنتھیر (1994-Guanther) مقاتل کے متون کے طریقۂ کار کا اچھا جائزہ ہے جس کا وقفۂ وقت زمانہ قبل اسلام سے المیہ کربلا تک پھیلا ہوا ہے، لیکن اس میں اُن متون کے مقاتل کی درجہ بندی اور صنفی انواع کی تقسیم (Classification and typology) مشکل سے ہی کی گئی ہے جو المیۂ کربلا سے متعلق ہیں۔

گوکہ کلاسیکی یا اوریجنل مقاتل کتابیں عربی میں ہی تالیف کی گئی تھیں لیکن دوسری زبانوں میں بھی مقاتل کی کتابیں موجود ہیں۔ خواہ صرف عربی سے ترجمہ ہوئی ہوں یا اوریجنل اشاعتیں ہوں (جنھیں عربی مآخذ سے تیار کیا گیا ہو) عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کے مقاتل میں فارسی میں ابنِ طاؤس کی 'لہوف' کے ترجمہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ (یا اس کا انگریزی ترجمہ جو اطہر حسین رضوی نے کیا ہے (۲۰۰۶ء) یا شیخ عباس قمی کی 'نفس المہموم' یا ابو مخنف کی کتاب 'مقاتل الحسین' کا ایچ موانی کا انگریزی ترجمہ، یا اس کا یوسیزجن (Usezgin) کا جرمنی ایڈیشن۔ گوکہ کلاسیکی اور روایتی انداز میں

مقاتل کی کتابوں سے توقع یہی ہوتی ہے کہ وہ ان میں امام حسینؑ کے گروہ پر ہوئے ظلم و ستم کو مرکزِ توجہ رکھیں گے مگر کچھ متن ایسے بھی ہیں جن میں پورے واقعے کا تحلیلی تجزیہ کیا گیا ہے اور اس واقعے کو سماجی، نفسیاتی یا سیاسی رخ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے، مثال کے طور پر آیتی کا بنیادی کام بعنوان ''بررسی تاریخ عاشورہ'' جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایک دوسری درجہ بندی روایوں سے تعلق رکھتی ہے۔ گوکہ تمام فارسی مقاتل کا مآخذ عربی ہی ہے، عربی کلاسیکی مقاتل یا تو چشم دید گواہوں کے بیانات پر مبنی ہیں یا اُن کے بیانات پر جنھوں نے چشم دید گواہوں کے بیانات و روایتوں کو باور کرلیا ہے۔ اس لیے بعض صورتوں میں اُن میں ایک دوسرے سے اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ بہرطور، کم سے کم ایک مقتل ہے جو دوسرے مقاتل کے مقابلے میں بہت اعلیٰ حیثیت کا حامل ہے۔ یہ مقتل بنیادی طور پر ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی، جو عام طور پر شیخ صدوق (انتقال ۳۸۱ھ مطابق ۹۹۱ء) کی تالیف ہے۔ گوکہ شیخ الصدوق کے مقتل کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اب وہ موجود نہیں ہے۔ اب اس کا متن براہِ راست حاصل نہیں کیا جاسکتا[۱] لیکن اُسے ان ثانوی ماخذوں سے، جن میں اس کے مختلف اقتباسات موجود ہیں دوبارہ تالیف کرلیا گیا ہے۔ اس مقتل کی بے نظیر خصوصیت جس نے اسے دوسرے تمام مقاتل میں سرتاج کی حیثیت بخشی ہے، یہ ہے کہ اس میں ائمہ معصومین اور دوسرے قابلِ اعتماد علماء اور فضلاء کے اقتباسات ہیں۔ اس حیثیت سے اسکا دوسرے مقاتل سے مقابلہ نہیں کرسکتے۔[۲] اس میں ایک مشہور دعا ہے، جو عام طور پر زیارتِ ناحیہ المقدسہ، کے نام سے معروف ہے، جس کی تالیف کو بنیادی طور پر امام معصوم مہدی عجہ سے، منسوب کیا جاتا ہے۔ اس میں پورے المیہ کی بالکل صاف اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے[۳] ان معصومین کے بیانات والے مقاتل کے بعد دوسرے مقاتل ہیں جنھیں ہم عارضی طور پر سنی یا شیعہ مآخذوں کی بنیاد پر تقسیم کرسکتے ہیں۔

مقاتل کے متون کو اُن کے سامعین کی بنیاد پر بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے جبکہ کسی مقتل کا غیر سہل شدہ متن علماء کے لیے جو اس سانحے کو بالکل حقیقی اور اوریجنل صورت میں پڑھنا یا سننا چاہتے

۱- شیخ الصدوق بہت زبردست لکھنے والے عالم تھے۔ انہوں نے ۲۵۰ کتابیں اور علمی مقالے لکھے لیکن اب اُن میں سے صرف ۱۴ باقی ہیں۔

۲- اُن کی کتاب کا فارسی ترجمہ بعنوان مقتل الحسین بہ روایت شیخ صدوق امام حسینؑ و عاشورہ از زبان معاصر ان ایڈنگ اور ترجمہ محمد محقی (دوسرا ایڈیشن) تہران، ہستی نامہ ۱۳۸۴SH مطابق ۲۰۰۶

۳- اس مقتل نما، زیارت کے متن کا انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو مجد ۲۰۰۴ء

ہیں!مناسب ہوگا کہ کچھ سہل شدہ متن بھی ہوں جو عام لوگوں اور غیر ماہرین کے لیے مفید ہوں گے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر متون کو معمر لوگوں اور نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مناسب مانا جائے گا۔[۲]

مقاتل کے متون اس لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں کہ ان میں کن واقعات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اہم ترین ہدف اور سب سے دردناک واقعہ تو شہادتِ امامِ حسینؑ ہی ہے، لیکن عین عاشورہ میں واقع ہونے والے اور امام حسینؑ کی دردناک شہادت سے پہلے یا بعد میں رونما ہوئے واقعات کی بنیاد پر بھی مقاتل کے متن میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ عین عاشورہ میں رونما ہونے والے واقعات میں امام حسینؑ کی شہادت اور ان کے بے مثال رفقاء و اعزاء جنمیں عباس، علی اکبر، علی اصغر وغیرہ کی شہادت شامل ہیں جبکہ عاشورہ سے قبل رونما ہونے والے واقعات کا تعلق ایسے سانحوں سے ہوتا ہے جیسے مسلم بن عقیل اور اُن کے دو بچوں کی گرفتاری اور شہادت، دشمنوں کی طرف سے پانی بند کیا جانا وغیرہ۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جو واقعات رونما ہوئے۔ اُن میں خیام کا لوٹا جانا اور جلایا جانا، عورتوں، بچوں اور امام علی بن الحسین کی گرفتاری اور اسیری شامل ہیں۔ یہ مناظر آگے بڑھ کر یزید کی طرف سے جشنِ فتح اور خوشیاں منانے اور اسیروں کو دمشق میں اپنے محل میں طلب کرنے جیسے واقعات تک پہنچتے ہیں۔ دمشق کے واقعات میں شاید سب سے دردناک اور متاثر کن واقعہ امام حسینؑ کی چہیتی بیٹی کے امام کے سر بریدہ کو دیکھ کر انتقال کرنے کی داستان ہے۔

مقتل کے مواد کو پیش کرنے کے طریقے بھی اب خاصے مختلف ہیں۔ عربی، اردو، ترکی وغیرہ زبانوں سے قطع نظر زیادہ تر مقاتل کو زبانی بیان کیا جاتا ہے، عزادار اسے سنتے ہیں اور خاموشی سے اس پر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ بیان کے دوسرے طریقے بھی ہیں جن کا تعلق ڈراموں سے ہے۔ مثال کے طور پر شرقوی (۲۰۰۳) نظمیں[۳] اور نثر۔[۴]

۱- ایسے مقاتل کے متون عربی میں یا اُن کے ترجموں کی شکل میں موجود ہیں۔ ایچ موانی نے ۲۰۰۲ء میں ابومخنف کے مقتل کا ترجمہ انگریزی میں کیا، اطہر حسین رضوی نے ابنِ طاؤس کی 'اللھوف' کا ترجمہ انگریز میں ۱۹۷۱ء میں کیا پھر اس کا جرمن روپ تیار کیا، اور بہت بڑی تعداد میں ایرانیوں نے ابنِ طاؤس اللھوف (عام طور پر اللھوف کے عنوان سے مشہور) کی فارسی روپ چھپوائے۔ مرزا درضا غولی خان شقانی (فوت ۱۲۸۳ھ) اور ایک لکی کاکا اس ر ل، ملاحظہ ہو یوسف غردی ۱۳۸۳ھ/ ۲۰۰۴ء۔ صرف چند کا ذکر کیا گیا

۲- مہدی واحدی۔ صدر کے تیار کردہ کتابچے (۱۳۸۵ شمسی/۲۰۰۶ء) فارسی میں اس سلسلے کی نمائندگی کرتے ہیں

۳- عام طور پر وہ نظمیں جو عاشورہ کے واقعے سے تعلق رکھتی ہیں انہیں مرثیہ کہا جاتا ہے اور یہ بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اب تک لکھی گئی ←

کتابیات

۱- ابو مخنف (۲۰۰۲ء) کتاب مقتل الحسین، 'نیریٹیو آف دی مارٹارڈم آف الحسین، ترجمہ: ایچ موانی۔ مانٹریال کینڈا۔ نجی طور پر شائع کی۔ (عربی نسخے کے متعلق خیال ہے کہ اب ناپید ہے۔ یہ المیہ عاشورہ کے بعد جلدی ہی کسی زمانے میں لکھا گیا تھا)

۲- ابو مخنف (۲۰۰۴/SH ۱۳۸۳) کتاب مقتل الحسین۔ فارسی ترجمہ عاشورہ نخستین گذارش مستند از نہضت، از ایم ایچ یوسفی۔غروی اور جے سلیمانی، قُم، ایران، امام خمینی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ

۳- اگیکم، کے (.Agyekum, K) (۲۰۰۲ء) 'دی کمیونیکیٹو رول آف سائیلنس ان اکان، پریگمیٹکس 12-1:31-51

۴- آسٹن، جے۔ایل (۱۹۷۵ء) ہاؤٹو ڈو تھنگس ود ورڈس، دوسرا ایڈیشن، ایڈیٹر جے۔او۔ارمسن (J.OUrmson) اور ایم۔سبیسا (M.Sbisa) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

۵- آیتی۔آئی SH ۱۳۸۲/ ۲۰۰۴) بررسی تاریخ عاشورہ، دوسرا ایڈیشن، ایڈیٹر ایم۔انصاری، (۶۳۔ ۱۹۶۲/ SH/ ۱۳۴۲ میں دیے ہوئے لیکچرس) قُم، ایران، امامِ عصر، انگریزی ترجمہ (۱۹۹۱ء) اے پروپ انٹودی ہسٹری آف عاشورہ، لندن، الخوئی فاؤنڈیشن

۶- ایوب، ایم (۱۹۸۷ء) ریڈیمپٹیو سفرنگ ان اسلام: اے اسٹڈی آف دی ڈیووشنل آسپیکٹس، آف عاشورہ ان ٹوایلورشی ازم (اثنا عشری) دی ہیگ، موٹن (Mouton)

۷- کلر، جے (J.Culler) ۱۹۹۷، 'لٹریری تھیوری: وری شورٹ انٹروڈکشن، نیویارک آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

۸- ایسپوسیٹو، جے ایل۔ (Espocito J.L.) ایڈیٹنگ (۱۹۹۵ء) دی آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ ۴ ج، نیویارک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

۹- فخر۔ روحانی، ایم۔آر۔ (۲۰۰۶) عاشورہ پوئمس ان انگلش، ایکسپینڈ اینڈ اینوٹیٹڈ، ج ۱، کربلا، 'امام الحسین سیکریڈ سنکچوری)

۱۰- فیلمین، رمس (۱۹۸۳/ ۱۹۸۰) دی لٹریری اسپیچ ایکٹ، ترجمہ، سی۔پورٹر اتھاکا، این وائی (.Ithaka.N.Y) کورنل یونیورسٹی پریس

→

ان نظموں کا جمع کرلینا ناممکن ہے چونکہ اس ادبی رجحان کا کوئی آخری سرانہیں ہے۔ خاص طور پر عربی جیسی زبانوں میں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو شبّر ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۸ء) فارسی (ملاحظہ ہو مثال کے طور پر مجاہدی SH ۱۳۷۹ بمطابق ۱۹۹۹ء) اور اردو (دیکھیے مثال کے طور پر میر بَبّر علی انیسؔ (۱۸۰۱ تا ۱۸۷۴) اور مرزا سلامت علی دبیرؔ (۱۸۰۳ تا ۱۸۷۵) فی زمانہ عاشورہ کے واقعات پرانگریزی نظمیں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو فخر روحانی ۔۲۰۰۶ء

۴- کربلا کے دل سوز واقعات کو یاد کرنے کے لیے لکھی گئی مخصوص کتابوں کے علاوہ دوسری ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں امام حسینؑ کی زیارت سے حاصل ہونے والی خوبیوں کے بیانات اور امام حسینؑ کو یاد کرنے والے تذکرے بھی دل سوز اور رنج افزا ہیں۔

۱۱- فرو، جے (۱۹۸۰ء) 'ڈسکورس جنریز' جرنل آف لٹریری سیمانٹکس، ۸۱-۷۳-۲-۹

۱۲- گینتھر، ایس (.Guenther,S) (۱۹۹۴ء) مقاتل لٹریچر ان میڈیول اسلام۔ جرنل اف عربک لٹریچر ۲۱۲۔۱۹۲:S۴

۱۳- ہاورتھ۔ٹی۔ایم۔ (.Howath-T.M) (۲۰۰۵ء) دی ٹویلور (اثناعشری) شیعہ از اے مسلم مائنارٹی ان انڈیا، پلپٹ آف ٹیٹرس، لندن، روٹلیج

۱۴- حیدر، ایس۔اے۔ (۲۰۰۶ء) ری لوتنگ کربلا۔ مارٹائرڈم ان ساؤتھ ایشین میموری، نیویارک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

۱۵- ابنِ طاؤس (۲۰۰۳/SH ۱۳۸۵) اللھوف علی، قتل التفوف، فارسی ترجمہ مویہائے غریبانہ، (Mouyeha-e-SHGharibanch) ازمرزا رضاقلی خان شقاقی، ایڈیٹنگ بدہاندی (B.Bidhandi) اور بازگر لغروئی۔قم، ایران سید اطہر حسین رضوی، کربلا، امام الحسینس سیکریڈ سینکچوری

۱۶- موانی۔ایچ۔ملاحظہ ہو ابومخنف، حوالہ سابقہ

۱۷- مجاہدی، ایم اے۔ (۱۹۹۱/SH۱۳۷۹) شکوہ شیرِ عاشورہ درزبان فارسی، قم، ایران شہید محلاتی انسٹی ٹیوٹ

۱۸- مہدی۔جے۔ (۲۰۰۶/SH۱۳۸۵ء) فرہنگِ عاشورہ۔آٹھواں ایڈیشن، قم، ایران معروف

۱۹- مقرّم، اے۔آر۔المساوی (۲۰۰۶/۱۴۲۷ء) العباس، ایڈٹنگ ایم الحسن کربلا، دی سیکریڈ سینکچوری آف حضرت العباس

۲۰- ناگاراجن ایم ایس (۲۰۰۶ء) انگلش لٹریری کریٹی سیزم اینڈ تھیوری: این انٹروڈکٹری ہسٹری، حیدرآباد، انڈیا، اورینٹ لانگمین

۲۱- نقاش۔ وائی (۱۹۹۳) این اٹیمپٹ ٹورئیس دی اوریجن آف ریچولس آف عاشورہ Die 33.2:161-181 Weldes Islam

۲۲- پورامنی، ایم بی (۲۰۰۲/SH۱۳۲۸) چہارہادرحماسۂ کربلا (کربلا کی جنگ میں افراد) قم، ایران، بستانِ کربلا

۲۳- رضوی، سید اے۔ایچ۔۱۳۸۲۱/۲۰۰۶) ملاحظہ ہو ابن طاؤس۔ سابقہ حوالہ

۲۴- صدوق ال۔ شیخ الابوالجعفر محمد، بن علی، بن حسین بن بابویہ القمی۔ (۲۰۰۶/SH۱۳۸۴) مقتل الحسین، فارسی تیرجمہ، مقتل الحسین بروایت شیخ صدوق، امام حسین و عاشورہ از زبان معصومان، از ایم، صحتی سرورودی، دوسرا ایڈیشن، تہران، ہستی نامہ

۲۵- سیرلے جے (Scarle. J) (۱۹۷۹ء) ایکسپریس اینڈ مینٹنگ اسٹڈیز ان دی تھیوری آف اسپیچ ایکٹس، کیمبرج، کیمبرج یونیورسٹی پریس

۲۶- صحتی سرورودی ایم۔ ایڈیٹنگ اور ترجمہ(۲۰۰۶/SH۱۳۸۴ء) مقتل الحسین بروایت شیخ صدوق، امام حسین و عاشورہ از زبانِ معصومان دوسرا ایڈیشن، تہران، ہستی نامہ

۲۷- سیزنگ یو (Sezeing U) (۱۹۷۱ء) ابومخنف(Abu Mikhnaf) 'Ein Beitivag zur Historiographie der umadishen Zeit برلن (گنتھیر کی کتابیات سے حوالہ لیا گیا۔)

۲۸- شبیر۔جے (Shabbir-J) (۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء) 'ادب الطاف' ۱۰ ج، بیروت دارالمرتضیٰ

۲۹- شرقودی، عبدالرحمن، ال (۱۴۲۳ھ/۲۰۰۳ء) 'حسین دی مارٹائیر، ایک ڈرامہ، ۶ حصوں میں۔ ترجمہ انعم عبدالرزاق، شکاگو (IL The Open School)

۳۰- سوزافلہو (Souza Filho D,M. De) (۱۹۸۴ء) لینگویج اینڈ ایکشن، اے ری ایس منٹ آف اسپیچ ایکٹ تھیوری۔ امسٹر ڈام۔ جان بینجمنس

۳۱- سٹینگاس، ایف۔ (۱۹۸۴/ ۱۸۹۲) 'اے کمپری ہینسیو پرشین، انگلش ڈکشنری، لندن، روٹلیج، اینڈ کیگان پال اور تہران، ایران، یونیورسٹی پریس

۳۲- طباسی۔ النجفی۔ ایم آر۔ ال (ھ ۱۴۲۴/ ۲۰۰۳) مقتل الاماالحسین، ایڈ: ایم، اے الامینی، قُم، ایران، محبّین۔

۳۳- طباطبائی، سید۔ اے ۔ال (ھ۱۴۱۷/۱۹۹۶ء) 'اہلِ البیت فی المکتبہ العربیہ، (عربی مآخذوں میں اہل بیت)۔قُم ایران۔ البیت

۳۴- تھائس۔جی (Thass,G) (۱۹۹۵ء) 'روضہ خوانی' آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ کی تیسری اور چوتھی جلد، صفات ۱۳۔۴۱۲۔ ایڈیٹنگ بے ایل ایسپوسیٹو (J.L.Esposito) نیویارک۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

۳۵- وحیدی۔صدر، ایم (۱۳۸۵SH/ ۲۰۰۶ء) اصحابِ عاشورہ سیریز، قُم، ایران، رویسش

۳۶- زیدی۔اے۔ جے۔'اے ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ نئی دہلی۔ ساہتیہ اکیڈمی

خانقاہ نیازیہ میں عزاداری امام حسین علیہ السلام کی روایت

ڈاکٹر عراق رضا زیدی☆

ہندوستان میں فارسی زبان کے آخری صوفی شاعر شاہ نیاز احمد نیازؔ بریلوی کے مزار پر ہونے والا اجتماع آج بھی ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ یہ مزار ہندوستان میں ایرانی طرزِ تعمیر کا ایک ایسا دلکش نمونہ ہے جو ہماری مٹتی ہوئی تہذیب اور گرتے ہوئے آثارِ تمدن کو جلا بخشنے کی آخری زور آزمائی کی یادگار ہے۔ جہاں ہر مذہب و مسلک کے انسان جمع ہوکر آپ کے وسیلے سے منہ مانگی مرادیں پاتے ہیں۔ ہندوستان کی جانی مانی عظیم شخصیتیں اس خانقاہ پر حاضر ہونا باعث افتخار سمجھتی ہیں۔ یہاں تک کہ اہل طریقت اور اہلِ شریعت بھی، جیسے حاجی وارث علی شاہ صاحب اور مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی وغیرہ نے بھی عقیدت سے یہاں حاضر ہونے پر فخر محسوس کیا ہے۔[1] بھارت رتن بسم اللہ خان اپنی وفات سے چند ماہ قبل یہاں حاضر ہوکر ہندوستان کی ترقی اور اہل ہند میں اتفاق و اتحاد کے لئے دعا مانگ چکے ہیں۔ اس مزار پر کسی بھی مذہب و مسلک یا ذات کے ہر طرح کے انسان حاضر ہوسکتے ہیں۔ کسی کے بھی آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہاں دل توڑے نہیں، جوڑے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں رائج اکثر تیوہار یہاں بڑی آب و تاب سے منائے جاتے ہیں۔ ان سبھی تیوہاروں کی مدت ایک دو روز سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن عزاداری امام حسین علیہ السلام کا سلسلہ یہاں تقریباً اکیاون دنوں تک جاری رہتا ہے۔ یعنی ذی الحجہ کی ۲۹ تاریخ یا محرم کی چاند رات سے ماہ صفر کی اکیسویں تاریخ یعنی چہلم کے دوسرے دن تک لگاتار کسی نہ کسی صورت میں ذکر امام مظلومؑ یا عزاداری شہداء کربلا ادا ہوتی رہتی ہے۔

شاہ نیاز بے نیاز کی ولادت ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں صوبہ پنجاب کے مشہور و معروف شہر سرہند میں ہوئی تھی، جو صوفیوں کی آماجگاہ اور فارسی شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔ آپ کے والد حاجی

☆ شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۱۔ محمد قاسم نیازی، فضائل اہل بیت: سوال و جواب، خانقاہ نیازیہ بریلی، ص ۵

رحمت اللہ علوی کا شجرہ نسب حضرت محمد حنفیہ کے سلسلے سے سرچشمہ ولایت حضرت علیؑ تک پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ بی بی لاڈو عرف بی بی غریب نواز بنت سعید الدین رضوی کا شجرۂ نسب آٹھویں امام حضرت علی رضاؑ کے سلسلے سے بی بی فاطمہ زہرہ (س) اور حضرت علیؑ تک پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کربلا اور عزاداری حسین مظلومؑ آپ کو اپنے اجداد سے ورثے میں ودیعت ہوئی تھی۔

۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۵ء میں شاہ نیاز احمد اپنے پیرومرشد مولانا فخر الدین دہلوی کے مشورے اور حکم سے بریلی تشریف لائے اور بہاری پور کی ایک مسجد میں درس و تدریس میں مشغول ہوکر تمام مخلوق خدا کی حاجت روائی کا کام بھی انجام دینے لگے۔ ان کے ہاتھ ہمیشہ دعا کے لئے بلند رہتے اور یہ دعا بھی مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی کے لئے نہ ہوکر صرف اور صرف انسانوں کے لئے کی جاتی تھی۔ بریلی آنے کے کچھ دنوں بعد ہی شاہ صاحب نے ''خوبی محلّے'' میں ایک خانقاہ تعمیر کی، جس کے بعد یہ محلّہ ''خواجہ قطب'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جب یہ خانقاہ تعمیر ہوئی تو اس میں امام حسینؑ کے ذکر کے لئے ایک خاص امام باڑے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ آج تو اس خانقاہ کے آس پاس پانچ۔ چھ امام باڑے تعمیر ہو چکے ہیں۔ شاہ نیاز احمد صاحب غم حسینؑ، بڑے انہماک اور جذباتی طور پر برپا کیا کرتے تھے۔ فرش عزاء پر شہدائے کربلا اور اسیران کربلا کا تذکرہ مستقل جاری رہتا۔ یہاں تک کہ تعزیوں کے جلوس کے ساتھ بہ نفس نفیس خودگشت میں شامل ہوتے، جیسا کہ سلسلہ نیازیہ میں آنند شرما نے تحریر کیا ہے۔

''آپ محرم میں عاشورہ کی رات میں دو بجے کے بعد پیدل تعزیوں کی زیارت کو جاتے تھے۔ تمام خانقاہی آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ آپ پانچ تعزیوں کی زیارت کرکے واپس تشریف لاتے تھے''۔[1]

شاہ صاحب کا یہ طریقہ مرتے دم تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ جب آپ پر فالج کا اثر ہوگیا اور بغیر سہارے کے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تو بھی پانچ تعزیوں کی زیارت کا سلسلہ مریدوں کی مدد اور ہاتھ کی چھڑی کے سہارے جاری رہا۔ ''کرامت نظامیہ'' میں ایک واقعہ اس طرح درج ہے کہ:

''حضرت نیاز بے نیاز محرم کی رات کو پانچ سات تعزیوں کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ آخر عمر میں ایک بار کمزوری کے باعث طاقت نہیں تھی، حضرت مستغرق بیٹھے تھے کہ صورت نورانی حضرت بی بی فاطمہ زہرؑا ظاہر ہوئی اور فرمایا کہ میاں آج ہمارے بچوں کی زیارت کو نہیں

۱- آنند شرما، سلسلۂ نیازیہ (ہندی) نیازیہ اکیڈمی، بریلی جولائی ۲۰۰۰ء ص ۳۴

اٹھے۔ حضرت پر رقت طاری ہوئی خدام کو حکم ہوا کہ جیسے ہو سکے ہم کو لے چلو..... پھر آپ نے پانچ تعزیوں کی زیارت کی''۔[۱]

آپ صرف آنکھوں یا ہاتھوں سے زیارت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ تعزیوں کو ہاتھ لگا کر اپنے منہ اور سینے پر بھی پھیر لیتے تھے۔ تعزیوں کو شرک اور بدعت سمجھنے والے اس وقت بھی موجود تھے جن میں سے ایک کا احوال آنند شرما نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''ایک بار سورت، گجرات کے ایک مولوی اکبر علی صاحب محرم کے زمانہ میں خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے اور عاشورہ کی رات کو حضور قبلہؒ کے ساتھ تمام خانقاہی بھی ان کے سنگ گئے۔ اس رات حضور قبلہ نے تخت کو ہاتھ ہی نہیں لگایا بلکہ منہ سے چوما بھی۔ اس پر مولوی صاحب کے دل میں خیال آیا کہ یہ تو شرک ہے، خدا کی خدائی میں کسی کو شریک جاننا ہے۔

حضور نے ان کے دل کا حال جان لیا اور پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب تعزیے کو دیکھئے۔ جب مولوی صاحب نے تعزیہ دیکھا تو وہ چیخ کر بے سدھ ہو کر گر گئے۔ حضور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے لوگوں نے پوچھا! مولوی صاحب آپ کیوں چیخے؟ مولوی صاحب نے بتایا'' میں نے تعزیے میں ایک طرف حضرت امام حسنؑ اور دوسری طرف لال کپڑوں میں حضرت امام حسینؑ کو دیکھا۔[۲]

مندرجہ بالا اقتباس ایک غیر مسلم لیکن غالباً حسینی ہندو کا تحریر کردہ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ نیاز صاحب کے ہر قوم و قبیلے کے مرید عزاداری میں اس طرح شرکت کرتے ہیں، جس طرح عام مسلمان۔ جس کی وجہ اس غم کا ہر غم پر ترجیح دینا ہے۔

مولانا اکبر علی سورتی کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے تعزیوں کے توسل سے سبطین پیغمبرؐ کی بھی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا توبہ کرتے اور تعزیے داری میں بہ نفس نفیس حصہ لیتے لیکن اللہ ایمان کی دولت سے ہر کسی کو نہیں نوازتا، یہ تو نواسے تھے۔ خود نبی کریمؐ کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد بھی منافق، منافق ہی رہے، مسلمان نہ ہو سکے۔ لہٰذا مولانا نے شاہ نیاز صاحب کی خدمت میں تین سوال باقاعدہ جڑ دیئے جن میں سے پہلا سوال قوالی کے بارے میں تھا۔ جس کا جواب تھا:

۱- سید محمد فائق واسطی نیازی، کرامت نظامیہ، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۳۳۲ ص ۱۰

۲- آنند شرما سلسلۂ نیازیہ (ہندی) نیازیہ اکیڈمی بریلی، جولائی ۲۰۰۰ ص ۳۵

''مولوی صاحب ڈھولک کی آواز کانوں میں اس قدر بھری ہے کہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی۔
دوسرا سوال تعزیہ کے بارے میں تھا۔ جس کا جواب صاحب سلسلہ نیازیہ نے اس طرح درج کیا ہے:
''آپ نے فرمایا: اگر تعزیہ بنا ہی نہیں ہوتا تو میں کسی کو اسے بنانے کی اجازت نہ دیتا۔ کیونکہ پوری طرح اس کی تعظیم نہیں ہو پاتی۔ اب جہاں تک ہوگی وہاں تک تعزیے کی تعظیم وتکریم کروں گا''۔[۱]

مندرجہ بالا قول کے بارے میں راقم نے اسی خانوادے کے ایک فرد ڈاکٹر مصطفیٰ حسن نیازی سے رجوع کیا تو ڈاکٹر صاحب نے بھی اس واقعے کی تصدیق فرمائی، جو کئی عدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں تاریخ روہیلکھنڈ، اور تاریخ اودھ قابل ذکر ہیں۔

لہٰذا اس جواب کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ شاہ نیاز صاحب تعزیے کو شعائر اللہ میں سے مانتے ہیں جیسا کہ محمد قاسم نیازی نے تحریر کیا ہے۔
''اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے
"ومن یعظم شعآئرا للہ فانها من تقوی القلوب" سورہ حج آیت ۳۱ یعنی جو لوگ اللہ کی نشانیوں اور یادگاروں کا اہتمام کرتے ہیں پس یہ فعل ان کے دلوں کا تقویٰ کہلاتا ہے۔ تفاسیر اوراحادیث میں لکھا ہے کہ ہر وہ چیز (شعائر اللہ) یعنی اللہ کی نشانی اور اس کی یادگار میں داخل ہے، جس کو دیکھ کر اللہ اور رسولؐ اور اللہ والے یاد آئیں۔
میں تعزیہ داری کی مخالفت کرنے والوں سے پوچھتا ہوں کہ ایمان داری سے بتائیں کہ کیا محرم میں تعزیہ دیکھ کر انھیں حضرت امام حسینؑ کی اور ان کی قربانی کی یاد نہیں آتی''۔[۲]

شاہ نیاز صاحب بھی اسی لئے تعزیے کی انتہائی تعظیم وتکریم کے قائل ہیں۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اس خانقاہ میں کسی کی برائی نہیں کی جاتی ہے۔ اسی نظریے کا فائدہ اٹھا کر مولانا اکبر علی نے دشمنِ اہلِ بیت اور واقعہ کربلا کو انجام دینے والے ظالم و جابر کے بارے میں بھی سوال کیا، جس کا تذکرہ منوج شرما نے بھی کیا ہے۔

تیسرا سوال: آپ یزید پلید ابنِ معاویہ کے اوپر لعنت بھیجنا جائز سمجھتے ہیں؟
آپ نے فرمایا: ''آج تک اللہ نے میری زبان کو اس ناپاک نام لینے کا اتفاق نہیں دیا۔ ایک بار

۱-آنند شرما سلسلۂ نیازیہ (ہندی) نیازیہ اکیڈمی بریلی، جولائی ۲۰۰۰ء ص ۳۵

۲- محمد قاسم نیازی، فضائل اہل بیت: سوال وجواب، خانقاہ نیازیہ بریلی، ص ۳۷

یہ نام زبان سے نکل جائے تو پھراسکی ناپاکی نہیں جائے گی‘‘۔

لعنت کا ایسے میں سوال کہاں ہے؟ میں اتنی دیر میں حضرت امام حسینؑ کا نام لینا پسند کروں گا جس سے زبان وقلب روشن ہوں‘‘۔[۱]

مندرجہ بالا عبارت میں شاہ صاحب نے اپنا جواب اتنی احتیاط سے دیا ہے کہ ان کا کسی کو برا نہ کہنا بھی ثابت رہے اور صحیح مقصد بھی بیان ہوجائے۔ یوں تو دشمن خدا شیطان پر لعنت کہے بنا چارہ نہیں ہے۔ اسی طرح دشمن اہل بیت پر بھی لعنت کا جواز ثابت ہے۔ لیکن شاہ صاحب تو لعنت کے لئے ہی صحیح شیطان کا نام تو لے سکتے ہیں لیکن یزید کا نام اس مقصد کے لئے لینا بھی نہیں چاہتے گویا یہ نام منحوسیت کی آخری حد سے بھی آگے کی منزل ہے۔ شاہ نیاز صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کے نام بھی امام حسینؑ کے نام پر تجویز فرمائے، اللہ نے ۳۰ نومبر ۱۸۱۸ء/ ۱۲۳۴ھ میں جب آپ کو پہلا بیٹا عنایت کیا تو آپ نے اس کا نام شاہ نظام الدین حسین رکھا، اس طرح یکم دسمبر ۱۸۲۷ء میں دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تو اس کا نام شاہ نصیر الدین حسین رکھا۔ اس طرح اپنے مریدوں، خلفاء اور خاندان والوں کو محبت اہل بیت ودیعت کرتے ہوئے۔ ۱۲۵۰ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ کرامات نظامیہ میں آپ کی تاریخ وفات کلام پاک کی مشہور آیت **ان اولیاء الله لاخوف علیهم و لا یحزنون** سے برآمد کی گئی۔ اس مکمل آیت کے حروف سے ۱۲۵۰ھ برآمد ہوتی ہے۔ اس صنعت فالی میں مسلم معنوی تاریخ کا برآمد ہونا بھی حیرت واستعجاب سے کم نہیں ہے۔

شاہ صاحب فارسی کے آخری صوفی شاعر تھے۔ گویا سنائی، عطار، رومی اور جامی سے۔ شروع اور پروان چڑھنے والی روایت، جسے ہندوستان میں سید علی ہجویری، معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء، خسرو، گیسودراز وغیرہ نے سرسبز وشاداب رکھا وہ انگریزوں کی آمد پر خزاں رسیدہ ہوکر دم توڑنے لگی۔ اس کی آبیاری میں شاہ نیاز صاحب نے آخری دم تک جدوجہد کی۔ آپ کے کلام میں بھی اہل بیت اطہار خصوصاً مولا علیؑ اور امام حسینؑ سے محبت اور عقیدہ کا اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کی مدح میں فرماتے ہیں؟

زہی عزو جلالی بوتراب فخرانسانی | علی مرتضیٰ مشکل گشای شیریزدانی
ولی حق وصی مصطفیٰ دریای فیضانی | امام دوجہان و قبلۂ دین شمع ایمانی

۱- آنند شرما سلسلۂ نیازیہ (ہندی) نیازیہ اکیڈمی بریلی جولائی ۲۰۰۰ء، ص ۳۶

پیمبر بر سر منبر نشست و خواند مولایش | کہ تا مولاش را باشند اندر خلق برہانی

شاہ صاحب قیامت میں بھی حضرت علیؑ سے مدد کے خواہاں ہیں۔ لہٰذا مقطع میں فرماتے ہیں:

نیاز اندر قیامت بی سر و سامان نخواہی شد
کہ از حبّ و تولّای علیؑ داری تو سامانی[۱]

شاہ نیاز صاحب قادریہ اور چشتیہ سلسلہ کی ایک ایسی مضبوط کڑی ہیں جسے حضرت نظام الدین اولیاء کے بعد افضلیت و اہمیت و بزرگی حاصل ہے۔ اسی لئے ان کے مرید چشتی یا نظامی نہ لکھ کر ''نیازی'' کہلاتے ہیں۔ اور شاہ صاحب قطب عالم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔لیکن جب امام حسینؑ کی مدح سرائی کرتے ہیں تو اپنے اسی مقام کو دھیان میں رکھتے ہوئے انؑ کو سلطان اولیاء سے تعبیر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار مجالس میں مرثیہ سے قبل سوز کی شکل میں بھی پڑھے جاتے ہیں۔

ای دل بگیر دامن سلطان اولیاء | یعنی حسینؑ ابن علیؑ جان اولیاء
چون صاحب مقام نبیؐ و علیؑ ست او | ہم فخر انبیاء شدہ ہم شان اولیاء
آئینہ جمال الٰہی ست صورتش | زان رو شدست قبلہ ایمان اولیاء
ذوق دگر بجام شہادت ازو رسید | شوق دگر بہ مستی عرفان اولیاء
دارد نیاز حشر خود امید باحسینؑ | با اولیا ست حشر محبان اولیاء[۲]

شاہ صاحب امام حسینؑ کو دنیا کے تمام ولیوں کا سردار تسلیم کرتے ہوئے ان کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں جب امام حسینؑ دوش پیمبرؐ کی زینت بنتے ہیں تو ان کا مقام اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ وہ نبیوں سے بھی زیادہ اعلیٰ مقام کے حامل ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے نبیؐ تمام انبیاء سے افضل ہیں انہیں امام حسینؑ کی صورت میں جمال الٰہی نظر آتا ہے اس لئے یہ چہرہ قبلۂ ایمان ہے۔ لوگوں کے دلوں میں انہیں کی بدولت شہادت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ولیوں کے قلوب کی مستی بھی انہیں کے دم سے ہے۔ گویا ان کی ذات عشق خدا کی محرک ہے۔ اسی لئے نیاز نے اپنا حشر امام حسینؑ کے ساتھ چاہا ہے۔

شاہ صاحب کے کلام میں اس طرح کے کافی نمونے موجود ہیں۔ جن کا اس مختصر مقالے میں تحریر کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان ہی چند اشعار سے ان کے جذبۂ عشق حسینؑ کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

۱- شاہ نیاز احمد، دیوان نیاز، ص ۱۴۱ ۲- ایضاً

شاہ صاحب کی وفات کے بعد خانقاہ نیازیہ کی خلافت ان کے بڑے بیٹے اور خلیفہ نظام الدین حسین کے سپرد ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۶ سال تھی۔ لیکن عرفانی کیفیت کے لئے عمر نہیں لو، لگن، کشف اور عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کم عمری میں بھی نظام الدین حسین نے اپنے والد کی طرح تمام علوم شرعیہ قرآن، تفسیر، فقہ، حدیث وغیرہ کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی قواعد، فلسفہ، منطق، فلکیات، نجوم اور عقائد و کلام جیسے علوم پر دسترس حاصل کر کے عوام کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ اور مخلوق خدا کی حاجت روائی میں کوشش کرنے لگے۔ اپنے والد کی طرح عزاداری امام حسینؑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور اسے فروغ دینے کے لئے امام باڑے تعمیر کروائے اور تعزیوں کے ساتھ گشت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کا وصال یکم رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں ہوا اور اسی خانقاہ میں مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد اس سلسلہ کو حضرت محی الدین احمد عرف ننھے میاں خلف و خلیفہ شاہ نظام الدین نے آگے بڑھایا۔

ننھے میاں کی ولادت ۱۹ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ / ۱۸۵۸ء میں خانقاہ نیازیہ بریلی میں ہوئی۔ ننھے میاں نے شریعت اور طریقت دونوں علوم پر دسترس حاصل کر کے عربی، فارسی اور اردو زبان کے علاوہ ترکی اور پشتو زبان کی صلاحیت بھی پیدا کی۔ عشق علیؑ و آل نبیؐ میں ہمیشہ سرشار رہتے تھے۔ محرم کے مہینہ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں ہمیشہ آنسوؤں میں تربتر دکھائی دیتے تھے۔ سچے عاشق حسینؑ تھے۔ وہ عزاداری کے لئے خانقاہ سے باہر بھی جہاں مجالس برپا ہوتیں، جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ضلع بریلی میں قصبہ سیتھل کی عزاداری کمشنری بریلی کے اضلاع میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ جہاں دو مہینے آٹھ دن یعنی عشرہ محرم سے ۸ ربیع الاول تک لگاتار مجلس و ماتم جلوسِ علم و مہندی اور تعزیہ داری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس قصبہ میں ۳۶ گاؤں کے تعزیے کربلا میں دفن ہونے کے لئے آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر انجمن کی شکل میں نوحہ خوانی کرتے ہوئے بی بی فاطمہ (س) کو پُرسا دینے کے لئے ننگے پیر آہ و زاری کرتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ سبھی گاؤں اہلِ سنت و الجماعت خاص کر بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ہیں۔ ننھے میاں نے سیتھل کے محرم میں شرکت کی ہے۔ وہ ایسے عاشق اہلِ بیت تھے کہ مولا علیؑ کا تذکرہ سنتے سنتے ایسے سرشار ہوئے کہ اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ یہ عشق کی معراج ہے۔ جیسا کہ Silsila-e-Niazia:An Introduction میں تحریر کیا گیا ہے۔

"Hazrat Shah Moeenuddin Ahmad Sahib (R.A.) was so imbued with the devotion and love of the "Ahlebait" that during Moharram his eyes always remained wet with tears. On one such occasion when he was at sainthal, a village near bareilly, and a qawwal party sang the couplet.

باشد ایمان مسلمان مصحف روی علیؑ

سجدہ گاہ ماست محراب دو ابروی علیؑ

(In Ali's visage and Mien rest the genesis and cause of a Muslims faith"- "My head prostrates at the two splendidly arched eyebrows of Ali(A.S.)

Hazrat Shah Mohiuddin Ahmad Sahab (R.A.) was so flooded with love of Hazrat Maula Ali (A.S.) that he put his head on the floor in devotion even as the qawwal kept repeating the couplet. He did not raise his head thereafter and breathed his last in the same condition. It was 26th Rabi-ul-Awwal, 1343 A.H./1924 A.D.[۱]

غرض کہ ننھے میاں کا وصال قصبہ سینتھل، ضلع بریلی میں چراغ علی شاہ کے عرس کے موقع پر راقم الحروف کے جد میر سید علی افضل کی ملکیت میں حضرت علیؑ کے عشق میں ہوا۔ اور حضور کی حدیث کے مصداق "من مات علی حب آل محمدؐ مات شہیدا" و من مات علی حب آل محمدؐ مات مغفورا۔ وہ شہید ہوئے اور مغفرت کئے ہوئے اٹھے۔ محی الدین ننھے میاں کے زمانہ میں خانقاہ نیازیہ میں اودھ کی طرز پر محرم داری کا سلسلہ جاری تھا۔ جو تاہنوز برقرار ہے۔ ننھے میاں کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، جس کی وجہ آپ کی اہلیہ کا جلد انتقال ہوجانا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی اور صرف ایک صاحبزادی سے گھر منور ہو چکا تھا۔ آپ سے دوسری شادی کے لئے بہت کہا گیا مگر یہ کہہ کر شادی کرنے سے انکار کرتے رہے کہ "حضور پاکؐ کی طرح میری نسل بھی نواسے سے چلے گی"۔ یہ جملہ جہاں عشق محمدؐ و آل محمدؐ کی معراج ہے وہیں ان تمام سوالوں کا عملی جواب بھی ہے جو تاریخ کے دامن میں اکثر ابھرتا رہا ہے۔ ہر بار اس سوال کا جواب نئے طریقہ سے دیا گیا ہے۔ کسی زمانہ میں یہ جواب دہرایا نہیں گیا۔ یہ سارے جوابات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہاں اس سے صرف نظر کرتے ہوئے، ننھے میاں کا ایک قطعہ تحریر کیا جاتا ہے۔

نونہال چمن فاطمہ(س) زہرہ حسنینؑ   گل گلزار علیؑ قامت رعنا حسنینؑ
ماہی قلزم و دریای خداوند قدیر   حلیۂ پاک نبیؐ بود سراپا حسنینؑ

۱- ڈاکٹر محمد عباس نیازی، سلسلہ نیازیہ اکیڈمی ۲۰۰۶، اپریل ص ۳۱

تقریباً یہی مضمون فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں نے بھی بزبان اردو موزوں کیا ہے

معدوم نہ تھا سایہ شاہ ثقلین　　اس نور کی جلوہ گاہ تھی ذات حسینؑ
تمثیل نے اس نور کے دو ٹکڑے کئے　　آدھے سے حسنؑ بنے ہیں آدھے سے حسینؑ

ننھے میاں کی اکلوتی بیٹی کی شادی بچھڑایوں کے شاہ محمد مہدی میاں فریدی سے ہوئی، جن کے بطن سے شاہ محمد تقی عرف عزیز میاں کی ولادت ۲۱ ربیع الاول ۱۳۱۶ / ۱۸۹۹ء میں ہوئی اور یہی عزیز میاں ننھے میاں کے خلیفہ و جانشین بغیر کسی اختلاف کے بنائے گئے۔ عزیز میاں کو ''محبوب حق'' کا خطاب عطا ہوا، جو اپنے نانا ننھے میاں کی ہو بہو تصویر تھے۔ عزیز میاں کا نام نویں امام حضرت محمد تقی علیہ السلام کے نام نامی سے ماخوذ ہے، جو اہل بیت کی محبت آشکارا کرنے کا پہلے قدم ہے۔ عزیز میاں عالم و فاضل ہونے کے علاوہ ایک اچھے طبیب بھی تھے اور بڑے سے بڑے مرض کا علاج چٹکیوں میں کر دیتے تھے۔ عزیز میاں کی جانشینی سے واقع غدیر جیسے کئی واقعات کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ سلسلۂ نیازیہ میں درج ہے۔

حضرت کے نانا نے جب آپ کو جانشینی بخشی تو ایک بڑے جلسہ کا اہتمام کیا اور آپ کی تعریف میں فرمایا ''یہ میرے بیٹے اور جگر کے ٹکڑے ہیں ان کے حکم کو ماننا، میرے حکم کو ماننا ہے۔ ان کی دشمنی میری دشمنی ہے۔ یہ بالکل میری طرح ہیں۔ انہیں وہی سمجھے جو میں ہوں۔ میرے مرید اور خلیفہ انہیں کے مرید اور خلیفہ ہیں۔ ان کو میرے ساتھ وہی نسبت ہے جو حضرت امام حسینؑ کو حضور رسول اکرمؐ سے تھی''۔[1]

شاہ عزیز میاں صاحب کا زمانہ راقم کے والد ماجد مرحوم حکیم سید احمد اصغر قلم سیتھلی کا زمانہ ہے۔ جن سے شاہ صاحب کے اچھے مراسم تھے۔ اس زمانے میں ۱۱ محرم کو ایک بڑی مجلس برپا ہوتی تھی جس میں تقریر کرنے کے لئے لکھنؤ سے کوئی شیعہ ذاکر بلایا جاتا تھا۔ مجلس کے بعد نوحہ خوانی کے لئے بریلی و نواح بریلی کی کئی انجمنیں ماتم برپا کرتی تھیں۔ یہ دستور ابھی بھی باقی ہے۔ عزیز میاں اپنے اسلاف کی مانند شاعر اہل بیت بھی تھے اور رازؔ تخلص فرماتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بات ہے بھی تو اس قدر ہے بات　　میرے لب پر ہے یا علیؑ دن رات
رہبر اعظم طریقت ہیں　　ہے شریعت پناہ بھی یہ ذات

۱- آنند شرما، سلسلۂ نیازیہ (ہندی) نیازیہ اکیڈمی بریلی جولائی ۲۰۰۰ء ص ۵۵

دل میں رکھ لی ہے میں نے راز کی بات　　راز دنیا سے راز کیوں میں کہوں

امام حسینؑ کی سرکار میں یوں ملتجی ہیں۔

سخی ابن سخی میری خبر لو　　محمد کے ولی میری خبر لو

حسینؑ ابنِ علیؑ میری خبر لو　　بحق حضرت خاتون جنت (س)

عزیز میاں صاحب امام حسینؑ کی شہادت کو خود پیغمبر آعظمؐ کی شہادت مانتے ہیں۔ اسی لئے وہ ایک سلام میں فرماتے ہیں۔

کسی کا وقت شہادت جمال کیا کہئے　　یقین تھے وہ محمدؐ بزیرِ خنجر غم

اس شعر کو سمجھنے کے لئے احادیث رسولؐ اور قرآنی تفسیر کے ساتھ ساتھ قول علماء کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہاں اس شعر کی تشریح سے قطع نظر اتنا کہنا کافی ہے کہ ایسے شعر بہت کم تخلیق ہوتے ہیں۔ عزیز میاں کا انتقال ۱۶ رشوال ۱۳۸۷ھ میں ہوا تو آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ محمد حسن سجاد عرف حسن میاں سجادہ نشین و خلیفہ بنائے گئے۔ حسن میاں کو خود راقم الحروف کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ شب عاشور محرم، چہلم اور ۲۵ صفر کو بریلی کے مشہور آصفی امام باڑے میں جلوس علم وتعزیہ کی زیارت کرنے حاضر ہوتے تھے۔ ایک بار ۲۵ صفر میں انہیں اس طرح آتے دیکھا کہ ان کے ساتھ اہلِ خاندان و خانقاہ کے مریدوں کے علاوہ چند سکھ حضرات بھی پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب وہ شہ نشین (وہ جگہ جہاں علم وتعزیے سجائے جاتے ہیں) میں داخل ہوئے تو تنہا آگے بڑھے اور جب واپس آئے تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ حسن میاں صاحب خود تحت خوانی فرماتے تھے۔ ان کی مجلس میں ہر مسلک اور مذہب کے لوگ شامل ہوتے تھے جو حسن میاں کے مرثیہ پڑھنے کے انداز اور طرز ادا کا بھرپور لطف اٹھاتے تھے۔ آپ کو مرثیہ کے سیکڑوں بند زبانی یاد تھے، جیسا کہ آنند شرما نے بیان کیا ہے:

''درگاہ شریف میں گیارہ محرم کو مجلس ہوتی تھی۔ دونوں فرقوں کے مقررین پڑھتے تھے۔ مرحوم جناب صغیر لکھنوی ہر سال مرثیہ سناتے تھے۔ مگر میاں صاحبؒ کا مرثیہ پڑھنے کا انداز جو آج بھی لوگوں کو نہیں بھولتا۔ سوسو بند آپ کو منہ زبانی یاد تھے''۔

ان کے خلیفہ جے پور کے سید محبوب الرحمٰن نیازی کہتے ہیں۔ ''اس دور میں ایسا کوئی ماہر فن نہیں۔ میں نے بہت سی مجلسوں میں شرکت کی، لیکن آج تک وہ رونگٹے کھڑے کردینے والی آواز

سنائی نہیں دیتی ہے''۔[۱]

شاہ حسن میاں کے دل میں اپنے اجداد خصوصاً ننھے میاں صاحب کی طرح اہل بیت کا عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خود آپ کا نام محمد حسن سجاد بھی اپنا اثر رکھتا ہے۔ اسیرانِ کربلا کے قافلہ سالار بیمار کربلا، سید سجاد، کا نام بھی آپ کے نام میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرتے وقت بھی صرف امام حسین کو یاد کرتے رہے۔ آنند شرما کے مطابق:

''تھوڑی دیر بعد فرمایا: حضرت حسین، سید الشہداء علیہ السلام کی عمر ساڑھے چھپن سال ہوئی تھی۔ میری بھی عمر ساڑھے چھپن کی ہے۔ اس رات آپ نے فرمایا'' ہمارا پلنگ وہاں ڈالو جہاں امام باڑہ سجا ہے''۔[۲]

رات میں آپ کے چھوٹے بھائی عابد میاں صاحب اٹھے تو انہوں نے امام باڑے کے پاس دیکھا کہ آسمان سے روشنی آ رہی ہے۔ صبح پتہ چلا کہ ان کا دیہانت ہوگیا۔[۳]

شاہ محمد حسن سجاد صاحب کا امام حسین سے عشق و مودّت کا یہ جذبہ دیکھنے میں کہیں اور بہت کم نظر آتا ہے کہ اپنی عمر کو اپنے آقا حسین کی عمر سے زیادہ نہ ہونے دینے کی خواہش، دم واپسیں، امام باڑے سے لو لگائے رکھنا وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ بالیں پر امامؑ ضرور تشریف لائیں گے۔ جیسا کہ آسمان سے آنے والی روشنی سے واضح ہے۔ موت کی تمنا کرنا مومن کی پہچان ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں فرمان ایزدی ہے۔ فتمنوا الموت ان کنتم صادقین (اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو)

خانقاہ نیازیہ کے موجودہ سجادہ نشین شاہ محمد حسنین عرف حسینی میاں، شاہ محمد حسن صاحب کے فرزند ارجمند ہی ہیں۔ جن کی ولادت ۱۱ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ کو بریلی میں ہوئی۔ یہی وہ تاریخ ہے جس میں خانقاہ کی وہ مشہور و معروف مجلس برپا ہوتی ہے جس میں ہر مذہب اور مسلک کے افراد شریک ہوتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے طرز پر عربی، اردو اور فارسی زبان پر دسترس حاصل کرکے دینی تعلم میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ جیسا کہ آپ کے نام سے واضح ہے محبتِ اہل بیت میں سرشار و سرمست ہیں۔ جب ایک خانقاہی نے آپ کے ماتم کرنے کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا ماتم کرنا ضروری نہیں سمجھتے لیکن اکثر اویس قرانی کی تاسی میں فرش عزاء پر خوب ماتم کرتے ہیں۔ بقولے یہ کیفیت جان بوجھ کر

۱- آنند شرما، سلسلۂ نیازیہ (ہندی) نیازیہ اکیڈمی بریلی جولائی ۲۰۰۰ء ص ۵۵ ۲- ایضاً ص ۵۹

۳- محمد قاسم نیازی، فضائل اہل بیت: سوال و جواب، خانقاہ نیازیہ بریلی ص ۳۵

نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ آپ کے دونوں بیٹے، شاہ عسکری میاں اور حسان میاں، نے اسی سال محرم میں اس زور کا ماتم کیا کہ اپنے ہوش کھو بیٹھے۔خصوصاً محرم کی سات تاریخ کو ماتم کرتے ہوئے بے ہوش ہوگئے اور جب ہوش میں آئے تو .E.C.G تک کی ضرورت محسوس ہوئی۔

دورِ حاضر میں خانقاہ نیازیہ میں عزاداری امام مظلوم،محرم کا چاند دیکھتے ہی شروع ہوجاتی ہے اور پہلا تعزیہ محلّہ پھول والان، چھوٹا دروازہ، میں جناب شکیل نیازی کے دولت کدہ سے برآمد ہوکر بریلی کی چند گلیوں اور بڑے بازار سے گشت کرتا ہوا خانقاہ پہنچتا ہے۔جس میں خود خانقاہی شامل ہوتے ہیں۔ خانقاہ میں چاند دیکھنے کے فوراً بعد تمام مستورات اپنی چوڑیاں اور زیورات اتار دیتی ہیں۔ یاد رہے کہ نواح بریلی کی شیعہ عورتیں چاند دیکھنے کے بعد امام باڑہ میں جاکر اپنی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔ خانقاہ نیازیہ میں اس دوران سب کا لباس سبز ہوتا ہے۔ سبھی خانقاہی صرف سبز کپڑے پہنتے ہیں۔ بقول مصطفی حسن نیازی ان دنوں میں جنسی تعلقات بالکل منقطع رہتے ہیں اور سوز وغم کے سایہ میں ایک مکمل پاکیزہ زندگی گزاری جاتی ہے۔ یکم محرم سے بارہ محرم یعنی سوئم شہداء کربلا تک دن رات لنگر جاری رہتا ہے۔جس سے بلا تفریق مذہب و ملت مخلوق خدا کے لئے عام دعوت کا اہتمام خود بخود ہوجاتا ہے۔ گویا امام حسینؑ کے صدقہ میں ان بارہ دنوں تک کوئی بھوکا نہیں سوسکتا ہے۔ خانقاہ کے بڑے امام باڑے میں ہر وقت ذکر امام مظلوم جاری رہتا ہے۔ ۴ محرم کو امام باڑہ سے ضریح مبارک اور جلوس علم برآمد ہوتا ہے۔ اس خاص جلوس کے علاوہ خانقاہ سے برابر چار، چار، پانچ، پانچ مرید اپنے ہاتھوں میں علم لئے ہوئے ننگے پاؤں یاحسینؑ ! یاحسینؑ کی صدا لگاتے ہوئے تیزی سے آس پاس کی گلیوں میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ چار محرم کو خانقاہی، سجادہ نشین اور ان کے مرید فقیر بنتے ہیں۔ یہ طریقہ اہل تشیع میں بھی رائج ہے۔لیکن مراد برآنے پر ایسا ہوتا ہے اور وہ محرم کی کسی بھی طے شدہ تاریخ میں ہی فقیر یا بہشتی بنتے ہیں۔ خانقاہ میں فقیر بننے کے لئے ایک ڈنڈا ہاتھ میں لے کر سر پر کلاوہ باندھ کر باقاعدہ جھولی پھیلا کر امام حسینؑ کے نام پر بھیک مانگی جاتی ہے۔ ۵ رمحرم کو خانقاہ کے بچے بہشتی بنتے ہیں۔جس کے لئے ہرا لباس زیب تن کرکے کمر میں پٹکا باندھ کر حضرت عباسؑ علمدار حسینی کی تاسی میں ہاتھ میں علم لے کر پانی، شربت یا دودھ پر نذر دے کر موجود سوگواران امام مظلوم میں اپنے ہاتھ سے منقسم کرتے ہیں۔ اس خانقاہ کا سب سے بڑا جلوس علم وتعزیہ چھ محرم کو برآمد ہوتا ہے۔ جو چوبیس گھنٹے تک بریلی میں گشت کرتا ہوا خانقاہ کے امام باڑے میں واپس آتا ہے۔ اس جلوس

میں تمام خانقاہی ننگے پاؤں ہر وقت تعزیہ کے ساتھ گشت کرتے ہوئے جگہ جگہ نذر دیتے ہیں۔ خصوصاً موجودہ سجادہ نشین، شاہ محمد حسنین کے بھائی، جن کے پاس خانقاہ کا خاص انتظام ہے۔ شبو میاں اس ۲۴ گھنٹے کے جلوس میں ننگے پاؤں رہ کر اکثر گھروں میں ان گھر والوں کی خواہش پر خود نیاز دیتے ہیں۔ محرم کی ساتویں تاریخ جو کہ جناب قاسمؑ اور فاطمہ کبراؑ (س) سے منسوب ہے اس تاریخ میں خانقاہ کی سبھی بہوئیں فقیر بنتی ہیں۔ ۸ رمحرم کو حضرت عباسؑ کی نذر اور حاضری ہوتی ہے جس میں خاص طور سے ادب ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ نویں محرم سے خانقاہ میں کوئی بھی پلنگ یا تخت پر نہیں بیٹھتا بلکہ سبھی لوگ چٹائی پر بیٹھ کر نوحے یا مرثیے پڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ شب عاشور بارہ بجے کے بعد سبھی سجادے موجود ہ سجادہ نشین کے ساتھ تعزیوں کی زیارت کو نکلتے ہیں۔ کم از کم پانچ امام باڑوں کے تعزیوں کی زیارت لازمی ہے۔ خانقاہ کے آس پاس کے مندرجہ ذیل امام باڑے زیادہ معروف ہیں۔

۱- خانقاہ کا امام باڑہ
۲- نذو خاں کا امام باڑہ
۳- بنے کا امام باڑہ
۴- امام باڑہ گلی وزیر علی میں بدل کا امام باڑہ
۵- عقیل کا امام باڑہ
۶- فتح نشان کا امام باڑہ

ان امام باڑوں کے علاوہ بریلی کی ہر اس مسلم آبادی میں جہاں خانقاہ کا اثر ہے (جو تقریباً پوری بریلی کے مسلمانوں پر ہے)، امام باڑوں کی کثرت ہے۔ اس طرح بریلی میں تقریباً ایک سو سے زیادہ امام باڑوں کا وجود ہے۔ محرم کی دس تاریخ قیامت کی تاریخ ہے۔ اس دن خانقاہ کے سبھی افراد دن بھر باوضو رہ کر عبادت اور عزاداری میں مشغول رہتے ہیں۔ ساتھ ہی اس وقت تک فاقہ سے رہتے ہیں جب تک کربلا میں تعزیے دفن نہ ہوجائیں۔ واپسی میں سبھی حضرات فاقہ شکنی کرتے ہیں، جسے ''توشے'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ نو محرم کی بنی ہوئی روٹی ہوتی ہے۔ جس پر بھنا ہوا گوشت رکھا جاتا ہے۔ خانقاہ میں روزِ عاشورہ روزہ رکھنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔ سبھی خانقاہی فاقہ سے رہتے ہیں۔ جس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے خاندان والے تین دن تک بھوکے پیاسے رہے ایسے میں انہیں صرف نیت کرنا تھی لیکن دین کے اس وقت کے سب سے بڑے معلم، مبلغ

اور محسن نے فاقے سے رہنا گوارہ کیا، روزہ کی نیت نہ خود کی اور نہ اپنے بچوں، صحابیوں اور گھر والوں کو اس کا مشورہ دیا کیونکہ دین کی بقاء کے لئے یہی ضروری تھا۔ لہٰذا امام حسین کی تاسی میں روزہ نہ رکھ کر صرف فاقہ کیا جاتا ہے۔ گیارہ محرم کا تذکرہ ہو چکا ہے جس میں ایک خاص مجلس برپا ہوتی ہے جس میں کوئی شیعہ ذاکر خطاب کرتا ہے اور انجمن ہائے ماتمی نوحہ خوانی کرتی ہیں۔ اس مجلس میں بطور تبرک حلوہ پراٹھا تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس مجلس میں مجمع مخلوط ہوتا ہے اور تبرک کے لئے تقریباً پورا شہر امنڈ آتا ہے۔ بارہ محرم کو شہدائے کربلا کے سوئم کی تاریخ ہے، اس تاریخ کو بارہ ہی دیگیں کھچڑے کی تیار کر کے امام حسینؑ کے نام پر نذر کے بعد مخلوق خدا میں تقسیم کردی جاتی ہیں۔ اس روز سوئم کی فاتحہ کے بعد سوگ بڑھادیا جاتا ہے۔ لیکن چہلم تک سرخ کپڑے نہیں پہنے جاتے۔ نہ کوئی خوشی کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کڑھیا بھی نہیں چڑھتی۔ سوئم سے اربعین تک برابر سبیل جاری رہتی ہے۔ لیکن روز عاشورہ کی طرح چہلم کے دن بھی کربلا میں لنگر جاری رہتا ہے۔ یہ لنگر کبھی کبھی چھوٹی کربلا (منسوب بہ شیعان) میں بھی جاری کیا جاتا ہے۔

ان تمام جلوسوں اور دیگر اہتمام کے علاوہ محرم کی خاص اہمیت جو اسی خانقاہ کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری جگہ کو حاصل نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو شاذونادر ہی کہیں ہوگی۔ یہاں عاشور کو ایک ایسی تسبیح دکھائی جاتی ہے جو ٹھیک بارہ بجے کے بعد خود بخود خون آلود ہوجاتی ہے۔ اس کے لئے اہتمام یہ کیا جاتا ہے کہ خانقاہ کے کھچاکھچ بھرے ہوئے امام باڑے کے ہال میں گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر اس تسبیح کو بلند کیا جاتا ہے تا کہ سبھی حضرات دیکھ لیں کہ تسبیح پر کسی طرح کا کوئی سرخ نشان نہیں ہے۔ ۱۱ بج کر ۴۵ منٹ سے بارہ بجے تک یہ تسبیح اسی طرح بلند رکھی جاتی ہے اور جیسے ہی بارہ بجتے ہیں، اس تسبیح پر خون کے نشان ابھرنے لگتے ہیں۔ جسے دیکھ کر مجمع چیخیں مار کر، دہاڑ، دہاڑ کر روتا ہے اور سینہ کوبی کرتا ہے، اس طرح یہ منظر خاص طور پر قابل دید اور عبرتناک ہوتا ہے۔

ممکن ہے اس تسبیح میں اُس خاک کا کوئی جز پایا جاتا ہو جسے خود حضور اکرمؐ نے اپنی زوجہ ام المومنین جناب ام سلمہ کو یہ کہہ کر سونپ دیا تھا کہ جب یہ خاک خون اگلنے لگے تو سمجھ لینا کہ میرا حسینؑ شہید کردیا گیا۔ دسویں محرم ۶۱ ھ کو ایسا ہی ہوا اور جب یہ خاک خون آلود ہوگئی تو بی بی ام سلمہ نے سمجھ لیا جگر پارہ رسول شہادت سے ہمکنار ہو چکا ہے۔

بریلی میں جہاں حسینؑ کا غم گلی گلی کوچہ کوچہ میں برپا ہوتا ہے، وہیں اس عزاداری کو روکنے کے

لئے ہر سال محرم سے قبل کچھ خود ساختہ علما کے فتوے جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ فتوے بٹتے بھی ہیں اور دیواروں پر چسپاں بھی کئے جاتے ہیں۔ اور عزاداری امام حسینؑ کو بدعت بتا کر ختم کرنے کی پوری کوشش اور سازش کی جاتی ہے۔ بقول قلم سیتھلی:

کل تھا بیعت کا تقاضہ آج بدعت کا سوال
رُخ بدل کر آرہے ہیں شامیان کربلا

جب کہ بریلوی مسلک کے بانی فاضل بریلوی جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب کی ایک تحریر ماہنامہ اعلیٰ حضرت میں شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے شبیہ روضہ امام حسینؑ (یعنی تعزیہ) بنانے کو جائز لکھا ہے۔ مزہ کی بات تو یہ ہے کہ بریلی کے عوام پر بدعت کے ان فتووں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بریلی کی گلیوں میں پہلی محرم سے ہی تعزیوں کا گشت شروع ہوجاتا ہے۔ اور ساتویں آٹھویں محرم کو بریلی کی تقریباً ہر گلی میں ایک تعزیہ سجا ہوا ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ہر طرف کھچڑے کی دیگیں اترتی اور بٹتی نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہر تیسرے گھر میں ذکر شہادتین، سلام، نوحوں، مرثیوں اور تقریر کی شکل میں شہداء کربلا اور اسیران کربلا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ بریلی علم و ادب کا گہوارہ بھی ہے، جہاں شعراء حضرات کی ایک کثیر جماعت موجود ہے۔ تمام سال طرحی اور غیر طرحی مشاعرے اور نشستیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ماہ محرم میں یہ مشاعرے اور نشستیں مسالموں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ بریلی شہر میں ان دس دنوں میں تقریباً بارہ طرحی اور نہ جانے کتنے غیر طرحی مسالمے منعقد کئے جاتے ہیں۔

خانقاہ نیازیہ سے غیر فطری اور بدعتی فتووں کا مدلل جواب دیا جاتا ہے اس ذیل میں محمد قاسم نیازی صاحب کی ایک کتاب ''فضائل اہل بیت سوال و جواب'' سال گذشتہ ہی شائع ہوئی ہے جس میں ان سوالوں کا مدلل جواب دیا گیا ہے جو اہل بیتؑ اور عزاداری سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے ص ۳۳ پر بابا فرید کے بارے میں تحریر ہے۔

''حضرت بابا فرید شکر گنج کے واقعات میں ہے کہ جب آپ حضرت امامؑ کا ذکر سنتے تھے یا کرتے تھے تو روتے روتے بے ہوش ہوجاتے تھے''۔

اسی کتاب کے ص ۳۲ پر اکابرین دین وعلماء کے افکار اس طرح پیش کئے ہیں:

''شواہد النبوۃ میں لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ، شہید ہوئے تو مچھلیاں نہر فرات سے تڑپ تڑپ کر باہر نکل آئیں اور خاک میں لوٹنے لگیں۔ ہر طرف سے رونے کی آواز آتی تھی مگر رونے والا کوئی نظر

نہیں آتا تھا۔قبیلۂ (نبی طے) نے وہ مرثیہ سنا جو جنات حضرت امامؑ کی شہادت میں پڑھ رہے تھے“۔

امام زہری سے روایت کہ اس دن آسمان سے خون برسا اور بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا جاتا تھا، اس کے نیچے سے تازہ خون نکلتا تھا۔

تاریخ اعثم کوفی میں لکھا ہے جس وقت حضرت امامؑ شہید ہوئے اس وقت ایک سرخ آندھی اٹھی اور پوری دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔

صواعق محرقہ میں لکھا ہے کہ جناب امامؑ پر سات دن تک آسمان رویا اور درودیوار سرخ ہوگئے۔ تین روز تک بار بار اندھیرا چھا جاتا تھا۔ دیلمی نے حضرت عمار بن یاسر سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: آسمان یا تو حضرت یحییٰ پر رویا تھا یا میرے بیٹے حسینؑ کی شہادت پر روئے گا اور چالیس دن تک سورج سرخ رہے گا“۔

خانقاہ نیازیہ سے وابستہ اکثر حضرات خصوصاً شاہ نیاز صاحب کے خانوادہ کے افراد صاحب علم و دانش ہیں۔ یہاں شاعری کا بھی عام چرچا ہے۔ لہٰذا یہاں کے سبھی شاعر سلام اور نوحہ ضرور لکھتے ہیں۔ مرثیہ لکھنے کا رواج بھی اس خانقاہ میں عام ہے۔ یہاں شاہ نصیر میاں نیازی المعروف بابا صاحب جن کی سرپرستی میں تمام شہر بریلی کے شاعر ایک روز خانقاہ میں جمع ہوکر اپنا کلام سنا کر صحت کی سند حاصل کرتے ہیں، کے مرثیہ کے چند بند تحریر کئے جاتے ہیں۔

مقصد زیست ہے کیا، مدح شہنشاہ امم تابہ کے ضبط کہ اب ضبط سے گھٹتا ہے دم
جان رحمت تجھے اس رحمت عالمؐ کی قسم اب تو دیرینہ گنہگار پہ ہوجائے کرم
تیری رحمت سے مجھے اذن ثنا مل جائے
دامن حضرت زہرا (س) کی ہوا مل جائے

کربلا آیا ہے خود آج شہادت کے لئے خون بہانا ہے فقط دین کی عزت کے لئے
جان دینا ہے اسے حق و صداقت کے لئے مضطرب کب سے ہے یہ بخشش امت کے لئے
سب گوارا ہیں غم و رنج و مصائب اس کو
اپنے نانا کی خوشی چاہئے صاحب اس کو

مختصر یہ کہ خانقاہ نیاز یہ میں روز اول سے آج تک عزاداری امام حسینؑ کا اہتمام بڑی عقیدت اور خلوص سے کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی تحفظ عزاداری کے لئے بھی کارگر تدبریں کی جاتی ہیں۔ جس طرح

اس خانقاہ کے مرید ہر قبیلہ، مذہب اور مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، اسی طرح یہ سب کے سب عزاداری امام حسینؑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ ہی نہیں لیتے بلکہ اسے آپسی بھائی چارے اور رواداری کا محور بھی مانتے ہیں۔ ساتھ ہی مخلوق خدا میں اتحاد و اخوت کا ذریعہ سمجھتے ہوئے عزاداری کے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے کر تبلیغ دین کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ اور مقصد شہادت حسینؑ عام کرکے تبلیغ دین مبیں کا کام انجام دیتے ہیں۔

ہولکر حکمران اور محرم

ڈاکٹر جے۔سی۔ اپادھیائے ☆

ہولکر حکمرانوں نے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے آپسی میل جول اور مذہبی رواداری کی مثال قائم کی تھی۔ مسلم حکومت کے لمبے دور میں مالوہ میں مسلمانوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہولکر حکومت کے قیام اور استحکام میں افغان، ترکی اور عربی سپہ سالاروں نے سرگرم تعاون کیا تھا۔ ہولکر حکمراں ہر تیوہار خواہ دسہرہ ہو یا محرم میل ملاپ اور عقیدت کے ساتھ مناتے تھے۔ ہندو تیوہاروں کی طرح ہی مسلم تیوہاروں پر بھی پورے شہر میں حکومت کی جانب سے خاص انتظام کیے جاتے تھے۔

کسی زمانے میں اندور میں ہولکر حکمرانوں کے کئی کئی منزلہ اونچے اونچے قطب مینار نُما چوکور تعزیے پورے ملک میں مشہور تھے جو محرم کے پاک مہینے میں نکالے جاتے تھے۔ اس طرح کے تعزیے بنوانے پر اس زمانے میں تین ہزار روپے خرچ ہوتے تھے ۔ بعد میں منزلوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ پہلے گیارہ، پھر ۹ منزلیں اور پھر ۷ ہوگئیں اور اب یہ تعزیہ صرف ایک منزل کا رہ گیا ہے۔ لیکن جو چیز کم نہیں ہوئی ہے وہ ہے اس کے تئیں عقیدت آج بھی دیوی شری اہلیہ خانگی ٹرسٹ سے پانچ سو ایک روپیہ تعزیہ بنانے کے لیے دیئے جاتا ہے۔ سال ۲۰۰۶ میں ٹرسٹ کی جانب سے تعزیہ بنانے کے لئے دو ہزار روپیہ دیئے گئے۔ تعزیہ کے لئے حکومت کی جانب سے گوپال مندر کے پاس ۱۹۰۸ء میں ۱۲،۰۰۰ روپیہ خرچ کر کے امام باڑہ تعمیر کرایا گیا تھا آج بھی قایم ہے۔

ہولکر حکمرانوں کی جانب سے محرم کی تیاری کے سلسلے میں سبھی انتظامیہ دفاتر کو خاص احکام جاری کیے جاتے تھے۔ کب، کہاں اور انتظام ہونا ہے اس کے مختلف شعبوں کو احکام جاری کیے جاتے تھے۔

سرکاری نجومی پندرہ روز قبل نیک گھڑی کی اطلاع دے دیتا تھا۔ اس کے بعد سبھی حکومتی شعبوں کو محرم کی چاند رات سے تیرہویں رات تک کے سارے انتظامات کے لیے احکامات جاری ہوتے

☆ اندور

تھے۔ شہر قاضی کو امام باڑے میں بلا کر چوکی وغیرہ دھلوانے کا انتظام سونپا جاتا تھا۔ حکومت کے افسران، وزرا، انسپکٹر جنرل پولیس، اور ضلع جج کو مختلف انتظامات اور ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔

کچھ فقیر راج باڑے میں آتے انھیں باقاعدہ تعزیے کی تعمیر کے لیے بانس، لوبان، اگر بتی، ہار، پھول، تبرک (بتاشے) اور چراغ جلانے کے لیے چار آنے (موجودہ ۴۰۰ روپیہ) دیئے جاتے۔ مخصوص راتوں میں فوج کا بینڈ بھی چلتا تھا۔ رات ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک پروگرام چلتے رہتے۔

چاند رات

جس رات محرم کا چاند نظر آتا تھا اسے چاند رات کہا جاتا۔ محرم کا پہلا روز اسی چاند رات کے دوسرے روز سے شروع ہوتا تھا۔ چاند رات کو چاند دیکھتے ہی شہر قاضی اور تابوت کے فقیر ایک لکڑی کی چوکی سجا کر اس پر عود دان رکھتے تھے اور اسے شاہی ملازم کے سر پر رکھ کر امام باڑے سے راج باڑے کے پیچھے نذر باغ میں لایا جاتا تھا۔ یہاں وہ چوکی رکھ کر فقیر درود پڑھتے تھے۔ تبرک کی شکل میں بتاشے بانٹے جاتے تھے۔ پھر اس چوکی کو امام باڑے میں لا کر تعزیے کے سامنے رکھا جاتا تھا۔

چاند رات سے قبل کی رات تک ہر روز امام باڑے پر ماتمی ساز بجتے تھے۔ تابوت کی حفاظت کے لیے ایک سپاہی فوج کی جانب سے اور ایک خاص بردار کی جانب سے، دو سپاہی پہرے کے لئے امام باڑے پر لگائے جاتے تھے۔

پانچواں دن

اس روز فوج کے کچھ لوگوں کو فقیری (کپڑے وغیرہ) دیئے جاتے تھے۔ فقیری کی شکل میں فوج کے کمانڈر ان چیف کو ریشمی دوپٹہ اور کفنی کے لئے کپڑا دیا جاتا تھا اور باقی لوگوں کو سادہ دوپٹہ اور رنگین کفنی مہاراج کی جانب سے دی جاتی تھی۔ تعزیے کے انتظام کے لئے امام باڑے میں پولیس کا بندوبست ہوتا تھا اور محرم کی آٹھویں تاریخ تک روز رات کو ۸ بجے سے رات ۱۱ بجے تک فوج کا بینڈ بجایا جاتا تھا۔

ساتواں دن

محرم کی ساتویں اور آٹھویں تاریخ کو ایک رنگ کیئے ہوئے ڈبے پر ایک کماں دار آڑا بانس باندھ کر اس کے دونوں سروں پر کھلی تلواریں لٹکا کر جلوس نکالا جاتا تھا۔ اسے علَم بھی کہتے تھے۔ علم کے جلوس

میں مندرجہ ذیل شامل ہوتے تھے:۔

۱- گھوڑ سوار ۲۵
۲- پیدل سپاہی ۴ (سنتور اور بانسری بجانے والے کے ساتھ)
۳- خاصے سے گھوڑے ۵
۴- خاصہ برادر ۵
۵- قرابین بیڑے کے سپاہی ۸
۶- ڈفلی والے ۴
۷- ہلکارے ۲
۸- جاسود ۲
۹- بھالے والے ۲
۱۰- بلسار ۱
۱۱- چوبدار ۱
۱۲- ہاتھی ۱

فوج کے کچھ لوگ فوجی معیار کے مطابق وردی پہن کر ہاتھی پر بیٹھتے تھے اور کچھ پیدل چلتے تھے۔ علم کے برابر جو عود دان ہوتا تھا اسے ایک سرکاری ملازم اپنے سر پر لئے ہوتا تھا۔ یہ جلوس دو روز نکلتا تھا۔ مہاراج کی جانب سے جو رقم ملتی تھی وہ ہاؤس ہولڈ افسر کے حکم سے انعام کے طور پر بٹتی تھی۔

محرم کی ساتویں تاریخ کو مہاراجہ ہولکر سونے چاندی کے زیورات سے سجے ہاتھی پر چاندی کے ہودے میں بیٹھ کر امام باڑے آتے تھے۔ فاتحہ اور درود اور نماز کے بعد مہاراج تعزیہ بنانے والوں کو نقد انعام دیتے تھے۔ 'سیلیاں' (جنیؤ کی طرح) کاندھے سے کمر تک پہنی جانے والی دھاگوں کی چمکیلی مالا بانٹتے تھے۔ مہاراج خود بھی سیلی پہنتے تھے۔

ساتویں تاریخ کو رات کو ۴۰ کلو آٹے کی روٹیاں اور پندرہ کلو مسور کی دال تیار کی جاتی تھی جسے ''چھاندہ'' کہا جاتا تھا۔ یہ چھاندہ فقیر لوگوں اور تابوت کے حقدار لوگوں میں بٹتا تھا۔ آٹھویں تاریخ کو گڑ کا شربت تیار کر کے فقیروں کو پلایا جاتا تھا۔

نویں تاریخ ''قتل کی رات''

تابوت کی 'سرگس' اس روز کا خاص پروگرام رہتا ۔ اس کے لیے صبح 'خاص نیز' کارخانے کے لوگ اور بھوئی اور خلاصی کمیٹی کے افسران سمیت امام باڑے پر آتے تھے۔ تابوت کی ساتوں منزلیں ایک پر ایک رکھ کر بجائی جاتیں۔ تعزیے کے اوپر کے ڈھانچے کو مضبوط کسنے کے بعد اسے اٹھانے کے لیے ایک بلی پر نو نو بھوئی اور ایک ایک نایک تعینات کیا جاتا تھا۔ رات ساڑھے دس بجے تعزیے کو درود پڑھ کر فوج اور شاہی لوازمے کے ساتھ شوبھا یاترا (گشت) پر نکالا جاتا تھا۔

مہاراجہ جونے باڑے سے قتل کی رات کا جلوس دیکھتے تھے۔ جونے باڑے کے خاص دروازے کی دوسری اور تیسری منزل پر مہاراجا ہولکر اپنے وزراء، سرداروں، راجے راجوڑوں وغیرہ کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ڈیلی کالج، کے سبھی شہزادے طلباء، اساتذہ اور یوروپین افسران وغیرہ بھی شامل ہوتے ۔ جونے راج باڑے کی تینوں جانب کے جھروکوں میں بھی شاہی خاندان یا دوسرے چھوٹے بڑے افسروں کی بہو بیٹیاں، بہنیں بیٹھتی تھیں۔

تعزیے کا جلوس راج باڑے کے پیچھے سے 'پچھڑی ڈیوڑھی' کے سامنے دونوں راج باڑوں کے بیچ کی سڑک سے راج باڑے ہوتا ہوا گوپال مندر سے کھجوری بازار، شکر بازار، بوہرہ بازار، بجاج خانہ چوک سے پیپلی بازار میں راج گورو، شاہی استاد کے گھر کے سامنے ہوکر پھر امام باڑے پہنچتا تھا۔ راج گورو کے گھر کے سامنے تابوت کا جلوس رُکتا تھا۔ راج گورو تعزیے پر ریوڑیاں اور گلاب کے پھول چڑھاتے اور جلوس پھر چل پڑتا۔ تعزیے کے اوپر دونوں طرف دوسرکاری مُلہاری مارتنڈ، اکھاڑے کے استاد کو شاہی استاد انعام دیتے۔

ہیجڑے چاندی کے چنور اس وقت تک ہلاتے رہتے جب تک کہ جلوس ختم نہ ہوجاتا۔ جلوس کے خاتمے پر تعزیے کو پھر امام باڑے میں اسی جگہ رکھ دیا جاتا تھا۔ اس جلوس کے ساتھ مندرجہ ذیل سرکاری عملہ ہوتا تھا۔

۱- فوج کی جانب سے ڈنگا نشان سوار ۵۰
۲- بینڈ سمیت پلٹن
۳- خاصہ بردار (افسروں سمیت) ۵۰
۴- قرابین بیزہ (نشان سمیت) ۵۰

۵- ہلکارے چپراسی (افسروں سمیت) ۵۰
۶- جاسود (نائیکوں سمیت) ۹
۷- بھالےکری (لگی بلم سمیت) ۵
۸- چوبدار (چاندی کی چھڑوں کے ساتھ) ۵
۹- خاصے گھوڑے

دس محرم

محرم کی دسویں تاریخ یعنی تابوت کے ٹھنڈا کرنے کا دن۔ اس روز تابوت کو درود پڑھ کر وقت مقررہ پر قریب ساڑھے چار بجے کربلا میدان پر جلوس کی شکل میں لے جایا جاتا۔ جلوس کے شروع ہونے سے قبل فوجی اور شاگرد پیشہ پہلے سے ہی امام باڑے پر تیار رہتا تھا۔ تعزیئے کا جلوس امام باڑے سے نکل کر دونوں راج باڑوں کے بیچ سڑک کے راستے سے راج باڑے کے خاص دروازے پر پہنچتا۔ اس کے بعد راج باڑے کے دو پھیرے لگا کر آڑا بازار، پنڈھری ناتھ، ہنس سدھی سے پرانے موتی بنگلے کے سامنے سے ہوتا ہوا کربلا پہنچتا۔ وہاں بنے ہوئے پکے اوٹلے پر تعزیہ رکھا جاتا۔ یہاں تعزیے کو سلامی دے کر عملے کو چھٹی دے دی جاتی۔

محرم کی دس تاریخ کو تعزیہ دفن کرنے کربلا کے میدان لے جاتے ہیں۔ قتل کی رات کی طرح ہی سارا سرکاری عملہ تعزیئے کے ساتھ رہتا ہے۔ مہاراج ہولکر بھی سجے ہوئے ہاتھی پر بیٹھ کر بلا میدان جاتے تھے۔ سرکاری تعزیہ دن کو چار بجے امام باڑے سے چل کر جونے راج باڑے کے دو چکر لگاتا۔ راج باڑے کے خاص دروازے پر مہاراج کا ہاتھی سلامی کی شکل میں کھڑا رہتا۔ مہاراج پہلے تعزیے کو ''سیلی'' و''پنچک'' چڑھاتے۔ مہاراج کے چاندی کے ہودے میں، بیٹھتے ہی شاہی جلوس شروع ہو جاتا۔ مہاراج کے ساتھ برطانوی فوج کا پورا ایسکورٹ چلتا تھا۔ مہاراج ہولکر اس جلوس میں ہرا کرتا اور لال ہولکری پگڑی باندھے ہوتے جلوس راج باڑے سے اڑا بازار، پنڈھری ناتھ مندر سے موجودہ پھول منڈی، موتی تبیلے کی ریپٹ سے موتی بنگلا ہوتا ہوا کربلا میدان پہنچتا تھا۔ جلوس میں دوسرے ہاتھیوں پر وزیر اور اعلیٰ افسران سوار رہتے تھے۔ جلوس کے کربلا پہنچتے ہی مہاراج ایک خاص شامیانے میں آرام فرماتے۔ سرکاری تعزیہ آتے ہی ایک مضبوط چبوترے پر رکھ دیا جاتا۔ مہاراج شامیانے سے نکل کر تعزیے کا ایک چکر لگاتے اور پھر پانے گلے کی 'سیلی' 'پنچک' ندی میں بہاتے۔ پھر

تعزیے کی تدفین ہوتی۔

بارہ محرم

اس روز کو تعزیے کا آخری دن کہا جاتا ہے۔ اس روز سوئم کا پروگرام ہوتا۔ فقیر اور تعزیے کے حقدار لوگوں کو امام باڑے میں کھانا دیا جاتا۔ زعفرانی چاول (زردہ) خاص کھانا ہوتا تھا۔ سوئم ختم ہونے پر شام کو کربلا میں تعزیہ اٹھانے والے بھوئی اکھاڑے والوں اور دوسرے حقدار لوگوں کو پہلے سے طے شدہ رقم کا انعام دیا جاتا تھا۔

تیرہ محرم

اس دن صبح تعزیے کے فقیر، بھوئی، کمیٹی کے افسران اور ملازمین کربلا آ کر تعزیہ کھولتے تھے اور اس کی ایک ایک منزل ندی میں بہاتے تھے۔ اس کے کانچ، لکڑی کے کھمبے اور ابری، وغیرہ امام باڑے میں لا کر رکھتے۔ اس کے بعد امام باڑے میں شروع سے تعینات پہرے داروں کو چھٹی دی جاتی اور امام باڑہ بند کر دیا جاتا۔ اس طرح محرم کا تیوہار ہولکر ریاست میں اختتام پذیر ہوتا تھا۔

حکومت کی غیر فرقہ وارانہ پالیسی اور انصاف کے ساتھ گھل مل کر ہندو مسلم قومیں ہر تیوہار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ اس طرح ہولکر ریاست میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کے ہولکر حکمرانوں کی مذہبی رواداری تمام مذاہب سے یکساں احترام اور فرقہ وارانی ہم آہنگی کی تھی۔

ملک کی تقسیم سے پہلے ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ کے اخبار ''الناطق'' میں زیرِنظر مضمون شائع کیا گیا تھا۔ جسے جنرل موہیال سبھا نے اب اسے پمفلٹ کی صورت میں موہیالی بھائیوں کی واقفیت کے لئے شائع کیا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کا موئے مبارک جو موہیال ویر راہب دت کے خاندان کے پاس بطور تبرک محفوظ تھا۔ چند سال ہوئے سری نگر میں شیعوں کی عبادت گاہ کے حوالے کردیا گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی متعلقہ تاریخی دستاویزات بھی پیش کی گئی تھیں جو اب بھی محفوظ ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری قوم کے سردار نے حق اور باطل کی جنگ میں حق کے علمبردار حضرت امام حسینؑ کا ساتھ دیا۔

جنرل موہیال سبھا نے اس قسم کی تاریخی دستاویزات کو پمفلٹوں کی صورت میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ موہیال بھائیوں سے درخواست ہے کہ ان کے پاس اس طرح کی جو دستاویزات ہوں وہ ہمیں بھیج دیں تاکہ انہیں شائع کیا جائے۔

جے دیوناتھ دت
جنرل سکریٹری جنرل موہیال سبھا رجسٹرڈ
چاولی گنج کشمیری گیٹ دہلی - ۶

شہیدانِ کربلا کے فدائی ہندو

شاہ نذیر ہاشمی غازی پوری

ہندوستان کی میدانی اقوام میں جو گنگا اور جمنا شہرجو اور گھاگرا کے حواشی اور الہ آباد، بنارس اور گورکھپور کی زرخیز اور مردم خیز کمشنریوں میں آباد ہیں، براہمنوں کی ایک کثیر تعداد قوم ''بھومیار'' ہے۔ اس کے نوجوانوں کے مضبوط اور خوبصورت ڈیل ڈول۔ اس کے گورے چٹے پنڈے اور اس کی زمینداریاں اور زمانہ حال کی ترقیوں سے اس کا مالا مال ہونا، یہ سب اس کی امتیازی خصوصیات ہیں جو اس کی جانب تحقیق کی نظر کو بیساختہ بُلند کرتی ہیں۔ اصل میں یہ لفظ ''موہیہال'' تھا۔ رفتہ رفتہ بھومیا ہوگیا۔ انھیں کو پورب کے اضلاع میں باہمن بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ وسط ایشیا کے آریا جنم بھوم سے آئے تھے۔ عزم راسخ اور حق کی حمایت ان کا شیوہ تھا۔ ان کو ''موہیال'' یعنی موہی زمین اور دال یا والد اضافی نسبت سے زمین والد کہتے تھے۔ س کی سات ذاتیں ہیں۔ دت۔ وید۔ چھبر۔

بالی ۔ موہن ۔ لو ۔ بھمیوال ۔ اس قوم کے کارناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرب وسط ایشیا افغانستان اور ایران ایسے ممالک میں اپنے ڈنکے بجا چکے ہیں ۔

آج بھی عالی جناب مہاراجہ صاحب بہادر بنارس، مہاراجہ صاحب بابا، مہاراجہ صاحب تہوا، مہراجہ صاحب ٹیکاری، راجہ صاحب لال گولا اور راجہ صاحب تمکو ہی وغیرہم اسی قوم بھونیہار کے مشاہیر سے ہیں ۔ تاریخی حیثیت سے ظاہر ہے کہ اس قوم کا نشان مہابھارت سے پہلے تھا ۔ اس زمانے سے تاایندم یہ لوگ ہندوستان کے ہر شعبہ علم اور عمل میں دلچسپی لیتے رہے ۔ ان کے خاندانی خطابات مہتہ، بخشی، رائے زادہ ،ملک اور رائے سے ظاہر ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف دور حاکمیت میں صاحب خطاب و با اثر تھے ۔ ان کا سلسلہ بہار، صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں راولپنڈی، جہلم، سیالکوٹ، گورداسپور، ہوشیار پور اور جالندھر میں بہت دور تک بڑی تعدد میں پھیلا ہے ۔ اس قوم کی دتّ ذات اور ذاتوں میں مشہور ہے ۔ دت کہا جاتا ہے کہ سنسکرت کے لفظ داتا کا اختصار ہے اور داتا کے معنی فیاض کے ہیں ۔ چونکہ یہ قوم بہت اولوالعزم، جنگجو اور سیاح تھی اس لیے اس کے کارناموں اور چرچوں سے کہاوتوں، گیتوں، مثالوں اور کہانیوں کو زینت دی گئی ہے ۔

حال میں عراق، عرب کے ریگ زاروں میں اور قدامت کے برآمد شدہ ڈیروں میں ایسے آثار ملے ہیں جن پر کبھی منادر کے ہونے کا شبہ ہوتا ہے ۔ غالباً یہ اسی قوم کے باقیماندہ عبادت خانوں کے مدفون اور مرحوم نشانات ہیں ۔ افغانستان میں بڑے بڑے عہدوں اور ذمہ داریوں کے مالک یہ دت ذات بھونیہار کے براہمن ہیں ۔ ان کے عادات اور معاشرتی انداز بتا رہے ہیں کہ ان کو جہاں نوردی، قوت آزمائی اور سچائی کی حمایت کا شوق تھا ۔ ان کے ساتھ بھاٹ، شاعر اور کبت گو منجملہ اور لوازمات قافلہ آرائی کے ہوتے تھے ۔ یہ ذریات اس ذات کے حسن و عشق کے کارناموں، جنگ و جدال کے واقعات اور مختلف ممالک کے سیاحانہ، فتوحانہ واقعات کو مختلف طریقوں سے نظم میں شاعرانہ تلمیحات کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے ۔ ان کا فرض ہوتا تھا کہ شادی اور غمی کے موقعوں پر جب دتّ ذات کے مشاہیر اور اکابر کا مجمع ہوتا تو اپنی اپنی شاعری سے ان کو خوش کرتے اور طالب انعام ہوتے تھے ۔ پرانے ہندوستان کے نہایت دلچسپ اور صحیح یادگار واقعات رفتگانِ الٰہی کے نظمیہ قصوں اور داستانوں میں محفوظ ہیں ۔ اسی قسم کا ایک کبت دتّ ذات میں اب تک سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ دتّ ذات کے آباواجداد کسی زمانہ میں نخلستان عرب میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے اور اس

صحرائی قدرتی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے تمام قومی لوازم اور خصوصیات رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف صحر نشیں تھے بلکہ وہاں کے عربی قبائل کے اقدامات اور مبارزات باہمی میں ایک نہ ایک فریق کے شریک کار ہوتے تھے۔

دتّ ذات کا شیوہ تھا کہ وہ مختلف ممالک اور قطعات عالم روندا کرتی تھی، کوہ و دریا عبور کرتی تھی اور اس سیاحانہ گردشِ ارضی میں جہاں کوئی بہادرانہ معرکہ گرم ہوتا تھا اس میں وہ مظلوم کے ساتھ ہوکر حقدار کے لیے سرفروشی کرتے تھے۔ اسی طرح وہ شہادتِ زار کربلا میں قافلۂ حسینؑ کے ساتھ ہوکر یزیدی لشکر کے خلاف صف آرا رہے اور اپنی قوم کے سات پہلوانوں اور حرب آزماؤں کو نذرِ حسینؑ کردیا۔ اس قوم کا جو ''کبت'' انگریزی تواریخ کے ضمیمہ جات میں مرقوم ہے، وہ شاہد ہے کہ یہ ذات براہمن عرب میں شریف اور معزز خیال کی جاتی تھی، وہاں اس کا اقتدار تھا۔ اس کو ''اہلِ بیتؑ'' سے خاص شغف اور عقیدت مندی تھی اور یہ ایک خدا کے ماننے والے تھے۔ چونکہ ''کبت'' مکمل نہیں ہے اور زبان اس کی قدیم پنجابی ہے، اس لئے بہت سے امور افق لیے قدامت میں دُھندلے نظر آتے ہیں۔

ایک بیان جو اس کے اشعار سے مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب شہدائے کربلا آسودہ شہادت ہوچکے اور امتحان و ابتلا کی تمام حجت اپنے اوپر ختم کرچکے تو اسی ذات دتّ براہمن کے ایک نامور سردار راہب نامی نے بقیۃ السیف و ماندگان حق کی حفاظت میں اپنے بہترین فرزندوں کو یکے بعد دیگرے قربان کردیا۔ یہاں تک کہ وہ مذبح حسینیؑ کے نظارۂ بیکسی سے دلگیر ہوکر پھر عرب کو خیرباد کہہ کر ہندوستان چلے آئے۔ مگر اس کے اندر بعض اشارات ایسے ہیں جن سے انتقام حسینؑ کا کنایہ ظاہر ہے۔ غالبًا حضرت مختار علیہ الرحمۃ نے جب خونِ حسینؑ کا بدلہ لیا تھا اور کوفہ کی زمین کو یزیدیوں کے خون سے سرخ اور شاداب کردیا تھا اس وقت دتّ ذات کا راہبؔ نامی سردار اپنی فوج کے ساتھ شریک حضرت مختار علیہ الرحمۃ رہا ہوگا۔ کیونکہ خون حسینؑ کے بدلہ لینے اور کوفہ کے تاراج کرنے کی خوشی کا اثر کبت میں ہے۔ یا کربلا کے معرکۂ کارزار اور انتقام حسینؑ کے مجاہد، ان دونوں موقعوں پر راہبؔ اور اُس کے جاں نثاران طرفدار امام مظلوم رہے۔ بہرحال وہ فدایانِ حسینؑ میں رہے۔

رائے زادہ رتن چند وید مرحوم نے اپنی تاریخ مونیہال میں لکھا ہے کہ جب راجہ پورس اور سکندر اعظم میں جہلم کے قریب جنگ ہوئی تھی موہیال لوگ راجہ کے شریک تھے۔ سکندر کو اس قوم کی بہادری دیکھ کر ان سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ اپنے ساتھ ایک فوج اسی ذات کے جوانوں کی لے کر

واپس گیا۔ یہی فوجی جماعت عرب اور مقدونیہ میں پھیلی اور سرگرم کارزار ہی۔ گمان غالب ہے کہ یہی منتخب جماعت عرب میں آباد ہوگئی ہوگی اور اسی نے شہدائے کربلا کی رفاقت اور خدمت کو اپنے لیے سعادت دارین سمجھ کر اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا ہوگا۔

ایک اور بیان ہے کہ مہابھارت کی خونریز بھارت کُش اور تباہ کن جنگ کے بعد درون آچاریہ کے بیٹے اسوستھامہ کو عرب کی سمت جلا وطن کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ایک بڑی جماعت نے بھی اپنے آپ کو جلاوطن قرار دیا اور اس کے جلو میں ساتھ ساتھ عرب اور اس کے سرابستانوں میں زندگی بسر کی۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ دتّ براہمن ''اولوالعزم'' اور ''جہان پان'' تھے۔ ان کی بڑی تعداد وسط ایشیا اور خصوصاً افغانستان اور کافرستان میں پہنچ کر آباد ہوگئی۔ ان کا بڑا حصہ اسلام کی سادگی، خداپرستی اور تہذیب سے اثر پذیر ہوکر بعد کو مسلمان ہوگیا اور پٹھانوں میں جذب ہوگیا۔ اس کے علاوہ ان دتّ ذات کے براہمنوں کے متعلق جنگ نامہ (صفحات ۱۷۵ ۔ ۱۷۶) مصنف احمد صاحب پنجابی اور گجرات کی رپورٹ بندوبست ۱۸۶۸ء مرتبہ مرزا محمد عظیم بیگ میں لکھا ہے کہ ان کا مورث اعلیٰ واقعہ کربلا کے بعد دینا نگر ضلع سیالکوٹ میں آکر رہ گیا۔ پھر شیرشاہ کے زمانے میں یہ قصبۂ رہتاس اور وہاں سے قصبۂ کریالی میں جاکر رہے۔ (رپورٹ گجرات صفحہ ۲۴۲)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مورث ضرور بالضرور کبھی نہ کبھی عرب میں تھے اور وہیں سے آکر پنجاب کے اضلاع میں رہنے لگے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام راہب تھا جس کے سات لڑکے خون حسینؑ کا انتقام لینے میں کام آگئے۔ جو تاریخ ایک یورپی مؤرخ نے اس قوم کی لکھی ہے اس میں ان فرزندان راہب کے نام سہس رائے ماہر جس رائے، پوروشیر خاں، رام سنگھ، رائے پون، دھورو اور پورہ لکھے ہیں۔ بعض روایات اسلام میں بھی راہب اور اس کے بیٹوں کا ذکر آیا ہے۔ بہرنوع وہ کبت بھی اسی تاریخ سے نقل کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر حسینؑ پوتھی نامی کتاب بھی ہم کو مل جائے۔ یہ کتاب دت لوگ عرب سے اپنے ساتھ لائے تھے اور اس میں جملہ حالات شہادت امام مظلوم علیہ السلام کے محفوظ وقلمبند تھے۔ سنا گیا ہے کہ اس کو برکت اور ثواب کے خیال سے خاص موقعوں پر پڑھتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی قسم کے مضبوط اعتقادات سے جو وہ شہدائے کربلا کے لیے رکھتے تھے، ہندوستان کی عام اقوام میں محرم کی عظمت اور محبت بڑھی اور ایک گونہ اسلام کی صداقت اور دیانت آشکارا ہوئی۔

وہ مشہور کبت جو فخریہ اس قوم میں مشہور ہے اس طرح ہے

سندھ جھوجھا کی مانش میں دت نام سلطان   سدھ بیوگ جو بیر جی عرب کیو استھان
عرب کیو استھان میر سدھانی ہویو   پنج پروہت بھئے برہم آ دگور جانکا وہیو
بہاردواج جورشی جی جن کی یہ سنتان   سردیجئے نام حسینؑ کے عرب کیو استھان
بہاردواج جو رشی جی جن کی یہ سنتان   سردیجئے نام حسینؑ کے عرب کیو استھان
سدھ دت کے نندجی سہس رے اپرمان   ہرس رے جودت جی رکھیں ٹیک میدان
رکھیں ٹیک میدان شیر جوں شتردہاری   رام شبیہہ بلوان پھڑیں برچھی جو کٹاری
رائے پُن پُن آتی کریں دیس جودھیان   دھارو میرو جودت ہیں عرب کیو استھان
چڑھے عرب سے دت بڑھے جودھے بلکاری   بجے ہے شتری بھیرنال فوجا اسواری
سب پرکار جو لشکری دیش و سب پہ چھاگئو   چڑھیودت بادشاہ جو لوگ دیکھ اجرج بھئو
بھے دت جو بیر سازدوٹوک مچائی   سب شتروکو مارنچ رن پھرے دھائی
سب کائر گئے بھاگ جاوندے نظر نہ آویں   مدد دی حسینؑ قدمہ پیچھے نہ پاویں
لڑیودت دل کھیت جی تین دک شاکا پڑہیو   چڑھیودت دل گرجی گڈھ کوفہ جالوٹیو
بجے بھیر کو چوٹ فتح میدان جو پائی   بدلہ لیا حسین دھن دھن کرے لوکائی
راہب کی جو جد نسل حسین جو آئی   دے سات فرزند بھئی قبول کمائی
جو حسین کی جد ہے دتّ سب دہایو   عرب شہر کے بیچ میں راہب تخت بٹھایو
ہر یابندر چھوڑ یاتاں پکڑ لئی تلوار   آئے دوڑے پھر روم شام بجائے نقارا
پھر غزنی لیا آئے کے پھر بلخ بخارا   گئے کنارے سندھ دے سمہت قندھارا
پھر آئے چڑھے اٹک تھیں ملک پنجاب سدھارا

ترجمہ و مطلب

۱- سدھ بھوگ دتّ جس نے اپنا لقب سلطان اختیار کیا تھا۔ ایک جنگجو سپاہی تھا۔ اور وہ سدھ جھوجھا کی نسل سے تھا اور عرب میں سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ سدھ، بزرگ اور ولی کو کہتے ہیں۔

۲- عرب میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے وہ میر سدھانی کے لقب سے پکارے گئے وہ برہم آد کی پرستش کرتے تھے اور پنج کو اپنا پروہت مانتے تھے۔ یعنی ایک برہم خدا کی پرستش وعبادت کرتے تھے

اور پنج کو اپنا پروہت مانتے تھے۔ یعنی ایک برہم خدا کی پرستش وعبادت کرتے تھے۔ اور پنج غالبًا پانچ پیر (ہندوستان میں ایک فرقہ ہندوؤں کا جو پانچ مسلمان اولیاء کا ماننے والا ہے) کو اپنا رہنما اور پیشوا خیال کرتے تھے۔

۳- وہ بھاردواج کی نسل سے تھے جوایک بزرگ اورفقیر تھے۔ وہ عرب میں آباد ہوئے تھے کہ اپنا سر حسینؑ کی خاطر قربان کریں۔

۴- مشہور ومعروف ساہیس راے اور ہرس راے سدھ دت کے لڑکے تھے اور یہ بہادر لوگ تھے۔ یہ میدان جنگ میں عزت وغیرت کی خاطر ''بات کی ٹیک'' پر لڑتے تھے۔

۵- میدان جنگ میں بات کی خاطر وہ شیروں کی طرح مردانہ ہیں۔ وہ میدان میں خنجر بکف اور رام کی طرح شہزور اور بل دکھانیوالے ہیں۔

۶- رائے پن ایک پاک نفس شخص ہے۔ وہ وطن کی بھلائی کو ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے۔ دھارومیر دت کے تمام خاندان نے عرب کو اپنا وطن بنایا۔

۷- جب یہ بہادر جانباز دت عرب سے نکلے تو ان کی فوجیں (رسالے اور پیدل) نفیری اور ڈھول کے پرشورترانوں کے ساتھ بڑھیں۔

۸- دت بادشاہ نہایت تزک واحتشام سے برچھی اور ڈھال سے مسلح اور آراستہ تھا اور اس شان سے تمام مُلک پر چھا گیا تھا۔

۹- بہادر دت نے نہایت درجہ فیصلہ کن جنگ کی۔ بڑے سورماؤں کو تہ تیغ کیا اور رن میں اپنے زور سے دہائی مچادی۔

۱۰- بزدل عرب بھاگ کر نظروں سے غائب ہوگئے۔ دت لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کی پوری پوری مدد کی اور ایک قدم بھی میدان سے پیچھے نہیں ہٹے۔

۱۱- جانثاران و جانبازان دت نے نہایت بہادری کی۔ وہ میدان جنگ میں خوب لڑے۔ اور قلعہ کوفہ کو انھوں نے تاخت وتاراج کردیا۔

۱۲- جب انھوں نے میدان جنگ میں فتح پائی تو خوب خوشی اور فتح کے نقارے بجائے گئے۔ شور ہوا کہ ''قتل حسینؑ'' کا بدلہ لے لیا۔ اور لوگوں نے نعرہ ہائے مسرت وکامرانی بلند کیئے۔

۱۳- راہب کے سات لڑکوں نے حسینؑ کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ انھوں نے مظلوم شہید پر اپنی جانیں

قربان کردیں۔ اور اس طرح حق رفاقت ومحبت پورا کیا۔ (بھئی قبول کمائی) یہ قبولیت اور یہ کمائی نہایت درجہ معنی خیز ہے۔ انتہائی محبت کی دلیل ہے کہ سات لڑکوں کی بھینٹ چڑھانے کے بعد اس کو ایک آن کار حیات سمجھا۔

۱۴- اے حسینؑ کی اولاد میں ہونے والو اور حسینؑ کے نام لیواؤ تمہارا فرض ہے کہ تم دت لوگوں کو نہ بھلاؤ، یہ وہ دتّ تھا جو حسینؑ کے خاتمہ سے پہلے بھی عرب میں حکمراں تھا۔

۱۵- ہریا کے بندرگاہ سے روانہ ہوکر بلند تلوار کئے ہوئے روم وشام میں نقارہ بجاتے واپس آئے۔

۱۶- آگے بڑھ کر غزنی لیا اور پھر بلخ بخارا فتح کیا۔ سندھ کی طرف رُخ کیا اور قندھار کو اپنے قبضہ میں کیا۔

۱۷- دریائے اٹک کو عبور کرکے پنجاب میں داخل ہوئے۔ جہاں سے زمانہ قدیم میں وہ عرب کی طرف راہی ہوئے تھے۔

یہ نظم ابھی نامکمل حالت میں ہم کو ملی ہے۔ ہم اس کو تمام وکمال دیکھ کر اس کے اوپر نقد وتبصرہ کرسکتے ہیں۔ اس وقت کم سے کم اس سے یہ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اقوام میں جو شہدائے کربلا کی محبت اورعقیدت مندی ہے اس کا سبب دتّ ذات کے مشاہدات اور چشم دید واقعات ہیں جن کا پتہ ''حسینؑ پوتھی'' اور اس قسم کے کبتوں او رخاندانی زرمیہ نظموں میں ہے۔ (حسینی برہمن) غازی پور کے مرحوم رائے بہادر سالک رام کے پاس کچھ اس قسم کی نظمیں اور روایتیں تھیں انہیں سے معلوم ہوا کہ حسینی برہمن بھی ہوتے ہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتے تھے۔ چند دعائیں اور روایتیں سینہ بہ سینہ ان کے علم میں تھیں۔ ایک روز دیکھا گیا کہ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو لئے ان کے پاس آئیں۔ انھوں نے کچھ پڑھا اور پڑھ کر ان بچوں پر دم کیا۔ معلوم ہوا کہ '' گل سوئے'' (گالوں کی سوجن) کا علاج محض دعا سے کرتے ہیں۔ دریافت کیا گیا تو پتہ چلا کہ عرب سے ان کے آباواجداد جو تصرفات لے کر آئے تھے۔ یہ اس کا اثر ہے۔ غالبًا کشمیر اور پنجاب میں حسینی برہمن بہت ہوں گے کیونکہ غازی پور کے اس خاندان کی قرابتیں انہی اطراف میں ہیں۔

''حسینؑ کے نام لیواؤ'' نظم مقتبسہ کے اندر ایک التجا ہے کہ جو لوگ حسینؑ کے ماننے والے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ دت برہمنوں کو نہ بھولیں بلکہ ہمیشہ یاد رکھیں اور ان کا لحاظ کریں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر مسلمان کو اس ذات کے ادانیٰ اور اعلیٰ کے ساتھ حسینؑ کے خون پاک کی خاطر جس کے انتقام

لینے میں وہ کام آ گئے لطف و کرم کا برتاؤ کرنا چاہئے بلکہ ہر ہندو ذات کے ساتھ محبت اور اخلاص سے پیش آنا چاہئے۔ ان کی غلط فہمیوں اور زیادتیوں پر صبر اور تحمل کرنا چاہئے۔ اسلام میں خون حسینؑ کی قیمت بہت بڑی ہے اور جو ذرا بھی اس خون سے متاثر ہے ہمارے بہترین جذبات اخلاق و کرم کا مستحق ہے۔ اے کاش ہندو اور مسلمان اپنی تفریقیں خون حسینؑ کے خیال سے مٹا دیں۔ ان کو خیال کرنا چاہئے کہ کل وہ لوگ دوش بدوش میدان کربلا میں صف استبداد و جبر کے خلاف کھڑے تھے۔

ہندوستان میں امام باڑے کی طرزِ تعمیر کا ارتقاء

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی وطیبہ منور☆

حضرت محمدؐ رسول خدا نے مدینے میں اسلامی جمہوری نظام کی بنیاد ۶۲۲ء میں رکھی۔ اس اسلامی جمہوریت کا کردار اور اس کی خصوصیات ۶۶۱ء تک باقی رہیں۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ نے ۶۶۱ء میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کردیا اور پھر یزید کو اپنا جانشین بھی نامزد کردیا۔ یزید نے معاویہ کی موت کے بعد اپنی خلافت کا اعلان کردیا۔ موروثی جانشینی کا یہ طریقہ اسلامی جمہوریت کی روح سے تضاد رکھتا تھا اور ملوکیت (موروثی شہنشاہیت) کے مترادف تھا۔ یزید نے تمام مسلمانوں سے بیعت (وفاداری کی یقین دہانی) طلب کی لیکن نواسۂ رسولؐ حسینؑ نے یزید کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا، جس کے نتیجے میں یزید نے ایک فوج بھیج کے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو ۶۸۰ء میں قتل کرادیا۔ حسینؑ کی شہادت کے نتیجے میں ماہِ محرم میں عزاداری کی رسوم کی بنیاد پڑی۔

بارہویں صدی عیسوی میں صوفی ہندوستان آئے اور انہوں نے یہاں صوفی تحریک کی ابتداء کی۔ انہوں نے یہاں دو مرکزوں کی بنیاد رکھی۔ خانقاہ اور امام باڑہ اور ان دونوں مرکزوں کے دروازے بلاتفریق مذہب و مسلک اور ذات و نسل ہر شخص پر کھلے رکھے۔ ان لوگوں نے روزِ عاشور، یعنی ۱۰ محرم کو سوگ یا یومِ غم مقرر کیا۔

محرم کی عزاداری ہندوستان میں بہت عام ہوئی۔ ہندوؤں کو بھی یہ تصور پسند آیا اور انہوں نے اس سلسلے کی ان مجلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونا شروع کیا جو امام حسینؑ کے ذکر سے تعلق رکھتی تھیں۔ دس محرم کو صوفیاء جلوس نکالتے تھے جو کربلا پر ختم ہوتا تھا۔ اس کے لیے صوفیوں نے قصبے میں اس قطعۂ زمین کا انتخاب کیا تھا جو ''شاملات دیہہ'' کہلاتی تھی۔ یہ قطعۂ زمین قصبے کے تمام لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہوتا تھا۔

عزاداری کا ادارہ یا سلسلہ ہندوستان میں منظم اور مستحکم ہوتا چلا گیا اور جس جگہ یہ روایات انجام

☆شعبۂ تاریخ و شعبۂ آر کے ٹیکچر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

دی جاتی تھیں صوفیاء نے اسے امام باڑے کا نام دیا جو عربی اور ہندی لفظوں کا مرکب ہے۔ یہ لفظ بذاتِ خود صوفیوں کی فکر و کا اظہار کرتا ہے۔ 'امام باڑہ' خالص ہندوستانی ادارہ ہے۔ ایسا کوئی ادارہ عرب، ایران، وسطِ ایشیا یا کسی عرب ملک میں نہیں نظر آتا۔

ابتدائی دور میں اس کی عمارت کا کوئی مقررہ منصوبہ یا نقشہ نہیں ہوتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ امام باڑے کا نقشہ بھی متعین ہوتا چلا گیا۔ اس منصوبے کے ساتھ مسجد کی طرح امام باڑے کے طرزِ تعمیر کے نقوش بھی پختہ ہوتے چلے گئے۔ امام باڑے بھی مسجدوں کی طرح اونچی کرسی پر بنائے جاتے تھے۔ اس میں ایک وسیع وعریض صحن ہوتا ہے تاکہ عزاداری کی رسوم انجام دینے کے لیے بڑی تعداد میں آنے والے لوگوں کو آسانی سے جگہ مل سکے۔

امام باڑے کی عمارت کا منصوبہ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اسے ایک بڑے قطعۂ زمین پر بنایا جاتا ہے جس میں چار دیواریں اور دو اونچے دروازے ہوتے ہیں تاکہ پروگرام کے بعد لوگ سکون کے ساتھ باہر آسکیں۔ ایک بڑا سا دالان (برآمدہ)، جس کے پیچھے شہ نشین (وہ جگہ جہاں بادشاہ بیٹھتا ہے۔ یعنی امام حسینؑ) ہوتی ہے۔ یہ امام باڑے کے دالان سے ایک میٹر اونچی ہوتی ہے۔ شاہ نشین میں علم (پرچم) اور تعزیے رکھے جاتے تھے۔ ایک طرف ایک منبر (لکڑی کا زینہ نما اسٹینڈ) رکھا جاتا تھا جس پر بیٹھ کر امام حسینؑ کا مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ امام باڑوں کی تعمیر کے لیے مغل بادشاہ بھی مالی امداد عطا کرتے تھے۔ شاہ جہاں آباد میں ایک امام باڑہ چاندنی چوک میں بیگم سمرو کے محل کے پاس میر عسکری نے بنوایا تھا۔ عشرت علی خاں ناظر نے جس نے مغل بادشاہ اکبر ثانی کے عہد میں خدمات انجام دی تھیں، اس نے ایک امام باڑہ نواب مبارک محل کے باغ میں اس جگہ تعمیر کرایا تھا جہاں آج کل جور باغ آباد ہے۔ شاہجہاں آباد ہی میں ایک امام باڑہ عشرت علی خاں نے کوچہ بلاقی بیگم میں بنوایا تھا۔ جلالی میں سید خیرات علی نے، جو 'کبروی' سلسلے کے صوفی تھے ۱۷۷۴ میں ایک امام باڑہ تعمیر کرایا تھا، جب نواب شجاع الدولہ نواب رحمت علی خاں سے جنگ کرنے جارہے تھے اور راستے میں محرم کا چاند نظر آگیا تو شجاع الدولہ نے جلالی میں محرم کی عزاداری کی۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے اس امام باڑے کو معافی میں پانچ گاؤں دیے۔ بہرحال، سب سے متوازن اور متعینہ منصوبہ کے ساتھ جو امام باڑہ تعمیر ہوا وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کا بنوایا ہوا امام باڑہ ہے۔

آصف الدولہ کا امام باڑہ، جو نوابی دور کے طرزِ تعمیر میں پہلی عمارت ہے، لکھنؤ میں گنتی کی ان چند

عمارتوں میں سے ہے جن میں یوروپی اثرات بالکل نہیں ہیں۔ نوابین جنہیں حکمراں کی حیثیت سے ہرطرح کی آزادی حاصل تھی، ان کے پاس دل کھول کر تعمیراتی کاموں پر خرچ کرنے کا موقع تھا۔ چنانچہ یہ امام باڑہ بڑے عالیشان انداز میں بنایا گیا گو کہ کہیں کہیں اس میں ضرورت سے زیادہ آرائشی اضافوں کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بڑا امام باڑہ، آصف الدولہ امام باڑے کے مکمل منصوبے، کا ایک حصہ ہے جس میں ایک مسجد، صحن، دروازے اور باؤلی (سیڑھیوں والا کنواں) جسے گرمیوں کے محل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، شامل ہیں۔ اسے ۱۷۸۴ کے قحط کے بعد 'قحط امدادی کام' اور ان ہی خصوصیات کا تتبع کرتے ہوئے اسی امام باڑے کا طرزِ تعمیر اپنایا گیا۔ گو کہ امام باڑے میں سب سے اہم بات اس کی اسلامی روایت سے تعلق رکھتی تھی مگر اس کی ابتداء اور بنیاد خالص ہندوستانی ہے۔ اس کا منصوبہ اور پورا خاکہ ہندوستان میں ہی تیار کیا گیا اور اس میں آج بھی تمام ہندوستانی خصوصیات ہیئت اور کردار موجود ہیں۔

امام باڑے کا خاکہ:

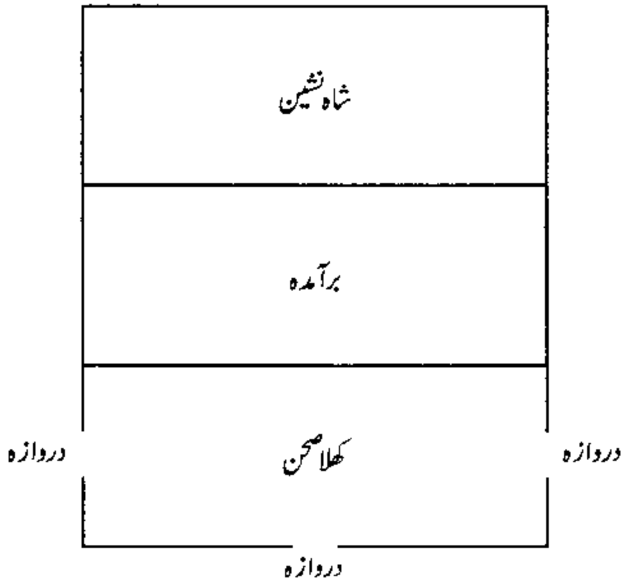

میمن* میں عزاداری

سید اسد حیدر زیدی☆

موضع میمن سادات، مغربی یوپی کے ضلع بجنور کی تحصیل نجیب آباد میں واقع ایک شیعہ بستی ہے۔ یہ بجنور، نجیب آباد قومی شاہ راہ پر بجنور سے ۲۵ کلومیٹر اور نجیب آباد سے ۱۴ کلومیٹر اور درگاہ نجفِ ہند جوگی پورہ سے ۲۴ کلومیٹر دور ہے۔

اس بستی کے مورث اعلیٰ سید شاہ اشرف علی الواسطی نے اس کو ۱۳۸۸ء میں بعہد سلطان فیروز شاہ تغلق آباد کیا تھا۔ سادات زیدی الواسطی سید ابوالفرح واسطی کی نسل سے ہیں جو عراق کے شہر واسط میں رہتے تھے اور اسی کی رعایت سے واسطی کہلاتے تھے۔ حضرت زید شہید کے چھوٹے صاحبزادے جناب محمد عیسیٰ کے پوتے علی کو خلیفہ مامون رشید نے واسط کا گورنر مقرر کیا تھا۔ مامون کی موت کے بعد واسط ایک خود مختار ریاست کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اُنہی علی کی آٹھویں پشت میں ابوالفرح والیِ واسط تھے۔ جب سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملوں کے لیے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا لیکن مطمئن نہیں تھا اس وقت اسے خواب میں بشارت ہوئی کہ ابوالفرح واسطی سے مدد لو۔ ادھر جناب ابوالفرح واسطی کو بھی عالم خواب میں سلطان کی مدد کرنے کا حکم ہوا۔ سلطان محمود ان سے ملا اور وہ اپنے ۱۲ بیٹوں میں سے ۱۱ کو ساتھ لے کر ہندوستان کے حملوں میں اس کے شریک ہو گئے۔ ۹۹۹ء یا ۱۰۰۰ء سے لے کر ۱۰۲۵ء یعنی سومناتھ کی فتح تک سلطان محمود غزنوی کے مددگار رہ کر آپ نے پنجاب اور سندھ وغیرہ علاقوں میں حکومت کے نظام کو درست کرنے اور اس علاقے میں فوجی بالادستی قائم رکھنے کے لیے اپنے چار بیٹوں کو ہندوستان میں ہی رہنے کا حکم دے کر باقی کو واپس واسط لے گئے اور پھر وہیں ۱۰۵۵ء میں انتقال کیا۔ ہندوستان میں انہی چار بیٹوں ۱-ابوالفرح ۲-ابوالفضائل ۳- نجم الدین اور ۴- سید داؤد کی نسلیں سادات زیدی الواسطی کہلاتی

* اس کا اظہار شروع میں ہی ضروری ہے کہ یہ مضمون اس میمن نسل سے تعلق نہیں رکھتا جو بمبئی اور اس کے قرب و جوار میں آباد ہے اور ہندوستان میں اپنی تجارتی اور کاروباری صلاحیتوں کے لیے مشہور ہے۔

☆ فیکلٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہیں۔ میمن کے مورث اعلیٰ کا تعلق جناب ابوالفرح کی نسل سے ہے۔ شاہ اشرف علی کے والد جناب عارف علی شاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ہم عصر تھے اور زیادہ وقت ان کے ساتھ دہلی میں گزارتے تھے اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا، اور درگاہ شاہ مرداں (موجودہ جور باغ، نئی دہلی) میں ان کا مزار ہے۔ ان کے انتقال کے بعد جانشینی کے سلسلے میں ان کے تین بیٹوں میں تنازعہ ہوا اور منجھلے بیٹے سید حسین کا قتل ہوا۔ الزام اشرف علی صاحب کے سر آیا اور آپ بادشاہ فیروز تغلق کے خوف سے روپوش ہوکر گھومتے پھرتے اس مقام تک آ پہنچے جہاں آج کل میمن سادات آباد ہیں۔ یہ ایک گھنا جنگل تھا جہاں کول بنجارے رہتے تھے۔ یہاں اشرف علی صاحب فقیر کے بھیس میں مصروف عبادت تھے کہ ایک دن اس علاقے کے حاکم زماں خان کے آدمیوں نے دیکھا اور حاکم کو اطلاع کی۔ حاکم نے خود آپ سے ملاقات کی اور سارا واقعہ سن کر از راہ ہمدردی آپ کو یہ علاقہ بیع کرکے یہیں بسنے کے لیے اصرار کیا۔ آپ نے منظور کر لیا۔ اسی دوران زماں خان کے جاسوس آپ کی ریاست دھرسونواز پور واقع پنجاب سے خبر لائے کہ سید حسین کا قاتل پکڑا گیا اور آپ الزام سے بری ہیں اور بادشاہ فیروز تغلق کا انتقال ہو چکا ہے۔ چنانچہ آپ نے کچھ جنگل کٹوا کر ایک بہت بڑا مکان بنوایا جس کو گڑھی کا نام دیا گیا۔ پھر آپ وطن اہل و عیال کو لینے گئے۔ بڑے بھائی محمد نواز کے اصرار پر بھی آپ وطن میں نہ رکے اور اپنے نئے مسکن میں آ کر بس گئے۔ یہاں حاکم زماں خان نے ان کی سہولت کے لیے کچھ جلاہے، کمہار اور دوسرے کاریگر قسم کے لوگ تحفے کے طور پر دیئے جن کی نسلیں آج بھی میمن میں آباد ہیں۔ آپ کی نسل میمن میں ۲ بیٹوں سید برہان شاہ اور سید علی سے چلی۔ چونکہ آپ کو اس علاقے میں امن نصیب ہوا اس لیے آپ نے اسے ''مامن'' کہا جو بعد میں کثرت استعمال سے میمن ہوگیا۔

شاہ اشرف کی بنا کردہ مسجد میں، جسے اب جامع مسجد کہتے ہیں، ان کا مزار واقع ہے اور حوض کے کنارے بنا ہوا ہے۔ اس مسجد کی حال ہی میں بڑے پیمانے پر مرمت و وسعت جناب نواب حیدر مرحوم کی محنت و کوشش اور مؤمنین بستی کے اشتراک و تعاون سے بڑے خوبصورت انداز میں ہوئی ہے۔ شاہ اشرف کی مسجد کے بعد اور بھی کئی مساجد عالم وجود میں آئیں اور بفضل خدا سب آباد ہیں۔

اس دور میں شیعہ قوم اپنے مذہبی رسومات کی ادائیگی اور عزاداری کے معاملے میں بہت حد تک پوشیدگی سے کام لیتی تھی۔ مثال کے طور پر فیروز تغلق کے ذاتی دستاویزات سے ایک اقتباس اسحتھ

۱- جناب حجۃ الاسلام سعادت حسین صاحب

۲- مولانا حافظ کفایت حسین صاحب

۳- حجۃ الاسلام کلب حسین صاحب

۴- مولانا سید محمد دہلوی صاحب

۵- سید العلماء مولانا علی نقی (نقن) صاحب

۶- حجۃ الاسلام مولانا مرتضیٰ حسین صاحب

۷- علامہ ابن حسن نونہروی صاحب

۸- علامہ سید عدیل اختر صاحب پرنسپل مدرسۃ الواعظین

۹- مولانا شمس الحسن صاحب

۱۰- حجۃ الاسلام مولانا کلب عابد صاحب

۱۱- مولانا طاہر جرولی صاحب

۱۲- حجۃ الاسلام مولانا شمیم الحسن صاحب بناری

بستی کے قابل فخر علماء جناب محمد جعفر صاحب قبلہ اور مولانا رضی حیدر مرحوم تو باوجود اپنی بیرونی مصروفیات کے وقتاً فوقتاً اہالیان وطن کو مشکور فرماتے رہتے تھے۔ آج بھی ماشاء اللہ بہت سے نوجوان سادات اور انصاری برادری کے برادران علم دین میں فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور بہت سے مختلف دینی مدارس میں مصروف تعلیم ہیں۔

نوحے اور سلام وغیرہ بستی کے نوجوان خود ہی کہتے اور پڑھتے تھے۔ یہاں خوش الحان پڑھنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ شاعر حضرات میں اختر میمنوی، اظہر میمنوی اور مصطفیٰ زیدی تیغ مرحومین میں سرفہرست تھے۔ آج بھی اظہر حسنین صاحب (مقیم علی گڑھ) شاعرِ اہل بیت کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ سوز خوانی و مرثیہ خوانی میں ماہر حضرات میں جناب انتظار حسین مرحوم کا نام سرفہرست ہے۔ انہیں ایک بے مثال مرثیہ خواں کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ موجودہ وقت میں جناب لیاقت حسین صاحب دور دور تک مشہور ہیں۔

دیوان خانہ اور ڈاکٹر ابن حسین صاحب کے مکان پر میر ضمیر، میر خلیق، میر انیس اور مرزا دبیر کے تصنیف کردہ مراثی کی تحت اللفظ ذاکری ہوتی تھی۔ بقیہ امام باڑوں میں حدیث خوانی ہوتی تھی۔

معروف تحت اللفظ ذاکرین میں جناب علی اختر، جناب اختر عباس اور انصار رضا مرحومین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حدیث خوانی میں انصاری بزرگ جناب میاں جی مرحوم منفرد مقام رکھتے تھے۔

عشرۂ محرم میں پہلا جلوس ۸ محرم کو احاطے سے نکلتا، ذوالجناح سج کر پوری بستی کا گشت ختم کرتا۔ یہ جلوس دیوان خانہ پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ دوسرا یوم عاشورہ دیوان خانہ سے شروع ہوکر پوری بستی کے گشت کے بعد حوض پر پہنچ کر ختم ہوتا تھا۔ ان دونوں جلوسوں کی شان قابل دید تھی ایسا پُرغم اور پُرتاثیر ماحول اور بستیوں کے جلوسوں میں شاید ہی نظر آتا ہو۔

موجودہ دور میں وقت اور حالات کی تبدیلی اور پرانے لوگوں کے اب موجود نہ ہونے کی وجہ سے عزاداری کے انداز اور مجالس کی تعداد اور اوقات میں کافی تبدیلیاں رونما ہوگئی ہیں اور کثیر تعداد میں امام باڑے بھی تعمیر ہوگئے ہیں۔ آج ماشاء اللہ میسن سادات میں تقریباً پندرہ امام باڑے موجود ہیں جن میں سے کچھ کا پہلے ذکر ہوچکا ہے۔ جیسے چھتہ، دیوان خانہ، بنگلہ اور کوٹھی وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک امام باڑہ املی والا کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے اس کی عمارت کچی تھی لیکن ۲۰۰۴ء میں اس کی عمارت پکی بنوائی گئی ہے۔ عاشورہ کے دن ذوالجناح اسی امام باڑے سے برآمد ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مجنوں شاہ کا امام باڑہ جگنی کا امام باڑہ، آمرو کا امام بارہ، نوردیوں کا امام باڑہ، امام باڑہ اہل بیت، نیا امام باڑہ، اصغریہ امام باڑہ، زینبیہ، ڈاکٹر صاحب کا امام باڑہ اور ماما کا امام باڑہ وغیرہ ہیں۔

نوردیوں کا امام باڑہ ۱۹۵۹ء میں تعمیر ہوا تھا۔ انصاری برادری نے ۱۹۶۷ء میں نیا امام باڑہ اور ۲۰۰۰ء میں امام باڑہ اہل بیت بنوایا۔ ۱۹۸۰ء میں زینبیہ تعمیر ہوا جو کہ اصل میں لڑکیوں کا مدرسہ ہے جہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن وہاں محرم اور اس کے علاوہ بھی زنانی مجلسیں کی جاتی ہیں۔

میسن سادات میں عزاداری شروع ہی سے ہوتی رہی ہے۔ شروع میں یہاں پر عاشورہ کے دن الاؤ دہکائے جاتے تھے اور اس کے چاروں طرف ماتم ہوتا تھا۔ باقاعدہ نوحے نہیں پڑھے جاتے تھے۔ مرثیے بھی فارسی اور عربی زبان میں ہی پڑھے جاتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی گئیں۔ دیوان خانہ بننے کے ساتھ جلوس برآمد ہونا شروع ہوئے۔ جلوس میں ایک بڑا حلقہ بناکر تاشوں اور نقاروں کے ساتھ ماتم ہوتا تھا۔ نوحے صرف امام باڑوں میں پڑھے جاتے تھے۔

بعد میں عزاداری کا انداز کچھ بدلا، جب میسن کے کچھ لوگ جو لکھنؤ اپنی تعلیم کے سلسلہ میں گئے تھے۔ وہاں انہوں نے محرم دیکھا۔ واپس آکر انہوں نے انجمن حسینیہ بنائی۔ ان میں سید ظفریاب

عباس اور سید اختر رضا کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے سے یعنی ۱۹۳۱ء سے شبیہ ذوالجناح برآمد ہونے کی روایت قائم ہوئی۔

ذوالجناح کے جلوس میں جو نوحہ پڑھا جاتا ہے وہ یہ ہے:

جو نہر پہ پیاسا سوتا ہے
یہ اس کی سواری آتی ہے

محرم میں عزاداری کی شروعات چاند رات سے ہی ہو جاتی ہے۔ نماز عشاء کے بعد دیوان خانہ سے ایک جلوس نکلتا ہے جو سب امام باڑوں میں جاتا ہے۔ وہاں یہ نوحہ پڑھا جاتا ہے:

پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے

آخر میں جب جلوس دیوان خانہ پہنچتا ہے تو مجلس ہوتی ہے۔ دیوان خانہ میں یہ تاریخی مرثیہ ہوتا ہے:

محرم آیا ہے اے محبو رسولؐ روتے ہیں کربلا میں

پہلی محرم سے آٹھ مردانی اور تین زنانی مجلسیں ہوتی ہیں۔ محرم کی چار تاریخ کو دیوان خانہ میں حضرت زینت کے بیٹوں سے منسوب یہ تاریخی مرثیہ پڑھا جاتا ہے:

ستاروں کی آمد ہے کالی گھٹا میں

چھ محرم کو نئے امام باڑے کی مجلس کے بعد شبیہ تابوت جناب عون و محمد برآمد کیا جاتا ہے۔ رات کو دیوان خانہ میں تاریخی مرثیہ ہوتا ہے:

اصحاب جاں نثار رسولؐ خدا کے تھے

سات محرم کو عصر کے بعد آمرد کے امام باڑے میں مجلس کے بعد شبیہ تابوت جناب قاسم برآمد ہوتا ہے اس کے بعد جلوس برآمد ہوتا ہے جو ماما کے امام باڑے میں ختم ہوتا ہے۔ اس دوران سب امام باڑوں سے اور کچھ گھروں سے بھی مندرجہ ذیل تاریخی نوحہ پڑھنے کے بعد مہندی اٹھائی جاتی ہے۔ نوحہ یہ ہے:

اس کو مجرا جو کہتی تھی رو کر
مہندی آتی ہے قاسم بنے کی

آٹھ محرم کو صبح سے شام تک کی سب مجلسیں ایک بجے سے پہلے ختم کردی جاتی ہیں۔ اسی دن گھروں میں منت کے علم برآمد کیے جاتے ہیں اور بچوں کو جن کی منت ہوتی ہے سقہ بنایا جاتا ہے۔

آٹھ محرم کا جلوس دیوان خانہ میں تاریخی مرثیوں سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں دو تاریخی مرثیے پڑھے جاتے ہیں:

۱۔ کہتی سکینہ یہ تھی اب نہیں رونے کی میں

۲۔ جب قصد کیا نہر کا سقائے حرم نے

اس کے بعد شبیہ علم حضرت عباسؑ برآمد کیا جاتا ہے۔ تاشوں کے ساتھ جلوس احاطے پہنچتا ہے۔ وہاں پر پھر یہ دونوں مرثیے تھوڑے تھوڑے پڑھے جاتے ہیں اور شبیہ ذوالجناح برآمد ہوتا ہے۔ پھر جب جلوس احاطے کے اندر بنگلے (زنانہ امام باڑہ) کا چکر لگا کر باہر نکلتا ہے تو یہ تاریخی نوحہ پڑھا جاتا ہے:

خیمہ سے چلا رن کو جو عباس علمدار

اس کے بعد شبیہ ذوالجناح کوٹھی لے جایا جاتا ہے جہاں سب عورتیں اس کی زیارت کرتی ہیں اور علم اٹھایا جاتا ہے۔ پھر جلوس احاطے سے آگے بڑھتا ہے تو یہ تاریخی مرثیہ ہوتا ہے:

جب علمدار کو میداں کی اجازت نہ ملی

پورے جلوس کے دوران جگہ جگہ چائے کی سبیل ہوتی ہے۔ یہ چائے مٹی کے پیالوں میں پلائی جاتی ہے جنہیں سکورے کہتے ہیں۔ یہ جلوس آمرو کے امام باڑے سے ہوتا ہوا نوردیوں کے امام باڑے جاتا ہے۔ اس کے بعد انجمن اصغریہ شبیہ تابوت حضرت عباسؑ برآمد کرتی ہے۔ پھر جامع مسجد کے سامنے آگ پر ماتم ہوتا ہے۔ ماتم کے بعد شبیہ تابوت مسجد میں لے جایا جاتا ہے۔ پھر انجمن حسینیہ جامع مسجد کے پاس قبرستان جاتی ہے جہاں شاہ اشرف بانی میمن اور سید صادق علی، سید آغا حسن اور سید باقر رضا مرحومین کی قبریں ہیں۔ اس کے بعد جلوس املی والے امام باڑے پہنچتا ہے وہاں پر بڑے علموں کے پھریرے کھولے جاتے ہیں اور ان پر لکھا ہوا یہ تاریخی نوحہ پڑھا جاتا ہے:

سقائے سکینہ شیدائے سکینہ

یہ نوحہ وہاں موجود سب ہی لوگ پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد جلوس ڈاکٹر صاحب کے امام باڑے کی طرف بڑھتا ہے۔ بڑھتے ہوئے یہ نوحہ پڑھا جاتا ہے:

یا سیدی یا عباس

اور اس نوحے پر لوگ سر کا ماتم کرتے ہیں۔ پھر جلوس دیوان خانہ پہنچ کر ختم ہوتا ہے اور وہاں مجلس ہوتی ہے۔ نو محرم کو نئے امام باڑے میں شبیہ تابوت حضرت علی اکبر برآمد کیا جاتا ہے۔ رات میں دیوان

خانہ کی مجلس کے بعد شبیہ تابوت حضرت علی اکبر اور شبیہ جھولا حضرت علی اصغر برآمد کیا جاتا ہے۔

شب عاشورہ کو اعمال کے بعد تمام انجمنیں امام باڑوں کا گشت کرتی ہیں جہاں ان کے لیے چائے کا اہتمام ہوتا ہے۔ فجر کے وقت گشت ختم ہوجاتی ہے۔ پھر صبح کو دیوان خانہ، املی والا امام باڑہ اور کربلا میں اعمال روزِ عاشورہ ہوتے ہیں۔ اس دن سب لوگ فاقہ کرتے ہیں۔

یوم عاشورہ کا جلوس دیوان خانہ سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے وہاں دو تاریخی مرثیے پڑھے جاتے ہیں:

۱- قتل کی رات کوتھی شام سے گریاں زینب

۲- آج زینب یوں کہے بھائی میرا سرور نہیں

اس کے ساتھ تاریخی ضریح نکالی جاتی ہے۔ پھر سب امام باڑوں اور بعض گھروں سے منتی ضریحیں نکالی جاتی ہیں اور ہر جگہ یہ مرثیہ پڑھا جاتا ہے: آج زینب یوں کہے......

سب تعزیے احاطے کے باہر جمع ہوتے ہیں اور وہاں سے جلوس کی شکل میں آگے بڑھتے ہیں۔ راستے میں یہ تاریخی مرثیہ پڑھا جاتا ہے:

جب قافلہ حرم کا چلا سر کھلا ہوا

جب جلوس املی والے امام باڑے پہنچتا ہے تو وہاں مجلس ہوتی ہے اور یہ مرثیہ پڑھا جاتا ہے:

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اس کے بعد یہ تاریخی مرثیہ پڑھا جاتا ہے:

حسین جب کہ چلے بعد دوپہر رن کو

مجلس کے بعد شبیہ ذوالجناح برآمد کیا جاتا ہے اور یہ نوحہ پڑھا جاتا ہے:

گھوڑا نکل رہا ہے شہِ مشرقین کا

اس کے بعد جلوس مجنوں شاہ کے امام باڑے ہوتا ہوا چھتہ پہنچتا ہے۔ وہاں پر مجلس ہوتی ہے اور یہ تاریخی مرثیہ پڑھا جاتا ہے:

روانہ نہرِ لبن کو جو شیرخوار ہوا

مجلس کے بعد ایک اور تاریخی مرثیہ پڑھا جاتا ہے:

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر

یہ جلوس بڑے امام باڑے کی طرف بڑھتا ہے اور وہاں حوض کے کنارے زنجیروں کا ماتم ہوتا

ہے۔ پھر امام باڑوں کی ضریحیں بڑے امام باڑے میں رکھ دی جاتی ہیں اور باقی ۳۵، ۳۰ تعزیے ڈولا والی کربلا لے جا کر دفنا دیے جاتے ہیں۔ وہاں پر بھی تاریخی نوحہ پڑھا جاتا ہے:

صد الوداع حسینا

اس کے بعد زیارت روز عاشورہ پڑھائی جاتی ہے۔ پھر واپس آ کر جگہ جگہ فاقہ شکنی کروائی جاتی ہے۔ رات میں سب امام باڑوں میں چھوٹی چھوٹی شام غریباں کی مجلسیں ہوتی ہیں پھر بڑی مجلس دیوان خانہ میں ہوتی ہے۔ مجلس کے بعد سب لوگ کربلا 'ڈولا والی' جاتے ہیں اور وہاں موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں۔ کوٹھی اور بنگلہ میں زنانی مجالس میں بھی تاریخی مرثیے اور نوحے ہوتے ہیں اور تاریخ کے حساب سے علم اور تابوت برآمد کیے جاتے ہیں۔

یمن سادات میں ہمیشہ سے ہی بہت اچھے نوحہ خواں اور مرثیہ خواں پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے زمانے میں بہت مشہور رہے ہیں۔ ماضی قریب میں اختر رضا صاحب کے لکھے اور اختر عباس صاحب کے پڑھے ہوئے نوحے بہت مشہور تھے۔

یمن کی عزاداری میں پورا یمن سادات شریک رہتا ہے۔ محرم کے دنوں میں یمن سے باہر رہنے والے بھی یمن پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آٹھ اور دس محرم کے جلوس میں قریب کی آبادیوں کے لوگ بھی شریک ہونے اور زیارت کرنے آتے ہیں۔ یمن کے اہل سنت حضرات اور کچھ ہندو بھی اپنے تعزیے جلوس کے ساتھ ہی نکالتے ہیں۔ یہ یک جہتی کا انداز بہت کم جگہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

ضلع مظفرنگر میں محرم کی عزاداری کی روایت

ڈاکٹر مسز عابد رضا زیدی☆ و ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی*

مظفرنگر اتر پردیش کے مغربی حصہ کا ایک اہم ضلع ہے۔ یہ قومی شاہراہ نمبر ۵۸ پر دہلی سے لگ بھگ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور نسبتاً متمول ضلع ہے۔ یہ گنگا جمنا دوآبے کے علاقے میں واقع ہے۔[1] گنگا اس ضلع کی مشرقی سرحد ہے اور جمنا مغربی سرحد اسکے شمال میں اتر پردیش کے دو ضلعے سہارنپور اور ہردوار ہیں اور میرٹھ اور باغپت اس کی جنوبی سرحد بناتے ہیں۔

ضلع کا صدر مقام مظفرنگر ''۳۰ '۱۱ ۲۹ طول البلد شمال اور ''۴۵ '۳ ۷۷ عرض البلد کے درمیان واقع ہے۔[2] یہ شہر جہانگیر کے دور حکومت سے پہلے نقشے پر موجود نہیں تھا۔ اُس زمانے میں ثروت نام کا شہر اہم جگہ مانی جاتی تھی۔ مظفرنگر نام کا شہر شاہجہاں کے زمانے میں وجود میں آیا۔ سید مظفر خاں کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام پر اس کی بناء رکھی تھی۔ اصل میں یہ شہر ثروت سے ہی ملا کر آباد کیا گیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مظفرنگر مشہور ہوتا چلا گیا اور ثروت کا نام معدوم ہوگیا۔ ۱۸۲۶ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مظفرنگر کو، اس کی اہمیت سمجھتے ہوئے، مظفرنگر کو ضلع کا صدر مقام بنادیا۔[3] اس فیصلے کے بعد یہ جگہ اور مشہور اور اہم ہوگئی۔

مظفرنگر کی تاریخ میں ایک خاندان کی بہت اہمیت رہی ہے۔ یہ 'بارہ سیدوں' کا خاندان ہے۔ یہ سید 'بارہ' کیوں کہلاتے ہیں۔ مورخین کا اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ یہ سید دہلی سے باہر رہتے تھے اس لیے 'بارہ سید' کہلاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ یہ شیعہ ہیں، جو خاندان رسولؐ میں سے بارہ اماموں کے معتقد ہوتے ہیں، اس لیے انہیں بھی بارہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ چونکہ یہ سید لوگ پنجاب سے ہجرت کرنے کے بعد اس علاقے کے بارہ گاؤں میں قیام پذیر ہوئے اس لیے 'بارہ' کہلاتے ہیں۔[4] زیادہ تر مورخوں نے اسی

☆ میرٹھ * جامعہ ملیہ اسلامیہ

۱- نیول ۔ ایچ آر (Nevill H.R.) 'ڈسٹرکٹ گزیٹر آف یونائیٹڈ پراونسیز، مظفرنگر جلد III، گورنمنٹ پریس ۱۹۵۳، ص ۱

۲- ایضاً، ص ۱ ۳- ایضاً، ص ۲۹۵ ۴- ایضاً، ص ۱۱۵

خیال کو تسلیم کیا ہے کیونکہ اس سے پہلے یہ لوگ پنجابی سید کہلاتے تھے۔ اس خاندان کے جدِ امجد ابوالفراح واسطی عراق میں واسط شہر کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے بارہ بیٹوں کے ساتھ ہندوستان آئے اور کچھ عرصے بعد اپنے آٹھ بیٹوں کے ساتھ وطن واپس لوٹ گئے۔[۱] باقی چار بیٹے پٹیالہ کے قرب و جوار میں ٹھہر گئے۔ سید داؤد تہان پور میں مقیم ہوئے اس لیے ان کی اولاد تہانپوری کہلاتی ہے۔ سید ابوالفضل چھت بانور میں رُکے۔[۲] ان کی اولاد چھتروری کہلاتی ہے۔ چھت بانوری ہی چھت روری بھی کہلاتے ہیں۔ سید ابوالفاضل نے کنڈلی میں قیام کیا، چنانچہ ان کی اولاد 'کنڈلی وال' کہلاتی ہے۔ سید نجم الدین جوجھر میں آباد ہوئے اس لیے ان کی اولاد 'جوجھاری' یا 'ججیری' کہلاتی ہے۔ جوجھاری کو 'ججنیر ' یا جگنیر بھی کہتے ہیں۔[۳]

پنجاب سے نکلنے کے بعد یہ سید مختلف شاخوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک سید خاندان بلگرام میں مقیم ہوا۔ اس کی ایک ذیلی شاخ ضلع میں مرہارا میں پہنچی اور دوسری شاخ کی چاروں ذیلی شاخیں گنگا جمنا کے دوآبے کے علاقے میں میرٹھ اور سہارنپور کے درمیانی علاقے میں رہنے لگیں۔[۴]

بارہ سید شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لفظِ شیعہ ایک لفظ 'شاع' سے مشتق ہے جس کے معنی پیروی کرنا' توثیق کرنا، حکم ماننا، کے ہوتے ہیں اس طرح اس سے مراد کسی کا معتقد گروہ یا پارٹی سے ہوتی ہے۔[۵]

ابنِ حزم نے شیعہ کی تعریف مختصراً اسطرح کی ہے۔ ''وہ شخص جو شیعوں کے اس عقیدے سے متفق ہو کہ رسولؐ کے بعد افضل ترین علیؑ ہیں اور وہ اور ان کے بعد اُن کی اولاد ہی کسی اور کے مقابلے میں امامت کے لائق ہیں، شیعہ ہے''۔[۶]

حالانکہ امام حسینؑ کا انتقال کربلا میں چودہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ لیکن اس المیہ کو شیعوں اور بہت سے اور لوگوں نے سالانہ محرم کی رسموں کے ذریعہ ایک مستقل اور متحرک جگہ بخش دی، جسے ڈونالڈسن نے ''شیعوں کی رسوم میں ممتاز ترین اور معروف ترین رسم''[۷] سے تعبیر کیا ہے۔

۱- ابوالفضل، آئین اکبری (بلاچ مین۔ انگریزی ترجمہ) کلکتہ، درسہ ۱۸۷۳، ص ۴۲۸

۲- ایٹکنسن ایڈورڈ، ٹی (Aitkinson Edward T.) اسٹیٹسٹکل ڈیسکرپٹیو اینڈ ہسٹاریکل اکاؤنٹ آف نارتھ ویسٹرن پراونسیز آف انڈیا، جلد III، حصہ II ۱۸۷۶، ص ۵۹۰ ۳- ابوالفضل، سابقہ حوالہ، ص ۲۹-۴۲۸ ۴- ایضاً، سابقہ حوالہ، ص ۴۲۹

۵- ہولسٹر، جان، نارمین (Holister John Nor Man) زیدی شیعاز آف انڈیا' اورینٹل بکس ری پرنٹ کارپوریشن، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۹، ص ۳ ۶- ایضاً، ص ۴ ۷- ایضاً، ص ۱۲۴

۳۵۲ ہجری میں ہی جب بغداد میں بویہ عروج پر تھے معزوالدولہ نے ایک خاص وقفہ وقت میں محرم کے واقعات کی یاد منانے کی رسم شروع کردی۔[۱]

''بازار بند کردیئے جاتے تھے، قصاب اپنا کاروبار بند کردیتے تھے، باورچی کھانا پکانا چھوڑ دیتے، پانی کی ٹنکیاں (Cistern) خالی کردی جاتیں، مٹکوں پر نمدے کے ڈھکن رکھ کر سڑک کے کنارے رکھ دیئے جاتے، عورتیں بالوں کی لٹیں نیچے گرائے، چہروں پر سیاہی لگائے، پھٹے پرانے کپڑے پہنے، غمِ حسینؑ میں روتی، چہروں پر طمانچے مارتیں راستوں پر چلتی نظر آتی تھیں۔[۲] اس وقت بھی مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے تھے۔[۳]

محرم کی رسوم شیعوں کے ساتھ ساتھ پھیلیں۔ ہندوستان میں شیعوں کی آمد کوئی خاص منصوبہ بند انداز میں نہیں ہوئی، رفتہ رفتہ ملک میں داخلے سے ہوئی۔[۴] بس یہ آ گئے۔ کبھی اکیلے کبھی گروہ میں انہیں ہندوستان کی راہیں مل گئیں۔ ان میں سب سے پہلے وہ لوگ تھے جو بنو امیہ اور بنو عباس حکومتوں کے متواتر دباؤ اور بڑھتے ہوئے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے پناہ گزیں کی حیثیت سے یہاں آ کر بس گئے۔ ان کے لیے طاقت کے استعمال کے بجائے پُرامن داخلہ زیادہ مناسب تھا۔ انہوں نے ملک کی زندگی کو بہت کچھ دیا بھی، آرنلڈ کے مطابق۔[۵]

''منتظمین (ایڈمنسٹریٹر) فوجی افسر، علم و ادب کے میدان کے فنکاروں، استادوں اور صوفیوں کی حیثیت سے ہندوستان کے سیدوں نے مسلم تہذیب میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے..... صوفی، مذہبی اساتذہ، شعراء اور علمی کاموں میں مصروف، یہاں تک کہ سید سپاہی ہندوستان میں فارسی لطافت و نزاکت اور فہم و فراست اپنے ساتھ لائے''۔

بارہ سیدوں نے مظفر نگر دوآب کے علاقے میں قیام کے بعد سے یہاں کے تمدن کو بہت کچھ دیا اور اس علاقے میں رونما ہونے والے حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کی تاریخ بنیادی طور پر سیدوں کی تاریخ ہے۔[۶]

پورے مغل دور میں یہ لوگ بڑے مستعد اور بہت بہادر سپاہی مانے جاتے تھے۔ اس دور میں بارہ سادات کے بہت سے لوگوں نے فوجی میدان میں اپنی بہادری و وفاداری میں نام پیدا کیا اور انہیں

۱- ہولسٹر، جان، نارمن (Holister John Nor Man) زیدی شیعاز آف انڈیا' اورینٹل بکس ری پرنٹ کارپوریشن، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۴ ۲- ایضاً، ص ۱۶۴ ۳- ایضاً، ص ۱۶۴ ۴- ایضاً، ص ۱۰۱ ۵- ایضاً، ص ۱۰۲

۶- نیول۔ ایچ آر، سابقہ حوالہ، ص ۹۰

بہت اہم منصب عطا ہوئے۔ انہیں بہار، بنگال، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں اہم انتظامی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ان کے سلسلہ میں ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ بارہ سادات کے لوگ ملک کے دوسرے حصوں میں انتظامی یا فوجی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنے گھر والوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ خاندان کی رہائش بارہ سادات کے علاقے میں ہی تھی۔ انہوں نے اپنے علاقے میں بہت سی عمارتیں بنوائیں اور کیونکہ شیعہ تھے اس لیے اس علاقے میں محرم کی عزاداری کی روایت بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس سلسلے میں شروع میں مجالسِ عزاء ان کے گھروں کے اندر ہی منعقد ہوتی تھیں، لیکن جب علاقے میں ان کے قدم مضبوطی سے جم گئے تو انہوں نے عاشور خانے یا 'امام باڑے' بنوانے شروع کردیئے۔ یہ قابلِ ذکر بات ہے کہ شیعوں کے یہاں کوئی بھی محفل یا مجلس مسجد میں نہیں ہوتی۔[1] اسے صرف نماز کے لیے وقف رکھا جاتا ہے۔ امام باڑوں کو صرف مجلسوں اور اماموں کی یاد کے سلسلے کے اجتماع کے لئے بنوایا گیا ہے۔

مجالس کا سلسلہ مجتمع رکھنے کے لیئے ایک تار یا رستے کی سی حیثیت رکھتا ہے اور یہ سوگ کے دس دن یا اس سے بھی زیادہ مدت میں ہونے والے پروگراموں کو یکجا اور منظم رکھتا ہے۔ اس میں روزانہ درجہ بدرجہ واقعات کربلا کو یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت سے جب کوفیوں کی طرف سے حسینؑ کو بلانے کا پہلا خط ملا اُن کی شہادت کے آخری لمحوں تک کو یاد کیا جاتا ہے۔ نیچے ہم اس ضلعے کے کچھ مقامات پر عزاداریٔ محرم کی کچھ رسوم و روایات کو مختصراً بیان کررہے ہیں۔

سمبھلیڑا: یہ وہ پہلا گاؤں ہے جہاں پنجاب سے ہجرت کرنے کے بعد بارہ سیدوں نے اس علاقے میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس گاؤں میں اب بھی کئی سید خاندان آباد ہیں۔ اس گاؤں میں پانچ پرانے امام باڑے ہیں، جن کے نام ہیں:

۱- طالب علی کا امام باڑہ
۲- مشرف حسین کا امام باڑہ
۳- ساجد حسین کا امام باڑہ
۴- ڈپٹی نثار حیدر کا امام باڑہ
۵- تقی کا امام باڑہ

۱- ہولسٹر، جان، نارمین، سابقہ حوالہ، ص ۱۶۵

طالب علی کا امام باڑہ لگ بھگ ۱۵۰ سال پرانا ہے۔[۱] پہلے دس دنوں میں روزانہ صبح کو دو مجلسیں ہوتی ہیں، ایک مردانی، ایک زنانی، اس امام باڑے میں ۶ ر محرم کو ضریح رکھی جاتی ہے۔ اس ضریح کو میرا پور قصبے سے لایا جاتا ہے۔ مہندی کا جلوس حضرت قاسم کی یاد میں نکالا جاتا ہے۔ جو امام حسنؑ کے بیٹے تھے اور ان کی شادی امام حسینؑ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مہندی ڈپٹی جعفر حسین کے امام باڑے سے یہاں لائی جاتی ہے۔ ۸ ر محرم کو اسی امام باڑے سے ایک تابوت لایا جاتا ہے اور 'سقہ کی روایت' انجام دی جاتی ہے جس میں حضرت امام حسینؑ کے رفقاء کے چھوٹے سے لشکر کے سپہ سالار اور علمبردار حضرت عباس کی یاد میں نوخیز لڑکے سقے بننے کی رسم ادا کرتے ہیں، ہتھکڑی، بیڑی اور ڈھال پر نذر دی جاتی ہے جس سے امام حسینؑ کے گھرانے کی اسیری کی یاد دلائی جاتی ہے۔ ذوالجناح کے ساتھ علم کا جلوس ۸ ر اور ۱۰ محرم کو نکلتا ہے۔ عام طور پر مقامی لوگ ہی 'حدیث' اور تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے تھے مگر اب کوئی خطیب (مولانا) مجلس کو خطاب کرتے ہیں۔

ایک اور امام باڑہ جو 'بیچ کی ڈیوڑھی' کہلاتا ہے، اسے تحصیل سے سو روپیئے مالی اعانت کے طور پر ملتے ہیں۔ یہاں بھی پہلی سے ۹ ر محرم تک ایک اور دو بجے کے درمیان مجلس ہوتی ہے۔ اسی طرح ساجد حسین کے امام باڑے اور مشرف حسین کے امام باڑے، دونوں جگہ محرم کے دس دن مردانی اور زنانی دونوں مجلسیں ہوتی ہیں۔ لکڑی کی ایک نوے یا سو سال پرانی ضریح ساجد حسین کے امام باڑے میں اب بھی موجود ہے، ڈپٹی جعفر حسین کا امام باڑہ جسے نقی کا امام باڑہ بھی کہتے ہیں، یہ بھی بہت پرانا امام باڑہ ہے اور یہاں بھی محرم میں روزانہ رات کو مجلس ہوتی ہے۔ اس طرح یہ تمام کام بالکل منظم ہیں اور مختلف امام باڑوں میں مختلف مگر مقررہ وقت پر مجلسیں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد پہلی سے دس صفر تک مولانا ممتاز کے گھر میں خواتین کے لیے شب بیداری ہوتی ہے اور ۱۱ سے ۲۰ صفر تک 'مردانہ عشرہ' (مردوں کی دس مجلسیں) منعقد ہوتا ہے۔ اس طرح چہلم تک مجلس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔[۲]

جانسٹھ: جانسٹھ بارہ سیدوں کی تہان پور شاخ کا مسکن ہے۔ اس قصبے میں زیادہ مشہور امام باڑے ہیں:

۱۔ شیش محل امام باڑہ

۱۔ انٹرویو ۱۷ ر اکتوبر ۲۰۰۲، سید شہاب عالم ابن سید ظہیر عالم مرحوم، عمر ۵۵ سال، سکونت سمبھلیرا، گاؤں، مظفر نگر، سید سیف عالم ابن سید شاہ عالم، عمر ۲۰ سال، سکونت، سمبھلیرا گاؤں، مظفر نگر ۲۔ انٹرویو " " "

۲- رنگ محل امام باڑہ

۳- جمعہ امام باڑہ

۴- جنت آباد امام باڑہ

۵- موتی محل امام باڑہ

شیش محل امام باڑہ سب سے پرانا ہے جسے سید حسین علی خاں نے سترھویں صدی میں بنوایا تھا۔ سید حسین علی خاں اور ان کے بھائی سید عبداللہ خاں آخری مغل دور کی تاریخ میں 'بادشاہ گر' کہے جاتے تھے۔حسین علی خاں نے ہی یہاں عزاداری کی ابتداء کی تھی۔ رنگ محل کا امام باڑہ سید ذوالفقار علی خاں نے بنوایا تھا۔ رنگ محل اور ایک مسجد ۱۸۰۵ میں بنی تھی، امام باڑہ ان کے کچھ بعد میں بنا تھا۔ ذوالفقار علی خاں کے ورثاء اب بھی وہاں رہتے ہیں۔عباس علی اس کے متولی ہیں۔ اس زمان میں یہ امام باڑہ بغیر چھت کا ہے، صرف شاہ نشین باقی ہے۔شروع میں اس امام باڑے میں چند مجلسیں ہوتی تھیں۔مگر جب سے ذوالفقار علی خاں کے بیٹے سید مظفر خاں نے ایک ضریح لاکر امام باڑے میں رکھی ہے یہاں مجلسوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔[۱] جمعہ امام باڑہ بھی کافی پرانا ہے۔ اب اس کی تعمیر نو ہوئی ہے۔ اس امام باڑے میں رسول اللہ کا 'قدم شریف' بھی ہے۔اس امام باڑے کے انتظامات کو ایک دس ممبری کمیٹی انجام دیتی ہے۔محمد علی صاحب اس کے متولی ہیں۔ جنت آباد جانسٹھ کا بہت پرانا محلّہ ہے۔ امام باڑے میں ایک کتبہ موجود ہے جس میں اسکی تاریخ ۱۳۰۹ ہجری لکھی ہوئی ہے۔

محرم کے پہلے نو دنوں میں جنت آباد کے امام باڑے میں عورتوں کی مجلس شام کو اور مردوں کی مجلس صبح کو شیش محل کے امام باڑے میں ہوتی ہے۔نو تاریخ کو ایک الوداعی مجلس ہوتی ہے جس میں عباس علی خاں تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے ہیں۔عشرے کا جلوس شیش محل امام باڑے سے شروع ہوتا ہے، رنگ محل کے لوگ 'سواری' پڑھتے ہیں اور جلوس رکلی دروازے سے ہوتا ہوا جمعہ امام باڑہ پہنچتا ہے[۲] ۔ یہاں بھی ایک 'چھوٹی مجلس' ہوتی ہے اور دوسرے تمام امام باڑوں کے جلوس جمع ہوکر ایک بڑے جلوس کی شکل میں کربلا کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ شام کو رنگ محل امام باڑے میں شام غریباں کی مجلس ہوتی ہے۔ یہ مجلس ایک عرصے سے یہاں ہوتی آرہی ہے۔ اس میں کوئی خطیب واقعات کربلا

۱- انٹرویو ۱۸/اکتوبر ۲۰۰۶، سید ظریف الحسن، ابن اکبر حسین، عمر ۳۳ سال سکونت: شیش محل۔ جانسٹھ

۲- انٹرویو ۲۵/اکتوبر ۲۰۰۶، سلیمان علی خاں، ابن صنعیم علی خان عمر ۶۰ سال، سکونت، رنگ محل، موجودہ پتہ، رام پورم، مظفر نگر

بیان کرتا ہے۔ رات کو عزادار کربلا جاتے ہیں اور وہاں روشنیاں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد چہلم تک جنت آباد امام باڑے میں روزانہ مجلس ہوتی ہے۔[۱]

مظفرنگر: جیسا پہلے بیان کیا گیا مظفرنگر کو ابوالمظفر خاں کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام پر آباد کیا تھا۔ ابوالمظفر کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

۱- سب سے بڑے بیٹے منصور علی نے منصور پور آباد کیا۔

۲- دوسرے بیٹے منور خان نے اپنے باپ کے نام پر مظفرنگر آباد کیا۔

۳- تیسرے بیٹے نے اپنے باپ کے خطاب (خان جہان) کی نسبت سے خانجہاں پور بسایا اور پھر اپنے نام پر شیر پور گاؤں بسایا۔

منور علی خاں اکے پانچ بیٹے تھے۔

۱- سید طٰہٰ، ۲- سید وجیہ الدین، ۳- سید عیوض علی، ۴- سید ابواسعید خاں اور ۵- سید نصراللہ خاں۔

نصراللہ خاں نے محلّہ ندی والا اور پچدرہ بسایا۔ وجیہہ الدین نے محلّہ موتی محل آباد کیا۔ ابوسعید خاں نے محلّہ ابوپورہ آباد کیا۔ مظفرنگر شہر میں موتی محل، کٹھیرا، ندی والا، ابوپورہ اور 'پنچ والا' سب سے پرانی آبادیاں ہیں۔ پنچ والا محلے میں ایک بہت پرانا شاہ جہاں کے وقت کا امام باڑہ موجود ہے۔ موتی محل والا امام باڑہ ابوسعید خاں نے بنوایا تھا۔ ندی والا امام باڑے میں ایک کتبہ ہے جس میں لکھا ہے:

ظہور وقف شد از سید ذوالفقار علی مرحوم

محرم کے پہلے چھ دنوں میں ان سب چھ امام باڑوں میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ پھر چھ تاریخ سے علموں کے جلوس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اب پانچ تاریخ کو بھی دو جلوس نکلنے شروع ہوئے ہیں، جو بکرا مارکیٹ اور کھالا پار میں امام باڑہ خورجے والے سے بالترتیب نکلتے ہیں۔[۲]

چھٹی تاریخ کو ایک مجلس کے بعد علَم کا جلوس انصاری روڈ پر نذر محمد ایڈووکیٹ کے گھر سے بھوکا محلّہ امام باڑے کے لئے نکلتا ہے۔ سات اور آٹھ محرم کے جلوس، جن میں 'سواری' پڑھی جاتی ہے موتی محل سے سات تاریخ کو اور ابوپورہ سے آٹھ تاریخ کو نکلتے ہیں۔ یہ جلوس شہر کے تمام مشہور امام باڑوں سے گزرتے ہیں۔

۱- انٹرویو: ۱ نومبر ۲۰۰۶، غلام علی، ابنِ غلام حسن عمر ۵۰ سال، سکونت جانسٹھ مظفرنگر

۲- انٹرویو ۵ نومبر ۲۰۰۶، رضی الحسن، ابنِ ریاض الحسن، عمر ۷۰ سال، سکونت بھوکا محلّہ، مظفرنگر

۱۰ رمحرم کا جلوس مذکورہ بالا دونوں امام باڑوں سے نکلتے ہیں اور بھگت سنگھ مارکیٹ پر مل جاتے ہیں اور یہاں سے کربلا چلے جاتے ہیں۔

علَم، تعزیہ اور ذوالجناح ان جلوسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ۱۰ رمحرم کو سنی حضرات بھی تعزیے نکالتے ہیں۔

مظفر نگر ضلع: مظفر نگر ضلعے میں بہت سے گاؤں ہیں جہاں سیدوں کی آبادی خاصی بڑی تعداد میں ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک صرف چند بااثر سید خاندانوں میں ہی مجلسیں ہوتی تھیں جن میں قرب و جوار کے گاؤں کے لوگ شرکت کرتے تھے۔ مگر اب ساداتِ بارہ کے علاقے کے اُن تمام گاؤوں میں جہاں سیدوں کی آبادی ہے۔ (پورے ضلعے میں لگ بھگ ۴۰ گاؤں) مجلسیں ہوتی ہیں اور ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ مجلس کا طریقہ ہے کہ سب سے پہلے دو تین افراد کی ٹولی سوز، سلام، مرثیہ اور تحت اللفظ پڑھتی ہے۔ پھر ایک ذاکر (خطیب) بیان (ذاکری) کرتا ہے اور تفصیل سے کربلا کے واقعات بیان کرتا ہے پہلے ہر گاؤں میں دو تین افراد تحت اللفظ مرثیہ پڑھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ تحت اللفظ صرف ایک شخص پڑھتا تھا۔ اور عام طور پر میر انیسؔ یا مرزا دبیرؔ کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ مگر اب ہندی کا چلن بڑھنے سے یہ روایت معدوم ہوتی جارہی ہے چونکہ وہ لوگ جو اردو اور فارسی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں بہت کم رہ گئے ہیں۔[۱]

محرم کے جلوسوں میں علَم، ضریح، تعزیے اور ذوالجناح نکالے جاتے ہیں۔ ضریح حضرت علیؑ یا امام حسینؑ کے روضے کی شبیہہ ہوتی ہے۔ لفظ 'تعزیہ' یوں تو غم کو ظاہر کرتا ہے مگر ہندوستان میں اب یہ امام حسینؑ کے روضے کی چھوٹی شبیہہ کے مترادف ہے۔ تعزیے مختلف اونچائی، مختلف تناسب اور مختلف چیزوں کے بنے ہوتے ہیں۔ مگر اپنی شکل کے لحاظ سے عام طور پر یہ ایک گنبد والے مقبرے جیسے ہوتے ہیں۔ علَم میں سب سے اوپر ایک پنجا (کھلے ہاتھ کی شبیہہ) جو رسول اور اُن کے چار قرابت داروں ('پنجتن' یعنی محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ) کو یاد دلاتا ہے۔ سمبھلیڑا میں طلب علی کے امام باڑے میں موجود ایک پنجے (لگ بھگ ڈیڑھ دو سو سال پرانا) کی تصویر آخر میں دی گئی ہے۔ نوحے کے ساتھ عزادار، یا حسینؑ، کے نعروں کے ساتھ ہاتھ سے سینے پر ماتم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ زنجیروں میں لگی چھریوں سے اپنی پیٹھ پر بھی ماتم کرتے ہیں جس سے خون نکلنے لگتا ہے۔

۱- انٹرویو ۷ نومبر ۲۰۰۶، سید شمو، ابن سید مقصود علی، عمر ۴۵ سال، سکونت بھٹورا گاؤں، مظفر نگر

کربلا میں قبریں بنائی جاتی ہیں اور تعزیے (کے کچھ چھوٹے حصے) اُن میں رکھ کر انہیں مٹی اور پانی کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔

عزادار محرم کے مہینے میں کالے کپڑے پہنتے ہیں اور زندگی کی کسی آسائش سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ جب محرم کا چاند نظر آتا ہے تو عورتیں اپنی چوڑیاں اور زیور اتار دیتی ہیں اور رنگین کپڑے نہیں پہنتیں۔ ہنسا سختی سے منع ہوتا ہے۔ بارھویں (یعنی عشرے سے تیسرے دن) کو ایک مجلس ہوتی ہے جس کا سلسلہ چہلم تک چلتا ہے۔ چہلم کو پھر ایک جلوس نکلتا ہے۔ گکرولی گاؤں میں اربعین کی مجلس ہوتی ہے۔[1] سوگ کا زمانہ ۸ ربیع الاول تک بڑھادیا گیا ہے۔ اس روز عزادار سوگ کا یہ زمانہ پورا کرکے زندگی کے عام معمولات پر واپس آجاتے ہیں۔

۱- انٹرویو ۷ نومبر ۲۰۰۶، سید رونق علی زیدی، ابن سید نائب حسین عمر ۵۸ سال، سکونت انصاری روڈ، مظفر نگر

جونپور میں عزاداری کی روایات: تاریخی جائزہ

ڈاکٹر سید محمد عامر☆

جونپور، قرونِ وسطیٰ کا شیرازِ ہند، مشرق کی سمت ضلع غازی پور اور اعظم گڑھ، مغرب میں ضلع پرتاپ گڑھ اور الہ آباد شمال میں ضلع سلطان پور، جس کی ایک پتلی سی پٹی اسے ضلع فیض آباد سے جدا کرتی ہے، اور جنوب میں مرزا پور اور بنارس[1] کے اضلاع سے گھرا ہوا ہے، یہ '۲۴'۔'۲۵ ' ڈگری/ اور '۱۲۔۲۶' ڈگری شمالی طول البلاد اور '۷'۔ ۸۲ ڈگری اور '۵'۔ ۸۳ مشرقی عرض البلد کے علاقوں کے درمیان واقع ہے۔[2] اس ضلع کی شمالی وجنوب میں زیادہ سے زیادہ لمبائی ۹۰ کلومیٹر اور شرق وغرب میں زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۸۵ کلومیٹر ہے۔ ۲۰۰۱۔۲۰۰ کے سروے کے مطابق اس کا کل رقبہ ۳۶۶،۲۶۶ مربع کلومیٹر ہے۔[3]

اس مقالے میں آثارِ قدیمہ اور تاریخ کے توسط سے اس تاریخی شہر میں عزاداری کی روایت اور شہر میں موجود عزا خانوں کے بارے میں کچھ حقائق پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تحقیق کے لیے علاقے کا سروے اور مشاہدہ بھی کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں اس تحقیق کے نتائج کو کچھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

میں نے اس شہر کے بارے میں ادبی اظہارات اور بیانات کو علاقے کے آثارِ قدیمہ کے باقیات کے ساتھ رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس ابتدائی جائزے کے لیے ہمیں اس علاقے کے بارے میں کچھ ایسی معلومات حاصل کرنے کا موقع بھی ملا جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عرصے تک تغلق اور شرقیوں کے درمیان یہاں سیاسی ہلچل کیوں رہی۔ اس سے جونپور میں قدیم وقتوں سے چلے آرہے کچھ رسوم و رواج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

☆ جامعہ آرکائیوز، جامعہ ملیہ اسلامیہ

۱- احمد، سید اقبال، تاریخ سلاطین شرقی وصوفیائے جونپور ۱۹۸۸، ص ۳۳

۲- نیول۔ ایچ۔ آر۔ ڈی (Nevill.H.R.D) ڈسٹرکٹ گزیٹیرس آف یونائیٹڈ پراوِنس آف آگرہ اینڈ اودھ جلد ۔ XXVIII ۱۹۰۸ الہ آباد، ص ۱

۳- جونپور ایڈمنسٹریٹیو، جونپور ۲۰۰۱-۲۰۰۰

ہندوستانی تاریخ میں شرقی دور میں جونپور میں شرقی علم و ادب کی بے مثال ترقی کے شواہد بہت زیادہ ملتے ہیں جو پوری پندرھویں صدی پر محیط ہیں۔ کم و بیش پوری صدی میں شرقی حکومت کے درالسلطنت ہونے کی وجہ سے اسے سیاسی عظمت بھی حاصل رہی جس کے نتیجے میں یہاں بڑے باحوصلہ اور مضبوط بادشاہ بھی ہوئے جیسے سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱ تا ۱۴۴۰) سلطان محمود شاہ شرقی (۱۴۴۰ تا ۱۴۵۷) اور سلطان حسین شاہ شرقی (۱۴۵۸ تا ۱۴۸۷) جن کی تحریک اور عمل کے ثبوت مسجد جامع الشرق، مسجد اٹالہ اور مسجد لال دروازہ کے شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جونپور کی مسجدیں خود شرقی دورِ حکومت کی یادگاریں ہیں عالی شان قلعے، محلات، مقبرے، مسجدیں، خانقاہیں، عزاخانے یا امام باڑے غالباً ہندوستان میں طرزِ تعمیر کے اعلیٰ معیار کے بہترین اور حیرتناک نمونے ہیں۔ یہ خوبصورت عمارتیں خود بھی طرزِ تعمیر کا ایسا معیار بن گئی ہیں کہ انہیں بھی ایک الگ 'جونپور طرزِ تعمیر' کا نام دیا جانے لگا ہے۔[۱]

ان بادشاہوں نے یہ شاندار عمارتیں قدیم تباہ مندروں کے مقامات پر کھڑی کرکے تاریخ کی بدنامی تو ضرور مول لی مگر ان کے بدترین نقاد اور نکتہ چیں بھی یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے خود کو 'تباہ کار' کے مقابلے میں بہتر 'معمار' ضرور ثابت کردیا۔ بہرحال یہ جواز سکندر لودھی کے حق میں پیش نہیں کیا جاسکتا جس نے شرقی بادشاہوں جیسا عمل کیا تھا۔

طرزِ تعمیر کے عروج پر پہنچے ہوئے اس شہر کو اپنی سیاسی شکست و ریخت اور ثقافتی تنزل سے اس وقت دوچار ہونا پڑا جب سکندر لودھی (۱۴۸۹ تا ۱۵۱۷) نے شرقی خاندان کے آخری حکمراں[۲] (۱۴۹۴) حسین شاہ شرقی (۱۴۵۸ تا ۱۴۸۷) کو شکست دی۔ لودھی نے اس سلطنت کی خودمختاری ختم کردی اور جونپور کو دہلی سلطنت میں ملا لیا[۳] لودھی کے چھ مہینے کے قیام میں پورے جونپور پر خوف و ہراس طاری رہا اور اس نے جونپور کی ثقافتی اور فنی شان و عظمت کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ اس عرصے میں اس نے شرقی دور کے ہر طرح کے آثار کو مٹانے کی ٹھان لی، شرقی بادشاہوں کے پُرشکوہ محلوں، حسین باغوں اور عالی شان امام باڑوں کو زمیں بوس کردیا اور شرقی سلطنت پر اپنے مکمل تسلط کے اظہار کے

۱- فصیح الدین، مولوی محمد، دی ہسٹری آف شرقی مونیومینٹس ان جونپور، بدایوں، ۱۹۲۲، ص ۲ اور ۳

۲- احمد نظام الدین، طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۳۵، ۱۹۲۷ ج ۱، ص ۱۹-۳۱۸

۳- سعید، میاں محمد، شرقی سلطنیت آف جونپور، (اے پالیٹیکل اینڈ کلچرل ہسٹری) کراچی ۱۹۷۲، ص ۲۰۳

لیے ان کے ناموں سے منسوب ہر چیز کو تباہ کردیا۔ قلعوں، محلوں اور تمام غیر مذہبی قسم کی عمارتوں کو تباہ کر چکنے کے بعد اس نے شرقی مساجد کو تباہ کرنا شروع کیا، حالانکہ وہ خود راسخ الاعتقاد مسلامان تھا۔ آخر علماء کے احتجاج نے اُسے مساجد کی مزید بے حرمتی سے باز رہنے پر مجبور کردیا۔[۱] اب جو کچھ جونپور میں ہم دیکھ سکتے ہیں وہ ان مفخر بادشاہوں کی تعمیرات کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہی ہیں۔ اس فنی عظمت کی اتنی تباہی کے بعد بھی مغل شہنشاہ شاہجہاں نے اس کے ادبی اور فنی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے جونپور کو 'شیرازِ ہند' کے لقب سے عزت بخشی تھی۔[۲]

جونپور جو اب شمالی ہندوستان میں اتر پردیش ریاست کا کا ایک شہر ہے وہ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں صدیوں سے شیعہ آبادی کا مرکز رہا ہے۔ شیعوں کی اس مرکزیت کے آثار یہاں چودھویں صدی عیسوی میں شرقی خاندان کی حکومت کے قیام میں ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ پہلے شرقی سلطان، خواجہ جہاں ملک سرور سے آخری سلطان حسین شاہ شرقی تک سب سید الشہداء کے عزادار، اہل بیت کے دوستدار اور شیعہ (اثناعشری) تھے۔[۳]

ایک دہے کے قریب جونپور کے قیام کے دوران میں نے محرم کے اجتماعی پروگرام اور رسومِ عزاداری کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔ محرم کا مقدس مہینہ جونپور شہر اور س کے مضافات میں بڑے پرشکوہ اور سنجیدہ انداز میں منایا جاتا ہے۔ ہر دور کا اپنا یزید ہوتا ہے مگر ظلم کی مزاحمت جس کی لاثانی مثال حسین نے پیش کی، اسے اپنا ناہر صاحب عقیدہ کا فرض ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ ان کے عزادار سال بسال جونپور میں ان کے خاندان پر گزرے مصائب اور ظلم وستم کو یاد کرنے جمع ہوتے ہیں۔[۴] ماتم کرنے والوں کے دستے، نوحہ خوانوں کی ٹولیاں، سالانہ مجالسِ عزا اور رضاکاروں کے منظم کیے ہوئے جلوسوں کو محرم کے پورے مہینے جونپور میں دیکھا جاسکتا ہے۔

عزاداری کی روایت جونپور میں ۱۳۶۰ سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ کئی جگہوں پر بڑی تعداد میں امام باڑے قایم ہوئے۔ حضرت مولانا مخدوم سید علی نصیر نے محلہ نصیر خان، معروف بہ چھتری گھاٹ میں

۱- ایضاً ص ۱۹-۱۸، ۳۔ خیرالدین، مولوی محمد کے، جونپور نامہ، میں بھی حوالہ ۱۸۹۹، ص ۲۰-۱۹، نظام الدین اور نعمت اللہ دونوں نے سکندر لودھی کے جونپور میں چھ مہینے کے قیام کا ذکر کیا ہے، لیکن انہوں نے اس کے شہر کو تباہ کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جبکہ خیرالدین اور نیویل نے چھ مہینے کے قیام اور شہر کو تباہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ ۲- اکرام، شیخ محمد، آب کوثر، دہلی (۱۹۵۲) ص ۵۰۸، احمد، سید اقبال، تاریخ سلاطین شرقی وصوفیائے جونپور، جونپور، (۱۹۸۸) ص ۳۶،۳۷ ۳- حسین، مظفر، ہسٹری آف عزاداری ان جونپور۔ جونپور ۱۹۶۷، ص ۹

۴- مشیر الحسن، میکنگ سینس آف ہسٹری، سوسائٹی، کلچر اینڈ پالکس، نئی دہلی۔ ۲۰۰۳ ص ۱۳۷

ایک امام باڑہ ۱۳۷۱ میں تعمیر کروایا جو، گوکہ ابھی باقی ہے مگر بڑی خستہ حالت میں۔ یہ جونپور کا سب سے پہلا امام باڑہ تھا۔[1]

دوسرا تاریخی امام باڑہ فاطمہ بی بی معروف بہ 'باہوا بیگم' نے بنوایا جو مولانا نصیر علی کی اولاد میں تھیں۔ اس کی زمین شہزادہ ناصرالدین محمود تغلق نے دی تھی۔ یہ بھی ابھی موجود ہے اور 'امام باڑہ دالان' کے نام سے جانا جاتا ہے۔[2]

شرقی سلاطین کے دور میں عزاداری کی روایت پوری طرح جم گئی اور جونپور میں اس کا وقار و احترام عام ہوگیا۔ شرقی سلطانوں نے اس میں ذاتی توجہ دی اور اپنے محلوں میں مجالس عزا منعقد کیں۔ گوکہ خواجہ جہاں ملک الشرق، نے خودتو کوئی امام باڑہ تعمیر نہیں کروایا مگر مجالس عزا میں ضرور شریک ہوتا تھا اور شاہی خزانے سے مجالس کے لئے ہر سال مالی امداد ضرور دیتا تھا۔

خاندان شرقی کے سب سے کامیاب حکمراں ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱ تا ۱۴۴۰) نے اپنے دور میں ایک بڑا شان دار عزا خانہ بنوایا جو 'خانقاہِ نوحہ گراں' کے نام سے مشہور تھا۔ اب یہ بڑی مسجد (جامع الشرق) کے قریب ہے اور تعزیے (امام حسینؑ کے روضے کی شبیہہ) اس کی وصیت کے مطابق اس کی قبر پر رکھے جاتے ہیں۔ اس کے لڑکے سید محمود شاہ شرقی نے (۱۴۴۰ تا ۱۴۵۷) سے محلہ بیگم گنج میں ایک عزاخانہ بنوایا جو اپنے طرزِ تعمیر کی خوبصورتی کی وجہ سے جونپور کے تمام امام باڑوں میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

سکندر لودھی نے اپنے حملے کے دوران اس کے کچھ حصوں کو منہدم کرایا۔ اب اسی جگہ صدر امام باڑہ (جومحرم کی تمام رسومات کا مرکز) ہے جو سلطان محمود کی یاد میں بنوایا گیا ہے۔ پرانی عظیم الشان عمارت کے آثار ابھی تک موجود ہیں جن سے اُس شاہی سرپرستی کا اندازہ ہوتا ہے جو اسے حاصل تھی۔

سلطان محمود شاہ کی چہیتی بیوی ملکہ راجے بی بی نے اس سے ملی ہوئی ایک خوبصورت مسجد، ایک عزاخانہ اور ایک خانقاہ بنوائی۔ مولانا سید علی داؤد کو ان تمام عمارتوں کا ناظم مقرر کیا گیا۔

مشرقی خاندان کے آخری حکمراں حسین شاہ شرقی کے 'نوحہ گران' (ابراہیم شاہ کا صدر امام باڑہ) کی توسیع کی۔ اس نے ایک عالیشان مسجد، جامع الشرق' بھی تعمیر کروائی، جو جونپور میں ایک عرصے تک عزاداری کا مرکز رہی اور بعد میں جونپور کے ہی سید کرامت علی کی کوششوں سے حکومتِ برطانیہ

۱- سابقہ حوالہ، ہسٹری آف عزاداری ان جونپور ص ۲۱ ۲- ایضاً ص ۲۱ ۳- ایضاً، ص ۲۵-۲۲

نے کچھ عرصے کے لئے یہاں عزاداری کو ممنوع قرار دے دیا۔[۱]

اکبر کے دور میں منعم خاں خانخاناں جونپور کا گورنر ہوا (۱۵۶۷ تا ۱۶۷۶) جو انتظامی امور کی بہت اچھی قابلیت رکھتا تھا۔ یہ اثنا عشری شیعہ تھا۔ اس نے کنگھرا میں ایک مسجد اور ایک خانقاہ ذکران، بنوائی۔ عزاداری پھر کافی مقبول ہوئی اور جونپور عزاداری کا مرکز بن گیا۔ اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سید احسن اخوندمیر، جو ایران کے شاہ طہماسب کا ایک فوجی افسر تھا، وہ ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آیا تھا اور جونپور میں ہی مقیم ہوا تھا۔ یہاں اس نے کئی عزاخانے بنوائے اور عزاداری کی رسوم میں ایرانی طریقہ کے مطابق، ذوالجناح کا جلوس قایم کیا۔[۲]

راجا ادارت جہاں، اپنے سلسلۂ نسب کے اعتبار سے سید احسن اخوند میر کے سلسلے سے جا ملتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک مسجد اور عزا خانہ بنوایا جو ابھی تک باقی ہیں اور اچھی حالت میں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں جونپور کا پہلا مقتول ایک عزادارِ حسین ہی تھا۔ شہ بزرگ بھی راجا ادارت جہاں ہی تھے۔ ان کے لڑکے راجا مظفر جہاں اور پوتے ذوالفقار جہاں اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اب بھی مجلسوں اور تمام ماتمی رسوم میں حصہ لیتے ہیں۔[۳]

جہاں تک جونپور کی عزاداری اور اس کی اہمیت کا سوال ہے۔ اسے جعفری ٹائمس (جعفری آبزرور) ایک شیعہ اخبار جو بمبئی سے شائع ہوتا ہے اور جونپور میں کافی مقبول ہے، کے بیانات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے خصوصی محرم نمبر میں لکھتا ہے۔ ''امام حسینؑ کا مقصد اپنے سماج کے حالات کو سدھارنا اور اسلام کے فراموش کردہ قوانین وقواعد، کو دوبارہ مستحکم کرنا تھا۔ اس لیے ہم اس وقت تک خود کو سچا عزادار کہلانے کے مستحق نہیں ہوسکتے جب تک ہم اپنے فرائض، جیسے قرآن کی واجب کردہ نماز، روزہ، اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور انسانوں سے محبت وغیرہ انجام نہ دیں، اور ممنوعہ اعمال، جیسے موسیقی سننا، گندی فلمیں دیکھنا، غیر ضروری گپ شپ میں وقت ضائع کرنا وغیرہ سے پرہیز نہ کریں۔[۴] اس طرح اس نے عزاداری کے روحانی پہلو پر بار بار زور دیا۔

عزاداری حقیقت میں رسول اللہؐ کے خاندان کے محترم افراد پر اسلام دشمن لوگوں کی طرف سے کیے جانے والے مظالم کے خلاف ایک اجتماعی احتجاج ہے اور مجلس عزا کو اصل میں حضرت زینب (س)

۱- ایضاً نیز، بیگ، مرزا عباس علی، جونپور نامہ، حسینی مشن، لکھنؤ ۱۹۸۷، ص ۸۷ میں حوالہ ۲- ایضاً ص ۴۵-۴۲ ۳- ایضاً ص ۵۳-۵۰

۴- کریمی، محمد رضا، ''دی امپارٹینس، آف مورننگ،'' ''عزاداری'' جعفری ٹائمس، جعفری آبزرور، ۲ نمبر ۱، اگست ستمبر، بمبئی ۱۹۸۸، ص ۱۳

کی سنت کہا جاسکتا ہے۔ جونپور کے شیعوں کے لیے محرم کی ہر شام، شام غریباں، ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید وصی احمد کاظمی سے عزاداری کی اہمیت پر گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ کربلا میں حسینؑ کا شہادت کو چُن لینا ہمیں بتاتا ہے کہ ''دوسروں کو تکلیف دینے سے بہتر خود تکلیف برداشت کرلینا ہے''۔ ان کی شہادت بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لیے پیش کی جانے والی قربانیوں میں ایک مثالی قربانی ہے۔ ماتم کے عمل اور خود اذیتی سے ہم خود کو تکلیف پہنچاتے ہیں''۔[۱]

حسینؑ اور اُن کے رفقاء پر ماتم عزاداریِ محرم کا مخصوص عمل ہے۔ یہ اصطلاح شدتِ غم میں خود کو ہاتھوں سے (فارسی میں سینہ زنی کہا جاتا ہے) یا کسی ہتھیار سے (کوڑے کی طرح استعمال کرتے ہوئے۔ زنجیر زنی) اپنے جسم کو مارنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جونپور کے لوگ پہلی سے دس محرم کے دوران عزاخانوں میں ماتم میں حصہ لیتے ہیں۔ جونپور کی ایک ممتاز شیعہ شخصیت، حیدر عباس کے قول کے مطابق، محرم میں ماتم اللہ کے نزدیک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے ورنہ وہ اپنی مخلوق میں اپنے اپنے انداز میں رونے اور ماتم کرنے کی صلاحیت ہی نہ دیتا۔ اس کو سید محمد عمید نے اُن روایات سے تقویت دی ہے کہ کربلا میں حسینؑ کے غم میں پوری کائنات شریک تھی۔

عمید نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ نے ان عملوں (گریہ و بکا) کو دنیا میں ظاہر ہی اس لیے کیا تاکہ حسینؑ کے غم اور اُن کی یاد کی اہمیت لوگوں پر واضح ہوتی رہے۔[۲]

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ صرف شیعہ ہی محرم میں حسینؑ کا احترام نہیں کرتے۔ بہت سے سنّی اور ہندوؤں کے کچھ گروہ بھی کسی حد تک محرم خصوصاً عاشورہ کے جلوسوں میں حصہ لیتے ہیں۔ جونپور میں ہزاروں کی تعداد میں ماتم دار سڑکوں پر کربلا (پان دریبہ میں (صدر امام باڑے)[۳] کی

۱۔ مجلسِ عزا، سنتِ زینبی ہے، جس کی ابتداء انہوں نے دمشق کے قید خانے سے نکلتے ہی کی تھی۔ جنابِ زینب خاندانِ رسول سے متعلق یعنی حضرت علیؑ کی بیٹی تھیں۔ انہوں، کوفہ، کربلا اور شام میں بہت ظلم و زیادتیاں سہیں اور خود بھی دمشق میں شہید کی گئیں۔

حضرت زینب کا یہ عمل (مجلس) کی تصدیق امام معصومؑ نے کی تھی اس لیے یہ ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے حکم پر عمل کرے۔ (ایس۔ وی۔ میر علی، حسین، دی سیویئیر آف اسلام، تاریخ ترسیلِ قرآن، نیویارک ۱۹۹۱، ص ۲۳۵

۲۔ عمید، سید محمد، دی امپارٹینس آف کوپنگ اینڈ ویلنگ، کراچی، ۱۹۷۳، ص ۱۰-۷

۳۔ یہ شہر کے شمال مغربی آخری حصے میں جگدیش پور گاؤں میں واقع ہے اس کا بہت عالی شان دروازہ ہے اور احاطے میں کئی عمارتیں ہیں، جن میں 'قدمِ رسولؐ' اور روضۂ حضرت عباسؑ بھی شامل ہیں۔ یہ مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۷۱۹ تا ۱۷۳۹) کے دور میں شیخ فتح محمد عرف منگلی میاں نے تعمیر کروایا تھا۔ منگلی میاں الٰہ آباد کے ناظم کے رسالہ دار تھے۔ (مولوی فصیح الدین میاں، دی شرقی مونومینٹس آف جون پور، بدایوں ۱۹۲۲، ص ۶۷۰

طرف جاتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ہماری قومی ایکتا اور فرقے وارانہ ہم آہنگی کا ثبوت ہے جو جونپور اور اس کے اطراف میں نظر آتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ تاریخ داں کے تجربے کا نام ہے، مجھے جونپور میں نصیب خاں کی منڈی میں واقع ناظم علی خاں کے عزا خانے میں جانے کا موقع ملا۔ ان کے دور سے آج تک یہاں مجالس عزا متواتر ہوتی آئی ہیں۔ ایک مخصوص ذاکر کو کربلا حسین کے لیے بلایا گیا تھا۔ ہر مجلس مرثیہ خوانی سے شروع ہوتی ہے جسے لگ بھگ چھ افراد مل کر پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ''ذاکر کا بیان'' (وعظ) ہوتا ہے۔ اس 'وعظ' (ذاکری) کی ساخت روایتی انداز میں مقرر ہے۔ خدا کی حمد وثنا، رسول اور اہل بیت کی فضیلت کا بیان، فضائل اور دعا، کربلا کے شہداء کے فضائل، اس بات پر زور کہ ہمیں اُن سے ہدایت حاصل کرنی چاہیے، شہدائے کربلا اور رفقائے حسینؑ پر ہوئے مظالم یعنی 'مصائب' کی تفصیل، ظالموں کی ایذا رسانی کا ذکر جس کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ہر شخص زور زور سے رو رہا ہوتا ہے یا اپنی رانوں اور سروں کو پیٹ رہا ہوتا ہے، یا رومال سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو ڈھک کر سسکیاں لے رہا ہوتا ہے۔ یہ مجلس ناظم علی خاں کے پوتے علی ضامن خاں نے منعقد کی تھی۔ ان کے اچھے دنوں کے گزر جانے کے باوجود ان کے خاندان میں عزاداری کی روایت ابھی تک باقی ہے۔

عام طور پر مجلس عزا کے پانچ حصے ہوتے ہیں: ۱- سوز خوانی ۲- سلام ۳- مرثیہ خوانی ۴- مذہبی بیان اور ۵- نوحہ۔ سوز، پیغمبرؐ، اُن کے وصی و اہل بیتؑ کی شان میں اردو میں چھوٹی نظمیں ہوتی ہیں جو سُر سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد عام طور پر سلام پڑھے جاتے ہیں پھر مرثیہ پڑھا جاتا ہے جس میں المیہ بیان ہوتا ہے چنانچہ زیادہ تر عزادار رونے لگتے ہیں۔ اس کے بعد جو بیان ہوتا ہے اس کے دو حصے ہوتے ہیں پہلے حصے میں ذاکر اسلام کے اصولی اور تاریخی نکتے بیان کرتا ہے اور دوسرا حصہ کربلا کے المناک واقعات بیان کرنے کے لیے وقف ہوتا ہے اور پُرسوز ہوتا ہے۔ مجلس نوحے پڑھے جانے کے بعد ختم ہوتی ہے۔ نوحہ پڑھتے وقت عزادار کھڑے ہوجاتے ہیں۔[۱] مجلس عام طور پر تبرک کی تقسیم پر ختم ہوتی ہے اور سے مولیٰ علی کی عطا سمجھتے ہوئے متبرک مانا جاتا ہے۔

دس محرم، جسے عاشورہ کہتے ہیں، اس روز (۶۸۰ عیسوی میں)[۲] امام حسینؑ اور اُن کے بہتر رفقاء

۱- امام باڑے میں مرد اور خواتین دونوں مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر ایک سیاہ پردہ درمیان میں پڑا ہوتا ہے۔ خواتین ذاکر کی صرف آواز سُن سکتی ہیں چونکہ ذاکر مرد سامعین کی طرف منھ کرکے بیٹھتا ہے۔ ماتم صرف مرد کرتے ہیں۔

۲- اس مجلس میں غم کی علامت کے طور پر امام باڑے کی تمام روشنیاں بجھادی جاتی ہیں۔ لوگ سیاہ لباس پہنے امام باڑے میں بیٹھتے ہیں۔

کی یاد میں خصوصی مجلسیں ہوتی ہیں۔ اس روز جونپور میں بہت مجمع ہوتا ہے کیونکہ آج شہر اور مضافات سے تعزیے لاکر دفن کیے جاتے ہیں۔ملہار روڈ پر واقع مفتی محلے کے پاس صدر امام باڑے سے ملحق کربلا میں لگ بھگ ایک لاکھ لوگ جمع ہوتے ہیں۔[۱] حالانکہ عددی اعتبار سے شیعہ جونپور کی آبادی میں کچھ فیصد ہی ہیں لیکن یہ محرم کی عزاداری میں اجتماعی طور پر اتنے زیادہ شریک ہوتے ہیں کہ بظاہر یہ بڑی تعداد لگتی ہے۔

اپنے سروے کے دوران میں نے سو سے زیادہ عزا خانے جونپور میں پائے ان جگہوں پر تعزیے رکھے جاتے ہیں۔ اس طرح جونپور کی سماجی زندگی میں عزاداری کی جڑیں بڑی گہری نظر آتی ہیں اور ان کا اثر یہاں کی عام زندگی کے عام رسم و رواج پر بھی نظر آتا ہے۔ اس طرح ایک زمانہ گزر جانے کے باوجود اس تاریخی شہر جونپور نے نہ اپنا غیر فرقہ وارانہ کردار گم کیا ہے اور نہ اپنی تاریخی روایتوں کو بھلایا ہے۔ نئی نسل مغربی تہذیب کے اثرات کے باوجود اپنی عزاداری کی تاریخی روایت کی قدر کرتی ہے۔ یہ لوگ کسی اور چیز سے زیادہ ان اجتماعی رسوم کی روحانی طاقت اور محرم کی روایتوں کو سمجھتے ہیں۔ پروفیسر صادق نقوی (شیعہ ڈگری کالج، جونپور) نے دوران گفتگو مجھے بتایا کہ محرم کے دنوں میں ہر شیعہ کا گھر امام باڑے میں بدل جاتا ہے۔محرم کے دس دنوں میں آخری دن الوداع پر ہر طرف یہ آوازیں گونجتی سنائی دیتی ہیں۔ ''واممداً! کشتہ شد حسینؑ'' (اے محمدؐ۔ حسینؑ شہید کردیے گئے)۔

اس طرح شیعوں کی عزاداری کچھ مقدس ہستیوں پر کیے گئے بدترین مظالم اور غیر انسانی برتاؤ پر اظہار رنج وغم کے لیے کی جاتی ہے جو اُن لوگوں کے ہاتھوں ہوئے تھے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔حقیقت میں انہوں نے اس پوری دنیا میں بنی نوع انسان کے کردار پر ایسے بدنما داغ لگادیئے ہیں جو صفحۂ تاریخ سے کبھی مٹائے نہیں جاسکتے۔ یہ وہ غم ہے جس پر پورا خاندان بنی نوع انسان تا قیامت رنج وغم مناتا رہے گا۔[۲] حقیقت یہ ہے کہ امام حسینؑ جیسا نہ کبھی کوئی ہوا نہ کبھی ہوگا۔ چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی پوری دنیائے انسانیت کے لیے حسین حوصلے اور ولولے کا منبع ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے مندرجہ ذیل چند مصرعوں میں اظہار کیا ہے۔ (انگریزی متن سے آزاد نثری ترجمہ)

۱-تعزیہ کا جلوس بہت بڑے مجمعے کے ساتھ کربلا پہنچتا ہے۔ اس کے چاروں طرف کی بڑی شاہراہوں پر ٹریفک ۳ سے ۸ بجے رات تک ۴ یا ۵ گھنٹے کے لیے روک دیا جاتا ہے یا کسی دوسرے راستے کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

۲-ایس۔وی۔میر احمد علی، حسن دی سپوئیر آف اسلام، تاریخ ترسیل قرآن نیویارک ۱۹۹۱، ص ۳۶-۲۳۵

میرے ملک کے لوگ آج تجھ پر آنسو بہا رہے ہیں
اور شدتِ غم سے اپنے سینوں پر ماتم کر رہے ہیں
اور غمگین، دردناک سُروں میں، اُن قصوں کو دہرا رہے ہیں
کیسے جلتی ریت پر تونے جان دی
تونے ظالم کی سفلہ مانگوں کو ٹھکرا دیا
اور اپنی روح کی شکست کے بجائے تونے موت کو ترجیح دی
کسی طرح کی لغزش بغیر تونے شہادت کو گلے لگا لیا
اس حقیقت کو جس نے سمجھ لیا وہ رو دیا

میوات کے میووں میں محرم کی رسمیں

ڈاکٹر جی ڈی گلاٹی☆

میووں کا علاقہ 'میوات' راجستھان کے الور اور بھرت پورضلعوں کے بڑے حصوں اور ہریانہ میں گوڑگاؤں اور فرید آباد اور اتر پردیش میں متھرا اور آگرہ کے کچھ حصوں پر مشتمل ہے۔ اب حکومت ہریانہ نے اس خطے میں ایک الگ ضلع بھی بنادیا ہے جس کا صدر مقام نوح ہے۔

روایات کے اعتبار سے میولوگ راجپوت نسل سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔[1] اب میو مذہباً مسلمان ضرور ہیں لیکن اپنی تمام ثقافتی اور مذہبی قدیم روایات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ تبلیغی جماعت ایک کے مبلغ اور ترجمان نے لکھا کہ: ''میولوگ نماز کے نام تک سے ناواقف تھے''۔[2] اگر اتفاقاً کوئی مسلمان ان کے علاقے میں چلا جاتا تھا اور نماز پڑھنے لگتا تھا تو اس کے چاروں طرف لوگ جمع ہوکر حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ ان کے خیال میں اس کے پیٹ میں درد ہورہا ہوتا یا وہ بالکل مخبوط الحواس ہوچکا ہوتا، جس کی وجہ سے وہ بار بار اٹھک بیٹھک لگاتا نظر آتا تھا۔

یہ بات واضح نہیں ہے کہ کب اور کیسے اسلام کی جڑیں میوات میں جمیں۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں دو دارالسلطنتوں دہلی اور آگرہ کے درمیان رہتے ہوئے[3] بھی یہ ترکوں اور مغلوں دونوں سے الجھتے رہے۔ پھر بھی مغلوں کے تحت انہوں نے شاہی خدمات بھی انجام دیں اور اکبر کے دور میں انہیں دوڑنے والے (ہرکارے) کی حیثیت میں ملازم رکھا گیا۔ ابوالفضل نے'' آئین اکبری'' میں اکبر کی فوج کی تقسیم کی تفصیلات دیتے ہوئے میووں کا ذیلی سرخی ''میوڑے'' کے تحت تذکرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:'' یہ میوات کے باشندے ہیں اور دوڑنے والوں کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہ بڑے دور دراز علاقوں سے بڑے جوش وخروش کے ساتھ ہر مطلوبہ چیز لے آتے ہیں۔

☆ دہلی یونیورسٹی

۱- تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ''میوات ڈیورنگ تھرٹینتھ سنچری'' از جی۔ڈی گلاٹی، پنجاب ہسٹری کانفرنس کے پندرھویں اجلاس کی روداد، پٹیالہ۱۹۸۱ء، ص ۶۱

۲- منظور نعمانی کی ''تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات'' لکھنؤ ۱۹۸۹ء کا اقتباس یوگندر اسکند کی'' دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف تبلیغی جماعت'' (۱۹۲۰-۲۰۰۰)' نئی دہلی ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۰

۳- جی۔ڈی گلاٹی، سابقہ حوالہ، ص ۶۴-۶۱

بہترین جاسوس ہیں اور بڑی الجھی ہوئی خدمات بجالا سکتے ہیں۔ ایسے ہزاروں لوگ موجود ہیں جو احکام بجالانے کے لیے ہر وقت حاضر ہیں'' ۔[1]

ان کے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں کئی نظریے سامنے آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سالار مسعود غازی (جو محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے) کے میووں پر گہرے اثر کی وجہ سے ان میں تبدیلیِ مذہب کی ابتدا ہوئی۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں اس خطے میں بہت سے صوفی داخل ہوئے، جس کے نتیجے میں کئی صدیوں کے دوران میووں میں تبدیلیِ مذہب کا سلسلہ شروع ہوا مگر ان کی 'اسلامیت' بہت جزوی سی ہی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسلام کے کچھ عمل اپنا لیے لیکن ساتھ ہی اپنے مقامی کلچر اور مذہب کی روایات کو بھی باقی رکھا۔ وقتاً فوقتاً صوفیائے کرام اور علمائے عظام اس بات کی کوشش بھی کرتے رہے کہ ہندو کلچر کے جو بہت واضح عمل ان میں باقی نظر آرہے تھے انہیں ختم کردیں۔ بہرحال یہ تبدیلیِ مذہب جزوی اور برائے نام ہی رہی۔[2] انیسویں صدی کے آخری ربع میں ریاست الور کے سیٹلمنٹ آفیسر میجر راڈلینٹ کے الفاظ میں:

''اب تمام میو مسلمان ضرور ہیں لیکن ان کے گاؤں کے دیوی دیوتا وہی ہیں جو وہاں کے ہندوؤں کے ہیں اور یہ لوگ کچھ تہوار بھی وہی مناتے ہیں۔ چنانچہ میووں میں ہولی کھردرے قسم کے کھیلوں کا تہوار ہے اور اسے اتنا ہی اہم تہوار سمجھا جاتا ہے جتنا محرم، عید اور شب برأت، اور یہ اسی طرح جنم اشٹمی، دسہرا اور دیوالی بھی مناتے ہیں۔ یہ لوگ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کی غرض سے نوٹ (پیلی چٹھی) لکھنے کے لیے ایک برہمن پجاری کو بھی متعین کرتے ہیں، خود کو ہندو ناموں سے پکارتے ہیں مگر ان میں رام شام نہیں ہوتا۔ بہرحال سنگھ عام طور پر ناموں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اماوس کے دن جو ہر مہینے سورج اور چاند کے ملاپ کا دن ہوتا ہے، میو ہندو اہیروں اور گوجروں وغیرہ کے ساتھ محنت مزدوری چھوڑ دیتے ہیں، یا جب وہ کوئی کنواں بناتے ہیں تو اس سلسلے کا سب سے پہلا عمل 'بیرو جی' یا ہنومان کے لیے ایک پلیٹ فارم بنانا ہوتا ہے۔ اپنے رسم و رواج کے اعتبار سے آدھے ہندو ہوتے ہیں۔ ان کے گاؤں میں مشکل سے ہی کوئی مسجد نظر آتی ہے۔ میووں کی عبادت گاہیں ان کے پڑوسی ہندوؤں جیسی ہی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر 'پنج پیر' 'بھاٹیا' اور 'چاہنڈ' وغیرہ۔ چاہنڈ اور کھیرا دیو،

۱- ابوالفضل، آئینِ اکبری، ترجمہ: ایچ بلوخمین، ج ۱، تیسرا ایڈیشن، طباعت ثانی، نئی دہلی، ص ۲۶۳

۲- یوگیندر اسکند، سابقہ حوالہ، ص ۱۱۲

اپنے لباس کے سلسلے میں بھی یہ لوگ میوات میں آباد دوسری کسان ذاتوں کے لوگوں سے کسی طرح ممتاز نہیں کیے جاسکتے تھے۔ میونیاں (میوعورتیں) راجستھانی لہنگا اور بلاؤز پہنتی تھیں اور چاندی کے بھاری بھاری زیور۔ زیادہ تر میو سر پر چوٹی یا بودھی بھی بڑھاتے تھے جو ہندوؤں میں عام رواج تھا۔[۲] جہاں تک اسلامی ظاہری امور کا سوال ہے ان میں مردوں میں ختنہ، نکاح اور دفن کے سلسلے کے امور پورے کیے جاتے تھے گوکہ ان امور کو بھی کسی حد تک ہندو سانچے میں ڈھال لیا گیا تھا۔ انہوں نے کبھی ماضی بعید میں اسلام ایک مذہب کے طور پر قبول کرلیا تھا اور انہیں خود کو مسلمان کہے جانے پر فخر بھی تھا۔ لیکن وہ ملک کے باقی حصے کے مسلمانوں کے مقابلے میں میوات کے ہندوؤں سے قریب تر تھے۔ اس طرح میو تمدن کا مطالعہ کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ میووں میں ایک ایسی شعوری کوشش یا فکر موجود تھی کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کلچروں کے عناصر کو اپنائے رہیں اور ایک ایسا انداز پیدا کریں جو بنیادی طور پر میواتی ہو۔ دونوں فرقوں کے صوفی سنتوں کا احترام و عقیدت، اور دونوں فرقوں کی مقدس کتابوں اور روایات سے لگاؤ ان کے یہاں بالکل واضح نظر آتا ہے۔ میووں کے ثقافتی ورثے میں دونوں جزو لازم کی طرح سموئے ہوئے ہیں۔[۳] انہیں ہندوستان کے مخلوط کلچر کی بہترین مثال کہا جاتا ہے۔ ایک بہت عام کہاوت، جس میں ہندو جاٹوں اور مسلمان میووں کے انداز میں مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے اس طرح ہے: 'جاٹ کیا ہندو! اور میو کیا مسلمان!'۔[۴]

میووں کی بارہ 'پالوں' اور لگ بھگ باون 'گوتروں' میں تقسیم سے بھی ان کے راجپوت سلسلے سے تعلق رکھنے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یعنی یادو، تومر، اور کچھواہا شاخیں۔ ہر پال اور گوتر اپنی ایک الگ شناخت رکھتا تھا اور میوات میں کئی کئی گاؤں پر مشتمل ہوتا تھا۔ بہرحال، اب میو ایک وسیع علاقے میں آباد ہیں جو ملک کی چار ریاستوں ہریانہ، راجستھان، اترپردیش اور مدھیہ پردیش میں پھیلا ہوا ہے۔

جیسا کہ جدید محققین کا خیال ہے میووں کی مذہبی روایت ان کے لیے خاصی فائدہ مند ہی ثابت ہوئی ہے۔ میوات کی زراعتی زمینوں میں سے زیادہ تر زمینوں پر میو کاشتکار ہونے کی وجہ سے متصرف رہے۔ اس علاقے میں عددی اعتبار سے میو یہاں کی غالب ذات تھے۔ اپنے علاقے کے غیر اسلامی رسم و رواج اور اداروں کو جیسے گوتر، اور پال کا نظام اور نچلی ذاتوں سے چھوا چھوت کے عمل کو برقرار

۱- میجر پاؤلیٹ، گزیٹر آف الور، لندن ۱۸۷۸ء، ص ۳۸ ۲- یوگیندر اسکند، سابقہ حوالہ، ص ۱۱۳

۳- شمس الدین شمس، میوز آف انڈیا، ویز کسٹمس اینڈ لاز، نئی دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۳۶ ۴- ایضاً، ص ۳۶

رسم و رواج اور اداروں کو جیسے گوتر، اور پال کا نظام اور نچلی ذاتوں سے چھوا چھوت کے عمل کو برقرار رکھنے کی وجہ سے ایک حد تک اسلامیت قبول کر لینے کے باوجود میووں نے اس علاقے کے سماجی درجات میں ایک اونچے درجے کی دعوے داری قائم رکھی۔ غیر مسلم دستکار، خدمتگار، یہاں تک کہ برہمن تک زرعی پیداوار میں ایک حصے کے بدلے میں اپنے میو مربیوں کی خدمت کرتے رہے۔ جب تک ان گاہک یا خدمت گزار قسم کی ذاتوں کی معاشی اور سماجی زندگی میں کوئی اختلال پیدا نہیں ہوا، ان ذاتوں کے لوگوں نے میووں کی مخلوط سی مذہبی شناخت کو نظر انداز کرنا مناسب سمجھا۔ اس لیے میووں نے بھی ان دونوں فرقوں (ہندو اور مسلمان) میں سے کسی طرف بھی زیادہ جھکنے کی کوئی ناگزیر مجبوری محسوس نہیں کی کیونکہ ان کی حیثیت میوات میں محفوظ تھی۔ میوات کی دوسری ذاتوں کے گروہوں نے بھی اس علاقے پر میووں کے غلبے پر کوئی سوال نہیں اٹھایا۔[۱]

دوسری طرف، چونکہ میو عام طور پر دہلی کے مسلم حکمرانوں سے مخالفانہ رویہ رکھتے تھے اس لیے ان کی عام مذہبی روایات انہیں ایک علاحدہ شناخت کا احساس دلاتی رہتی تھیں، جو ان کے شاہی مخالفوں سے بالکل متضاد تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میوات کا مقامی جاگیردار اعلیٰ طبقہ 'خان زادے'، میووں کے مقابلے میں اسلامیت کا زیادہ حامل تھا، اپنی عورتوں کو سخت پردے میں رکھتا تھا اور دوسری اسلامی روایات کا زیادہ پابند تھا۔[۲]

اگلے چند برسوں میں مختلف سماجی، معاشی دباؤ اور مجبوریوں کے سبب میووں کی حالت امید افزا نہیں رہی، میووں کو لگ بھگ معینہ وقفوں کے ساتھ بہت سخت قحط جھیلنے پڑے جن کے نتیجے میں یہ جین اور ہندو بنیوں، ساہوکاروں وغیرہ سے لیے ہوئے قرضوں کے بوجھ میں بری طرح دب گئے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ان کی معاشی ابتری میں نہ صرف بہتری نہیں ہوئی بلکہ اس میں بہت تیز گراوٹ آئی، جس کا اظہار پنجاب گورنمنٹ کی انتظامی رپورٹ ۱۹۱۶ء سے ہوتا ہے۔ جیسے جیسے میو غربت و افلاس میں نیچے اترتے رہے انہیں شدت سے یہ بھی احساس ہوتا رہا کہ بنیے نہ صرف ان کی مصیبتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ حقیقت میں وہ اس صورت حال کی جڑ بھی ہیں۔ اور چونکہ بنیے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی زندگی کا ایک مقامی منبع سمجھے جاتے تھے اس لیے ان کے خلاف بڑھتے ہوئے جذبات رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی ہندو مذہبی روایات سے دوری کی صورت میں ظاہر ہوئے اور

۱۔ شمس الدین شمس، میوز آف انڈیا، ص ۳۵
۲۔ یوگیندر اسکند، سابقہ حوالہ، ص ۱۱۴

نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے سے انکار کردیتے تھے اور انہیں اپنی رسوم میں گندگی پیدا کرنے والا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی دوران تبلیغی جماعت تحریک بھی علاقے میں داخل ہوچکی تھی، جنہوں نے میووں کو ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائے رکھنے کی تلقین کی۔ اس طرح سے میووں کو ایک طرف تبلیغی جماعت کے پرچار اور دوسری طرف جدید تعلیم کے اثر سے اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہوا۔ مدرسوں کا قیام اور مسجدوں کی تعمیر، ان کے توسط سے ہوئی۔ اسلامی تعلیمات نے انہیں ایک علاحدہ مذہبی گروہ کی شکل دے دی اور انہیں پہلے سے زیادہ متحد کردیا۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم ملک نے میووں کے لیے حقارت اور پریشانی کے نئے دروازے کھول دیئے تھے۔ تقسیم کے بعد جو فسادات ہوئے اس میں میووں کی بہت سی زمینوں پر نچلی ذاتوں کے ہندو قابض ہوگئے، پھر جو میو پاکستان چلے گئے ان کی زمینوں کو حکومت نے پنجابیوں کو الاٹ کردیا جو مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ تھے۔ ایک وقت چونکہ تبلیغی جماعت نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو اسلام کو کم سے کم ظاہری طور پر اپنالینے کی طرف راغب کردیا تھا تو ان نئے بیرونی عوامل نے ان میں اسلامیت کے نفوذ کو اور تیز کردیا۔ آمد و رفت کی بہتر سہولتوں نے میوات میں تبلیغی دوروں میں بہت تیزی سے اضافہ کیا جن میں باہر کی تبلیغی جماعتیں اور خود میووں کی اپنی جماعتیں شامل تھیں جو اس پورے خطے میں اور باہر آتی جاتی تھیں۔ اسلامی ادب اور اسلامی تعلیم دونوں سے میووں نے اور زیادہ واقفیت حاصل کی جس سے رفتہ رفتہ ان میں ایک اسلامی شناخت اور پورے ملک کے مسلمان فرقے سے ان کی ایکتا اور یکسانیت کا احساس اور بڑھا۔ بابری مسجد کے بحران سے مذہبی شناخت کے احساس میں خاص طور پر اور اضافہ ہوا۔ چنانچہ آج میو ہندو روایت کو چھوڑ رہے ہیں مگر یہ لوگ دونوں مذہبوں کی ہلکی پھلکی اور دلچسپی کی حامل رسوم میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ہریانہ میں زیادہ واضح ہے جہاں میو زیادہ تعلیم یافتہ اور معاشی اعتبار سے بہتر حالت میں ہیں لیکن راجستھان میں اپنی غربت کی وجہ سے وہ اب بھی پرانی روایات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ [1]

اسلامی کلینڈر کا پہلا مہینہ محرم اسلامی معاشرے میں بہت اہم مانا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں، جس میں ہندوستان بھی شامل ہے اسے پورے جوش وخروش، شان وشوکت، اور گہرے جذبے کے ساتھ

۱- مزید مطالعہ کے لیے یوگیندر اسکند، سابقہ حوالہ ملاحظہ ہو، ص ۱۴۸ تا ۱۷۴، نیز ملاحظہ ہو نور محمد (ایڈ) انڈین مسلمس، نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۳

اسلامی کلینڈر کا پہلا مہینہ محرم اسلامی معاشرے میں بہت اہم مانا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں، جس میں ہندوستان بھی شامل ہے اسے پورے جوش وخروش، شان وشوکت، اور گہرے جذبے کے ساتھ ایک مذہبی فریضے کے طور پر منایا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں شیعہ فرقے کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر محمدؐ کے نواسے حسینؓ خلافت کے حقدار و جانشین تھے۔ یہ لوگ ان کی شہادت کا سوگ مناتے ہیں جو دس محرم ۶۱ھ/۶۸۰ء میں کربلا کی جنگ میں واقع ہوئی تھی۔ حسینؓ کے بھائی حسنؓ (جنہیں شیعوں کے یقین کے مطابق زہر دیا گیا) انہیں بھی اس موقعے پر یاد کیا جاتا ہے۔ ملک میں سنی فرقہ عام طور پر محرم کے اس سوگ میں شریک نہیں ہوتا مگر میو اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ سنی ہوتے ہوئے بھی محرم میں شریک ہوتے ہیں، ہاں کسی طرح کا سوگ نہیں مناتے۔ حقیقت میں اس سانحے کی یاد میں عام شیعہ انداز کے برعکس ان لوگوں میں کربلا کے غمناک واقعات سے کسی قسم کے ذاتی لگاؤ یا جذبے کا فقدان نظر آتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا نسلی اعتبار سے ان کا راجپوت سلسلے اور ہندوؤں سے ایک دیرینہ تعلق اور ان کے میلوں اور تہواروں میں شریک ہوتے رہنے کی وجہ سے محرم بھی ن کے لیے اور بہت سے تہواروں کی طرح ایک تہوار ہی ہے۔

جہاں تک میوات میں محرم کی رسومات کی ابتدا کا سوال ہے ہم مشکل ہی سے کوئی تحریری شہادت حاصل کرسکتے ہیں، بہرحال یہ بات بالکل صاف ہے کہ یہ صوفی اثرات کا نتیجہ ہوسکتا ہے یا ان کے راجپوت نسل سے تعلق کا۔ اس کے علاوہ صدیوں سے ان کے ہندو میلوں ٹھیلوں اور تہواروں میں حصہ لیتے رہنے کے نتیجے میں وہ اس علاقے میں ثقہ قسم کے مسلمان کا روپ اختیار بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ہم ان کے تبدیلی مذہب اور مغلوں کی خدمات انجام دینے کا ذکر کرچکے ہیں۔ مغل خود ہی ایک مخلوط کلچر کی ابتدا کرنے والوں میں سے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہمایوں اور بیرم خان دونوں نے میو لڑکیوں سے شادی کی تھی جس سے ہندوستان میں اپنی رعیت کی طرف ان کے نرم رویّے کا اظہار ہوتا ہے۔ اکبر کے دربار میں کئی شیعہ عالم بھی موجود تھے۔ عبدالرحیم خانخاناں جسے عام طور پر رحیم کہا جاتا ہے، ایک میونی کا ہی بیٹا تھا۔ اب اس بات کو باور کرلینے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے کہ اس دور کے میو وہی مذہبی روایات پوری کررہے تھے جو اس وقت کے مذہبی ماحول اور ان کے دوسرے بھائیوں، یعنی ہندوؤں کے ساتھ رہنے سے مطابقت رکھتی تھیں۔ ایسی صورت حال میں سنی مذہب کی راسخ الاعتقادی ان پر کوئی بہت گہرا اثر نہیں ڈال سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے آزاد روش اور اسلام کا وہ

1

میرے بچپن کے زمانے میں ہم لوگوں نے ہر سال اس مہینے کو دھوم دھام سے نہ صرف مناتے ہوئے دیکھا ہے بلکہ اسے ایک مبارک مہینہ سمجھتے ہوئے ہم میوؤں کے جلوس میں شریک بھی ہوئے ہیں، ان کے ساتھ گاؤں، گاؤں گھوم کر ٹھنڈا شربت پلایا ہے اور حسینؓ اور حسنؓ سے برکتوں کی دعا بھی کی ہے۔ مقامی لوگ تعزیے کے جلوس میں کسی تعزیے کے نیچے سے نکلنا ایک محترم اور مقدس عمل سمجھتے تھے اور اسے اپنے مستقبل کی بہتری کا ضامن مانتے تھے۔ اس پورے علاقے میں محرم کی رسوم کے لیے بہت سے مقررہ مرکز تھے۔ ان رسومات کی ادائیگی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ایک ماہر علم البشر (اینتھرو پولوجسٹ) نے، جس نے میوات کے چاونڈی کلاں نام کے ایک گاؤں میں مہینوں تک قیام کیا تھا اور ان کے ساتھ رہا تھا، لکھا ہے کہ یہ گاؤں اپنی وسعت، محلِ وقوع، ذات پات کے ڈھانچے اور معاشی اور سماجی تنظیم وغیرہ ہر لحاظ سے میوات کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہ گاؤں راجستھان کے ضلع الور کی تحصیل میں قومی راجدھانی دہلی سے ۱۴۰ کلومیٹر دور 'تجارہ' تحصیل میں واقع ہے۔

کئی لیڈروں اور میوات کے بہت سے بزرگوں سے گفتگو کر کے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس علاقے میں ہریانہ کے ضلعوں کے لوگ ماہِ محرم کے پہلے ہفتے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن ہمارے ماہر علم البشر دوست نے راجستھان کا کچھ مختلف منظر پیش کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ انہوں نے لکھا ہے:

''چاونڈی کلاں میں محرم کی رسومات کے سلسلے میں سب سے پہلے، گھروں میں، ایک میٹھی چیز پکائی جاتی ہے۔ نوجوان لوگ پیک کا سا لباس پہنتے ہیں اور آس پاس کے گاؤں میں جاتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں اس ٹولی میں چار میو اور ایک سقہ شامل تھے۔ اس وقت ان کا مخصوص لباس، جسے وہ اپنے عام کپڑوں پر ہی پہن لیتے ہیں، ایک سرخ لنگی ایک سبز الفی (مستطیل کپڑا، جس میں بیچ میں ایک سوراخ یا شگاف سا ہوتا ہے، اور اسے سر پر ڈال لیا جاتا ہے)، ایک لال اور سفید 'گنڈا' (رنگین دھجیوں سے بٹی ہوئی ایک لمبی ڈوری جسے پگڑی، سینے، پیٹھ اور کمر کے چاروں طرف لپیٹا جاتا ہے)، چمڑے کی یا دھاگوں کی ایک پٹی جس میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوتی ہیں اور ہاتھ میں ایک تلوار یا لکڑی، پر مشتمل ہوتا ہے۔ پیکوں کو جوتا پہننا منع ہوتا ہے۔ انہیں چارپائی پر سونے اور پہیے والی گاڑی پر سوار ہونے کی بھی ممانعت ہوتی ہے''۔[۱]

اس دن دوپہر کے وقت یہ پیک، گاؤں کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان ڈکوٹ

پر سوار ہونے کی بھی ممانعت ہوتی ہے"۔[1]

اس دن دوپہر کے وقت یہ پیک، گاؤں کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان ڈکوٹ برہمن جو ان کا سربراہ (انچارج) ہوتا ہے، ایک لال ڈوری (لال دھاگہ جو ہندو لوگ مذہبی رسوم ادا کرتے وقت استعمال کرتے ہیں) ان کی کلائیوں پر باندھتا ہے اور مرثیہ خوانی کر کے ان کی سربراہی کرتا ہے۔ گاؤں کے میدان میں ایک نقارہ رکھ دیا جاتا ہے جسے دو آدمی ایک ساتھ مار مار کر بجاتے ہیں۔ پیک اس کی تال پر ایک گھنٹے تک ناچتے کودتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتے ہیں اور پھر گاؤں کے دورے پر نکل جاتے ہیں۔

یہ لگ بھگ ہر گاؤں میں جاتے ہیں، پہلے اس گاؤں کے میدان میں ناچتے ہیں پھر گھر گھر جاتے ہیں، ناچتے ہیں اور پیسے جمع کرتے ہیں، اس طرح جو پیسہ جمع ہوتا ہے اسے کسی مذہبی عام منصوبے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ جیسے نگاڑے کی مرمّت وغیرہ۔ رات کو یہ لوگ کسی گاؤں میں آرام کرتے ہیں مگر صرف زمین پر فرش بچھا کر۔ اگلی صبح یہ اپنا دورہ پھر شروع کر دیتے ہیں اور روزانہ پانچ، چھ گاؤں پورے کر لیتے ہیں۔ یہ محرم کے ساتویں دن اپنے گاؤں واپس آجاتے ہیں۔

گاؤں کے زیادہ تر مرد کم سے کم ایک بار یا اس سے زیادہ مرتبہ جوانی میں پیک بنتے ہیں، مگر چاونڈی کلاں میں ہمیں ہندو اور سکھ لڑکے بھی پیک کا روپ بھرنے والے نظر آئے۔ پچھلے کچھ سالوں میں گاؤں کا ایک سکھ اور ایک ہندو نائی لڑکا حسینؑ کے سپاہی بنے تھے۔ جن ماں باپ کی اولاد مر جاتی ہے وہ اس امید میں کہ ان کا لڑکا زندہ رہے گا اپنے بچوں کو پیک بنانے کی منت مان لیتے ہیں۔[2]

سات محرم کی شام کو بہت سے خاندان مہندی کی رسم مناتے پیکوں کی واپسی پر، ان کا استقبال کرتے، گاؤں کے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لوگ دس بارہ روشن دیے، شربت کا ایک گلاس، ایک پیالی کھیر اور پسی ہوئی مہندی رکھ کر ایک پیتل کی تھالی سجاتے ہیں۔ اگر آدھی رات تک پیک واپس نہیں آتے، ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے، تو 'مہندی' کی یہ روایت اگلی رات میں پوری کی جاتی ہے۔

چاونڈی کلاں گاؤں کے پیک محرم کے آٹھویں دن صبح کو لوٹتے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کر کے وہ

۱- پرتاپ سی۔ اگروال، کاسٹ ریلیجن اینڈ پاور- این انڈین کیس سٹڈی، نئی دہلی ۱۹۷۱ء، ص ۶۵-۱۶۱

۲- ایضاً، ص ۶۲-۱۶۱

رات نہ لوٹنے، اپنے دورے کے درمیان بیل گاڑی پر سواری کرنے اور حسینؑ کی نافرمانی پر سرزنش کرنی شروع کردی۔ اس نے ایک فقیر کو بھی ڈانٹا جس نے ان پیکوں کے ساتھ رہنے کے فرض کو پورا نہیں کیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ اٹھا اور حاجی پیر کے مزار کی طرف دوڑا اور وہاں سجدے کی حالت میں کچھ دیر پڑا رہا۔ پھر وہ سیدھا لیٹا تو لگتا تھا اس کا جسم اکڑ گیا ہے۔ ایک چھوٹے سے مٹی کے برتن میں اپلا سلگا کر اس پر کسی قسم کے گوند (غالباً لوبان) کا سفوف ڈال کر اس کے پاس رکھ دیا گیا۔ اس کی دھونی نے اسے آہستہ آہستہ کچھ سکون پہنچا، اور کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ گاؤں کے ایک بزرگ سے پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ اس نوجوان کو کئی سال سے اس قسم کے دورے پڑ رہے ہیں، اور یہ اس وقت سے پڑنے شروع ہوئے ہیں جب سے وہ پاکستان سے واپس آیا ہے، جہاں وہ تقسیم ملک کے بعد ہجرت کر گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اسے معلوم ہوا کہ اس کی زمین کسی پنجابی رفیوجی کو الاٹ کی جا چکی تھی۔ اسی وقت سے اس کی یہ پریشانی شروع ہوئی ہے''۔

تقریباً دوپہر کے وقت پیک پھر کچھ آس پاس کے گاؤں کا دورہ کرنے چلے گئے اور رات کو نو بجے کے آس پاس واپس ہوئے۔ پیکوں کی کمر میں لپٹی پٹیوں میں لگی گھنٹیوں کی آواز پر گاؤں کے میدان میں مہندی کی تھالیاں پہنچنی شروع ہوئیں۔ پانچ خاندان بلاناغہ مہندی لاتے ہیں، ویسے جو چاہے وہ لاسکتا ہے۔ اس وقت یہاں صرف چار مہندیاں تھیں۔ ایک پچھلی رات یعنی مہندی کی رات کو ہی مسجد لے جائی گئی تھی۔

پیک گاؤں کے مختلف حصوں میں ناچتے ہوئے رفتہ رفتہ پکی مسجد کی طرف بڑھتے رہے مہندی کی تھالیاں اٹھانے والے ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کافی بڑی تعداد میں لوگ اس جلوس میں شامل تھے جو لگ بھگ دو بجے رات کو مسجد پہنچا۔ یہاں بھی پیک کچھ دیر ناچتے رہے پھر آرام کرنے رک گئے۔ انہیں مہندی کی تھالیوں سے شربت اور کھانا دیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے چراغوں کو مسجد کے طاقوں میں رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد ہر شخص خالی تھالیوں کے ساتھ اپنے گھر کو چلا گیا۔ تھالیوں میں مہندی اب بھی لگی ہوئی تھی جسے بعد میں دھو دیا جاتا ہے۔

۲۲ مئی، محرم کے نویں دن پیکوں نے پھر ناچنا شروع کیا۔ انہوں نے پورے گاؤں میں گھوم کر ہر گھر سے پیسہ جمع کیا۔ اس میں سے نصف روپیہ تعزیے کے اخراجات کے لیے تھا، اس کے علاوہ کچھ پیسہ دوسری رسموں کے لیے لیا گیا۔

۲۲ مئی، محرم کے نویں دن پکیوں نے پھر ناچنا شروع کیا۔ انھوں نے پورے گاؤں میں گھوم کر ہر گھر سے پیسہ جمع کیا۔ اس میں سے نصف روپیہ تعزیے کے اخراجات کے لیے تھا، اس کے علاوہ کچھ پیسہ دوسری رسموں کے لیے لیا گیا۔

دس محرم (۲۳ مئی) دوتانا میں ایک میلا لگایا گیا۔ بانسوں اور رنگین کاغذوں کا بنا ایک تعزیہ لایا گیا۔ تعزیے کے اخراجات کے لیے سات گاؤں نے چندہ دیا تھا۔ تعزیہ کا ڈھانچہ، جسے حسینؑ کے مزار کی نقل مانا جاتا ہے، لگ بھگ چھ میٹر اونچا تھا اور اس پر ایسی علامتیں بھی تھیں جن سے ان کے بھائی حسنؑ کے مزار کا اشارہ ہوتا ہے (تعزیے کے نیچے) دونوں طرف بانسوں کو کافی آگے بڑھا کر لگایا جاتا ہے تاکہ لوگ اسے کندھوں پر اٹھا سکیں۔ تعزیے کے آگے ایک نقارہ رکھا جاتا ہے جسے ہندو مسلمان دونوں دن بھر بجاتے رہتے ہیں۔ تعزیے کے آگے سقے پانی پلاتے ہیں۔ کچھ لوگ تعزیوں کے آگے اپنی طرف سے پانی چھڑکنے کے لیے پیسے بھی دیتے ہیں۔ اس عمل کو نیک کام سمجھا جاتا ہے، اور اسے کربلا میں حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کردیے جانے کی نشانی کے طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ پکے ہوئے کھانے بھی چڑھاتے ہیں جو تعزیے کے کسی خدمتگار کو دے دیا جاتا ہے، جو عام طور پر ملا ہوتا ہے۔ چاونڈی کلاں کے ایک بوڑھے بنیے نے بتایا کہ: ''پرانے وقتوں میں ہم بھی محرم میں شامل ہوتے تھے۔ ہم تعزیے کے خدمتگار کو میٹھے چاول دیا کرتے تھے جیسا میو کرتے ہیں، مگر اب جب کہ میو لوگ کٹر مسلمان ہوگئے ہیں اور انھوں نے ہمارے تہواروں میں شریک ہونا بند کردیا ہے تو ہم نے بھی تعزیے پر چڑھاوے بند کردیے ہیں''۔

سیکڑوں لوگ، جن میں زیادہ تر میو ہوتے ہیں میلے میں آتے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے اپنے بہترین لباس پہنے خوش خوش میلے میں آتے ہیں۔ اس دن میو اپنے گھروں میں کوئی میٹھی چیز بھی پکاتے ہیں۔ میلے میں بہت سی دکانیں لگ جاتی ہیں جن میں کھانے پینے کا سامان، ہلکے پھلکے زیور اور کھلونے بکتے ہیں۔ کوئی چار بجے تعزیے کو بڑھایا جاتا ہے، ایک وقت میں کچھ میٹر۔ اسے عیدگاہ کے پاس تالاب تک سورج غروب ہونے تک پہنچنا ہوتا ہے۔ یہاں اسے توڑ کر پانی میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ جب تعزیہ میلہ میدان سے آگے بڑھایا جاتا ہے تو یہاں کھیل تماشے شروع ہوتے ہیں۔ جیسے کشتی کے دنگل وغیرہ ہوتے ہیں۔

محرم کے تیرھویں دن (۲۵ مئی ۱۹۶۴ء) چاونڈی کلاں میں ایک تعزیہ کھانا ہوا۔ پکیوں، نے

لیے پلاؤ نہیں کھایا کہ اسے مسلمانوں نے پکایا تھا اور اسے بھینس کے گوشت میں بنایا گیا تھا۔

پہلی جولائی ۱۹۶۴ء کو پورے میوات میں حسینؓ کے 'چالیسے' (حسینؓ کے انتقال کی برسی کے چالیسویں دن) پر میلے لگے۔ چاونڈی کلاں کا کوئی شخص کسی میلے میں شریک نہیں ہوا لیکن زیادہ تر گھروں میں اس دن کچھ میٹھا ضرور پکایا گیا۔

جیسا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے ہریانہ میں محرم کچھ ہی گاؤوں میں منایا جاتا ہے جب کہ راجستھان میں یہ روایت اب بھی بہت سے گاؤوں اور شہروں میں باقی ہے۔ مثال کے طور پر الور میں اب بھی تعزیے کا جلوس میو بورڈنگ ہاؤس سے نکلتا ہے اور ایک جگہ جسے ابھی تک کربلا کہا جاتا ہے، وہاں لے جاکر دفن کیا جاتا ہے۔اس سے پہلے یہ جگہ قبرستان (ڈمپنگ گراؤنڈ) ہی تھی مگر اب یہاں عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ پھر بھی حکومت نے اس کے ایک حصے کو تعزیے دفن کرنے کے لیے مختص کردیا ہے اور اسے ابھی کربلا ہی کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جلوس کے دوران میونیاں حسینؓ کی یاد میں جو کچھ گاتی ہیں وہ ان کی مادری زبان 'میواتی' میں ہوتا ہے جو برج بھاشا اور راجستھانی سے ملی جلی زبان ہے۔ ہندو تہوار منانے کا رواج میوؤں میں اب لگ بھگ ختم ہوتا جارہا ہے پھر بھی ایسے موقعوں پر یہ دوستوں کو مبارکباد دے کر اور مٹھائی کھاکر خوشی منالیتے ہیں۔ بھیروں جی کا چبوترہ، اب بھی تمام فرقوں میں عام طور پر مقبول ہے، جس میں میو بھی شامل ہیں۔ اس طرح ہم ملک کے اس حصے میں ایک مخلوط کلچر کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور اس پر فخر کرسکتے ہیں۔

کتابیات:

۱- جی۔ڈی گلانی: میوات ڈیورنگ تھرٹینتھ سنچری، پنجاب ہسٹری کانگریس کی کارروائی، پروسیڈنگس میں شائع ہوئی، پٹیالہ ۱۹۸۱

۲- یوگندر اسکند: دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی تبلیغی جماعت (۱۹۲۰--۲۰۰۰)' نئی دہلی ۲۰۰۲ء

۳- ابوالفضل: آئین اکبری، ترجمہ: ایچ بلوشمین، ج ا، تیسرا ایڈیشن، طباعت ثانی، نئی دہلی

۴- میجر پاؤلیت: گزیٹر آف الور، لندن ۱۸۱۷ء

۵- شمس الدین شمس: میوز آف انڈیا، ڈیپ کسٹمس اینڈلا، نئی دہلی ۱۹۸۳

۶- نور محمد (ایڈ) انڈین مسلمس، نئی دہلی ۱۹۹۹ء

۷- پرتاپ اگروال: کاسٹ ریلیجن اینڈ پاور- این انڈین کیس سٹڈی، نئی دہلی ۱۹۷۱ء

۸- ہاشم امیر علی: دی میوز آف میوات، نئی دہلی ۱۹۷۰

۵-شمس الدین شمس: میوز آف انڈیا، ویز کسٹمس ایندلا، نئی دہلی ۱۹۸۳
۶-نور محمد (ایڈ) انڈین مسلمس، نئی دہلی ۱۹۹۹ء
۷-پرتاپ اگروال: کاسٹ ریلیجن اینڈ پاور- این انڈین کیس سٹڈی، نئی دہلی ۱۹۷۱ء
۸-ہاشم امیر علی: دی میوز آف میوات، نئی دہلی ۱۹۷۰
۹-شیل مایارام: اگینسٹ ہسٹری اگینسٹ اسٹیٹ، کولمبیا یونیورسٹی پریس ۲۰۰۳ء
۱۰-کے۔ایس۔سنگھ: انڈیاز کمیونیٹیز، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۸ء
۱۱-ڈینزل ابٹسن: پنجاب کاسٹس، انڈین ری پرنٹ، پٹیالہ ۱۹۸۱
۱۲-امپیریل گزیٹر آف انڈیا، ج (XVII) ۱۹۰۸ء
۱۳-ندیم حسنین اور شیخ ابرار حسین: شیعاز اینڈ شیعہ اسلام ان انڈیا، نئی دہلی ۱۹۸۹ء
۱۴-مسز میر حسن علی: آبزرویشنس آف مسلمانس آف انڈیا ۱۸۸۲ کی طبع ثانی، نئی دہلی ۱۹۷۳ء
۱۵-انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، نیا ایڈیشن، ج VII، ای، جے، برل ۱۹۹۳ء
۱۶-انٹرویو (گفتگو)
۱-مفتی جمال الدین، الور
۲-محمد پلٹو خاں ایڈوکیٹ، الور
۳-صالح خان ایڈوکیٹ، فیروزپور جھرکا، ضلع گوڑگاؤں
۴-ڈاکٹر جگ مندر نایل، راج رشی کالج، الور
۵-بھوپ سنگھ پوسوال، ایڈوکیٹ، الور

داؤدی بوہرہ فرقے میں عزاداری

ڈاکٹر سریش مشرا☆

بوہرہ فرقہ

مشرقی اسماعیلی یا نزاری بوہروں کی نمائندگی گجرات میں 'خوجے' کرتے ہیں اور مغربی اسماعیلی یا مستعلی فرقے کی نمائندگی بوہرے کرتے ہیں۔ 'نزاری، اور مستعلی فرقوں کا یہ بٹوارا آٹھویں فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ (۱۰۳۵ تا ۱۰۹۴) کے عہدِ حکومت میں ہوا تھا۔ مستعلی بوہرے عام طور پر داؤدی بوہرے کہے جاتے ہیں یہ نام انہیں داؤد بن قطب شاہ ستائیسویں داعی کی نسبت سے دیا گیا ہے۔[۱]

اسماعیلی فرقوں کا گجرات میں قیام اور جماؤ ہندوستانی تاریخ کی ایک انوکھی حقیقت ہے۔ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ یہ فرقے قابلِ ذکر تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ اسلام کا نفوذ اتنے پرامن طریقے سے نہیں ہوا اور کسی فرقے کا عروج اتنے غیر محسوس انداز میں وجود میں نہیں آیا۔ اور اہم بات یہ کہ مسلمانوں کے کسی اور فرقے نے اپنے طرزِ فکر میں بیوپار اور کاروبار کو اتنا واضح طور سے نہیں اپنایا۔ اس سلسلے میں اُن کے مقابلے میں آنے والا اگر کوئی اور فرقہ ہے تو وہ صرف گجراتی 'میمنوں' کا ہے۔[۲]

دوسرے شیعوں کی طرح داؤدی بوہرے بھی حضرت علیؑ سے گہری عقیدت مندی رکھتے ہیں اور علیؑ اور فاطمہؑ کے خاندان میں ہونے والے اماموں کی تصدیق کرتے ہیں۔ جہاں تک علیؑ اور فاطمہؑ کے خاندان کے اماموں کا تعلق ہے بوہروں کو ان حضرات کے جمہوری انتخاب کے مقابلے میں ان کے منصوص من اللہ ہونے کا حامی کہا جاسکتا ہے۔ یہی بنیادی اصول بوہرہ فرقے میں ان کے اعلیٰ ترین رہنما کے تقرر میں بھی عملاً اپنایا جاتا ہے۔

☆ بھوپال

۱۔ حسین ملا عبدال، گلزارِ داؤدی، ص ۳ ۱، اس کتاب میں سنہ اشاعت نہیں دیا ہوا ہے (کچھ قرائن سے ۱۹۱۹ ثابت ہوتا ہے)

۲۔ مصرا، ستیش ۔سی۔ مسلم کمیونیز ان گجرات، بامبی، ۱۹۶۴، ص ۱۴

داعیِ مطلق

بوہرہ فرقے کے سربراہ داعیِ مطلق کہلاتے ہیں اور انہیں 'سیدنا' یعنی ہمارا سردار کا خطاب دیا جاتا ہے۔ انہیں 'ہز ہولینیس' (تقدس مآب) بھی کہا جاتا ہے۔ اصل میں انہیں 'امام' کا درجہ دیا جاتا ہے۔[1] پوری دنیا میں بوہرہ فرقے پر مذہبی نمائندوں کا ایک سلسلۂ مراتب کے توسط سے داعیِ مطلق گرفت رکھتا ہے۔ یہ سلسلہ مراتب بتدریج (نیچے کی طرف) 'مذہون' 'مکاسر' 'شیخ' عامل، اور میاں صاحب کی اصطلاحوں سے جانا جاتا ہے۔[2]

داؤدی بوہرہ فرقے کی تاریخ ہندوستان میں اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس کے ۲۳ویں داعی محمد عزیزالدین احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے ۲۳ویں سے ۳۳ویں داعیوں کا صدر مقام ۹۷۴ سے ۱۰۶۵ ھ تک احمد آباد رہا۔ پھر ۳۴ویں سے ۳۸ویں داعی تک جام نگر، ۳۹ویں اور ۴۰ویں داعیوں کا اجین اور ۴۱ویں، داعی ۱۱۹۳ سے ۱۲۰۰ ھ تک برہان پور منتقل ہوگئے۔ داعیوں کے صدر مقام کی یہ متواتر تبدیلی ان پر سنی حکمرانوں کی زیادتیوں اور دباؤ کی وجہ سے ہوئی۔ اس مذہبی ستم رانی کے اثر سے لگ بھگ تمام قسم کے رہائشی اور زراعت پیشہ لوگوں کو اپنے مسلک بدلنے پڑے اور نتیجتاً جو کچھ بچا وہ بوہروں کا ایک تجارتی خانہ بدوش طبقہ تھا۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد سے بوہروں پر یہ دباؤ ختم ہوا اور ان کے داعیِ مطلق نے ۱۷۸۵ء میں سورت میں قیام کرلیا۔[3] یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انتالیسویں سے اکتالیسویں داعی نے برہان پور اور اجین میں قیام کیا اور ان مقامات کو اپنا صدر مقام بنایا تو اس کی وجہ سندھیا حکمرانوں کی فراخدلی تھی، جنہوں نے مذہبی تحفظ کے ساتھ انہیں کافی زمین بھی دی۔

اپنے معتقدین پر داعی کا تسلط عاملوں کے توسط سے قائم ہوتا ہے، اُن سب ہی مراکز میں جہاں بوہرے رہتے ہیں، داعیوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ عامل کی بالکل واضح اجازت کے بغیر کوئی مذہبی یا سماجی کام جائز نہیں مانا جاتا۔ عامل وہ نمائندہ ہوتا ہے جو داعی سے 'میثاق' حاصل کرتا ہے اور وہ چٹھی یا خط دیتا ہے، جس کے دیندار بوہرے پابند ہوتے ہیں۔ صرف وہ لوگ نماز میں امامت کرسکتے ہیں جنہیں وہ اجازت دے دے، اور یہ بوہرہ مسجدوں، مقبروں اور دوسرے مقدس مقامات کے

۱- ہولسٹر، جان نارمین، اسلام اینڈ شیعہ فیتھ ان انڈیا، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۰ ۲- ہولسٹر، سابقہ حوالہ، ص ۸۲-۲۸۱
۳- حسین، ص ۴۴-۴۱

استعمال کی اُن لوگوں کے لیے ممانعت بھی کرسکتا ہے جو فرقے سے نکال دیئے گئے ہوں یا داعی اُن سے ناراض ہوگیا ہو۔'شیخ' بوہرہ فرقے کے علماء ہوتے ہیں۔[۱]

داعی جو عیش و آرام کے ساتھ محلوں میں رہتا ہے اس کے پاس اتنے وافر مالی ذرائع ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے عزیزوں اور نائبین کے اخراجات برداشت کرسکے۔ اس کے لیے بوہرہ فرقے کے ہر فرد سے مذہبی فرض کے طور پر ٹیکس، خصوصی نذریں اور جرمانے وغیرہ وصول کیے جاتے ہیں۔[۲]

مستعلی بوہروں کے یہاں ایک کیلنڈر ہے جو عام اسلامی کیلنڈر سے کچھ مختلف ہے۔ اس میں صرف یہی فرق ہے کہ یہ ہیئتی اعتبار سے چاند ظاہر ہونے پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ اس طرح حساب مرتب کیا گیا ہے کہ ماہِ رمضان میں ہمیشہ تیس دن ہوتے ہیں۔

محرم

اسلامی کیلنڈر میں محرم بانی اسلام و پیغمبر حضرت محمدؐ کے نواسے امام حسینؑ کی شہادت کی یاد کا مہینہ ہے۔ امام حسینؑ کا احترام بلا استثنا اسلام کے تمام فرقے کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے ہندو بھی امام حسینؑ اور اُن کے بہتر افرادِ خاندان اور ساتھیوں کے دس محرم کو کربلا میں بے رحمی سے قتل کیے جانے پر بڑے جذباتی انداز سے غم مناتے ہیں۔

بوہرہ فرقے کے لوگ جو اپنی نمازوں کے سلسلے میں بہت محتاط ہوتے ہیں وہ محرم میں سوگ منانے کے سلسلے میں اتنے ہی مستعد ہوتے ہیں۔ ان کے 'عامل' اور مقامی مُلا پوری پابندی سے مجلسیں کرتے ہیں اور ان میں اپنے وعظ یا بیانوں کے ذریعے اسلام کی اخلاقیات اور بنیادی اصولوں کی تشریح کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اسلام کی ابتدائی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں، خصوصاً اُن اسباب کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں جن کے تحت علیؑ اور ان کے دونوں بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کی شہادت واقع ہوئی۔ ان بیانوں کے ذریعے پورے ملک میں بکھری ہوئی بوہرا آبادی کے افراد کو بہت مفید معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ ان میں دولت مند لوگ کربلا اور مکے بھی جاتے ہیں۔ یہ لوگ سختی سے موسیقی، رقص اور کسی بھی نشہ آور چیز کے استعمال یا اس کی خرید و فروخت سے پرہیز کرتے ہیں۔[۳]

پورے برِ صغیر ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں محرم کے سلسلے میں رسوم و رواج، ہر جگہ ہر فرقے اور ہر مسلک میں کافی مختلف نظر آتے ہیں۔ ان رسوم میں عورتوں کا اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑنا، کربلا

۱- مصرا، ص ۱۸ ۲- حسین، ص ۹۲ ۳- حسین، ص ۹۲

میں موجود حسینؑ کے روضے کے ہوبہو شبیہیں بنانا۔ غم منانے کے لیے بالکل الگ گھر (امام باڑے، عاشورخانے) بنوانا اور بہت جذباتی انداز میں جلوس نکالنا وغیرہ شامل ہیں۔ اسلامی سال پہلی محرم سے شروع ہوتا ہے اور اس دن بوہرہ فرقہ کے ہر گھر میں بہت پرتکلف کھانے پکائے جاتے ہیں۔ اس میں کم سے کم پانچ قسم کے کھانے ضرور ہوتے ہیں۔ مچھلی، دہی، سدانا، (شکر اور گھی سے بنا ہوا)، لپکا (گڑ اور گیہوں سے بنا ہوا) اور تھولی (گیہوں سے بنا ہوا) چونکہ پہلی محرم سال کا پہلا دن ہے اس لیے اس دن مچھلی کا کھانا مبارک سمجھا جاتا ہے اور اس سے خوش نصیبی کی امید کی جاتی ہے۔[۱] دوسری تاریخ سے نویں محرم تک سوگ منایا جاتا ہے اور ہر روز صبح ۱۱ بجے سے دوپہر ۲ بجے تک وعظ ہوتا ہے۔ ان وعظوں میں امام حسینؑ کے کربلا کے سفر اور اُن کی شہادت کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور پورا منظر بے حد جذباتی ہوجاتا ہے جس سے لوگ آہ و بکا کررہے ہوتے ہیں۔ نماز مغرب کے بعد مجلس منعقد ہوتی ہے جس میں مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ اور گریہ و بکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد نیاز یعنی فرقے کا کھانا ہوتا ہے اور شربت اور دودھ کی سبیل لگائی جاتی ہے۔[۲]

ماتم اور وعظ

پورے ہفتے خصوصاً دوپہر بعد وعظوں میں شریک ہونے والے مرد اور عورتوں میں ماتم کی مدت اور شدت متواتر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لوگوں کو رونے اور سینے کے ماتم کی برابر ترغیب دی جاتی ہے تاکہ وہ امام حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ قربت وعقیدت کا مظاہرہ کرتے رہیں۔ ہر مناسب موقعے پر آنسو بہنے لگتے ہیں۔ مسجد میں بالکل صحیح علامتوں پر رونے اور چیخنے کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ ماتم میں کسی قسم کا ہتھیار یا اوزار استعمال کرنا سختی سے منع ہے۔[۳]

دس محرم کو پورے دن فاقہ کیا جاتا ہے۔ اس دن محرم اور سوگ کے تمام کام لگ بھگ پورے دن متواتر چلتے رہتے ہیں۔ روزانہ ہونے والا صبح کا وعظ بدستور ہوتا ہے۔ دوپہر کا وعظ شام (مغرب و عشاء) کی نماز تک چلتا رہتا ہے۔ کل ملاکر یہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کا ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ہفتہ کے دن آگے بڑھتے ہیں ان عملوں کی انجام دہی میں جذباتی انہماک کی سطح اٹھتی چلی جاتی ہے۔ بوہرہ لوگ ہر

۱۔ جیسا کہ محترمہ یاسمین سیفی نے بیان کیا۔ باہبے بازار، کھنڈوا، مدھیہ پردیش
۲۔ جیسا کہ عباس سیفی صاحب نے بتایا۔ باہبے بازار، کھنڈوا، مدھیہ پردیش
۳۔ عادل، شعیب کا غیر مطبوعہ تھیسس بعنوان ہسٹری آف بوہرہ کمیونٹی تھرڈ، دی ایجز اینڈ اِٹس کنٹری بیوشن ٹو دی سوشیو اکانومک، اینڈ کلچرل لائف آف انڈیا۔ دیوی اہلیا وشو ودیالیہ، اندور ۲۰۰۵، ص ۱۵۴

روز کو کسی اہم مذہبی کردار سے منسوب کردیتے ہیں۔ روزانہ وعظوں کا مختلف ناموں سے انتساب حسب ذیل ہے۔

۲- محرم ۔حضرت آدم نبی اللہ علیہ السلام

۳- محرم ۔حضرت نوح نبی اللہ علیہ السلام

۴- محرم ۔حضرت ابراہیم نبی اللہ علیہ السلام

۵- محرم ۔حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۶- محرم ۔رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۷- محرم ۔مولاتنا حضرت فاطمہ سلام اللہ علیھا

۸- محرم ۔مولانا حضرت علی علیہ السلام

۹- محرم ۔حضرت امام حسن علیہ السلام

۱۰- محرم ۔حضرت امام حسین علیہ السلام

اس سے قطع نظر کہ کونسا دن کس مقدس ذات کے لیے مقرر ہے ہر روز کے وعظ کے آخری حصے میں کربلا کے واقعات کا کچھ ذکر ضرور شامل کیا جاتا ہے۔کم وبیش ہر بوہرہ اس داستان سے واقفیت رکھتا ہے۔[۱]

بوہرہ حضرات میں مذہبی عملوں کے دوران آلتی پالتی مار کر بیٹھنا، کسی دیوار سے پیٹھ لگا کر سہارا لینا بُرا سمجھا جاتا ہے۔صرف اس طرح بیٹھنا صحیح مانا جاتا ہے کہ ٹانگیں جسم کے اوپری حصے سے دبی رہیں۔ (غالبًا دو زانو بیٹھنا مراد ہے) اس طرح بیٹھنے میں صرف اتنی ڈھیل ممکن ہے کہ جسم کے بوجھ کو کبھی کبھی ایک سے دوسری طرف منتقل کرلیا جائے۔

آٹھ یا نو محرم کو پوری دنیا کے بوہروں کو ایک کھانا دیا جاتا ہے جس میں ہر جگہ ایک سا کھانا ہوتا ہے۔ اس کا کل خرچ داعی برداشت کرتا ہے۔مختلف شہروں اور قصبوں وغیرہ میں داعی کے مقرر کردہ نمائندے اس کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔[۲]

عاشورہ

۱۰ محرم کو عاشورہ کہا جاتا ہے۔ اس دن لوگ فاقہ کرتے ہیں مگر روزے کی طرح نہیں اس کے لیے کسی

۱- عادل، شعیب، ص ۱۵۱ ۲- جیسا کہ محترمہ یاسمین سیفی نے بتایا

قسم کی سحری نہیں کھاتے۔ عاشورہ کے آخری حصے میں 'فاقہ شکنی' کے لیے مسجد میں کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر واپس لوٹنے سے پہلے فاقہ شکنی ہوتی ہے۔ یہ کھانا بہت سادہ ہوتا ہے۔ جو دال اور حلیم جیسے تین قسم کی دالوں اور گیہوں سے تیار کیا جاتا ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد 'شامِ غریباں' کی مجلس ہوتی ہے جس میں امام حسینؑ کی بہن زینب علیہا السلام اور اُن کے مصیبت زدہ اہل خاندان کے مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ اُن کے عزم اور صبر وسکون کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی کو ان نوحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

موجودہ داعی سیدنا ڈاکٹر برہان الدین ہر سال کسی ایک شہر میں خود عاشورہ کی رسوم کی سربراہی کرتے ہیں اور ہر سال دنیا کے مختلف علاقوں سے ہزاروں بوہرے اپنے داعی کے ساتھ محرم کی رسموں میں شرکت کرنے آتے ہیں۔ عاشورہ، کہیں بھی منعقد ہو 'جماعت' تمام بوہرہ شرکاء کے قیام و طعام کا مفت انتظام کرتی ہے۔ آمدورفت کے اخراجات ہر شخص خود برداشت کرتا ہے، جب ۲۰۰۱ میں یہ رسم دبئی میں منعقد ہوئی تو دنیا بھر سے ایک لاکھ سے زیادہ بوہروں کو ہوٹلوں اور نجی گھروں میں رہائش فراہم کی گئی تھی۔[۱]

جو بوہرے محرم کی رسوم میں کسی وجہ سے شرکت نہیں کرسکتے ان کے لیے پچھلے کچھ برسوں سے جدید تکنالوجی کی بھی مدد لی جاتی ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں سیدنا محمد برہان الدین کی روزانہ دعاؤں کے ویڈیو کیسٹس ہوائی کوریئروں کے ذریعہ دنیا بھر میں ۷۰۰ مسجدوں اور ۴۰۰ 'جماعتوں' میں زیادہ تر کو بھیجے جاتے رہے، تاکہ وہاں اُن کے معتقدین انہیں اگلے دن ہی دہرا سکیں۔[۲] ۱۹۹۰ء سے محرم کی عبادات کو نشر بھی کیا جانے لگا اور اب جماعتوں، نے عاشور نشریات، کو حاصل کرنے کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال بھی شروع کردیا ہے۔ اب ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین کی آواز کوئی مجمع یا فرد کم و بیش فوراً ہی ڈاؤن لوڈ، کرکے سنا اور سنایا جاسکتا ہے۔ بہت سی جماعتیں اب ان رسوم کو کلوز ڈ سرکٹ ٹیلی ویژن پر بھی چلاتی ہیں۔

ان دعوتوں اور موجودہ داعی ڈاکٹر سیدنا کی شخصیت کو ابھار کر پیش کرنے پر کچھ تنقید بھی شروع ہوئی ہے۔ ظاہر ہے صرف بوہروں کی طرف سے ہی۔ ایسی ہی ایک تنقید میں ان دعوتوں اور تقریبوں کو 'تماشے' کا نام دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ داؤدی بوہرے جو شیعہ ہیں اور

۱- عادل شعیب سابقہ حوالہ، ص ۱۵۰ ۲- عادل، شعیب، سابقہ حوالہ، ص ۱۵۰

حضرت علیؓ اور ان کے بیٹے امام حسینؓ سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں، آج کل اپنے رہنما اور مذہبی سربراہ سیدنا محمد برہان الدین کی قیادت میں محرم کے محترم اور پروقار دنوں کی یاد منانے کے بجائے ان کی تقریب مناتے ہیں۔ جیسے عید کا دن ہو، یہ لوگ مسرور انداز میں دس محرم کو 'عشرۂ مبارک' کہتے ہیں اور رنگین لباس پہن کر تقریب مناتے ہیں، (انڈین ایکسپریس نے بیان کیا" عورتوں کی بنائی ہوئی خوبصورت تصویر۔ جن میں بچکانے گلابی، ہلکے سبز، آبی نیلے رنگ کی خوبصورت نازک کڑھی (ردائیں پہنے) مرغ بریانی اور آئس کریم والے بہترین لذیذ کھانوں سے سیر ہوتے ہیں"۔

'دنیا میں کہیں بھی کوئی دوسرا رہنما اپنی شخصیت کا اتنے سستے سے انداز میں اظہار نہیں کرتا جیسا سیدنا کرتے ہیں۔ جگہ جگہ دوسرے وعظوں کو روک کر اپنے معتقدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ صرف اس جگہ جمع ہوں جہاں وہ خود تقریر کر رہے ہوں۔ بوہرہ دکان داروں کو اپنی دکانیں بند کردینے، بیوپاریوں کو اپنی بیوپار بند کردینے اور طالب علموں کو اپنی کلاسیں اور امتحان چھوڑ کر محرم کے نو دن ان مسجدوں میں حاضر ہونے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ جہاں سیدنا بیان فرما رہے ہوں۔ پوری دنیا میں جہاں جہاں بوہرے آباد ہیں وہاں سیدنا کے وعظوں کو ریلے کرنے پر کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ بمبئی میں ہی سیٹیلائٹ کے توسط سے تمیں سے زیادہ مرکزوں کو ۶۶۰ ٹیلیویژن سیٹوں اور ۴۷ بڑے 'جوائنٹ اسکرین پر ریلے کیا گیا۔[1]

۱- سیف الدین انصاف .www.dowoodi-bohra.com میں

شناخت بنیاد کی تحریک اور نوآبادیت مخالف جدوجہد

بہار میں شیعہ عزاداری جلوس

ڈاکٹر محمد سجاد☆

نوآبادیاتی تسلط کے خلاف تحریک نے، کچھ ٹھوس انداز میں انیسویں صدی کے آخر میں کسی قدر تنظیمی شکل اختیار کرنی شروع کی۔ اس نوآبادیاتی تسلط نے کچھ ایسے ادارے اور عمل پیدا کرنے شروع کردیے تھے جن کے سلسلے میں کسی نہ کسی شکل میں اظہار رائے یا اختلاف کے مواقع پیدا ہورہے تھے۔ ان اداریاتی مواقع سے متوسط اور اعلیٰ متوسط طبقہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ کچھ تحریکوں کے ذریعے سے (جن میں نوآبادیاتی حکومت سے گفت وشنید بھی شامل تھی) کچھ زور یا دباؤ پیدا کیا جائے۔ ان مسابقانہ تحریکوں کو آگے بڑھانے کے لیے کبھی کبھی مذہبی، ثقافتی علامات اور شبیہوں وغیرہ کا بھی سہارا لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ جدید مغربی قوموں کے برخلاف ہندوستان جیسے معاشرے میں عوامی دائرۂ کار میں غیر مذہبیت (سیکولرزم) نہ آئی تھی (نہ آئی ہے)۔ عوام کے مزاج میں کیونکہ مذہب بہرصورت مؤثر طور پر موجود تھا (اور ہے) اس لیے عوامی مقبولیت اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اور طریقوں کے ساتھ ساتھ، اسے بھی شامل کرلیا گیا۔

نوآبادیاتی جدیدیت کے ماحول میں کچھ شناختیں اپنے لیے متواتر خطرہ سا لاحق ہوتا محسوس کررہی تھیں۔ اس دور کی مختلف سماجی مذہبی اصلاحات کی کوششوں میں بھی مذہبی تخصیص کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ چنانچہ ہندوشناخت کو بہت سی اور تحریکوں کے ساتھ آریہ سماج اور اس کے شدھی سنگٹھن جیسی تحریکوں کے ذریعے محفوظ رکھنے اور مزید تقویت دینے کی کوشش جاری تھی۔ (جس کے اپنے کچھ اثرات تھے جو بیسویں صدی کی سیاست اور سماج پر پڑ رہے تھے، گئورکشا، سوسائٹیاں، ناگری پرچارنی سبھا اور ہندی ساہتیہ سمیلن، وغیرہ عمومی کلچرل اور مذہبی تصور کے ذریعے ہندو سماج کو ایک

☆ شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یکسانیت کا روپ دینے کی مہم چلا رہے تھے)۔[1] ظاہر ہے کہ اس قسم کے خطرے کا احساس شیعہ فرقے میں اور بھی زیادہ شدید ہوگا جو مذہبی روایت کا ایک اور چھوٹا فرقہ ہے۔ اس صورت میں مذہبی اور اس کے ساتھ فرقہ وارانہ احساس بہت تیزی سے بڑھا۔

اسلامی مقدس مہینے محرم میں عزاداری کے جلوس حسین اور کربلا کی علامتوں کے ساتھ کسی سیاسی تحریک کے لئے جذبات ابھارنے (ایک مرکز پر جمع کرنے) میں بے حد اہمیت کے حامل تھے (اور ہیں) مشیر الحسن کے الفاظ میں اس سے شیعوں کو اپنی ایک علاحدہ شناخت بنائے رکھنے اور اپنی عددی کمتری کو ایک مستحکم انداز اور وقتاً فوقتاً دباؤ اور گھٹاؤ پیدا کرنے والی اکثریت کے خلاف جم کر کھڑے رہنے کا سبق ملتا رہا۔[2] اس روایت پر کسی قسم کی پابندی کی مخالفت خصوصاً شیعہ فرقہ کی طرف سے ہونا، لازمی امر تھا۔

اس قسم کی تحریکوں کے نتیجے میں کبھی فرقہ وارانہ یا مسلکی جھگڑے بھی کھڑے ہوئے، جیسے لکھنؤ کے سنی شیعہ فسادات، جو ۱۸۸۰، ۱۸۹۰ اور ۰۸-۱۹۰۶ میں الہ آباد، بنارس، جونپور وغیرہ تک پھیلے۔[3] یہ قضیہ سنیوں کی طرف سے 'مدح صحابہ اور شیعوں کی طرف سے تبرے، کے سلسلے میں پیدا ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بہار میں ۱۸۹۰ء کے دہے میں جب حکومتِ برطانیہ نے عزاداری اور علم کے جلوس پر پابندی لگائی تھی، تو ہمیں اس حکم کے خلاف سنی، شیعہ بلکہ ہندو مسلمان بھی متحد و متفق دکھائی دیتے ہیں۔

۱۸۸۲ میں بہار میں گیا کے ڈپٹی مجسٹریٹ نے نقص امنِ عامہ کے خدشے کے سادے سے بہانے پر جلوس کی اجازت نہیں دی۔ ۱۸۹۲ء کے بعد سے متواتر ایک آئینی انداز کا احتجاج شروع کیا گیا چونکہ اسے مذہبی آزادی میں مداخلت مانا گیا۔ اس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس طویل

۱- گیانندر پانڈے، کنسٹرکشن آف کیونزم ان کولونیل انڈیا، او۔یو۔پی (۱۹۹۳) کمپیریٹیو اسٹڈیز ان سوسائٹی اینڈ ہسٹری (سی ایس ایس اچ) ج ۲۲ نمبر ۴ نیز دیکھیے، اکتوبر ۱۹۸۰، صفحات ۵۷۶ تا ۵۹۶ میں آنند یانگ کا مضمون سیکریڈ سمبل اینڈ سیکریڈ اسپیس ان رورل انڈیا: کیمونٹی موبلائزیشن ان وی، ایجی کاؤ کلنگ رائیٹ آف ۱۹۸۳، نیز کرسٹوفر آرکنگ: ون لینگویج۔ ٹو اسکرپٹس، دی ہندی موومینٹ ان نائنتھ سنچری ان انڈیا، او۔یو۔پی۔ بمبئی (۱۹۹۴) نیز فرانسسکا اورسینی (Francesca Orsini) دی ہندی پبلک اسفیر لینگویج اینڈ لٹریچر ان دی ایج آف نیشنلزم ۴۰-۱۹۲۰ ،او۔یو پی۔ دہلی ۲۰۰۲ نیز کینیتھ ڈبلیو جونس (Kenth W Jones) آریہ دھرم، ہندو کانشیس نیس ان نائنتھ سنچری ان پنجاب، کیلی فورنیا ۱۹۷۶

۲- مشیر الحسن، ٹریڈیشنل رائٹس اینڈ کنسٹیڈ مینکس، سیکلیر یمن اسٹرالف ان کولونیل لکھنؤ، ان واجلیف ......) لکھنؤ میمورائرس آف اے سٹی۔ او۔یو پی۔ دہلی ۱۹۹۷

۳- ایضاً۔ نیز ملاحظہ ہوشان محمد: خاکسار موومینٹ ان انڈیا۔ میناکشی پرکاشن، میرٹھ، ۱۹۷۳، چیپٹر ۴

عرصے تک چلنے والے احتجاج میں آئینی طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے ۱۸۹۲ء کے شروع حصے میں پٹنہ کے کمشنر کو ایک درخواست دی گئی۔ عرضی گزار ٹیکری (گیا) کے ایک زمیندار مرزا جلال الدین بخت بہادر تھے۔ عرضی پر پچھلے عدالتی اور انتظامیہ کے احکامات کی نظیر اور اس جلوس کے تاریخی جواز پر زور دیتے ہوئے مختلف فرقوں کے افراد کے دستخط تھے۔ کمشنر نے سال بھر بعد یعنی ۱۸۹۳ء میں اس معاملے پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اپریل ۱۸۹۳ء میں خیرات احمد، سکریٹری انجمن اسلامیہ گیا، سنی شیعہ دونوں فرقوں پر مشتمل ایک وفد کے ساتھ کمشنر سے ملنے گئے۔ کمشنر نے ملاقات کا شرف نہیں بخشا، مگر یہ وعدہ ضرور کیا یا کہ اگلے سال اس کی اجازت دے دی جائے گی۔ ۱۸۹۴ء تک حکومت بنگال نے ایک حکم (خط نمبر ۸۸۷، مورخہ ۶ فروری ۱۸۹۴) جلوس کی ممانعت کا جاری کر دیا۔ اس سے بہار کا شیعہ فرقہ اور چونکا۔ پورے بہار، پٹنہ مظفر پور، چھپرا، آرا وغیرہ میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ پٹنہ کے نواب ولایت علی خاں نے ۲۲ فروری ۱۸۹۴ء کو ایک جلسہ کیا جس میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اس جلسے میں اس سرکاری حکم کے خلاف سخت قسم کی کچھ قراردادیں پاس ہوئیں اور اس کے بعد مختلف شہروں میں احتجاجی جلسوں کا سلسلہ چلا۔ ان تمام جلسوں میں سخت الفاظ میں قراردادیں منظور ہوئیں۔ پریس نے اپنی ہشیاری اور خبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسے غیرضروری اور زبردستی کی پابندی بتایا۔[1] بہار ٹائمز، نے اپنے اداریہ میں اظہار خیال کیا کہ یہ ایک ''احمقانہ اور بے سوچے سمجھے دیا گیا حکم'' ہے۔ کلکتے کے دی انگلش مین نے اسے افسوس ناک کہا۔ بہار سپرینٹنڈنٹ نے فیصلے کو شدید غلطی سے تعبیر کیا اور نو آبادیاتی سرکار سے اسے منسوخ کرنے کی مانگ کی۔[2] حکومت بنگال سے ناامید ہو کر سنّی اور ہندوؤں کی پوری پوری حمایت کے ساتھ بہار کے شیعوں نے ۳۰ ستمبر ۱۸۹۴ء کو حکومت ہند کے سامنے میمورنڈم پیش کیا۔ اس عرضداشت میں انھوں نے اظہار کیا تھا کہ حکومت بنگال کے اس حکم سے 'ملکۂ معظمہ کے ۱۸۸۵ میں جاری کردہ، مذہبی رواداری کی پالیسی کے اعلان کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ پھر جب حکومتِ ہند نے بنگال سرکار کے مقامی انتظامات میں مداخلت سے دوبارہ انکار کر دیا تو انھوں نے اس معاملے کو امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں اٹھانے کا بندوبست کیا۔ مرزا جلال الدین بخت بہادر کی بیوہ جہاں آرا بیگم نے لیجسلیٹیو کونسل میں یہ سوال اٹھایا۔

۱- قیوم الدین احمد، این ارلی کیس آف کانسٹیٹیوشنل ایجیٹیشن ان بہار ۹۷ (۱۸۹۲) انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن جلد ۳۲ نمبر ۲ فروری ۱۹۵۶ میں صفحات ۷۱ تا ۷۷

۲- 'بہار ہیرلڈ، جون ۴ (۱۸۹۴)

اس سے حکومت ہند پر کچھ دباؤ، پڑا اور بہار کے شیعوں کو حکومتِ بنگال کی طرف سے اجازت مل جانے کی توقعات بندھیں۔ اس امید پر شیعوں نے چوتھی بار ۱۸۹۶ء میں حکومت سے اپیل کی۔ حکومت کو اب بھی یہ تذبذب تھا کہ کیا عام امن وسکون کے لیے کسی قسم کا خطرہ پیدا کیے بغیر جلوس نکالنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ شیعوں کی ثابت قدمی میں اب بھی کوئی کمی نہیں نظر آرہی تھی۔ انہوں نے اپنے احتجاجوں کا سلسلہ بند نہیں کیا تھا۔ مارچ ۱۸۹۷ء میں انہوں نے پھر حکومت بنگال کے سامنے اپنی مانگیں رکھیں۔ اس بار انہیں علم کا جلوس نکالنے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس پورے قضیے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہار کے شیعوں نے متعدد آئینی طریقے اپنے احتجاج کو آگے بڑھانے میں استعمال کیے۔ یعنی جگہ جگہ عوامی جلسے، یادداشتیں، پٹیشن، نظیریں پیش کرنا، عدالتی فیصلے دکھانا، لیجسلیٹیو اداروں اور پریس کا استعمال۔ قیوم احمد نے بجا کہا ہے کہ انہوں نے آئینی طرزِعمل سے کبھی تجاوز نہیں کیا، اور اس وقت تک کہ انہیں مذہبی آزادی کا حق واپس نہیں مل گیا انہوں نے صبر وسکون اور تکلیف دہ ثابت قدمی کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ وہی طرزِعمل تھا جس کا شروع شروع میں کانگریس نے مظاہرہ کیا تھا جب کانگریس اپنے اعتدال پسندانہ دور میں تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیعوں کا یہ احتجاج ملک کی نوآبادیاتی حکومت کی زیادتیوں اور دباؤ کے خلاف (بعد میں ابھرنے والے) احتجاج کی تیاری میں کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

بیسویں صدی کی ابتداء ہی میں شیعوں نے اپنی ایک علاحدہ سیاسی تنظیم شیعہ کانفرنس (لکھنؤ ۱۹۰۷) تشکیل دے لی تھی، جو بعد میں شیعہ پولیٹکل کانفرنس، کے نام سے جانی گئی۔ پہلی کانفرنس میں تو سنیوں کے خلاف بے باک اور شعلہ بار قسم کی تقریریں ہوئیں لیکن ۱۹۳۰ کے دہے میں یہ بھی لکھنؤ کے سیدوزیرحسن (۱۸۷۴ تا ۱۹۴۷) کی رہنمائی میں کانگریس کے قومی منصوبے کی طرف مائل ہوگئی۔

شیعہ کانفرنس کی بہار اکائی میں شیعہ رہنماؤں کا ایک اہم گروپ موجود تھا۔ سر سلطان احمد، سید حسن عسکری، مظفر حسین، یحییٰ ناظم (ایڈووکیٹ) علی مظفر، عبدالعزیز انصاری وغیرہ۔ اپریل ۱۹۴۰ میں شیعہ کانفرنس کے لکھنؤ اجلاس میں سر سلطان نے جناح کے دوقومی نظریے، کو سختی سے رد کیا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۴۰ کو شیعہ کانفرنس کی بہار اکائی کا جلسہ چھپرا میں ڈاکٹر شبیر حسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں مسلم لیگ کی ملک کو دو حصوں میں بانٹ دینے کی قرارداد پر بہت سخت تنقید کی گئی۔[۱] اس

۱- 'دی سرچ لائٹ' ۲۱ اپریل ۱۹۴۰

جلسے کی جگہ کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ صرف چار دن پہلے ۱۴ اپریل کو بہار صوبائی مسلم لیگ نے چھپرا میں اجلاس کیا تھا اور یہاں سے وہ لیگ کے لاہور کے اجلاس کی قرارداد کے لیے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے تحریک شروع کرنا چاہتے تھے اور یہاں کی ضلع مسلم لیگ کی اکائی بھی چھپرا میں ہی ایک جلسے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے چھپرا کا انتخاب لیگ کی لاہور قرارداد کی مخالف میں تحریک کی ابتدا کرنے کے لیے کیا تھا۔[1]

اکتوبر ۱۹۴۴ میں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے صدر سید علی ظہیر نے جناح کو ایک خط لکھا تھا جس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی پُرزور وکالت کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ شیعہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد اگر مسلمان ایسا چاہیں گے تو پاکستان کی تشکیل بھی خود بخود ہو جائے گی۔[2] انہوں نے جناح کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو پاکستان کی تشکیل کی کوشش کے ساتھ ساتھ پورے ملک کی آزادی کے لیے بھی جدوجہد کرنی چاہیے اور ملک کی دوسری سیاسی پارٹیوں سے اختلافات کو طے کر لینا چاہیے تاکہ ملک کی آزادی کی تحریک میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ پاکستان کی تشکیل پر اتنا اصرار ملک کی آزادی اور پاکستان کی تشکیل دونوں مقاصد کو کافی حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نوآبادیاتی بہار کے شیعوں نے اپنے مذہبی آزادی کے سلب کیے جانے کے خلاف ایک آئینی طرز کا احتجاج شروع کیا اور اس کے بعد سے ایک ایسا میدان اور قوت پیدا کر لی، جسے اُس تحریک کے ابھارنے میں کام میں لایا گیا جو نہ صرف ملک کی نوآبادیاتی حکومت سے آزاد ہونے کے لیے کی گئی تھی بلکہ لیگ کے علاحدگی پسندانہ رویہ کے بھی خلاف تھی۔ شناخت مستحکم کرنے کے لیے ابھاری جانے والی تحریکوں کو صرف تنگ نظرانہ یا علاحدگی پسندانہ ہی نہیں سمجھنا چاہیے۔

۱۔ محمد سجاد۔ بہار مسلمس۔ ریسپونس ٹو ڈی ٹو نیشن تھیوری ۴۷۔۱۹۴۰، غیر مطبوعہ پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۲۰۰۳) ص ۲۰۸

۲۔ انڈین اینول رجسٹرڈ، جولائی دسمبر ۱۹۴۴، این۔ایم۔ایم۔ایل۔ دہلی

بیکانیر میں محرم کے سلسلے کے انتظامات

ڈاکٹر مینا گوڑ☆

میرا یہ مختصر مضمون سابقہ ریاست بیکانیر میں محرم میں امن و قانون برقرار رکھنے کے لیے ریاستی حکومت کی طرف سے کیے جانے والے انتظامات کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس کے ماخذ حکومت کے شعبۂ امور داخلہ کی خفیہ فائلیں (۳۵-۱۹۳۲) ہیں۔

محرم یا عزاداری کے سلسلے میں سرکاری انتظامی امور کی تفصیلات بہت زیادہ ہیں اس لیے یہاں اس کے صرف وہ نکات مختصراً پیش کیے جا رہے ہیں جن سے محرم اور عزاداری کی کچھ رسموں اور اُن کے ادا کرنے کے طریقوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انتظامی امور کی تفصیلات موضوع سے غیر متعلق ہونے کی وجہ سے چھوڑ دی گئی ہیں۔

بیکانیر راجستھان کی اہم ترین ریاستوں میں ایک تھی۔ ہندوستان کے تمام راجواڑوں میں بڑی ریاستوں میں اس کا ساتواں نمبر تھا جبکہ راجپوتانہ میں یہ دوسرے نمبر پر تھی۔ اس کا رقبہ ۲۳،۳۱۷ مربع میل تھا۔ اس ریاست کو مارواڑ کے حکمراں راؤ جودھا جی کے بیٹے راؤ بیکا جی نے ۱۴۶۵ء میں قایم کیا تھا۔ اس کے حکمراں راجپوتوں کی مشہور و معروف شاخ راٹھور سے تعلق رکھتے ہیں اور تمام حکمران خاندانوں میں سب سے اعلیٰ سوریہ ونشی (سورج خاندان) سے متعلق ہیں۔ میرے زیرِ مطالعہ دور میں مہاراجہ گنگا سنگھ بیکانیر کے حکمراں تھے۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق پوری ریاست کی آبادی ۹،۳۶،۲۱۸ تھی جبکہ پایۂ تخت کی آبادی ۸۵،۹۲۷ تھی۔ جہاں تک اس آبادی کی ساخت کا سوال ہے، اس میں آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہندوؤں کا تھا جو ۷,۲۵۸۴ تھے۔ مسلم ۱۴۱،۵۷۸ تھے۔ جس کا مطلب ہے پوری ریاست میں مسلمان ۱۵ء۹۱ فیصد تھے۔

خفیہ سرکاری کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست بیکانیر میں محرم کی رسوم کی ادائیگی کے

☆ صدر شعبۂ تاریخ، موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی، اودے پور

دوران امن و قانون برقرار رکھنے کے لیے خصوصی انتظامات کیے جاتے تھے۔تمام ممکن احتیاطی تدابیر و اقدامات کیے جاتے تھے تاکہ جہاں تک ہو سکے نقصِ امن واقع نہ ہو اور فتنہ و فساد اور خونریزی کے خدشات و خطرات کو کم سے کم کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں جو عام قانون تھا وہ حسب ذیل ہے: (تفصیلات حذف کر کے صرف لازمی بنیادی ہدایتیں نیچے دی جا رہی ہیں)۔

پایۂ تخت اور تمام اضلاع کے سرکاری افسران کے ذریعے احتیاطی اقدامات۔

ہندو مسلمان دونوں فرقوں کے منتخبہ رہنماؤں سے محرم سے پہلے اور بعد میں مشورے، تجاویز شکایتیں اور تعاون حاصل کیا جاتا تھا۔

ضلع افسران کی ذمہ داری صرف اعلیٰ ذمہ دار ہستیوں کو باخبر رکھنا ہی نہیں تھا بلکہ مختلف صورت حال میں فوری اقدامات لینا بھی ان ہی کی ذمہ داری تھی جس میں تساہل کی صورت میں وہ پاداش کے حقدار ہوتے تھے۔

پولیس اور اعلیٰ انتظامی افسر پیشگی اقدامات کرتے تھے تاکہ بیرونِ ریاست سے خاص طور پر برطانوی ہندوستان میں رہنے والے افراد محرم کے دوران یا اس سے پہلے بدعنوانی نہ کر سکیں۔

بیکانیر اور چورو شہر کے انتظامی امور چیف ایگزیکٹیو افسر کے سپرد ہوتے تھے اور انسپکٹر جنرل پولیس اور ناظم صدر بالترتیب اس کی مدد کرتے تھے۔ رتنا گڑھ شہر کے انتظامات ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کرتا تھا۔ پورے ضلع میں ضرورت پڑنے پر ریاستی فوج رتنا گڑھ سے بھیجنا اُسی کی ذمہ داری تھی۔

اس کے لیے ایک میجر کی کمانڈ میں تین جونیئر افسروں کے ساتھ ۱۰۰/افراد پر مشتمل دستہ پہلے ہی رتنا گڑھ بھیج دیا جاتا تھا۔

کسی قسم کے فتنہ و فساد کی صورت میں پولیس اور فوج مل کر فوری حفاظتی کارروائی کرتے تھے۔صرف بڑے لیڈر یا خاص فسادیوں اور قانون شکنوں پر ہی مقدمہ چلتا تھا اور عام لوگوں کو فوری قسم کی معمولی سزائیں دے کر اور جرمانہ لے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

بیکانیر آرمی آرڈر

ہز ہائینس مہاراجہ بیکانیر کی سرکار کی طرف سے بیکانیر لے چیف ایگزیکٹیو افسر اور بیکانیر کے آرمی کمانڈر کو محرم کے انتظامات کے سلسلے میں جو احکامات، اپریل ۱۹۳۴ء میں بھیجے گئے ان کی رو سے سپاہیوں کی علاقہ وار تقسیم اس طرح تھی (صرف خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے)۔

یوم سِدّا: بارہ بجے دوپہر دس سوار انسپکٹر جنرل آف پولیس کو بھیج دیے جاتے تھے اور وہ اسی کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔

قتل کی رات: ایک کپتان کی کمان میں ۲۰۰ر افسر اور سپاہی چھوٹی ٹکڑیوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں ڈیوٹی دیتے تھے۔ سپاہی شام سات بجے سے اگلے دن صبح ساڑھے نو بجے تک موجود رہتے تھے۔

تعزیہ کے دفن کا دن: ۲۷۵ ر افسروں اور سپاہیوں کا رسالہ مختلف جگہوں پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں متعین رہتا تھا۔

سخت ہدایت تھی کہ ہندو، مسلمان یا کسی فرقے کے ساتھ کسی حالت میں کوئی تعصب یا جانبداری نہیں برتی جائے گی انتظامی امور میں ہر شخص کے ساتھ مکمل انصاف اور ایمانداری کی توقع کی جاتی تھی۔

محرم کے سلسلے میں پولیس کے قواعد و ضوابط: (صرف خاص نکات مختصراً دیے جارہے ہیں)۔

'سدّا' مہندی، موسیقی کے ساتھ تعزیہ نکالنے کی اجازت کی درخواست دو مہینے پہلے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو دینا ضروری تھا۔ خاص صورتوں میں دو مہینے کی مدت میں کچھ ڈھیل دیے جانے کی بھی گنجائش تھی۔

اجازت کی درخواست میں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ کیا گزشتہ برسوں میں بھی اجازت لی گئی تھی یا یہ جلوس نیا ہے۔ اکھاڑے اور جسمانی کرتبوں کے مظاہرے کے لیے جلوس کہاں کہاں روکا جانا ہے۔

'قتل کی رات' کے تعزیے اور آخری تعزیہ دفنانے کے جلوس کو ایسی صورت میں منع بھی کیا جاسکتا تھا اگر مقررہ راستے سے مختلف راستے سے جلوس لے جانے کی اجازت طلب کی جائے ان تعزیوں کے جلوس کے راستے کو قبل از وقت لی گئی اجازت کے بغیر تبدیل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

تعزیوں کو شہر سے باہر کربلا میں غروب آفتاب سے پہلے لے جانے کے احکامات جاری کیے جاتے تھے۔

کوئی نیا تعزیہ نکالنے کی اجازت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے لی جاتی تھی اور یہ یقین دہانی ضروری تھی کہ تعزیہ اتنا چوڑا یا اونچا نہ ہو کہ راستے میں یا بجلی کے تاروں سے کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔

ہوم ڈپارٹمنٹ: ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے سلسلے میں کوئی مستقل یا دوامی حکم نہیں تھا۔ ہر سال تمام معاملات نئے سرے سے اٹھائے جاتے تھے۔

ان انتظامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست کا سارا انتظامی عملہ کار ہر طرح غیر جانبدارانہ اور غیر فرقہ وارانہ انداز میں محرم کے انتظامات میں شریک ہوتا تھا تاکہ مسلمان شہری اپنی رسوم سکون سے انجام دے سکیں۔ جس جوش و خروش سے یہاں عزاداری کی رسوم ادا کی جاتی تھیں وہ لوگوں میں ایک طرح کی جنونی کیفیت پیدا کر دیتی تھیں جس سے کسی ناخوشگوار حادثے کا خدشہ پیدا ہوسکتا تھا''۔

کبھی کبھی مسلمان اور ہندو تہوار ایک ہی دن میں پڑ جاتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر جلوس کا راستہ پہلے سے نہ طے کر دیا جائے تو ٹکراؤ اور فساد کا خطرہ پیدا ہوسکتا تھا۔ اس لیے افسران مختلف فرقوں کے لئے الگ الگ راستہ طے کر دیتے تھے۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ فساد خود ایک ہی فرقے کی دو ٹولیوں میں اس لیے پیدا ہو گیا کہ اُن میں تعزیے، مجلس، عزاداری، اکھاڑے وغیرہ میں مقابلہ ہونے لگتا تھا''۔

خلاصہ

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اب سے ۷۴، ۷۵ سال پہلے۔ ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵ کوئی جمہوری نظامِ حکومت نہیں تھا۔ لیکن ریاست بیکانیر کے حکمراں اپنی ہندو اور مسلم رعایا کے لیے کتنے حساس اور لحاظ رکھنے والے تھے۔ یہ جاگیردار حکمراں پوری طرح چوکنا اور محتاط تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا تناؤ پیدا نہ ہو۔

حوالے

اس مضمون کے تمام حوالے سرکاری فائلوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔

زنگی پور ضلع غازی پور میں محرم
کچھ اہم یادداشتیں

سید وحید ظفر عابدی☆

زنگی پور ضلع غازی پور کا ایک حصہ ہے جو بنارس سے ۸۰ کلومیٹر دور ہے، اور اپنی وراثت اور کلچر کے اعتبار سے بہت جانا پہچانا مقام ہے۔

یہ نام تنزانیہ میں 'زنجبار' سے اخذ کیا گیا ہے کیونکہ نویں صدی ہجری میں زنجبار کے ایک عالم نورالدین زنگی یہاں آئے تھے۔ ان کی علمی اور روحانی عظمت کی وجہ سے اس جگہ کا نام 'زنگی فور' رکھا گیا جو بگڑ کر زنگی پور ہوگیا۔

لگ بھگ اسی زمانے میں (۸۰۴ ہجری) ترمذ (ایران) سے ایک اور عالم سید محمد عجال ترمذی بھی ہجرت کر کے لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے یہاں آئے۔

انہی کے خاندان کے ساتھ ایک اور بزرگ سیدابا بکر عرف سید محمد، سید محمد عجال سے علم حاصل کرنے یہاں آئے اور یہیں قیام کیا۔ ان کی قبر زنگی پور میں صدر امام باڑے کے مقابل موجود ہے جس پر ان کا نام تاریخ پیدائش و وفات سب کندہ ہے۔

چونکہ نورالدین زندگی کی اولاد آگے نہیں چلی اس لیے سیدابا بکر ہی یہاں کے مورثِ اعلیٰ ٹھرے۔ عجال ترمذی کے خاندان کے بارے میں معلومات موجود نہیں ہیں۔

زنگی پور کسی زمانے میں شیعہ اسلامی علماء کا مرکز تھا۔ یہاں کے علماء نے جو علمی اضافہ کیا اس کا ذکر اور حوالہ اسلامی علوم کی بہت سی کتابوں میں ملتا ہے۔

زنگی پور نے بڑی تعداد میں جیّد علماء مجتہدین ، ادبا و شعراء پیدا کیے جنھوں نے اسلام پر بڑی مفید اور علمی اعتبار سے قابل قدر کتابیں لکھیں۔

غازی پور میں تیس سے زیادہ ایسے خاندان ہیں جن کے یہاں ایک دو یا تین مجلسیں ایامِ محرم میں پابندی سے ہوتی ہیں۔

دس ایسے خاندان ہیں جن کے اپنے خاندانی امام باڑے ہیں جن میں پہلی سے دس محرم تک اور اس کے بعد بھی پابندی سے مجلسیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ دوسرے ملکوں سے بھی، اپنے وطن کا محرم کرنے یہاں آتے ہیں اور کبھی کبھی 'دسویں' تک قیام کرتے ہیں۔

پہلی محرم سے ۸ ربیع الاول تک یہاں بہت بڑی تعدد میں جلوس عزا نکلتے ہیں۔ جن میں سے کچھ یہاں کی مقامی انجمنیں منظم کرتی ہیں اور کچھ جلوس چند خاندانوں کی طرف سے نکلتے ہیں۔ یہ تعداد بہت ہے، یہاں صرف چند اہم اور بہت معروف جلوسوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ایک جلوس جو علامتی جلوس ہے، نو محرم کی رات کو نکلتا ہے، اسے 'ملنی (ملن سے متعلق) کہتے ہیں، جو ایکتا اور اتحاد کا مظہر ہے۔

دو بہت خوبصورت سجے ہوئے تعزیوں کے جلوس گاؤں کے دو مختلف مقامات سے نکلتے ہیں۔ ایک جو سید غضنفر علی کے امام باڑے سے نکلتا ہے، اس کا تعزیہ 'براق' رسول اللہ کی معراج سے متعلق علامت) کہلاتا ہے اور اس میں شیعہ، سنی اور ہندو سب ہوتے ہیں۔ دوسرا علی گنج محلے سے نکلتا ہے اس میں بھی بہت خوبصورت تعزیہ اور ایک لکڑی کا گھوڑا (ذوالجناح) کی شبیہہ ہوتی ہے۔ اس میں بھی شرکاء ملے جلے ہوتے ہے۔ یہ رات بھر پوری بستی کی گشت کر کے صبح ۳ بجے ملتے ہیں۔ اس وقت بہت لوگ جمع ہوتے ہیں۔ پھر تمام فرقوں کی ملی جلی آبادی ساتھ چلتی ہے۔ پھر کوئی بڑا عالم کربلا کے مقصد، تفصیلات، اہمیتِ شہادت اور اسلام میں اتحاد اور یگانگت کی اہمیت پر تقریر کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس علاقے میں تمام مذاہب اور فرقوں کے درمیان بہت اچھا تعلق ورشتہ ہے۔ یہ یہاں کے بزرگوں کا غیر معمولی تحفہ ہے۔

محرم کی انیس کو نسبتاً نئے انداز کی ایک مجلس صدر امام باڑے میں ہوتی ہے جس میں صرف وہ نوخیز اور نوجوان حصہ لیتے ہیں جو غیر شادی شدہ ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد نوجوانوں میں عزاداری کی تحریک اور شوق پیدا کرنا ہے۔ تین چار دن پہلے سے لڑکوں میں جوش وخروش پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ بزرگوں کی مدد سے تیاری کرتے ہیں اور پھر مجلس میں منبر پر اپنی صلاحیتوں اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ تربیتی اعتبار سے بہت بامقصد ادارہ ہے۔

بیس محرم کو بہت بڑا جلوس نکلتا ہے جسے 'دسواں' کہا جاتا ہے۔ یہ کربلا کے سب سے کم عمر شہید علی اصغر کی یاد میں منظم کیا جاتا ہے اور ضلع اور آس پاس کے علاقے میں بہت مشہور اور معروف حیثیت کا

حامل ہے۔ یہ لگ بھگ سو سال سے نکل رہا ہے اور اس میں بھی تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ مجلس میں کوئی بڑا ذاکر بیان کرتا ہے اور مختلف انجمنیں نوحہ خوانی کرتی ہیں۔ جلوس صدر امام باڑے سے شروع ہوکر پورے گاؤں میں گشت کرتا ہے۔ آخر میں سب سے بڑی مقامی انجمن، ہاتھ اور زنجیر کا ماتم کرتی ہے۔ یہاں کے زنجیر کے ماتم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں چھریوں والی زنجیریں سینے پر ماری جاتی ہیں جبکہ دوسری جگہوں پر پیٹھ پر لگائی جاتی ہیں۔ اس جلوس اور انجمنِ اصغریہ کے بانی علامہ لطیف زنگی پوری تھے۔ جلوس ۷ بجے صبح صدر امام باڑے پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک مختصر سی مجلس ہوتی ہے جس میں کربلا کے صرف مصائب پڑھے جاتے ہیں اس لیے یہ مجلس انتہائی پرتاثیر اور رقت افزا ہوتی ہے۔

صدر امام باڑہ عوامی وقف ہے۔ اس کے پاس ایک مسجد ہے جس میں ایک تنخواہ دار عالم امام جمعہ و جماعت بھی ہے۔

حکیم ہاشم صاحب مرحوم نے اپنی تمام املاک اس امام باڑے کو وقف کردی تھیں۔

حیدرآباد میں عزاداری محرم کی روایت

پروفیسر سید ایوب علی☆

اسلامی اثرات اور ان کا ثقافتی پھیلاؤ آندھرا میں چودھویں صدی یعنی ۱۳۲۳ء میں دہلی کے سلطانوں کے ہاتھوں کاکتیا سلطنت کے زوال کے بعد سے نظر آنا شروع ہوتے ہیں۔ شروع کے دور کے ادبی شواہد اور کتبوں وغیرہ سے ابتدائی مسلمان حکمرانوں کی تصویر خاصی بھیانک ابھرتی ہے اور ان کے طرزِ عمل میں مذہبی زیادتیوں اور کلچرل تعصب کا انداز نظر آتا ہے۔ لیکن قطب شاہی دور اور اس کے بعد کے دور، یعنی ۱۵۱۸ سے مذہبی اور ثقافتی امتزاج اور ہندو مسلمانوں کا آپس میں مل جل کر رہنے کا چلن آندھرا میں ابھرنے لگا تھا۔

آندھرا میں تمام مذہبی تیوہار اور دونوں فرقوں کی خوشیاں اور جشن یکساں جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں۔

خوش نصیبی سے قطب شاہی خاندان کے بعد یہ علاقہ آصف جاہیوں کے تسلط میں آیا۔ آصف جاہی حکمرانوں نے بھی فرقے وارانہ ہم آہنگی اور میل جول کا طریقہ اپنایا اور اس کو ۱۹۴۸ء تک باقی رکھا، جب حیدرآباد، انڈین یونین میں شامل ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی سماجی اور مذہبی طور طریقوں میں بڑی واضح تبدیلی آگئی۔ بہرحال محرم کی رسومات نہ ختم ہوئیں، نہ بدلیں۔ اب بھی آندھرا پردیش کے لوگ جو مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، صوبے کے مختلف علاقوں میں مذہبی تیوہار اور جشن اسی جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں۔

آندھرا پردیش میں مشکل سے ہی کوئی گاؤں ایسا ہوگا جہاں عاشور خانہ نہ ہو اور وہاں محرم کی رسمیں ادا نہ کی جاتی ہوں۔ خواہ اُس میں مسلمان رہتے ہوں یا نہ رہتے ہوں۔ یہاں تک کہ وہ قبیلے بھی، جو ریاست کے دور دراز گوشوں میں رہتے ہیں، محرم پورے احترام اور لگن سے مناتے ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ، اس مختصر مقالے میں آندھرا میں عزاداری کی روایت کی ابتداء اور غیر

☆ حیدرآباد

مسلموں کی ان روایات میں شرکت کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اُن لوک گیتوں پر بھی کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق آندھرا میں محرم کی روایت سے ہے۔

یہ بات کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں پہلا علَم کب نصب ہوا اور پہلی مجلس کب منعقد کی گئی مگر دکن میں، مجلسوں کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب بہمنی دور میں ایرانی یہاں آنا شروع ہوئے۔ علموں کے بارے میں حوالے تو موجود ہیں مگر افسوس ہے کہ اس دور کا کوئی علم نہیں مل سکا۔ بہمنیوں کے زوال کے نتیجے میں پانچ آزاد حکومتیں قائم ہوئیں۔ بیجا پور سلطنت کا بانی عادل شاہ وہ پہلا شخص تھا جس نے شیعہ اذان کہنے کا حکم دیا اور خطبوں میں بارہ اماموں کے نام لینے کی ہدایت کی۔ یہ عمل ارک قلعے میں ۱۵۰۳ میں شروع ہوا۔ گولکنڈہ میں چھ سال بعد قطب شاہی حکومت کے بانی قطب الملک نے یہ عمل شروع کیا۔

یہاں سے حیدر آباد میں قطب شاہی بادشاہوں کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی مجالس کا باقاعدہ تاریخی ریکارڈ ملتا ہے۔ علم رکھنے کے لیے عاشورہ خانوں کی مخصوص عمارتیں بنوائی گئیں۔

۱۵۹۲ء میں چار مینار کی عمارت پوری ہونے کے بعد بادشاہی عاشور خانہ تعمیر کروایا گیا، جس میں چودہ مرصع طلائی علم رکھے گئے اور یہ جگہ المیۂ کربلا کی یاد میں عزاداری کے لیے مخصوص مرکز ہوگئی۔

مرزا نظام الدین نے اپنی کتاب ''حدیقۃ السلاطین'' میں اور غلام حسین خاں نے اپنی کتاب 'گلزارِ آصفیہ' میں حیدر آباد میں عزاداری کا بہت تفصیلی بیان کیا ہے۔ نظام الدین کے بیان کے مطابق معاشرے کے تمام حصے محرم کی عزاداری میں شریک ہوتے تھے۔ محرم کے دوران لوگ موسیقی اور رقص کی محفلیں نہیں سجاتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ گوشت، اور پان تک جو مقامی لوگوں میں بہت مقبول تھا، کھانا چھوڑ دیتے تھے۔

مذہبی رسوم، جیسے ماتم کرنا، فاتحہ وغیرہ صرف وہ لوگ انجام دیتے تھے جو ان پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن عاشور خانے کی باقی رسوم بہت عام تھیں اور ان میں سب لوگ شریک ہوتے تھے۔

زیادہ تر رسوم مقامی رسم و رواج سے اپنائی گئی تھیں۔ جیسے سوانگ یا شیر یا بندر وغیرہ کا روپ بھرنا وغیرہ مقامی غیر مسلموں سے لیے گئے تھے۔ 'رشید الدین خانی' میں غلام امام خاں کی تصدیق کے مطابق محرم میں سلطان سے لے کر عام آدمی تک خواہ سنّی ہو خواہ شیعہ خواہ ہندو، ہر شخص لنگر کی روایت ضرور پوری کرتا تھا۔ یہ عمل اس شخص کی اپنی مالی حالت یا ذرائع کے مطابق ہوتا تھا۔

ہنم کونڈا اور وارنگل، ضلع وارنگل میں جڑواں شہر ہیں۔ یہ جگہ اپنی شان وشکوہ اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے آندھرا پردیش میں بہت مشہور ہے۔ یہاں نسل، ذات، مذہب کی تفریق کے بغیر ہر طبقے کے لوگ مسلمانوں کے ساتھ محرم کی روایات میں حصہ لیتے ہیں۔ وارنگل کی آبادی ۷ لاکھ ہے اور ہر سال لگ بھگ ایک لاکھ لوگ محرم میں شریک ہوتے ہیں ان میں سے ۵۰ ہزار سے زیادہ غیر مسلم ہیں۔

تمام فرقوں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ علم (پیرلؤ) ان کی دعا سن لیں گے اور ان کی مانگیں پوری ہوجائیں گی۔ محرم میں عام طور پر یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر 'اوؤ' (Owes) میں غالباً چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ پھول، ناریل، شکر، ہرایا لال رنگ کا کپڑا جس پر ملّو، (علم سے دعا) کا دھاگا لپٹا ہوتا ہے چڑھاتے ہیں۔

لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر بیمار، گونگے، اپاہج اور دماغی طور پر کمزور بچوں کو عَلَم کے گرد گھمایا جائے تو وہ ٹھیک ہوجاتے ہیں۔

جب کسی غیر مسلم کے یہاں عَلَم پر 'اَوس' چڑھانے کے بعد بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے بچے کے نام کے ساتھ کوئی اسلامی نام لگادیتے ہیں۔ جیسے حسین ریڈی، حسن راؤ، حسن اما وغیرہ۔

محرم سے وابستہ ایک اور روایت جو آندھرا پردیش میں عام ہوئی وہ نظم گوئی تھی۔ غیر مسلموں نے تیلگو میں ایسی نظمیں لکھیں جن میں المیۂ کربلا اور امام حسینؑ کی تعلیمات کو بیان کیا جاتا تھا۔

یہ نظمیں یا گیت جو اردو مرثیے، نوحے وغیرہ سے متن اور 'فارم' میں مختلف ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر زیادہ تر تیلگو گیتوں میں حسن اور حسین دونوں کی شہادت میدان کربلا ہی میں بتائی جاتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف امام حسینؑ اپنے بہتر ساتھیوں کے ساتھ وہاں شہید ہوئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ محرم کو ایک تیوہار کی طرح خوشی کے ساتھ مناتے ہیں، جبکہ محرم رنج وغم کا مہینہ ہے۔

ایسے اور بھی کچھ انحراف یا غلطیاں ہوسکتی ہیں مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان تیلگو گیتوں کے لکھنے والے غیر مسلم تھے اور اسلامی تاریخ سے واقف نہیں تھے۔ ان گیتوں میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے، اور ہمیں اسی پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ان شاعروں یا گیت کاروں میں کربلا کے لیے کتنا لگاؤ اور جذبہ تھا۔ محرم سے متعلق تیلگو میں کئی طرح کے گیت ہیں۔

کیرالہ میں نو آبادیاتی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں کربلا کے اثرات

پروفیسر کنھ علی☆

بوہرہ مسلم فرقہ کسی زمانے میں کیرالہ کے ممتاز بیوپاری طبقوں میں شمار کیا جاتا تھا اور کیرالہ کی سماجی زندگی میں یہ لوگ اپنا اثر قایم کیے ہوئے تھے۔ یہ یہاں اٹھارویں صدی میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ موجودہ دور میں ان کے ۳۰ خاندان کالی کٹ میں، ۸ کنور میں، ۲۵ کوچین میں، ۱۲ ارالاپورہ میں اور ۱۵ منگلور میں مقیم ہیں۔ کالی کٹ میں ۱۰۰ سال پرانی ایک مسجد ہے جو ساؤتھ بیچ روڈ کی بورہ آبادی میں واقع ہے۔ اس کے 'عامل' اجین کے شیخ عباس ہیں۔

یہ لوگ ۲ تا ۱۰ محرم تبلیغ کرتے ہیں اور دس محرم کو فاقہ کرتے ہیں۔ پورا فرقہ عزاداری میں شریک ہوتا ہے۔ کیرالہ کی زندگی کی ایک خصوصیت پیغمبر خدا حضرت محمدؐ اور ان کے خاندان سے گہری محبت وعقیت ہے۔ ملک کے اس حصے میں تاجروں نے اسلام کو متعارف کرایا۔ گوکہ 'تحفہ شیخ زین الدین مخدوم ۱۵۷۳ء[1] اور مقامی تحریری مآخذ۔ 'کیرالا پازاما (مال) اور 'کورالول پائی'[2] کے مطابق کیرالا میں اسلام کی آمد کو حضرت محمدؐ کے دورِ حیات میں ہی بتایا گیا ہے مگر زیادہ امکان یہ ہے کہ آنخضرتؐ کی وفات کے فوراً بعد، اسلام کے ابتدائی عروج کے وقت، اسلام کا تعارف ہندوستان کے جنوب مغربی ساحلی علاقوں میں ہوا۔ ساحلی شہروں میں عربوں نے پہلے اسلام قبول کیا۔ تجارتی گروہوں کی کچھ مخصوص چیزوں میں دلچسپی تھی اور کچھ مقررہ مخصوص عملوں کا اُن کا اپنا ایک دائرہ تھا۔ یہ بھی تحقیق ہوئی ہے کہ عرب تاجروں میں خالص عرب ہی نہیں تھے بلکہ ان میں ایرانی اور 'ایرانیائی عرب' بھی تھے۔

ایرانی ثقافتی حلقے کا اثر اس حقیقت سے مترشح ہوتا ہے کہ 'ظفر صرّاف'، بصرہ، قیس، عمان اور یمن

☆ کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالہ

۱۔ شیخ زین الدین مخدوم، تحفۃ المجاہدین بعض احوال البرتقالین (۱۵۷۳)

۲۔ ملیالی تحریریں، ۱۷ ویں ۱۸ ویں صدی

جیسے قرونِ وسطیٰ کے تمام تجارتی مراکز خلیج فارس کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں تارساپلی کی تانبے کی تختی میں مارسا پیراایسو کو دی گئی مراعات کی تصدیق کرنے والوں میں کوفی رسم الخط میں دستخط ملتے ہیں۔

اسلام کا کیرالہ میں تعارف خلیج فارس کے راستے ہوا، جس کا مطلب ہے کہ وہ خلیفہ عمر کے دور سے پہلے نہیں ہوسکتا تھا۔ فارسی کا یہ اثر کچھ مذہبی اہمیت کے عام اور معروف لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستان بھر میں صرف ماپلا (کیرالہ کے مسلمان) ہی نماز کے لئے 'اذان' کے بدلے 'بانک' (بانگ) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ماپلاؤں میں سنگِ مزار کے لیے 'میزان کالو' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو یقیناً 'نشا کالو' (نشان کا پتھر) ہے۔گھریلو استعمال کے الفاظ میں، مثال کے طور پر، پیالے کے لیے، کاسا پجانم اور مٹھائی کے لیے شیرنی فارسی، شیریں، سے لیا گیا ہوگا۔ بنیادی فقہ اورنحو کی کتابوں میں کتنے ہی الفاظ 'از' اور 'در' جیسے موجود ہیں۔[۱]

مختصراً جو اسلام ابتدائی منزل میں کیرالہ میں پہنچا وہ ایرانیائی عرب کے معیار و اقدار کا ایک انوکھا امتزاج تھا جسے مصدقہ اسلام مان لیا گیا تھا۔ اس طرح جنوب ایشیا کے اسلام میں، باوجود یکہ یہ عمومی سنی خصوصیات کا حامل ہے، کچھ مضبوط شیعہ اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ہمیں یہاں کے ہر گھر میں لوگوں کے ناموں میں شروع حصے میں یا آخر میں علی، فاطمہ، حسن اور حسین کی موجودگی نظر آتی ہے۔ جیسے زامورین کے بحریہ کمانڈر کوہا+علی+ مرارکار تھے۔ قادری طریقت کے شیخ الایدسّویا و العلویہّ کے ناموں میں علی شامل ہے، محمد علی، صادق علی، بشیر علی وغیرہ۔[۲]

مگر یہ چیزیں شیعہ عقیدے کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں۔ کونڈوٹی، ٹانگل، جب کونڈی میں اٹھارویں صدی کے ابتدائی حصے میں پہنچے اورانھوں نے مریدوں سے شیخ کے سامنے ماتھا ٹیکنے پر اصرار کیا تو لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، علماء نے فتویٰ دیا کہ یہ غیر اسلامی طریقہ ہے، پورا ماپلا طبقہ 'پوتانی کائی اور کونڈوٹی کائی' میں بٹ گیا۔ اس سلسلے میں بڑی مقدار میں عربی ملیالی ادب تخلیق ہوا جو دینیات کے مختلف رخوں اور فروعی حصوں سے تعلق رکھتا تھا، آخر میں کونڈوٹی، ٹانگل کو یہ اعلان کرنا پڑا، ''خدا میرا محافظ ہے، محمد میرے رسول ہیں اور کرم علی میرے پیر''۔

۱- جان ایل، ایسپازٹس: آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی میڈیول اسلامک ورلڈ، آکسفورڈ (۱۹۵۵) صفحات ۴۷-۳۴۶

۲- یہ محمد علی منگل، صدر کیرالہ اسٹیٹ مسلم لیگ کا طریقہ ہے   ۳-کائی (ہاتھ) گروپ رمسلک

۷۵۰ عیسوی سے ایرانی اسلام، جس میں عباسی دور کی دانشوری اور تہذیبی خصوصیات کا عمل دخل تھا، مسلمان تاجر طبقہ اسی کی تبلیغ اور نمائندگی کر رہا تھا۔ قدرتی طور پر کربلا، اس کی عظمت اور اس سے متعلق جذبات و احساسات بھی پھیل رہے تھے۔

مالابار میں جو صوفیت پھیلی اور پروان چڑھی وہ اپنے مقامِ پیدائش سے سمندر کے راستے، براہِ راست مالابار پہنچی اس لیے یہ بیرونی اثرات سے مبرّا اور غیر اسلامی روایات سے پاک تھی۔ اسی لیے ہمیں ابوالفضل کی فہرست میں ایسے کچھ صوفی سلسلوں کا ذکر نہیں ملتا جو جنوبی ہندوستان میں موجود تھے۔[1]

۱۵۲۱ء میں شیخ عبدالعزیز مخدوم، پوتانی کے مذہبی تربیتی مرکز کے سربراہ نے ہدایت الاذکیا فی طریقۃ الاولیاء[2] (ذی فہموں کے لیے اولیاء کے راستے کی ہدایت) لکھی جو مالابار میں صوفیت کا ہدایت نامہ مانی جاتی ہے، اس میں انھوں نے تحریر کیا تھا۔

''میرے بھائی! طریقت اور حقیقت ایسے ہیں کہ تم ان دونوں کو شریعت کے اعمال بغیر حاصل نہیں کرسکتے۔

اس کا مطلب ہے کہ صوفیت شریعت کے زیرِ اثر رہی۔ بہر طور رسولؐ اللہ اور آلِ رسول سے گہری محبت وعقیدت ماپلا صوفیت کی ایک اہم خصوصیت رہی۔ ماپلاؤں نے ایک عربی ملیالی بولی (عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی ملیالی) کو فروغ دیا جس کے توسط سے دینی اعمال کو نظم کیا۔ اس نظم کا بڑا حصہ رسولؐ، آلِ رسول اور اصحابِ رسول کی مدح و منقبت پر مشتمل تھا۔ لوگ ان منظوم حصوں کو بڑی عقیدت سے پڑھتے تھے، آہ و بکا کرتے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے دعائیں کرتے تھے جو ہر 'مالا پیٹوکل' (ہار) کے آخر میں ایک جزوِ لازم تھیں۔[3]

'تذکرے' یعنی وعظوں کی مناجاتوں میں انسان کے گناہوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور مقرب بندوں کے اعلیٰ درجات کے بیان کے بعد اُن سے سفارش و شفاعت کی درخواست کی جاتی تھی۔

ان نظموں میں رسول اللہ کے بعد فاطمہ زہرا مرکزی شخصیت تھیں۔ شادی بیاہ کے گیتوں میں فاطمہ

۱- حالانکہ ابوالفضل کے پاس مغل ہندوستان کے بارے میں تمام معلومات موجود تھیں لیکن اسے جنوبی ہندوستان کے صوفی سلسلے کے بارے میں واقفیت نہیں تھی۔ جیسا کہ محی الدین مالا (۱۵۷۳) میں محی الدین عبدالقادر جیلانی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے قادری سلسلہ صوفی سلسلوں میں بہت متحرک تھا۔ ۲- مالا بار ملائشیا اور مصر کے اعلیٰ تعلیمی مرکزوں میں یہ کتاب نصاب میں داخل تھی اور کیرالہ میں آج بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ۳- یہ مالا (ہار) کہلاتے تھے۔ اس کا ایک ایک لفظ یا مصرعہ ہار میں جمائے ہوئے موتی کی طرح تھا۔

عورتوں میں ہیرو کی سی حیثیت کی حامل رہی ہیں۔[۱] جو خوبصورت، مثالی زوجہ، علی کی شریکِ حیات، اور حسنؑ و حسینؑ کی ماں، ملیالی ادب میں کربلا پر افسانوی ادب (فکشن) تک موجود ہے۔

مالا بار پر کربلا کا تاثر بڑا گہرا اور دیرپا تھا۔ معاشرے کے لیے، انسان کی اپنی روح کے لیے اور حیات بعدازموت کے لیے شہادت کو اعلیٰ ترین قربانی مانا جاتا تھا۔ مالا بار میں پرتگالی محض تجارت کی غرض سے نہیں آئے تھے بلکہ ہلال (اسلامی علامت) سے صلیب (عیسائی علامت) کا بدلہ چکانے آئے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں سے گرم مصالحے کی تجارت چھینی، جہازوں کو لوٹا، حاجیوں کے جہاز جلائے، قرآن کی بے حرمتی کی، محمدؐ کی شان میں گستاخیاں کیں، مسلمانوں کو غلام بنایا اور عورتوں کی آبروریزی کی۔

شیخ یحییٰ زین الدین مخدوم نے ۱۵۲۱ء میں ''تحریک اھلِ الایمان علی جهاد عبداۃ الصلبان''، (صلیب کے پرستاروں کے خلاف اہلِ ایمان کو جہاد کی ترغیب) لکھی ۱۵۷۳ء میں ان ہی شیخ زین الدین مخدوم نے "تحفة المجاهدين فی بعض الاحوال برتقالين" (پرتگالیوں کے بعض اقوال کے سلسلے میں مجاہدوں کو تحفہ) لکھی۔[۲]

کتاب کے پہلے باب میں جہاد کی عظمت اور جنت میں شہید کے اعلیٰ درجے کا بیان ہے۔ قرآن و حدیث کے بہت سے اقتباسات کے ساتھ انھوں نے فرمایا کہ جہاد اور شہادت ہر مسلمان مرد اور عورت پر آقا کی اجازت کے بغیر غلام پر، قرض دینے والے کی اجازت بغیر مقروض پر اور شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی پر فرض عین ہے۔

ہزاروں لوگ پرتگالیوں سے لڑے اور جامِ شہادت پیا۔ متذکرہ بالا کتابوں کو درس میں پڑھایا جاتا تھا اور وعظوں (تذکروں) میں ان کا پرچار کیا جاتا تھا۔

کالی کٹ کے کنجالی مرکار، جو بحری فوج کے ایڈمیرل ہوتے تھے، بھرتی کے وقت موت تک لڑتے رہنے کا عہد لیتے تھے۔ یہ قلندریہ صوفی برادری میں ہوتا تھا۔ گوا کے سابق گورنر کے محل میں لگی بہت سی بڑی بڑی قلمی تصویروں میں، جو اب گوا میوزیم میں محفوظ ہیں، یہ تعارفی الفاظ نظر آتے ہیں، پرتگالی پادریوں کو مالا باری قتل کر رہے ہیں، ان میں ماپلا قلندروں کو بالکل اسی حلیے میں دکھایا گیا ہے

۱- اب بھی گیتوں کے تجارتی مجموعوں (البموں) میں فاطمہ ایک مرکزی تھیم ہے

۲- 'تحفہ' (۱۵۷۳) کیرالہ کی تاریخ پر پہلا تحریری کام مانا جاتا ہے۔

جیسا خلیق احمد نظامی نے بیان کیا ہے:

''قلندریہ سلسلے کے لوگ عام طور پر سر، بھنویں، داڑھی اور مونچھیں منڈواتے تھے۔ تصویروں میں انھیں صرف لنگی، کمر کی پٹی اور بازو پر اوپر تعویز باندھے تلوار کھینچے دکھایا گیا ہے''۔[۱]

کالی کٹ کی گرندھاولی میں اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں پام کے پتے پر لکھے ایک مخطوطے میں متذکرہ بالا کھی قلندرں کو 'کنجالی مرکار' کا لقب دیا گیا ہے۔ یہ 'اولا' (پام کا پتا) پرتگالی غارت گری کے مخالف زامورین کی طرف سے مرکار روایت کو ازسرِ نو زندہ کرنے کی کوشش تھی۔[۲]

اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی کنجالی مرکار جو بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا، کچھ ہی دن بعد وہ پھر ایک ایسی بہادر بحری فوج کے ساتھ واپس آجاتا، جس کے سپاہیوں کو اپنی موت تک لڑتے رہنے کے عہد پر بھرتی کیا گیا ہوتا۔

جب ۱۷۹۲ء میں سرنگا پٹم کے معاہدے کے بعد حکومت برطانیہ نے مالابار کے انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے عام طور پر زمینداروں کی طرفداری کرنے کی پالیسی اپنائی، اس میں بھی اکثریتی فرقے پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ تحفظ کے برطانوی قانون کے تحت جینمیوں (روایتی مالکان زمین) اور برطانوی افسروں نے مل کر مسلمان کاشتکاروں کو لگان بڑھانے اور بے دخلی وغیرہ سے بری طرح دبانا شروع کیا۔ اس فرقے کی تکلیفیں اور پریشانیاں اتنی بڑھ گئیں کہ آخر تنگ آکر انھوں نے لڑنے اور اپنے فرقے کی خاطر مر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے اپنے بھائیوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کو پورے فرقے پر ظلم تصور کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی مسلمان گروہ کسی برطانوی افسر یا جینمی کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا تھا تو اس گروہ کے لوگ اپنے سب قرضے چکاتے تھے۔ بیویوں کو طلاق دیتے تھے، سر منڈواتے تھے اور اپنا سارا وقت عبادت اور 'ذکر' میں گزارتے تھے۔ اس کے بعد یہ لوگ مامبورم کے باعلاوہ صوفی فضل سید فضل کی دعائیں لینے دور دراز کا سفر کرتے تھے اور پھر اپنے فیصلے پر عمل کرتے تھے۔ یہ لوگ مسجد میں بیٹھ کر برطانوی پولیس کا انتظار کرتے تھے اور ان کے آتے ہی یہ کود کر اُن سے لڑنا شروع کردیتے اور مارے جاتے۔[۳] اس سے اُن کے ارادتاً شہید ہوجانے کے فیصلے کا اظہار ہوتا ہے۔

۱- کے۔اے۔ نظامی، ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان انڈیا، ڈیورنگ، دی تھرٹینتھ سنچری، ص ۱۹۵

۲- زامورن مارکار جنگجوؤں کو ذیج غارتگروں کے خلاف دوبارہ ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا

۳- ایف۔ ڈی۔ اسٹیفن نے 'ماپلاز، مسلم کمیونٹی آف ساؤتھ ایسٹ ایشین فرنٹئر' میں گہرا مطالعہ کیا ہے

جیسا کہ ڈبلیو، فاسیٹ نے 'انڈین انٹیکوائری، (قدیم نوادرات کا مطالعہ) میں ۱۹۰۱ء میں بیان کیا ہے عورتیں کسی ایسی شہادت کے متمنی فرد سے، جو زندہ واپس آ گیا ہو، بے تعلق ہو جاتی تھیں، اگر یہ مردِ میدان ہوتا تو زندہ واپس نہ لوٹتا۔ یہ فاطمہؑ کے جذبات و احساسات کی ترجمانی تھی۔[۱]

شہداء کو بڑا تقدس و احترام ملتا تھا۔ ان کی قبروں کا احترام ہوتا تھا۔ 'جارام' نصب کیے جاتے تھے۔ پورے تقدس کے ساتھ عرس منعقد ہوتے تھے۔ ان سے کرامات منسوب کی جاتی تھیں اور ان کی زیارت کے لیے لوگ سفر کرتے تھے۔ تبرک تقسیم کیے جاتے، یا جارموں کے محافظ پڑھا ہوا پانی، گنڈے، تعویذ، یا جادوئی نقوش تیار کرکے لوگوں میں بانٹتے۔

جیسا کہ ''تحفہ'' کے مصنف نے بیان کیا ہے، شہید کا درجہ رسول کے بعد سب سے اعلیٰ ہے۔ ''شہیدوں کو مردہ تصور نہ کرو۔ وہ اپنے خدا کے حضور میں زندہ ہیں اور اس کی مرضی سے رزق پا رہے ہیں''۔

مصیبت میں مبتلا عام آدمی 'سیداکان ماز' (شہید میری مدد کر) کی دعا کرتا تھا۔ ارادتاً شہادت کا متمنی شخص برطانوی انتظامیہ کے لیے زبردست خطرہ تھا۔ ملاپورم کے تمام دیہاتوں میں، باغی ماپلاؤں کے ہاتھوں قتل ہونے والے انگریز افسروں کے مقبرے موجود ہیں۔ اس باغیانہ رجحان کو کچلنے کے لیے انگریزوں نے ماپلا انسداد ایکٹ، پاس کیا تھا۔ انتظامیہ میں بڑی بے چینی تھی کیونکہ یہ بغاوت خزانے پر بھی بہت بوجھ ڈال رہی تھی جب کلکٹر ایچ وی کونولی اپنے بنگلے میں ماپلاؤں کے ہاتھوں قتل ہوا تو برطانوی افسر مالابار میں خدمات انجام دینے سے گریز کرنے لگے۔[۲]

شہادت کے اس عقیدے کا آخری اظہار ۱۹۲۱ء میں خلافت تحریک میں نظر آیا، جسے عام طور پر ماپلا بغاوت کا نام دیا جاتا ہے اور جو حقیقت میں مالابار میں آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ تھا۔

۱۔ ڈبلیو فاسیٹ (W.Fawcet) وار سانگس آف ماپلاز (Indian Antiquary xxx (1901) U.P 501)
۲۔ یہ صوفیت کی طائفہ درجے کے متوازی تنظیم تھی۔

راجستھان میں عزاداری اور تعزیہ داری کی روایت

رنبیر سنگھ☆

۱۱۹۲ء عیسوی میں ہی جب محمد غوری نے ترائن کی دوسری جنگ میں پرتھوی راج چوہان پر فتح حاصل کر کے سرسی میں اس کا سرقلم کیا تو اجمیر جو چوہانوں کا دارالسلطنت تھا، اس پر محمد غوری کی فوجوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں میران کھانگ کی قیادت میں کچھ فوجی تاراگڑھ کے قلعے میں مقیم ہوئے۔ ۱۱۹۵ء میں عزاداری کی روایت قائم کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ تب سے یہ آج تک باقی ہے اور پورے راجستھان میں ایک روایت کی حیثیت حاصل کر گئی ہے۔ محرم کی رسوم کی ۲۹رذی الحجہ سے ابتداء ہوجاتی ہے اور تعزیوں کے جلوسوں کا سلسلہ بھی اسی دن سے شروع ہوجاتا ہے۔ اگر اس تاریخ کو محرم کا چاند نظر نہیں آتا تو محرم کی پہلی مجلس اگلے دن رات کو ہوتی ہے۔ دبیر، انیس، مونس اور راجستھانی شعراء کے مرثیے ان میں پیش کیے جاتے ہیں۔ پورے راجستھان میں اس تاریخ سے عزاداری اور تعزیہ داری کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ راجستھان کی دوسری ریاستیں، جیسے اودے پور، جودھپور اور جے پور وغیرہ جو بعد میں اہمیت اختیار کر گئیں اس دور میں اپنے قیام کے لیے کوشاں تھیں۔ ہندو اور مسلمان ثقافتوں کا امتزاج تو حقیقت میں مغل دور کے آغاز سے وجود میں آیا جس کا سہرا شہنشاہ اکبر کے سر ہے۔ آمیر کے راجا بھارمل کی لڑکی ہرکابائی کی اکبر سے شادی فی الحقیقت اُس گنگا جمنی کلچر کا سنگِ بنیاد تھی جسے آج مخلوط کلچر کا نام دیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں پورا ہندوستانی سماج ایک مضبوط رشتے میں بندھا اور ایک وحدت قایم ہوئی۔

آمیر وہ پہلی راجپوت ریاست تھی جس نے مغل شہنشاہوں سے گہرے اور قریبی رشتے قائم کیے۔ یہاں کے حکمراں مغل بادشاہوں کے معتمد، رازدار اور دربار کے بڑے منصب دار ہوگئے اور انھوں نے ان کے طور طریقہ اور زبان اپنا لی۔ سوائی جے سنگھ جو اپنے وقت کا ہوشیار ترین حکمراں تھا، جب اس نے ۱۷۲۸ء میں جے پور کے نئے شہر کی بنیاد ڈالی تو کچھ سیّد خاندان جو آمیر میں

☆ جے پور

سکونت پذیر تھے وہ جے پور منتقل ہوگئے۔ یہاں انہیں رہائش، مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر کے لیے زمینیں دی گئیں۔ کچھ افراد کو ریاست کے لیے گرانقدر خدمات انجام دینے کے صلے میں جاگیریں بھی عطا ہوئیں۔ انہی خاندانوں نے جے پور میں عزاداری اور تعزیہ داری کی روایت قایم کی۔ شروع میں یہ صرف چند خاندانوں تک محدود تھی جہاں مردانی اور زنانی مجالس منعقد ہوتیں اور تعزیے نکالے جاتے۔ شاہی خاندان والوں نے اس میں سوائی رام سنگھ کے زمانے سے حصہ لینا شروع کیا جو یہاں ۱۸۳۰ء سے ۱۸۸۰ء تک حکمراں تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں ہر مہینے چاند نکلنے کا اعلان ناہر گڑھ سے توپ داغ کر کیا جاتا تھا جو کچھ اونچائی پر واقع تھا اور گولے کی آواز شہر کے ہر کونے میں سنی جاسکتی تھی لیکن محرم کی چاند رات کو توپ نہیں داغی جاتی تھی بلکہ اس کی جگہ ڈھول، تاشے بجائے جاتے تھے اور سپاہیوں کے ساتھ ناہر گڑھ سے ایک جلوس کی شکل میں علَم نکالے جاتے تھے جو شہر کے تمام محلوں میں گشت کرتے تھے اور اس سے محرم شروع ہونے کا اعلان ہوتا تھا۔ رام سنگھ موسیقی کا شائق تھا اور یہ دستور تھا کہ ہر روز شام کو موسیقار دربار میں حاضر ہوکر کلاسیکی موسیقی اور غزلیں پیش کرتے تھے۔ مگر محرم کے پہلے دن سے ہی شاہی محل اور جاگیرداروں کے گھروں تک موسیقی کی یہ محفلیں منعقد ہونا بند ہوجاتیں۔

آخری دن ہر محلے میں تیار کردہ تعزیے ہوامحل کے چوپار میں جمع ہوتے تھے۔ رام سنگھ ایک تعزیہ چڑھاتا تھا جو آتش خانے کے صدر دروازے پر رکھا جاتا تھا اور یہیں سے یہ جلوس میں شامل ہوتا تھا۔ اس جلوس میں ہر فرقے کے لوگ شرکت کرتے اور ہندو اور مسلمان عورتیں سڑک کے دونوں طرف کھڑی رہتیں اور جب تعزیے اُن کے سامنے سے گزرتے تو وہ اپنے بچوں کو لے کے دوڑتیں اور انہیں ان کے نیچے سے گزارتیں تاکہ وہ آنے والی زندگی میں مصیبتوں اور خطروں سے محفوظ ہوجائیں۔ ایک بار رام سنگھ خود بیمار ہوا اور کسی علاج سے اُسے فائدہ نہیں ہوا۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ تعزیے کی ڈوری پہنے اور یہ معجزہ ہی تھا کہ وہ اسی دن ٹھیک ہوگیا۔ اسی پر اس نے سونے چاندی کا بنا یہ تعزیہ چڑھایا تھا۔

۱۹۴۲ء میں پہلی بار 'حسین ڈے' منایا گیا تھا جس میں مشہور دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ منشی چندر بہاری لال صباؔ، جو 'طوطیِ راجستھان' کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، انہوں نے ایک سلام پڑھا تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔ یہ پروگرام تین دن چلا تھا۔ دوسرا 'حسین ڈے' سوائی

مان سنگھ ٹاؤن ہال میں ہوا تھا اور تیسرا ۱۹۸۵ء میں امام باڑہ بدان پورہ میں منعقد ہوا تھا۔

جے پور میں پانچ مسجدیں، دو قومی امام باڑے اور سادات خاندانوں کا ایک قبرستان ہے۔

گوکہ بہت سے خاندان پاکستان ہجرت کر گئے مگر عزاداری اور تعزیہ کی روایت کو باقی رکھا گیا ہے اور تمام مذاہب اور ذاتوں کے لوگ پوری عزت و احترام کے ساتھ تعزیوں کے جلوس میں شریک ہوتے ہیں۔

جودھپور ایک اور ریاست تھی جس کے شادی کے توسط سے ہی مغل بادشاہوں سے گہرے تعلقات قایم ہوئے ۔ جودھپور کے راجا اودے سنگھ کی بیٹی جودھابائی کی شادی جہانگیر سے ہوئی تھی۔ گوکہ مسلم کلچر کا اثر جودھپور کے دربار اور عام لوگوں کی زندگی میں سرایت کر چکا تھا مگر عزاداری مہاراج جسونت سنگھ دوم کے زمانے سے شروع ہوئی جس کا دورِ حکومت ۱۸۷۳ء سے ۱۸۹۰ تک تھا۔ جودھپور میں ایک رواج یہ تھا کہ بمبا محلے کے لوگ، جہاں سے عزاداری کی ابتدا ہوئی، وہ ڈھول تاشہ بجاتے ہوئے پورے شہر کی گشت کرتے تھے اور چندہ اکٹھا کرتے تھے۔ سوسائٹی کا ہر طبقہ انہیں خوشی سے چندہ دیتا تھا۔ انہیں ۳۰ روپے مہران گڑھ سے ملتے تھے جو اس زمانے میں شاہی خاندان کا مسکن تھا۔ مہاراج تخت سنگھ کی ایک لڑکی کی شادی جے پور کے سوائی مان سنگھ سے ہوئی تھی۔ اس نے بڑے اعتقاد سے منت مانی کہ اگر اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو وہ محلّہ لاکھان کے تعزیے کو بہت خوبصورت بنوا دے گی۔ اس کے ایک لڑکا ہوا جو جے پور کا موجودہ حکمراں تھا۔ رانی نے حکم دیا کہ ۱۸ فٹ اونچا لکڑی کا تعزیہ بنوایا جائے جسے سونے چاندی سے منڈھا جائے۔ یہ خوبصورت تعزیہ آج بھی رانی صاحبہ کے محرم، کے نام سے جانا جاتا ہے اور جلوس میں ممتاز جگہ رکھتا ہے۔

ہندو مسلم ایکتا کا ایک خوبصورت منظر اس وقت مشاہدے میں آتا تھا جب چوب داروں کے محلے کا ایک تعزیہ، اور دوسرا محلّہ ناٹک والا تعزیہ جسے برہمن بناتے تھے، دونوں مقررہ وقت پر ڈھول تاشوں کے ساتھ مختلف سمتوں سے لاکر ایک جگہ قریب قریب رکھ دیئے جاتے۔ ہندو مسلمان اس موقعے پر بڑی محبت اور لگاؤ کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

ایک اور رواج یہ بھی تھا کہ جب تعزیے شو مندر کے پاس پہنچتے، جو ایک مینار مسجد کے قریب ہے، تو تعزیوں کو تھوڑا نیچے کر دیا جاتا تھا اور ایک بار پھر تمام فرقوں کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے اور جلوس جب دوبارہ چلنا شروع ہوتا تو عورتیں اپنے بچوں کو تعزیے کے نیچے سے گزارتیں۔

جودھ پور کا مہاراجا اپنے بھائیوں اور دوسرے درباریوں کے ساتھ تیجا ماجی کے مندر (جس کے معنی ہیں تیسری ڈوگرانی کا بنوایا ہوا مندر) کے چھجے پر بیٹھ کر جلوس کو دیکھتا تھا۔ مہارانیاں سردار بازار کے صدر دروازے پر بیٹھا کرتی تھیں۔ مہاراجہ کی طرف سے سب لوگوں میں کھیر اور مٹھائی تقسیم ہوتی تھی۔

کچھ شر پسندوں کے پیدا کردہ حالات کی وجہ سے ۱۹۶۸ء سے یہ تعزیے جلوس کی شکل میں نہیں نکالے جاتے صرف اپنے اپنے محلّوں میں رکھ دیے جاتے ہیں، جہاں تمام فرقوں کے لوگ، خصوصاً عورتیں وہاں جاکر سلام کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے پیار محبت سے ملتی ہیں۔ سب لوگوں کو مٹھائی اور شربت تقسیم کیا جاتا ہے۔

شیخاواٹی راجستھان کا ایک اور ایسا علاقہ ہے جہاں گنگا جمنی کلچر کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہندو اور مسلمان اب بھی امن و چین سے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ آمیر اور جے پور کے حکمراں خاندان کے ایک بیٹے موکال کے یہاں اولادِ نرینہ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن وہ صوفی شیخ برہان سے ملا اور ان سے دعا کرنے کو کہا۔ ان کی دعا سے اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ان صوفی صاحب کی نسبت سے شیخا رکھا گیا۔ وہ شیخاوت خاندان کی حکومت کا بانی ہوا اور اس کے جانشینوں نے جو علاقہ فتح کیا اسے شیخاوت کہا جاتا ہے۔ ایک دن شیخا کو پٹھانوں کی ایک ٹولی ملی جو اپنے خاندانوں کے ساتھ معاش اور رہائش کے لیے جگہ کی تلاش میں اس کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ کسی حکمتِ عملی کے تحت اس نے اُن سے دوستی کرلی اور انہیں وہاں قیام کے لیے زمین دے دی۔ پٹھانوں اور شیخا کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت یہ طے ہوا کہ پٹھان گائے کا گوشت نہیں کھائیں گے اور مور کو نہیں ماریں گے اور شیخاوت سور کا گوشت نہیں کھائیں گے اور صرف حلال گوشت کھائیں گے۔ بعض لوگ آج بھی اس پر عمل کرتے ہیں۔ شیخا لوگوں کے جھنڈے پر اب بھی ہندو مسلم ایکتا کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا جھنڈا پیلے رنگ کا ہوتا ہے جس کے کنارے سرخ ہوتے ہیں اور بیچ میں ہنومان کی شکل ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ایک لمبی پٹی نیلے رنگ کی بھی ہوتی ہے جس سے دونوں فرقوں کی ایکتا کا اظہار ہوتا ہے۔

شیخاوت کے سرداروں نے شہنشاہ اکبر کی ملازمت اختیار کی اور یہیں سے انہوں نے فارسی سیکھی جو دربار کی زبان تھی، انہوں نے مغل دربار کے آداب اور طور طریقے بھی اپنائے۔ شیخاوت کے تمام سرداروں کی جاگیروں میں ایک مسجد، ایک کربلا اور قبرستان کے لیے زمین متعین کی جاتی ہے۔ دونوں

فرقے اپنے تہوار جیسے ہولی، دیوالی، گنگور، عید اور محرم مل کر مناتے ہیں۔ محرم کے مہینے میں گانا اور رقص سختی سے ممنوع ہے۔ محرم کے آخری دن تعزیوں کا جلوس قلعے کے سامنے لایا جاتا تھا اور میدان میں ٹھہرتا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ ڈھول تاشے سننے، اور تلوار بازی کا مظاہرہ دیکھنے جمع ہوتے تھے۔ روایت تھی کہ ہر خاندان کا ایک فرد اس موقع پر ضرور شریک ہوتا تھا۔ میں نے سات یا آٹھ سال کی عمر میں اپنے والد کی طرف سے اس میں نمائندگی کا شرف حاصل کیا ہے۔ جب ڈھول اور تاشے کا مظاہرہ ختم ہوجاتا تھا تو تعزیہ اٹھایا جاتا تھا اور جلوس شروع ہوتا تھا۔ اسی وقت عورتیں اپنے بچے لے کر دوڑتی تھیں اور انہیں تعزیے کے نیچے سے گزارتی تھیں۔ تمام فرقوں کا یہ ملا جلا جلوس کربلا پہنچتا تھا جہاں تعزیے دفن کیے جاتے تھے۔ کچھ برس پہلے ایک بنیاد پرست پارٹی کے کچھ لوگوں نے جلوس کے راستے میں رامائن رکھ دی۔ کچھ سمجھدار مسلمان اور ہندو رہنماؤں کی مداخلت سے تعزیے کے راستے کو بدل کر بدتر نتائج نہ پیدا ہونے دیئے گئے۔ تعزیے سیدھے کربلا پہنچادیے گئے لیکن ہندوؤں نے راستے میں مٹھائی اور شربت تقسیم کیا اور عورتوں نے پہلے کی طرح اپنے بچوں کو تعزیوں کے نیچے سے گزارا اور یہ عمل آج بھی اسی طرح باقی ہے۔

راجستھان کی لگ بھگ تمام ریاستیں، بیکانیر، کوٹا، الور، بھرت پور، محرم کی روایت برقرار رکھے ہوئے تھیں اور کچھ ریاستیں تو خود بھی اپنا ایک تعزیہ جلوس میں شامل کرتی تھیں۔

آج ہم ایک خطرناک دور میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں ہمارے کلچر پر داخلی اور خارجی دونوں قسم کے حملے ہورہے ہیں۔ اس مادی قسم کے معاشرے میں ہر چیز کو ایک ایسی پیداوار کا روپ دیا جارہا ہے کہ اُسے آسانی سے بازار میں بیچا جاسکے۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہبی تیوہاروں اور رسوم کے تقدس اور اقدار کی اہمیت کو سوچے سمجھے بغیر سیاحت (ٹورزم) کی دوڑ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کر رہی ہے کہ وہ سیاحت کے بیوپاری بازار میں آسانی سے بک سکے۔ اس وقت سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہمارے سماج کا ہر حصہ اس رجحان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوجائے اور ہمارے تہذیبی ورثے کو تباہ ہونے سے بچالے۔

جموں و کشمیر میں محرم کی عزاداری کی روایت

پروفیسر جگر محمد☆

عام طور پر مانا جاتا ہے کہ چودھویں صدی کے آخری حصے میں تیمور لنگ نے عزادری کی روایت کی ابتدا کی۔ مگر امام حسین کی شہادت کی یاد ہندوستان میں تیرھویں صدی سے ہی منائی جاتی رہی ہے۔ منہاج سراج اور امیر خسرو دونو ں نے محرم کے پہلے دس دنوں میں رنج و غم منانے کا ذکر کیا ہے۔ خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں ''المیۂ کربلا کو ہندوستان میں ماہِ محرم کے پہلے دس دنوں میں وعظ کے جلسے منعقد کر کے منایا جاتا تھا''۔ ایک کتاب 'مقتلِ حسین' جس میں اس المیہ کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے اس کی بہت مانگ تھی۔[1] ابنِ بطوطہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ محرم کی دسویں تاریخ کو غریبوں میں بہت خیرات بانٹتا تھا۔ تعزیے (شہیدانِ کربلا کے مزاروں کی چھوٹی شبیہیں) ان شہیدوں کی یاد کی علامت کے طور پر بنانے شروع کیے گئے۔ تعزیوں کی روایت امام حسین کی اس قربانی کی یاد کو برقرار رکھنے میں بہت مؤثر ثابت ہوئی، جو انھوں نے اسلامی دنیا میں بادشاہت کے قیام کے خلاف اور اسلامی روایت کو ازسرِ نو مستحکم کرنے کی جدوجہد میں پیش کی تھی۔ تعزیے ماہ محرم میں شہیدانِ کربلا کی یاد کو تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اجتماع اور ملنے ملانے کا بھی ایک اہم ذریعہ بن گئے اور رفتہ رفتہ یہ ایک تیوہار اور تقریب کی سی حیثیت اختیار کر گئے۔ مغل دور کے مآخذ میں محرم کی رسموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مونسٹراٹ نے سولھویں صدی میں محرم منائے جانے کو دیکھا تھا اور بیان کیا تھا'' محرم کے مہینے میں لوگ خاصے جذباتی نظر آتے تھے۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر دو گروہ اپنے تابوت (تعزیے) لے جا رہے ہوں، اور ان میں سے ایک دوسرے کو جگہ نہ دے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ جنگ میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں''۔[2]

جہاں تک موجودہ ریاست جموں و کشمیر کا سوال ہے تو یہاں عام مذہب اسلام ہے اور مسلمان

☆ شعبۂ تاریخ، جموں یونیورسٹی، جموں

۱۔ خلیق احمد نظامی: سم آسپیکٹس آف ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان انڈیا ڈیورنگ دی تھرٹینتھ سنچری، دہلی ۱۹۷۴، ص ۲۹۸ 'مقاتلِ حسین' کا پی امیر خسرو کے پاس موجود تھی: ایضاً ص ۲۹۸ ۲۔ محمد یاسین، اے سوشل ہسٹری آف اسلامیک انڈیا، دہلی ۱۹۸۸، ص ۶۰۔ محمد یاسین کی رائے ہے کہ محرم کے کچھ رسوم، جیسے تعزیہ دفنانا اور مصنوعی جانوروں پر حملہ ہندوؤں کی رام لیلا سے متاثر ہیں، ص ۶۱

بحیثیت آبادی اکثریت میں ہیں۔ موجودہ ریاست جموں وکشمیر تین کلچرل حصوں پر مشتمل ہے۔ جموں، کشمیر اور لداخ۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف تک یہ الگ الگ خودمختار اکائیاں تھیں۔ مگر تینوں علاقے جو چھوٹے چھوٹے متعدد رجواڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے تیرھویں صدی یہاں سے قیام کرنا شروع کیا۔ کشمیر اور لداخ کے علاقوں میں مسلمان اپنی تعداد کے اعتبار سے ایک با اثر حیثیت کے حامل ہیں۔ حالانکہ کشمیر میں مسلمانوں کی آمد تیرھویں صدی سے شروع ہوئی مگر یہاں عزاداری اور تعزیہ داری کی ابتداء پندرھویں صدی کے اواخر یا سولھویں صدی کے ابتدائی حصے میں شروع ہونے کا امکان ہے۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ نوربخشی سلسلے کے ایک صوفی شمس الدین عراقی عراق سے تشریف لائے اور انھوں نے شیعہ فرقے کو کشمیر میں متعارف کیا، حالانکہ مرزا حیدر دغلات نے نوربخشی سلسلے کی وہ روایات و رسوم اور عقاید قائم کیے جو شیعہ یا سنی کسی بھی فرقے کے عقائد اور رسوم سے مختلف تھے۔[۱] ویسے نوربخشی سلسلے کے لوگ شیعہ عقائد کے ماننے والے تھے اور اب بھی ہیں۔ یہ حقیقت عام طور پر مانی جاتی ہے کہ نوربخشی محرم کا سوگ مناتے تھے اور کچھ لوگ امام حسینؑ کی شہادت کے غم کی علامت کے طور پر کالا لباس بھی پہنتے تھے۔[۲] یہ بھی عام طور پر مانا جاتا ہے کہ شمس الدین عراقی کے اثر سے کئی ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ نتیجتاً ان کا نام بارہ اماموں میں شامل کیا جانے لگا۔[۳] شمس الدین عراقی مشہد میں مدفون امام رضا کے بہت معتقد تھے۔ جب شمس الدین عراقی نے ۱۵۰۱ میں کشمیر کے لیے اپنا دوسرا سفر شروع کیا تو یہ پہلے امام رضا کے روضے کی زیارت کو گئے۔[۴] ان کا انتقال سری نگر میں ۱۵۲۶ء میں ہوا اور انھیں ''زادی بل'' میں دفن کیا گیا۔ کشمیر کے شیعہ مسلمان ان کے مزار کا بہت احترام کرتے ہیں۔[۵] اس کے علاوہ ان کے زیرِ اثر چاک قبیلے کے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور خود کو شیعہ ہی کہا۔[۶] پھر جب ۱۵۶۱ میں غازی چاک نے کشمیر میں اپنے خاندان کی حکومت قایم کی تو نوربخشیوں اور شیعوں کی حیثیت میں کافی عروج دیکھنے میں آیا۔ ابوالفضل نے بھی 'امامیوں' اور نوربخشیوں کے ایک اہم سماجی طبقہ ہونے اور ان کے کشمیر میں

۱- مرزا حیدر دغلات۔ تاریخ رشیدی، انگریزی ترجمہ از: ای۔ ڈینیس روس، کمنٹری کے ساتھ، ایڈٹ شدہ نوٹس اور نقشے از این الیاس دہلی، ص ۴۳۴ ۲-محب الحسن، کاشمیر انڈر دی سلطانس ۱۹۷۴، ص ۲۸۴، نوربخشی سلسلہ کربلا سے تعلق رکھنے والے سید محمد بن محمد بن عبداللہ نے قایم کیا۔؛ ایضاً، ص ۲۸۳ ۳- جی ایم ڈی صوفی: اسلامک کلچران کاشمیر، جموں ۱۹۹۹، ص ۴۶ ۴- محب الحسن: کاشمیر انڈر دی سلطانس، ص ۲۸۵ ۵- جی۔ایم۔ڈی۔صوفی، اسلامک کلچر، ص ۴۷ ۶- ایضاً، ص ۴۷

ایران اور ترکستان سے آنے کا ذکر کیا ہے۔[۱] زبانی روایات کے مطابق شمس الدین عراقی کے مزار کے علاقے میں پہلا امام باڑہ سترھویں صدی میں بنا تھا۔ ان تمام شہادتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عزاداری کی روایت یہاں شمس الدین عراقی کی تعلیمات کے اثر سے شروع ہوئی۔

بہرحال کشمیر میں محرم کی عزاداری کی روایت سولھویں صدی سے وہاں کے مذہبی رجحانات میں ایک اہم رجحان رہا ہے۔ کشمیر میں کاغذ اور لکڑی کے بڑے بڑے تعزیے بنتے ہیں۔ محرم کی اہم ترین روایات میں ایک اہم روایت تعزیوں کا جلوس ہے۔ حالانکہ یہ امام حسینؑ کی شہادت کے غم کی علامت کے طور پر نکالا جاتا ہے۔ لیکن عام لوگ اس موقعے کو ایک تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔[۲] تعزیے کے جلوس کو ذوالجناح بھی کہا جاتا ہے کیونکہ امام حسینؑ کے گھوڑے کا بھی تعزیے سے ایک رشتہ ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت کی اطلاع گھوڑے کے توسط سے ہی ہوئی تھی۔ اس طرح ایک گھوڑے کی شبیہہ، جسے ذوالجناح کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ امام حسینؑ کے کربلا کے روضے کا ایک مختصر سا ماڈل، جسے تعزیہ کہا جاتا ہے، کشمیر میں محرم کے جلوس کے جزوِ لازم ہوگئے۔ تعزیے کا جلوس صرف شیعہ ہی نکالتے ہیں سنی مسلمان اس میں شریک نہیں ہوتے۔ سنی حضرات جلوس کے اوقات میں عام طور پر اپنے گھروں میں ہی رہتے ہیں۔

محرم کے پہلے دس دنوں میں کشمیر کے شیعہ ماتم بھی کرتے ہیں۔ اس ماتم میں سینہ کوبی، چھریوں سے خود کو زخمی کرنا، اور آگ پر چلنا شامل ہیں۔ ماتم امام حسینؑ سے عقیدت و محبت کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے اور اُن کی شہادت کی برسی (یومِ عاشورہ) پر خود کو ان کے ساتھیوں میں شمار کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ سوگوار لوگ مرثیے یا نوحے بھی پڑھتے ہیں۔ سوگ کے دنوں میں شیعہ مسلمان بہت سادہ کھانا کھاتے ہیں اور غریبوں میں خیرات تقسیم کرتے ہیں۔

کشمیر میں محرم کی تعزیہ داری وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا عمل اور تہوار ہے۔ کشمیر کے لگ بھگ تمام ضلعوں، سری نگر، بڈگاؤں، بارہ ملاّ، اننت ناگ، پلواما، وغیرہ میں شیعہ مسلمان محرم مناتے ہیں۔ کشمیر کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں امام باڑے موجود ہیں۔ سری نگر میں قدیم ترین امام باڑہ زین واڑی حسن آباد کے زادی بل محلے میں واقع ہے۔ سرینگر شہر کے مادین صاحب میں بھی بڑے بڑے

۱- ابوالفضل: آئینِ اکبری جلد II انگریزی ترجمہ از کرنل ایچ۔ ایس۔ جیرٹ، تصحیح اور مزید تشریحات از: سر جے۔ این۔ سرکار۔ دہلی ۱۹۹۴، ص ۳۵۴

۲- سومناتھ دھر، جموں اینڈ کاشمیر، دہلی ۱۹۹۹، ص ۲۶۴۔

امام باڑے بنائے گئے ہیں۔ بارہ مولا ضلع میں سوناواڑی، احمد پور، اندرلوک پتیم پورہ میں بڑے بڑے امام باڑے ہیں۔ پلواما میں گونگو کا امام باڑہ بہت مشہور ہے۔ ضلع اننت ناگ میں چھترگل کا امام باڑہ بہت بڑا ہے۔ بڈگام ضلع میں بھی ایک بہت بڑا امام باڑہ موجود ہے۔

محرم کی عزاداری کی روایت کو جاری رکھنے کے انتظام کے لیے بہت سی شیعہ سنی تنظیمیں ہیں۔ فرقۂ قدیم، اتحاد المسلمین، انجمن شرع شیعہ وغیرہ محرم کے سلسلے کے بہت سے کام انجام دیتی ہیں یہ بہت متحرک اور فعال تنظیمیں ہیں۔ یہ تنظیمیں عام لوگوں کے لیے فلاحی کام بھی کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں کچھ تعلیمی ادارے جیسے جامعہ امام رضا، تنظیم المکاتب اور ایجوکیشنل ٹرسٹ آف کشمیر بھی چلاتی ہیں۔ یہ تنظیمیں اسپتال اور بلڈ بینک کا بھی انتظام کرتی ہیں۔

لداخ کے خطے میں کشمیر کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں محرم زیادہ وسیع پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ لداخ کے خطے میں تین ذیلی تہذیبی اکائیاں ہیں۔ کارگل، پورگ اور بالتستان ۱۹۴۷ میں تقسیم ملک کے بعد بالتستان پاکستان کا حصہ ہوگیا۔ تقسیم ملک سے پہلے ان تینوں علاقوں کی عزاداری محرم کا چرچا تھا۔ زبانی روایات کے مطابق امیر کبیر میر سید علی ہمدانی نے ان تینوں علاقوں میں اسلام کو متعارف کیا اور اُسے عوام میں پھیلایا۔[۱] محرم کے دنوں میں سوگ منانے کی روایت کی بنیاد شمس الدین عراقی نے ہی رکھی۔ لداخ کے مسلم فرقے میں شیعہ اکثریت میں ہیں۔ وارستان، اسکارڈو اور بالتستان میں آبادی کے تناسب کے اعتبار سے شیعہ غالب اکثریت میں ہیں۔ نوربخش اور اسماعیلیہ، شیعوں کے دو ذیلی مسلک بھی یہاں موجود ہیں۔[۲]

ایسا لگتا ہے کہ محرم کی عزاداری کی روایت لداخ کے خطے میں سب سے پرانی ہے۔ زبانی روایت کے مطابق محرم کی عزاداری کی رسوم پندرھویں صدی سے ہی یہاں شروع ہوئیں۔ یہاں کے سب سے قدیم امام باڑے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ پندرھویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہی بن گیا تھا۔ ذوالجناح کا جلوس یہاں کی عزاداری کا سب سے اہم جزو ہے۔ نو محرم کو ضلع لیہہ سے کچھ لوگ شبیہہ ذوالجناح بنانے کے لیے گھوڑا لینے چوشوٹ گاؤں جاتے ہیں۔[۳] اس گھوڑے کو ایک وقف پالتا ہے

۱- مولوی حشمت اللہ خاں لکھنوی، مختصر تاریخ جموں و کشمیر، جموں ۱۹۹۴، ص ۶۶۴

۲- ایم این پنڈت: موسکس اینڈ امام باڑہ، کلچر ہیریٹیج آف لداخ، پی این چوپڑا (ایڈ) میں حوالہ ۱۹۷۸، ص ۷۵

۳- ڈیوڈ بیناٹ: مسلم بدھسٹ ریلیشنس ان ریچول کنفلکٹ، مارٹن بیک کی کلچر، ہسٹری اینڈ ڈیولپمنٹ بٹوین ہمالیہ اینڈ کراکورم، میں حوالہ، ص ۲۹۶-۹۷

جس کا نام انجمن امامیہ ہے اور یہی عاشورہ کے جلوس کی منتظمِ اعلیٰ ہے۔ ذوالجناح کے جلوس کی قیادت ایک شخص 'مجاور' کرتا ہے۔ اس جلوس میں شیعہ لوگ ماتم بھی کرتے ہیں۔ ماتم دو طرح کا ہوتا ہے۔ 'ہاتھ کا ماتم'، اور 'زنجیر زنی'۔ ہاتھ کا ماتم، بہت عام ہے جس میں کھلے ہاتھ سے سینہ زنی کی جاتی ہے، جبکہ زنجیر زنی، صرف کچھ لوگ ہی کرتے ہیں اور اس میں لمبی لمبی زنجیروں میں لگی دھاردار چھریوں سے پیٹھ پر یا ماتھے پر ماتم کیا جاتا ہے۔ ہاتھ کا ماتم بھی مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے اور یہ طریقے خاص خاص ناموں سے موسوم ہیں۔ مثال کے طور پر بالستانی اسلوب، دستۂ انصارِ حسینی اور خمینی دستہ، لیہہ ضلع کے مختلف گاؤوں میں ان طریقوں سے ماتم کیا جاتا ہے۔[۱]

ذوالجناح یا عاشورہ کے جلوس میں صرف مرد چلتے ہیں اور عورتیں دور سے ہی ان کی زیارت کرتی ہیں۔ مائیں ذوالجناح سے برکت حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کو لے کر آتی ہیں۔ یہ ذوالجناح کے خادموں کو پیسے دیتی ہیں اور ذوالجناح کے سامنے اپنے بچوں کی صحت وسلامتی کی دعا مانگتی ہیں۔ حالانکہ ذوالجناح کی رسوم صرف شیعہ ہی ادا کرتے ہیں، سنی لوگ بھی جلوس میں حصہ لیتے ہیں اور اسے دیکھتے ہیں۔ 'انجمن معینِ اسلام'، کے ممبر جلوس میں شامل ہوتے ہیں مگر اُن کے طریقۂ کار کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ سنی نہ ماتم کرتے ہیں، نہ مرثیہ پڑھتے ہیں لیکن یہ لوگ الله اکبر اور لا اِلٰہَ الا الله کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ لوگ جلوس میں شریک عزاداروں پر عرقِ گلاب چھڑکتے ہیں اور زخمیوں کو پہلی طبی امداد فراہم کرتے ہیں۔ یہ لوگ سبیلیں بھی لگاتے ہیں اور جلوس میں شریک لوگوں کے لیے چائے اور پھلوں کا رس تقسیم کرنے کے لیے اسٹینڈ لگاتے ہیں۔ بدھ مت کے لوگ بھی جلوس دیکھنے آتے ہیں۔[۲]

لداخ کے علاقے میں بہت سے امام باڑے ہیں۔ 'چوشوٹ یوگما' گاؤں کا امام باڑہ سب سے پرانا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ ۱۴۳۰ یا ۱۴۷۰ کے درمیان بالتی کے مہاجرین نے بنایا تھا۔ قریب ہی لیہہ شہر کے دس امام باڑے ہیں کارگل ضلع میں کم وبیش ہر گاؤں میں ایک امام باڑہ موجود ہے۔ چونکہ کارگل میں زیادہ آبادی شیعوں کی ہے اس لیے یہاں کے لوگوں کے اہم ترین مذہبی کاموں میں امام باڑہ بنوانا بھی شامل ہے۔ کارگل ضلع میں کشکو اور اسکامبو کے امام باڑے بہت مشہور اور قدیم ہیں۔ سورو وادی اور دراس میں بھی جگہ جگہ امام باڑے موجود ہیں۔ سب سے بڑا امام باڑہ کارگل میں ہی

۱- ڈیوڈ پیناٹ: مسلم بدھسٹ ریلیشنس ان ریجول کنفلکٹ، مارٹن بیک کی کلچر، ہسٹری اینڈ ڈیولپمنٹ بنوین ہمالیہ اینڈ کراکورم، میں حوالہ، ص ۳۰۰-۲۹۷ ۲- ایضاً، ص ۳۰۱-۳۰۰-۲۹۷

ہے اور یہ سب سے پرانا مانا جاتا ہے۔[1] محرم کی عزاداری کا کارگل میں بہت چرچا ہے اور یہ شیعہ فرقے کے تمام طبقوں کی سماجی زندگی میں بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ کارگل کے ادب کا بڑا حصہ مذہبی شاعری، قصیدوں اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔[2]

جموں خطے میں محرم کی عزاداری کا سلسلہ کشمیر اور لداخ کے بعد شروع ہوا۔ زبانی روایات کے مطابق محرم کا جلوس انیسویں صدی میں شروع ہوا۔ مہاراجا پرتاپ سنگھ (۱۸۸۵ تا ۱۹۲۵) کے زمانے میں شیعوں نے انجمن امامیہ، کے نام کی ایک کمیٹی تشکیل دی جسے محرم کے جلوس کے تمام امور انجام دینے تھے۔ اس کمیٹی کے بانی ممبران میں سید فتح حسین کاظمی، سید نورشاہ، لفٹننٹ کرنل او۔بی۔آئی۔ بہادر اور کرنل ظہور حسن شامل تھے۔

جموں کے علاقے میں شیعہ لوگ محرم کے دنوں میں سیاہ اور سفید لباس پہنتے ہیں، سادہ کھانا کھاتے ہیں اور ہر طرح کی تفریحات سے باز رہتے ہیں۔ وہ محرم میں شادی بیاہ اور گھریلو قسم کی دوسری تقریبات منعقد نہیں کرتے۔ چالیس روز تک مجلسِ حسین کرتے ہیں۔ تمام مجلسیں رات کو ہوتی ہیں۔ مردانی اور زنانی مجلسیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ عورتیں امام حسینؑ کی یاد میں نوحے پڑھتی ہیں۔ یہ پردہ کرتی ہیں۔ سات تاریخ کو تعزیے کے ساتھ ایک جلوس نکلتا ہے، جسے مقامی طور پر 'ڈولی' کہتے ہیں اور تعزیے کے جلوس کو 'پالکی' کہتے ہیں۔ یہ شام کو شروع ہوتا ہے اور دیر رات گئے ختم ہوتا ہے۔ اسے 'مہندی کا جلوس' کہا جاتا ہے۔ یہ شہر کے مختلف علاقوں سے گزرتا ہے۔ اس کا پرانا راستہ استاد محلّہ سے کربلا میدان تک تھا۔ آج کل یہ جانی پور استاد محلّہ اور پیر میٹھا سے گزرتا ہے۔ دس محرم کو ذوالجناح کا جلوس برآمد ہوتا ہے۔ اس جلوس میں شیعہ دونوں طرح کا ماتم کرتے ہیں۔ ہاتھ کا ماتم اور زنجیر زنی۔ جلوس صوفی شاہ امام باڑے سے شروع ہوکر کربلا پر ختم ہوتا ہے۔ جب جلوس کربلا پہنچ جاتا ہے تو شیعہ آگ پر ماتم کرتے ہیں، یعنی آگ پر چلتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جموں کے مہاراجا پرتاپ سنگھ سے لے کر بعد تک، جلوس کے دوران تحفظ اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ ماتم اور مجلس کے علاوہ ہندو اور سنی دونوں محرم کی مختلف رسموں میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ راستے میں پانی، پھلوں کا رس اور طبی امداد بھی فراہم کرتے ہیں۔

۱۔ موسکس اینڈ امام باڑاز، ص ۷۶ ۲۔ کاچو اسفندریار خان: کلچرل ہیریٹیج آف کارگل، از ایف ایم حسین کی ہیریٹیج آف کاشمیر، سری نگر ۱۹۹۱ میں حوالہ ص ۵۷۔

جموں کا سب سے پرانا امام باڑہ صوفی شاہ پیر میٹھا پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں کئی امام باڑے ہیں۔ جیسے ٹینو پلاٹ اور 'بھٹنڈی' کے امام باڑے چونکہ جموں علاقے میں سنی اور شیعہ اوقاف کی ایک ہی تنظیم ہے اس لیے تمام امام باڑوں کا انتظام اور دیکھ بھال وقف بورڈ ہی کرتا ہے۔ امام باڑوں کے سلسلے کی پالیسی کے معاملات انجمن امامیہ طے کرتی ہے۔

جموں اور کشمیر میں عزاداری اس علاقے کی ایک کلچرل تقریب سی ہوگئی ہے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۰ کے دوران کچھ مدت کو چھوڑ کر یہ کام امن وسکون سے متواتر چل رہا ہے۔ یہ اختلافات میں ایکتا پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے اور مختلف عقائد وطرز فکر کو قدر و احترام دینے کا ایک عمل بھی ہے۔ سنی اور ہندو حضرات کا اس موقع پر خیرات تقسیم کرنا، آپس میں مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کے کاموں میں شریک ہونے کی بہترین مثال ہے۔

میواڑ میں عزاداری کی روایت

ڈاکٹر گریش ناتھ ماتھر☆

میواڑ میں ملک کے دوسرے تیوہاروں کی طرح محرم کا تیوہار (غمناک یاد) بھی مسلمان اور بوہرہ قومیں روایتی انداز میں مناتی ہیں۔ یہ ہر سال ماہِ محرم کی دو تاریخ سے دس تاریخ تک، پیغمبرِاسلام حضرت محمدؐ صاحب کے نواسے حضرت امام حسینؑ (۶۲۵ تا ۶۸۰ عیسوی) اور ان کے خاندان کے تین دن تک اپنے ایمان کے لیے بھوکے پیاسے رہ کر شہید ہوجانے کی یاد میں، غم اور ماتم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ماتمی تیوہار کی شروعات تیمور لنگ کے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملے کے دوران ہوئی۔ تیمور لنگ حضرت امام حسینؑ کا عقیدت مند تھا۔ وہ ہر سال محرم کے مہینے میں کربلا جاکر حضرت امام حسینؑ کی درگاہ کی زیارت کرکے غم منایا کرتا تھا۔ ایک بار تیمور اپنی بیماری کی وجہ سے کربلا نہیں جاسکا۔ اس وقت اس کے ایک بزرگ درباری نے صلاح دی کہ اگر وہ امام حسینؑ کی درگاہ کی شبیہہ بنواکر اس کی زیارت کرے تو اسے کربلا کے سفر جیسا ہی ثواب حاصل ہوگا۔ تیمور کو اس کا مشورہ پسند آیا۔ اس نے کاریگروں سے درگاہ کی ایک شبیہہ تیار کروائی جسے تعزیے کا نام دیا گیا۔ اس وقت سے ہندوستان میں (موجودہ ہندوستان، بنگلا دیش اور پاکستان ہیں) محرم کے موقع پر تعزیے نکال کر حضرت امام حسینؑ کی یاد کو تازہ کیا جاتا ہے۔

محرم کے دوران مسلم (سنّی) محلوں میں رات کو مجلس ہوتی ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؑ، ان کے خاندان اور قبیلے والوں کی شہادت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مرثیے اور قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ مذہبی رہنما، مولوی حضرات، امام حسینؑ کے علاوہ ان کے متعلقین کی زندگی اور ان کی تعلیم کے بارے میں تقریریں کرتے ہیں جن میں اخلاقی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

شیعہ مسلمان اور بوہرہ قوم کے لوگ مجلس کے دوران رو کر اور سینہ کوبی کرکے سوگ مناتے ہیں۔

☆ اودے پور

عصر کی نماز کے بعد برائے ثواب فقیروں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جگہ جگہ پر سبیلیں لگائی جاتی ہیں جن میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی یاد میں ٹھنڈا پانی، شربت اور دودھ وغیرہ پلایا جاتا ہے۔

میواڑ کی بوہرہ قوم میں محرم منانے کی الگ روایت ہے۔ یہ لوگ ان دنوں میں کالے لباس پہنتے ہیں۔ اگر کسی کو منت مانی ہو تو بچے کو امام حسینؑ کا فقیر بنا کر گھروں سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔ بوہرہ قوم محرم کی پہلی تاریخ کو، جو اسلامی نئے سال کا پہلا دن ہوتا ہے، ہنسی خوشی کے ساتھ مناتی ہے۔ اس کے بعد دسویں تاریخ تک سوگ منایا جاتا ہے ان دنوں میں اچھے لباس، زیورات، سیر سپاٹے، فلم، ٹی وی وغیرہ پر روک لگی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ہنسی مذاق بھی نہیں ہوتا۔ بوہرہ قوم میں بھی باقی مسلمانوں کی طرح مجلس ہوتی ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؑ، ان کے خاندان اور قبیلے والوں کی شہادت پر ماتم کیا جاتا ہے۔

بوہرہ قوم میں محرم کے ماتمی دنوں میں دو وعظ منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان میں آدم، نوحؑ، عیسیٰ، موسیٰ اور حضرت محمدؐ کے علاوہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا، نیز حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؓ، حضرت امام حسنؑ حضرت امام حسینؑ، اور ان کے بہتر رفیقوں کی شہادتیں پڑھ کر ماتم کیا جاتا ہے۔ بوہرہ قوم میں فاطمی روایت کے سیدناؤں پر بھی ماتم کیا جاتا ہے۔ خاص کر احمد آباد کے داعی سیدنا قطب الدین شہیدا ور گلیا کوٹ کے سیدنا فخرالدین شہید کا ماتم منایا جاتا ہے شام کو جماعت خانے میں کھانے کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔

بوہرہ قوم میں محرم کی چھٹی تاریخ کو حضرت محمدؐ، ساتویں تاریخ کو ان کی بیٹی حضرت فاطمہؓ، آٹھویں تاریخ کو حضرت علیؑ (فاطمہ کے شوہر) اور نویں تاریخ کو حضرت امام حسینؑ کی یاد میں وعظ ہوتا ہے۔

محرم کی دسویں تاریخ کو عاشورہ کہا جاتا ہے۔ عاشورہ کے دن شہیدوں کی بھوک پیاس کو یاد کر کے فاقہ رکھا جاتا ہے۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد 'خاک شِفا' (بھاجی) پالک، میتھی اور روٹی سے فاقہ توڑنے کے بعد حلیم (گیہوں) کا ملیدہ اور کہیں کہیں گوشت کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ دسویں تاریخ کو بوہرہ قوم میں رات کی مجلس نہیں ہوتی جبکہ باقی فرقوں میں اس دن بھی مجلس ہوتی ہے۔ دس تاریخ کو حضرت امام حسینؑ کی درگاہ کی شبیہہ کی شکل میں ملک کے دوسرے حصوں کی طرح میواڑ میں بھی

تعزیئے نکالے جاتے ہیں۔ پچھلی ریاست کے دارالحکومت اودے پور میں نکالے جانے والے تعزیے دوسرے شہروں کے مقابلے میں اپنی دستکاری اور صنعت کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔

ہجری سال کے شروع ہوتے ہی شہر کے مسلم علاقوں سواٹ واڑی، خیرادی واڑہ، خان جی پیر، مہاوت واڑی، کلے ساز، چوڑی گروں کا محلہ، چمن پورہ، جامع مسجد جیسی جگہوں پر کاریگر تعزیے بنانے کا کام شروع کردیتے ہیں۔ کہیں ایک دو آدمی تو کہیں پورا خاندان اس کام میں جٹ جاتے ہیں۔ میواڑ کے دوسرے قصبوں اور گاؤں میں بھی اسی وقت تعزیہ بنانے کا کام شروع ہوجاتا ہے لیکن وہاں کے تعزیے سادے ہوتے ہیں۔ تعزیہ بنانے کے طریقۂ کار کے بارے میں کاریگر بتلاتے ہیں کہ اس کے لیے سب سے پہلے بانس کی لکڑی کی چرائی کی جاتی ہے۔ پتلے پتلے ان بانسوں کو چھ کونیا، آٹھ کونیا، چتر بھج وغیرہ کی شکل میں ڈھالنے کے لیے پتلے تاروں سے کسا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر لال رنگ کرکے اخباری کاغز چپکایا جاتا ہے۔ گنبدوں پر اکثر لال یا ہرے رنگ کا کپڑا باندھا جاتا ہے۔ محراب، کنگھروں، جالیوں وغیرہ پر اخباری کاغذ چپکا کر اس پر مختلف ڈیزائنوں میں رنگ برنگے کاغذا ور پنّی چپکائی جاتی ہے عام طور پر تعزیوں میں مخملی کاغذ گنگا پاٹھا کے کاغذ اور پنّی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اودے پور شہر کا سب سے بڑا تعزیہ بڑی پلٹن کے تعزیے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ تعزیہ آٹھ کونیا بنایا جاتا ہے اس تعزیے کی تیاری کے لیے لوہے کا گھڑا بنایا جاتا ہے۔ پھر چھوٹا روضہ، گنبد، کلش، پھرکی لگاکر چھتری سے جوڑا جاتا ہے۔

ریاست کے دور میں بڑی پلٹن کا تعزیہ میواڑ کے مہارانا کی جانب سے بنایا جاتا تھا۔ اس وقت مہارانا میواڑ کی فوج کے ملازمین ہی تعزیے بناتے تھے۔ محرم کے روز مہارانا خود کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کہ پلٹن کا تعزیہ پچھولا جھیل میں ٹھنڈا کردیا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد تعزیے بنانے کا کام ۱۹۵۰ء میں مسلم فرقے کے ذریعہ بنائی گئی 'فیض حسین کمیٹی کی زیرِ نگرانی کیا جانے لگا۔ اس کمیٹی میں بیس سے تیس ممبر ہوتے ہیں۔ اس میں ہر محلے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر محلے میں بھی تعزیہ بنانے کے لیے اس کی اپنی الگ کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ تعزیہ بنانے کے کام میں پوری قوم کا تعاون رہتا ہے۔

تعزیہ بنانے والے کاریگر ہر سال اس میں نئے نئے ڈیزائن ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں پسندیدہ پھول پتیوں کے ساتھ ساتھ جھاڑ، فانوس، بیل بوٹے، قرآن کی آیتیں اور پنجتن پاک کے نام

نقش کیے جاتے ہیں۔ بڑی پلٹن کے تعزیے کے بعد دھولی باوڑی اور علی پورہ کے تعزیوں کا مقام ہے۔

بڑے سائز کے تعزیوں کی اونچائی ۳۲ سے ۳۴ فٹ ہوتی ہے۔ انھیں بنانے میں نو سے دس دن کا وقت لگتا ہے۔ ایک تعزیے کی لاگت آج کل بیس سے پچیس ہزار روپیہ آتی ہے۔ دوسرے تعزیوں کی اونچائی عام طور پر ۱۰ سے ۱۲ فیٹ ہوتی ہے۔ ان پر فی تعزیہ خرچ پانچ سے سات ہزار روپیہ بیٹھتا ہے۔ سب سے چھوٹے سائز والے تعزیے عام طور پر منت والوں کے ہوتے ہیں جنھیں مہندی کہا جاتا ہے۔

تعزیہ بنانے کے لیے شہر کا مسلم فرقہ کمیٹی کو ایک رقم دیتا ہے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو شہر میں چھڑی نکالنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اودے پور شہر میں الگ الگ محلوں کو ملا کر کل ۱۴ چھڑیاں ہوتی ہیں۔ انھیں 'نشان'' کہا جاتا ہے۔ بانس کے یہ نشان آٹھ فٹ تک لمبے ہوتے ہیں۔ ان کے آگے پنجہ یا علَم ہوتا ہے جسے روپہلے رنگ کی پالش سے سجایا جاتا ہے۔ ان نشانوں پر ہرار رنگ کیا جاتا ہے۔

بڑی پلٹن کی چھڑی لوہے کی بنی ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی پندرہ بیس فٹ ہوتی ہے۔ اس پر علَم لگا ہوتا ہے۔ یہ چھڑی شہر کی سبھی چھڑیوں سے بڑی ہوتی ہے۔ منت والی ان چھڑیوں کو چمن نورہ کی جامع مسجد میں رکھا جاتا ہے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو ان تمام چھڑیوں پر عقیدت مند ناریل نیبو وغیرہ کے سہرے باندھتے ہیں۔ نوجوان لوگ سبھی چھڑیوں کو چمن پورہ کی جامع مسجد سے علی پورہ، موچی واڑہ، شاستری سرکل، دھولی باوڑی، ناٹرہ کھاڑہ، سورج پجن، خیرادی واڑہ، جمے بائی کا تکیہ چوڑی گھر، کوٹھیوں کی گواری، میو فروش محلّہ، چلے کی مسجد، گھنٹا گھر ہوتی ہوئی ناوگھاٹ، پانڈوواڑی مسجد، چاند پول، ناگانگری، کلّے ساز، مہاوت واڑی، کارواڑی، سلاوٹ واڑی، ہاتھی پول، سوہن لوک سنیما سے ہوتی ہوئی شام سات بجے پھر چمن پورہ کی جامع مسجد میں رکھی جاتی ہے۔ قتل کی رات کو شہر بھر کے محلوں اور میواڑ کے سبھی قصبوں اور گاؤں میں تیار کیے گئے سبھی تعزیوں کو کسا جاتا ہے۔ بڑی پلٹن کے تعزیوں کو چیک سرکل کی پلٹن کی مسجد کے باہر کسا جاتا ہے۔ اس وقت وہاں عقیدت مند موجود رہتے ہیں۔ رات کو بارہ سے دو بجے تک بھڑبھونجا گھاٹی پر میوفروش کے تعزیوں کو سندھیوں کی چھڑی سے سلامی کرائی جاتی ہے۔ یہ سندھی مسلمان مہارانا اری سنگھ کی حکومت کے دوران مراٹھا حملہ آوروں کے خلاف میواڑ کی جانب سے لڑے تھے۔ اس طرح پوری رات جاگ کر بتائی جاتی ہے۔ اس دوران عقیدت مند تعزیوں پر ناریل، جلیبی، چھوارے، پھول وغیرہ چڑھا کر اپنی منتیں پوری کرتے

ہیں۔عقیدت مندوں کی طرف سے پانی اور شربت پلا کر امام حسینؑ کی پیاس کو یاد کیا جاتا ہے جو شہید ہونے سے پہلے تین دن بھوکے پیاسے رہے تھے۔

محرم کی دس تاریخ کو صبح ۹ بجے شہر کی سلاوٹ واڑی سے گھنٹا گھر اور گنگور گھاٹ تک تعزیوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ شام ۵ بجے تیج کے چوک سے بھڑ بھونجا گھاٹی، بڑا بازار، جگدیش چوک ہوتے ہوئے لال اور برہم پور پول تک تعزیوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ اس جلوس میں شہر کے ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ بڑی تعداد میں تعزیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔عقیدت مند کانچ کی بوتلوں میں پانی بھر کر تعزیوں کے اردگرد گھما کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ اس پانی کو پینے سے جسمانی اور نفسیاتی تکلیفیں دور ہوتی ہیں۔عقیدت مند تعزیوں کے پاس ناریل، جلیبی، طرح طرح کی مٹھائی، گیہوں کی بنی لیسی وغیرہ تبرک کے طور پر بانٹتے ہیں۔

تعزیوں کے جلوس میں پہلوان اور اکھاڑے اپنے کرتب دکھاتے چلتے ہیں۔ کچھ پہلوان تیر یا بھالے کو اپنے گالوں سے آر پار کر کے تو کچھ بڑی کیل کو زبان سے آر پار کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس دوران نقارے، عربی تال اور ڈھول وغیرہ بجائے جاتے ہیں۔ یا علیؑ، یا حسینؑ، یا حسنؑ، کہہ کر ماتم منایا جاتا ہے۔سنی مسلمان سینہ پیٹ کر یا زور زور سے ان شہیدوں کا نام لے کر ماتم منانا مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ پُرسکون رہ کر ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اور ان کے اصولوں پر چلنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔

شام کو سات بجے تک سبھی تعزیے پچھولا جھیل میں طے شدہ مقام پر ٹھنڈے کر دیے جاتے ہیں۔ ٹھنڈا کرنے سے قبل سونے چاندی کے چڑھاوے گلّے پر چڑھائے گئے پیسے، کلش، پھرکی اور چڑھاوے کی دیگر چیزیں اتار لی جاتی ہیں۔حضرت امام حسینؑ کی شہادت، ناانصافی اور ظلم کے سامنے نہ جھکنے اور آزادی کو مستحکم رکھنے کا پیغام دیتی ہے۔محرم اس کی اہمیت کی عکاسی کرتا ہے۔

انٹرویو: مولانا مرتضٰی صاحب، عمر ۳۵ سال

محترمہ (ڈاکٹر) ملکہ بوہرہ، ریسرچ اسکالر جناب ریاض حسین، عمر ۴۵ سال

پروفیسر بی موہن۔

آندھرا پردیش میں عزاداری کی روایت۔ ماضی اور حال

ڈاکٹر رحمت علی خاں ☆

دکن میں شیعیت کا فروغ بہمنی سلطنت، یعنی ۱۳۴۷ء سے شروع ہوا۔ اس دور میں ایرانی، اور عراقی بڑی تعداد میں گلبرگہ آئے اور یہاں بڑے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔[۱] تاریخی اعتبار سے پہلا عاشور خانہ محمد شاہ بہمنی دوم کے عہد میں، ۷۹۳ ہجری مطابق ۱۳۹۲ء سے پہلے،[۲] ساگر میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بیدر میں احمد شاہ بہمنی کے مقبرے پر بھی حضرت علیؑ اور شیعہ درود تحریر ہے۔[۳] اسی کے دور میں بیدر میں شخصی سطح پر عزاداری شروع ہوئی ہوگی ۔[۴] بیدر میں تختِ کرمانی میں محرم کی عزاداری پندرھویں صدی عیسوی میں ہوا کرتی تھی۔[۵] اس وقت زیادہ تر غیر ملکی لوگ شیعہ تھے۔[۶] اسی دور میں ایک نئی زبان، دکنی اردو، کو بھی فروغ شروع ہوا اور اس زبان کے شعرا صرف حضرت حسینؑ اور معرکۂ کربلا پر مرثیے لکھا کرتے تھے۔ اسی دور، یعنی پندرھویں صدی کے آخری حصے میں اشرف کی مثنوی 'نوسرہار' پہلی مثنوی لکھی گئی۔[۷]

بیجاپور کا یوسف عادل خان وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے ۱۵۰۳ء میں ہی شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان کردیا تھا اس طرح پورے ہندوستان میں بیجاپور پہلی شیعہ حکومت بن کر ابھری۔[۸] اسماعیل عادل خاں بھی شیعہ رہا جس کے صلے میں ایران کے شاہ اسماعیل صفوی نے اُسے پوری طرح نوازا۔ اس کے بعد علی عادل شاہ اول کٹر شیعہ بادشاہ ہوا ور اس نے دکن میں شیعیت کی

☆ سابق کیپر مخطوطات سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

۱- 'عہد بہمنی میں فارسی ادب' ایم۔اے۔ میمن، ٹائپ شدہ تھیسس، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، حیدرآباد، دکن کے بہمنی سلطان، ہاشم خاں شیروانی، دہلی ۔ ۱۹۷۸، ص ۹۴ وغیرہ ۲- دکن کے بہمنی سلطان، ہاشم خاں شیروانی، دہلی ۱۹۷۸، ص ۱۱۳

۳- ایضاً، ص ۱۴۹ ۴- ملاحظہ ہو حوالہ (۱) ص ۱۵۱ ۔ ۱۷۸

۵- ایضاً، ص ۱۷۶ ۔ دکنی کلچر ہارون خاں شیروانی، دہلی ۱۹۷۱، ص ۳۲ دکن میں مرثیہ اور عزاداری: ڈاکٹر راشد موسوی، دہلی ۱۹۸۹، ص ۴۸

۶- دکن میں مرثیہ اور عزاداری، راشد موسوی، دہلی ۱۹۸۹، ص ۱۷ اور دوسرے مصنفین جیسے محمد علی اثر اور طیب انصاری وغیرہ وغیرہ کی تحریریں۔

۷- 'پروگریس آف پرشین لٹریچر ڈیورنگ خانان، عادل شاہی ڈائنسٹی آف بیجا پور، رحمت علی خاں کا ٹائپ شدہ تھیسس، دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی۔ دکن کے بہمنی سلاطین، ہارون خاں شیروانی، ص ۲۹۶ اور ۲۹۹

۸- تاریخ فرشتہ..... واقعات مملکتِ بیجاپور، بشیرالدین احمد، دکن کے بہمنی سلطان، ص ۳۰۰-۲۹۹

کافی تبلیغ کی۔[۱] حالانکہ یہاں کوئی عاشورخانہ نہیں ہے لیکن محرم کی رسوم اطہر محل میں انجام دی جاتی رہی ہوں گی۔ برہان الدین جانم نے گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دکنی مرثیہ نظم کیا۔[۲] علی عادل شاہ دوم کے زمانہ میں عزاداری نے مستحکم شکل اختیار کرلی۔ اب روزانہ مجلسیں برپا ہوتیں اور ان میں مرثیے پڑھے جاتے۔ مرزا وہ پہلا دکنی شاعر ہے جس نے ایسا مکمل مرثیہ نظم کیا جس میں معرکۂ کربلا کی تمام تفصیلات، گھوڑے اور تلوار کی تعریف وغیرہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔[۳]

میری اپنی رائے یہ ہے کہ محرم کی رسوم میں ہندوستانی خصوصاً مہاراشٹر کے اثرات کے غلبے سے علموں پر پھول چڑھانے، تبرک کی تقسیم، ناریل پھوڑنے اور جانوروں کی شکلیں اختیار کرلینے جیسی چیزیں در آئیں۔ بہمنیوں کی تاسی کرتے ہوئے احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہوں میں شاہ طاہر نے اعلانیہ طور پر شیعیت کو متعارف کروایا اور ہرے جھنڈے کے ساتھ شیعہ خطبہ بھی شروع کیا۔ شیعہ علماء کا تقرر ہوا اور پہلے تین خلیفہ پر سب وشتم شروع ہوا۔ گریہ و بکا، نوحہ خوانی اور سینے کا ماتم اس زمانے میں عام ہوا۔[۴] اس مقام پر یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ۱۰۷۹ ھجری مطابق ۱۶۶۸ء میں بیجاپور میں فارسی میں ایک اہم تصنیف وجود میں آئی جس میں رسولِ خدا صلعم، ان کی بیٹی، بارہ شیعہ اماموں اور اُن کے عقائد کو قلمبند کیا گیا ہے جس کا نام ہے ''سفینۃ الاہل البیت۔[۵]

سلطان قطب الملک نے گولکنڈہ میں ۹۲۴ھ مطابق ۱۵۱۸ء میں اپنی آزادی کا اعلان کیا۔[۶] یہ خود شیعہ تھا اور اس نے گولکنڈہ میں اسی عقیدہ کو فروغ دیا۔[۷]

گولکنڈہ میں تین عاشورخانے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ 'نعل صاحب' وہ پہلا علم تھا جو ابراہیم قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ لایا گیا اور گولکنڈہ کے عاشور خانہ میں پہلی بار رکھا گیا۔[۸] محمد قلی قطب شاہ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے شیعیت کی جم کے تبلیغ کی۔ وہ خود بھی مرثیے نظم کرتا تھا مگر وجہی پہلا دکنی شاعر ہے جس نے گولکنڈہ میں مرثیے لکھے۔

قلی قطب شاہ نے حیدر آباد شہر پر تسلط قائم کرکے چار مینار کی عمارت تعمیر کی۔ بہرحال اس عمارت میں تعمیر کا مقصد ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔ اس نے ۹۳-۱۵۹۲ میں پہلا عاشورخانہ تعمیر کروایا

۱- واقعاتِ مملکتِ بیجاپور، بشیر الدین احمد آگرہ۔ ۱۹۱۵، ص ۳۴ ۲- دکن میں مرثیہ اور عزاداری ص ۷-۵۶، ۶۲ اور ۵۶
۳- ایضاً ص ۴۹ تا ۵۲ ۴- اے کیٹلاگ آف پرشین مینسکرپٹس، سالار جنگ میوزیم، جلد۱، محمد اشرف، حیدر آباد ۱۹۶۵، کیٹلاگ نمبر ۱۲۴
۵- ڈیکن، دی بہمنی سلطانس، ص ۲۹۲ ۶- ڈیکن میں، مرثیہ اینڈ عزاداری، ص ۵۳
۷- فرخندہ بنیاد ست گروپرشاد، حیدر آباد، ۱۹۴۵ ص ۱۰، ۱۴۸، اور ۱۵۵ ۸- الف، ڈیکن، دی بہمنی سلاطین، ص ۳۱-۳۰

جو بادشاہی عاشور خانہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔[۱] الف اس طرح اسے سولہویں صدی کے آخری حصے میں ہندوستان کا پہلا سب سے بڑا عاشورخانہ مانا جاسکتا ہے۔ بعد میں محمد قلی قطب شاہ ہر سال نعل صاحب علم کو گولکنڈہ سے حیدرآباد لایا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے حسینی علم عاشورخانہ تعمیر کروایا۔[۲] لیکن جہاں پورے دکن میں شیعیت کی عمومی مقبولیت کا سوال ہے وہ عبداللہ قطب شاہ (۷۲-۱۶۲۵) کے دور میں ہی ظہور میں آئی۔ اس زمانے میں سنی بلکہ ہندو بھی محرم کی رسوم میں دل کھول کر حصہ لینے لگے۔ اس نے اور اس کی والدہ حیات بخش بیگم نے مشہور علاوہ سرطوق اور پنجا شاہ عاشور خانہ تعمیر کروایا۔ اس نے بادشاہی عاشور خانہ کی بھی مرمت اور تزئین کاری کروائی اور نیا عاشور خانہ تعمیر کروایا جو اج کل 'بی بی کا علم' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علم عوام میں اب بھی بہت مقبول اور محترم سمجھا جاتا ہے اور ۱۰ محرم کو ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس جلوس میں شریک ہوتے ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ نے محرم کی عزاداری کے قواعد وضوابط بھی مرتب کیے۔[۳]

اس موقع پر بہت سے ہندو حضرات شریک ہوتے تھے، ہندو خواتین، ان کی لڑکیاں، ہندو جوگی اور فقیر وغیرہ ۱۰ محرم کو اسنان کرتے تھے۔ نیا لباس پہنتے تھے اور شاہی جلوس کے علاوہ میں شربت لے کر حاضر ہوتے تھے اور اسے وہاں تقسیم کرتے تھے۔ اس موقعے پر وہ بادشاہ کو نذر بھی پیش کرتے تھے۔ اور اگر اس زمانے میں ان کے یہاں کسی بچے کی پیدائش ہوتی تھی تو اس کا نام حسین رکھتے تھے۔ ان دس دنوں کے وقفے میں کوئی تفریحی کام نہیں کیا جاتا تھا۔[۴] میرا خیال یہ ہے کہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے اسی شدید جذبے کے اثر سے محرم کی رسوم کو دوردراز علاقوں میں پہنچنے میں مدد ملی اور یہ اثر آندھراپردیش میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے[۵] یہ روایت ۱۶۸۷ میں گولکنڈہ اور حیدرآباد کے زوال کے بعد بھی باقی رہی۔ دکنی اردو کے سب سے اعلیٰ درجے کے مرثیے اسی دور میں نظم کیے گئے۔[۶] اسی دور میں تیلگو شعراء نے بھی حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کے شان میں نظمیں لکھیں۔ ریال سیما اور آندھراپردیش کے عام دیہاتوں میں، اس یقین کے باوجود کہ یہ ہندوستانی تہذیب کے ہیرو

۱- ایضاً ۴ ر اور ۱۰ تا ۱۴ اور ۳۱ بالترتیب ۲- تا ۲۳- حدیقۃ السلاطین، نظام الدین احمد، حیدرآباد، ۱۹۶۱، ص ۴۸ تا ۵۸۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد: ست گرو پرشاد، محمد قلی قطب الدین شاہ ہارون خاں شیروانی، دہلی ۱۹۶۷، ص ۳۲-۳۰، حیدرآباد کی دستان، 'سیاست کی اشاعتوں میں سے ایک ... راحت عظیم، حیدرآباد، ۱۹۹، ص ۴۱، تا ۱۴۹، گلمپسیز آف قطب شاہی کلچر، ایڈیٹر ایم......۱۹۸۶ ص ۳۲ تا ۳۴۔ اور ۴۱ تا ۴۴، سالار جنگ میوزیم، بائی اینول جرنل، ایڈیٹر ڈاکٹر ایم ایل مرتگم، حیدرآباد ۸۹۔ ۱۹۸۳ ص ۲۷ اور ۲۸

نہیں ہیں، یہ اب بھی گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔[۱]

روزِ عاشور یعنی ۱۰ رمحرم کو تیلگو میں ''پیرلا پانڈوگا'' کہا جاتا ہے اور حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو بالترتیب، 'اشانا' اور 'اوشانا' کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ پانچویں اور ساتویں محرم کو یہ لوگ المیۂ کربلا کو تیلگو میں سنا کرتے تھے۔ ۱۰ محرم کو یہ لوگ آواز کے ساتھ گریہ و بکا کرتے تھے اور محرم کے جلوس میں پا برہنہ شامل ہوتے تھے۔[۲] آندھرا پردیش میں آج تک بھی بہت سے عاشورخانوں کے 'انچارج' ہندو ہی ہیں اور ان کا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ یہ لوگ یا حسنؑ یا حسینؑ کے نعرے لگاتے ہوئے ننگے پیر آگ پر چلتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاشورخانوں کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد ہندوستان میں تہذیبی ہم آہنگی اور قومی ایکتا پیدا کرنا تھا۔ علم اور پنجے حق، ایمانداری اور صفائے قلب کی علامتیں بن گئے تھے۔ عاشورخانوں کے دروازے بلا تفریق مذہب و علاقہ ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ لنگر کی روایت سنّی، شیعہ اور ہندو یکساں انداز میں پوری کرتے تھے۔ اس پورے طرزِ عمل میں محرم کی رسوم کو پورا کرنے کے سلسلے میں لوگوں نے بہت سے ہندوستانی عناصر کو اپنا لیا تھا۔ مثال کے طور پر شیر کا روپ بھرنا، اپنے جسموں کو مختلف رنگوں سے رنگنا، موسیقی کے ساز بجانا، بھنے چاول (مُرمُرے) بانٹنا، گڑ اور ناریل (بانٹنا) جو خالص ہندوستانی روایت ہیں۔ تیلگو گیتوں کے ساتھ ساتھ حضرت حسینؑ کی تعریف میں مراٹھی اور کنڑ زبانوں میں بھی گیت ہونے کا امکان ہے۔[۳]

آصف جاہ اول کے زمانہ میں مجالس میں فارسی روضۃ الشہداء ابھی اتنی ہی رائج اور مقبول تھی جتنی تیلگو مرثیے۔[۴] ولی ویلوری نے اسی زمانے میں دکنی میں روضۃ الشہداء نظم کی۔[۵] 'نہایت السؤل' حضرت حسینؑ کی سوانح عمری ہے جسے عبدالوہاب آرکاٹی نے ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۵ میں کرناٹکا کے

۱- دکنی کلچر: ہارون خاں شیروانی، انفلوئنس آف اردو آن تیلگو، ڈاکٹر وی سوارا جیہ لکشمی، حیدرآباد، ۱۹۸۹، سالار جنگ میوزیم، بائی انول جرنل، ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر ایم ایل... اور آرٹیکل از ڈاکٹر دھرمیندر پرشاد ۸۳ ر ۱۹۸۴ ص اور گلمپسیز آف قطب شاہی کلچر، ایڈیٹر ایم۔ ایل۔ گم، اور مرتبہ..... ڈاکٹر صادق نقوی اور ڈاکٹر دھرمیندر پرشاد، حیدرآباد ۱۹۸۲، ص ۳۲، ۳۳، ۴۱، ای ۔ ۴۴، دکن میں مرثیہ اور عزاداری، ڈاکٹر راشد موسوی وغیرہ ۲- گلمپسیز آف قطب شاہی کلچر، ایڈیٹر، ڈاکٹر ایم ایل مرگم مرثیہ دھرمیندر پرشاد اور ڈاکٹر صادق نقوی، حیدرآباد ۱۹۸۲ ص ۳۲، ۳۴، ۴۱، ۴۳، ۴۴، اور دہلی میں مرثیہ اور عزاداری، ڈاکٹر راشد موسوی وغیرہ

۳- اے کیٹالاگ آف دی پرشین مینسکرپٹس، سالار جنگ میوزیم، محمد اشرف حیدرآباد ۱۹۶۵ کیٹلاگ نمبر ۱۱۲، ۱۳۶ اور ۱۴۷ وغیرہ

۴- 'دکن میں مرثیہ اور عزاری، ڈاکٹر راشد موسوی، ص ۲۹ راور ڈیکن کلچر، ڈاکٹر ایچ، کے شیروانی، اور گلمپسیز آف قطب شاہی کلچر وغیرہ

۵- اے کیٹلاگ آف پرشین مینسکرپٹس، سالار جنگ میوزیم لائبریری، مخدوم اشرف حیدرآباد ۱۹۶۱، کیٹلاگ نمبر ۱۳۴، ۱۳۵، اور ۱۵۴

نواب والا جاہ کے لئے مرتب کیا۔[1] جب مغلوں نے میسور پر قبضہ کرلیا تو سارا کے نواب نے وہاں ایک امام باڑہ ۱۷۱۹ میں تعمیر کیا۔ بعد میں کرناٹکا کے کچھ نوابوں اور ٹیپو سلطان نے سری رنگا پٹنم میں امام باڑے تعمیر کرائے۔ باقر آغا نے بھی ایک کتاب اور کافی تعداد میں مراثی تصنیف کیے۔[2]

پھر جب آصف جاہ دوم نے زمامِ حکومت سنبھالی اور ۱۷۶۴ میں اپنا دارالسلطنت حیدرآباد میں منتقل کیا تو اس نے قطب شاہی بادشاہوں کی تہذیبی تاریخ کو دہرایا۔ تمام عاشور خانوں کی مرمت کرکے انھیں دوبارہ کھولا گیا اور اُن کے انچارج مقرر کیے گئے۔ اس کا وزیرِ اعظم شیعہ تھا اس نے ایک اور رئیس نواز علی خاں شیدا نے حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے میں آصف جاہ (دوم) کی مدد کی۔ گنگر کا جلوس شروع کیا گیا۔ اس دور کی خصوصی بات یہ ہے کہ محرم کی نیاز نذر کا سلسلہ سنی، شیعہ اور ہندوؤں میں عام طور پر رائج ہوگیا۔ اس کے لیے کھچڑی، شربت، روٹ، چونگے، اور بٹی جیسی مخصوص چیزیں تیار کی جاتی تھیں۔ جانوروں جیسے شیر وغیرہ کی شکلوں کا روپ بھرنا بھی رائج ہوا۔ سلامی مارچ (مارچ پاسٹ) دوبارہ شروع کیا گیا۔ چراغاں محرم کی دوسری خصوصی مد بن گیا۔[3] آصف جاہ ششم عزاداری کا بڑا مضبوط حامی تھا اور اس نے دل کھول کر اس کی سرپرستی کی۔ سرسالار جنگ کے دور میں میر انیس لکھنوی حیدرآباد آئے جس سے مرثیے کی تصنیف میں ایک انقلاب سا پیدا ہوگیا۔ مرثیہ خوانی سے پہلے سوز خوانی کا طریقہ شروع ہوا۔[4]

سوانگ اور زیادہ مقبول ہوا۔

محرم کے جلوسوں میں فوج نے بھی شرکت کرنا شروع کردی۔ مختلف رنگوں اور طرح طرح کے ڈیزائنوں کے لکڑی کے گملوں اور برتنوں کو سجاوٹ میں استعمال کیا جانے لگا جو خالص ہندوروایت ہے۔ اس دور میں حیدرآباد، میسور، مدراس اور بمبئی میں بہت سے شعرا نے فارسی اور اردو میں مرثیے، نوحے اور سلام لکھے۔ اسی دور میں فاتحہ اور بی بی کی صحنک کا رواج بھی عام ہوا۔ مدراس میں ایک بڑا عاشور خانہ، عباسی، یا بڑا نقشہ، نام سے تھا۔ حیدرآباد کے امراء کی ایک بڑی تعداد اپنے محلوں میں محرم میں عزاداری کی مجالس منعقد کرتی تھی جن میں سے کچھ میں خود آصف جاہ ششم بھی شریک ہوتے تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے صرف شعراء کی سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ خود بھی اردو میں

۱- دکن میں مرثیہ اور عزاداری، راشد موسوی ۱۹۸۹، دہلی ص ۱۷ تا ۵۲۵ سے ۲۰۲

۲- تا ۴- ایضاً ص ۱۷ تا ۸۰ اور...... راحت اعظمی، حیدرآباد ۱۹۹۸، ص ۶۲ سے ۶۶ اور ۹۷، فرخندہ بنیاد حیدرآباد، ست گورو پرشاد، حیدرآباد، ۱۹۴۵، ص ۱۲۳، ۱۰، ۱۲۳، ۱۳، ۲۰

ایک مرثیہ نظم کیا۔[1] آخری نظام آصف جاہ ہفتم شیعیت کی طرف خاصہ گہرا میلان رکھتے تھے۔ یہ خود اور ان کے امراء جی کھول کر عزاداری کی سرپرستی کرتے تھے اور آخر میں انھوں نے حیدر آباد کا آخری شاہی عاشور خانہ موسوم بہ عزاخانۂ زہرا تعمیر کروایا۔ اب تعزیوں اور علم کے جلوسوں کی کافی بڑی تعداد ختم ہوگئی ہے صرف ایک ''بی بی کا علم'' کا جلوس ۱۰ محرم کو نکالا جاتا ہے جس کے بعد 'نعل صاحب' اور حضرت عباس کا علم' نکلتے ہیں۔ موجودہ حکومت کے افسران اس جلوس میں شریک ہوتے ہیں اور عاشور خانے جاتے ہیں۔ سنی حضرات بھی بڑی تعداد میں مجالس عزا میں شریک ہوتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے گھروں میں عزاداری کے لیے ایک کمرہ علاحدہ بھی مختص کر لیتے ہیں۔ اب بھی کچھ لوگ اپنے گھروں کی دیواروں پر پریوں، فرشتوں اور شیروں کی تصویریں بنا لیتے ہیں۔ اب بھی کافی بڑی تعداد میں ہندو چھوٹے چھوٹے عاشورخانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جلوس کے انتظامات میں شریک ہوتے ہیں اور آگ پر بھی چلتے ہیں۔ اس طرح عاشور خانے قومی یکجہتی اور ثقافتی ہم آہنگی کی ایک علامت کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔

اب ہم اس مضمون کے دوسرے حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو کلیانی میں عزاداری کے خصوصی مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ کلیانی ایک مضبوط قلعے والی چھوٹی سی ریاست تھی۔ اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے یہ قرونِ وسطیٰ دور کے ہندوستان میں ایک اہم مقام تصور کیا جاتا تھا۔ یہ بیدر اور رائچور شہروں کے درمیان واقع ہے۔ بہمنی سلطنت سے یہ گولکنڈہ اور حیدر آباد کے قطب شاہی شیعہ خاندان کے تسلط میں آیا۔ جب ۱۷۲۴ میں اشرف شاہ اول دکن کا خود مختار حکمراں ہوا تو یہ اس کے قبضے میں رہا، بعد میں اس نے اس قلع دار ریاست کو اپنے امیر اور داماد میر کلاں خاں قیام الملک میر ابراہیم حسین کربلائی کو بطور جاگیر، دے دیا۔ یہ اور اس کے وارثین آصف جاہی خاندان کے وفادار رہے اور کلیانی میں امن وسکون برقرار رکھا۔ بہرحال اب یہ ریاست کرناٹکا کا حصہ ہے۔ بعد میں آصف جاہ سوم نے اُس کے پوتے سید محمد معین الدین حسین شاہ خیر الدین دوم کو، بہت سے خطابات کے ساتھ اپنی لڑکی نکاح میں دی۔ یہ تمام نواب سنی المذہب تھے۔ اصل میں سید محمد بابر حسین نے اٹھارویں صدی کے اواخر میں کلیانی محرم کی عزاداری کی ابتداء کی۔ اس کے پرپوتے سید محمد جمال الدین

۱- ایضاً ص ۷۱ تا ۸۰ اور۔ ۔ راحت اعظمی، حیدر آباد ۱۹۹۸، ص ۶۲ سے ۶۶ اور ۹۷، فرخندہ بنیاد حیدر آباد، ست گورو پرشاد، حیدر آباد، ۱۹۴۵، ص ۱۲۳، ۱۰، ۱۲۳، ۱۳، ۲۰

حسین خاں نے کلیانی کا محرم کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی اور اسے ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد سے شائع کیا۔[1]

اس طرح کلیانی میں عزاداری اور جلوس کی تیاری قمری مہینہ ذی الحجہ کے شروع ہونے پر توپ کے گیارہ گولے داغے جانے سے شروع ہوتی تھی[2] محرم کی عزاداری عام طور پر بارہ دن کی ہوتی تھی۔ ۲۰ ذی الحجہ کے بعد عزاداری کے سلسلے کی تمام خریداری حیدر آباد شہر سے کی جاتی تھی۔ ۲۰ ذی الحجہ کو ہی تمام عاشور خانوں کی چابیاں عاشور خانوں اور توشہ خانوں (گوداموں) کے کلید برداروں کو ہدایات اور مٹھائی پر فاتحہ کے ساتھ سونپ دی جاتی تھیں۔ تحصیلدار اور سکریٹری اس سلسلے میں براہِ راست نواب کو جوابدہ ہوتے تھے۔ تیاری میں سب سے پہلا کام عاشور خانوں کی صفائی، قلعی اور روشنی کے انتظامات کا ہوتا تھا۔ ایک نجی فوج جس کا نام 'علی غول' تھا۔ عوام میں اطلاع اور اعلان کی غرض سے مشعلوں اور ملازموں کے ساتھ مارچ کرتی تھی۔ محرم کی ابتدا کے اعلان کے لیے نوبت بھی بجائی جاتی تھی۔ اس میں خادماؤں (ماماؤں) کا حصہ کافی اہم ہوتا تھا اور وہ نواب کو مختلف واقعات کی اطلاعات پہنچانے سے پہلے بادشاہ علی پکارتی تھیں۔ عید غدیر منانے کے لیے ۱۸ ذی الحجہ کی تاریخ مقرر تھی۔ محرم کے تمام کام مٹھائی پر فاتحہ پڑھ کر شروع کیے جاتے تھے اور اس کے بعد مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ یہ مرثیے کسی راگ راگنی کی بنیاد پر پڑھے جاتے تھے اور حیدر آباد اور لکھنؤ سے بہت سے مرثیہ خوان بلائے جاتے تھے۔ پورے دس دن گوشت کا استعمال وغیرہ بالکل بند کر دیا جاتا تھا۔ بہت سے عاشور خانے 'علوہ' کہلاتے تھے مگر سب سے مشہور 'بی بی کا علوہ' تھا۔ شیرینی پر فاتحہ کے بعد پہلا، اللہ علم، ۲۹ر ذی الحجہ کو نکالا جاتا تھا۔ اس کے نصب کیے جانے میں دو دن لگتے تھے، اس کے بعد عباس علم، بازو کا علم، کربلا شاہ، ساما علم، بی بی کا علم، جُلال بخاری، چھوٹی بی، منجھلی بی کا علم، منبر کا علم، علم زین العابدین، نعل حیدر اور بڑے امام کا علم نکلتے تھے۔ بارہ دری کی صفائی کا کام سنار کرتے تھے، جو آثار شریف، رکھنے کے لئے مختص تھی۔ محرم کے چاند کی اطلاع نگاڑوں (نقاروں) اور نوبت بجا کر کر دی جاتی تھی۔ سب سے پہلے حیدر محل سے 'شاہ جھنڈا' اور 'حسینی جھنڈا' نکلتے تھے۔ حسینی جھنڈا ہرے رنگ کا اور شاہ جھنڈا سفید ہوتا تھا۔ جھنڈوں پر تحریروں کے لئے زیادہ تر خطِ طغریٰ کا استعمال ہوتا تھا۔

۱- کلیانی کا محرم: سید محمد جمال الدین حسین خاں، حیدر آباد ۱۹۴۸، ص ۱ تا ۲۵/ اور سب رس (ماہنامہ) حیدر آباد، ستمبر ۲۰۰۳، ص ۶۶-۶۵

۲- ایضاً، ص ۱۰۵-۱۰۹

نواب حیدر محل میں اپنے افسروں سے ملتا تھا۔علموں اور بارہ دری پر پھول اور سہرے چڑھائے جاتے تھے۔عود وغیرہ سلگانے کے لئے عود دان استعمال ہوتے تھے۔تمام مجالس اور اجتماعوں میں عوام، یا علی دولہا، کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ لوگ ایک خاص قسم کے لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ عاشورخانوں کو سفید چاندنیوں اور ایسے سبز پردوں سے سجایا جاتا تھا جن پر پنجتن کے نام لکھے ہوتے تھے۔ چھت گیریاں لگائی جاتی تھیں اور گلدانوں اور گملوں میں گھاس جمادی جاتی تھی۔ شمال مشرق کی طرف نگاڑے رکھے جاتے تھے اور آبدار خانہ شمال مغرب کی طرف ہوتا تھا۔ داخلے کا راستہ سیاہ چوبی کمان سے ہے جس پر قرآنی آیات ابھرے ہوئے انداز میں لکھی ہوتی تھیں، بڑے امام کی ٹٹی اور بُراق کی چوکی، کے ساتھ چھوٹی بی کی کمان، جنوب کی طرف ہیں اور اس کے سامنے نوبت خانہ تھا۔ بارگاہِ حسینی میں ایک علوہ، ہے جس میں بلوری ہانڈیاں، جھاڑ اور شیشے لگے رہتے تھے۔ اللہ علم، چاندی کا ہے اس لیے اُسے ہمیشہ سفید پس منظر کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔'ساما علم' کا پس منظر سرخ اور حضرت عباس کے علم کا رنگ سبز، کربلا شاہ، کے علم کے علاوہ باقی تمام علم سفید پس منظر میں رکھے جاتے۔ نقار خانے کو الگ رنگ کے کپڑوں سے سجایا جاتا تھا، نقار خانے کے نیچے اونٹ کی شکل میں تابوت تھا۔ صفائی ستھرائی بالکل مکمل رہتی تھی۔ بلاتفریق عمر اور جنس تمام شہری وہاں جمع ہوتے تھے۔ حفاظتی امور کے لیے مخصوص پولیس دستہ تھا اور ٹریفک کا بھی مناسب بندوبست کیا جاتا تھا۔ بارگاہِ حسینی سے شاہ جھنڈا تک سڑک کے دونوں طرف دوکانیں تھیں۔ قہوہ، چائے، حلوہ سوہن اور مجومہ، سُکھ مُکھ، اور گُواکو، ہر جگہ مل جاتا تھا۔ عام طور پر علموں کی سواری فوج اور اس کے بینڈ کے ساتھ آگے بڑھتی تھی۔ سب سے پہلے سلام اور مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ ہر قیام کے موقع پر محافظ دستے (گارڈس) عرب اور پولیس علموں کو سلامی دیتے تھے۔ آخر میں وہ بارگاہِ حسینی میں نوبت اور شہنائی کی آوازوں کے ساتھ اپنی مقررہ جگہوں پر نصب کردیئے جاتے تھے۔ نواب اس کے خاندان اور دوستوں کے لئے ایک جگہ مقرر تھی۔ علموں کو نواب کے مَس کرنے کے بعد نصب کیا جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ علم بہت اونچے تھے۔ پھول، خوشبوؤں، عطر اور عوُد کا دھواں وہاں ہمیشہ اُٹھتا رہتا تھا۔ ہر فاتحہ کے بعد عام لوگوں میں شیرینی تقسیم کی جاتی تھی۔ ساما کے علم کے علاوہ باقی تمام علم اسی کے سامنے کھڑا کرکے جمادیئے جاتے ہیں۔ ممبر کے علم کی سفید ھنی ہوتی تھی۔ کچھ علموں کے لیے فاتحہ کے بعد زیارت بھی پڑھی جاتی تھی۔

محرم کا چاند نظر آتے ہی نقارہ بجاکر اس کا اعلان کیا جاتا تھا اور بارگاہِ حسین کے قریب ایک

بہت بڑا شامیانہ نصب کردیا جاتا تھا۔ تمام عاشورخانوں میں فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ جس کے بعد اگلی صبح سے عزاداری شروع ہوجاتی تھی۔ بی بی کا علم اور دوسرے علم نواب اوراس کے مرد رشتے داروں کی موجودگی میں نصب کردیے جاتے تھے۔ نواب شاہی خاندان کی خواتین کے دربار میں جاتا تھا جہاں خواتین مرثیہ خواں مرثیہ پڑھتی تھیں، قبولی اور شربت دو بجے تقسیم کیا جاتا تھا۔ مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے فقیری لباس پہننے کا حکم دیا جاتا تھا۔ علموں کے لیے پھریرے تیار کیے جاتے تھے۔ پہلے روز نواب کے کسی لڑکے کو گل فروش بنا ہوتا تھا۔ ہر تین گھنٹے کے بعد 'معارفہ' بجایا جاتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد نواب بارگاہِ حسین جاکر سب سے پہلے ''اللہ علم'' کو سلام کرتا تھا۔ عاشور خانے کو بہت سی شمعیں جلاکر خوب روشن کیا جاتا تھا۔ اس دوران عوٗد برابر سلگتا رہتا تھا۔ اس کے بعد یہ اگلے تین علموں۔ 'ساما' 'عباس' اور 'کربلا' کی زیارت کرکے پھول چڑھاتے تھے، مرثیے پڑھے جاتے تھے اور شیر بیرنج اور گشتہ تمام حاضرین میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد آخر میں مجلس کے اختتام کا اعلان معارفہ بجاکر کردیا جاتا تھا۔

دوسری محرم بی بی فاطمہ کا علم نصب کرنے کے لیے متعین تھی، یہ علم بارگاہِ حسین میں چار بجے نصب کیا جاتا تھا۔ فاتحہ کے بعد نواب گھوڑوں کا تفصیلی معائنہ کرتا تھا۔ اس کے بعد علموں کی گُل پوشی اور فاتحہ ہوتی تھی جس کے بعد نوبت بجائی جاتی تھی۔ حاضرین میں نئی تقسیم ہوتی تھی۔ معارفہ بجانے کے بعد نواب بارہ دری میں جاتا تھا جہاں خواتین مرثیے اور نوحے پڑھتی تھیں۔ محرم کے دنوں میں خواتین اور بچوں کو بارہ دری میں جانے کی اجازت تھی۔ فاتحہ کے بعد خصوصی روشنیاں پورے ماحول کو جگمگادیتی تھیں۔

تیسری محرم کو فاتحہ کے بعد نواب اپنے اونٹوں کا تفصیلی معائنہ کرتا تھا اور غریب غربا میں حلیم بانٹا جاتا تھا۔ علموں کے ساتھ اونٹ بھی چلتے تھے۔ آخر میں نواب اپنے ہاتھیوں کا معائنہ کرتے ہوئے دس محرم کے لیے ان ہاتھیوں کا انتخاب کرتا تھا جو اپنے پورے ساز و سامان اور ماہی مراتب کے ساتھ جلوس میں شامل ہوتے تھے۔ اس کے بعد نواب بارگاہِ حسین جاکر علموں پر پھول چڑھاتا تھا۔ نوبت کے بعد فوجیوں، اور عام غریب، غرباء کو قبولی تقسیم کی جاتی تھی۔

چوتھی محرم کو حسینی بنگلے پر شام ۴ بجے چھوٹی فاتحہ ہوتی تھی۔ اس وقت نواب اپنی فوج اور اس کے کچھ سپاہیوں کی مستعدی اور صلاحیتوں کا معائنہ کرتا تھا۔ یہ فوج مسلمان، ہندو، سکھ اور روہیلے سپاہیوں

پر مشتمل تھی۔ فاتحہ کے بعد نوبت بجتی تھی اور حلیم پیش کیا جاتا تھا۔

پانچ محرم کو نواب صبح دس بجے بارہ دری جاتا تھا جہاں اس کی دادی اُسے فقیر کا لباس پہناتی تھی۔ نواب کو بھیک مانگنا ہوتا تھا اور عام طور پر عورتیں اُسے بھیک دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گل فروش بن جاتا تھا اور عام لوگوں کو پھول بیچتا تھا جو اِن پھولوں کو علی اصغر کے جھولے پر چڑھا دیتے تھے۔ اس طرح جو بھیک اُسے ملتی تھی اس رقم کو چہلم کے دن 'دم ردت' چنگے، اور حلوہ سوہن کی تیاری پر خرچ کیا جاتا تھا۔ محل میں ایک علاحدہ آب دار خانہ اس شربت کے لیے بنا ہوا ہے جو گُو، سرخ شکر، دھرگئی، شکر، مصری اور میوے دار اور عرقِ گلاب ملے دودھ میں ملا کر بنائے اور بانٹے جاتے تھے ان دنوں میں زیادہ تر لوگ سبز لباس پہننے کو ترجیح دیتے تھے۔ فاتحہ کے بعد چھوٹے چھوٹے بٹوؤں میں نقل بانٹے جاتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو چار بجے چھت پر چڑھ کر نواب کی سواری دیکھنے کی اجازت تھی۔ نواب سب سے پہلے بارہ دری کی زیارت کرتا تھا جہاں چھوٹی فاتحہ پڑھی جاتی تھی۔ اس کے بعد قرآن کی تلاوت ہوتی تھی۔ مردوں میں صافے اور ٹوپیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ نواب ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کے لیے فقیری ناڑے تقسیم کرتا تھا۔ شکاری پرندے بھی نواب سے تحفہ حاصل کرتے تھے۔ جبکہ مارچ پاسٹ کے بعد چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آتی تھیں جو مختلف لباس پہن کر لیلیٰ مجنوں، حاجی ملنگ، سائیں، شیر، بھالو، بندر اور سیدّیوں کا سوانگ بھرتی تھیں یہاں تاش منڈپ بہت مقبول و مشہور تھا جس کے ستون چاندی کے تھے اور اوپر سونے کا کلس تھا۔ یہ منڈپ لنگر کے اس جلوس کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا جس میں لڑکے پیڑ کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہاتھوں میں لیے چلتے تھے۔ اس موقع پر فاتحہ خوانی برابر جاری رہتی تھی۔ مزدور شربت اٹھائے ہوتے تھے۔ آخر میں یہ لوگ حسینی علم کی زیارت کرتے تھے۔ بی بی کے علم پر فاتحہ کے بعد نواب دوپہر کا کھانا کھاتا تھا اور پھر بارگاہِ حسینی کی طرف چلا جاتا تھا۔ پھول چڑھانے اور فاتحہ کے بعد لوگوں کو حلیم پیش کیا جاتا تھا۔ جلوس جو شاہ جھنڈا اور حسینی جھنڈا سے ہوتا ہوا محل کی طرف بڑھتا تھا اس میں پورے راستے میں بہت چراغاں ہوتا تھا۔ دکاندار بھی 'دھنیاں' پیش کرتے تھے۔ اگر نواب کسی دوسرے علم کے قریب سے گزرتا تھا تو وہ اس علم پر دھنّی اور رقم پیش کرتا تھا۔ پیر پادشاہ کے چلّے اور نواب کے آباؤاجداد کے لیے بھی فاتحہ پڑھی جاتی تھی۔ مرثیہ خوانی کے بعد قبولی تقسیم کی جاتی تھی۔ جوگنیں اپنا تلوار کا ناچ دکھانے آتی تھیں۔ شیر بندر اور بھالو کے سوانگ بہت مقبول تھے اور اس دن نواب انھیں مناسب انعام دیتا تھا۔

پٹواری اور پٹیل نواب کو چار بجے صبح دھتیاں پیش کرتے تھے۔

۶ رمحرم کا پروگرام بارہ دری اور زنانے محلوں میں بارہ بجے سلام خوانی سے شروع ہوتا تھا۔ بارہ دری میں فاتحہ کے لئے مردوں کو داخلے کی اجازت تھی۔ شب میں اچھی طرح چراغاں ہوتااور روشنی کے لیے ہدایات جاری کی جاتی تھیں۔ یہ خواتین کے حصے میں نواب تین بجے بھڑنگ کا سوانگ بھرتا تھا۔ اس میں اس کے چہرے کو سفید چاک سے رنگ دیا جاتا اور ایک جھولا اُس کی گردن میں لٹکادیا جاتا تھا، عورتیں اُسے خیرات دیتیں، مرثیے پڑھے جاتے۔ اس موقع پر مسلح عورتیں نواب کے تحفظ کی ذمہ داری نبھاتیں۔ بارگاہِ حسین اور دوسرے مقامات لوگوں سے بھرے رہتے اور فضا 'بھولک، دھپر ادوں' اور 'چھپرا ردوں'، وغیرہ سے ہمیشہ گونجتی رہتی۔ دوسری ٹولیاں بھی سوانگ بھرنے میں مصروف رہتیں۔ معارفہ کے ساتھ نواب کا جلوس ساڑھے چار بجے حسینی بنگلے پر پہنچتا۔ فاتحہ کے بعد ٹولیاں سوانگ میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور اس کے بعد سب کو حلیم تقسیم کیا جاتا۔ شاہی خاندان کے دوسرے مرد بھی فقیری لباس پہنتے۔ نواب کا جلوس نو بجے بارہ دری پہنچتا۔ بُراق کی شبیہ بارہ دری پر رکھی جاتی، فاتحہ اور پھر علموں کی گل پوشی ہوتی اور روضہ خوانی اور مرثیہ اور نوحہ خوانی ہوتی۔ نقارے اور اُبدے برابر بجتے رہتے۔ شربت کے ساتھ مزعفر لوگوں کو پیش کیا جاتا۔ دوسرے مشروبات جو اس موقع پر پلائے جاتے اور ان میں دھنیا، قہوہ، نمکین بھنے بادام، چکنی، الائچی اور تخمِ خیارین وغیرہ ہوتے تھے۔ پانچ بجے صبح روشن چوکی پر معارف بجانا شروع کردیا جاتا۔

۷ رمحرم کو عزاداری کا سلسلہ شام کو چار بجے بارگاہِ حسین میں شروع ہوتا اور چھوٹی فاتحہ کے بعد نواب حسینی بنگلے چلا جاتا جہاں حلیم پیش کیا جاتا، یہیں سے وہ صدر الدین کے عاشورخانے کی مجلس سنتا اس کے بعد وہ دوبارہ بارہ دری پہنچتا جہاں خواتین نیاز کراتیں۔ رات کو نو بجے بارگاہِ حسین میں امام زین العابدین کی چومکھہ عمل میں لائی جاتی۔ قرآن شریف کی تلاوت اور صدرالدین خاں کی مجلس کے بعد مرثیے پڑھے جاتے، شربت تقسیم ہوتا۔ فاتحہ کے بعد عورتوں وغیرہ کو قبولی پیش کی جاتی، دمدی کی تپلی، تابوت اور خونی علاوے دکھائے جاتے۔ خونی علاوے میں ایک شخص کو دکھایا جاتا جس کا سر تلوار سے کاٹا گیا ہو اور اس سے خون اُبل رہا ہو، اس کے پاس ہی ایک اور شخص کی لاش پڑی ہوتی۔

۸ رمحرم کا پروگرام بارہ دری میں بارہ بجے شروع ہوتا جہاں حضرت عباس کی فاتحہ کے بعد نواب خود مشکیزہ ہاتھ میں لے کر کلہڑوں میں لوگوں کو شربت پلاتا تھا۔ بارگاہِ حسین کی فاتحہ چار بجے شام کو

ہوتی۔ بہت بڑے مجمعے کے سامنے سوانگ کی ٹولیاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں۔ بارہ بجے رات کو بارگاہِ حسینی پر ایک بار پھر گل پوشی ہوتی، سب کو بریانی پیش کی جاتی۔ موسیقاروں کی ٹولی، ہاتھی، روشنی کا سامان، جھنڈے اور مورچھل حضرت قاسم کی سواری لانے کے لیے قاضی صاحب کو بھیجے جاتے، بہت سی ٹولیاں سلام، مرثیے اور نوحے پیش کرتیں۔ کھانا پیش کیا جاتا اور پنج محلے میں خواتین کی نشست کا انتظام کیا جاتا صبح چار بجے بڑی کمان سے ہوتا ہوا حضرت قاسم کا جلوس آتا۔ قاضی دھتی پیش کرتا جس کے پیچھے دوسرے علم ہوتے۔ اس دن عام طور پر پانچ پلے چاول پکائے جاتے۔

نو محرم کی صبح دس بجے علم حضرت قاسم کی سواری واپس ہوتی اور گیارہ بجے ''اللہ علمؑ'' کی گل پوشی کی جاتی۔ علم کے حضور میں پیش کرنے کے لئے بہت سے عریضوں پر نواب کے دستخط کرائے جاتے۔ سہرا جو پانچویں محرم سے تیار کیا جانے لگتا تھا اب اعلیٰ درجے کے سرپیچ اور کلغیوں کے ساتھ تیار ہوتا۔ اس موقعے پر سب لوگوں کو مٹی کی رکابیوں میں کھانا پیش کیا جاتا۔ نواب خاندان کے لوگ اور دوسرے عمائدین نواب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور باقی لوگ 'ساماعلمؑ' کے پاس بیٹھتے۔ علماء کے لیے ایک الگ دسترخوان لگایا جاتا۔ گلال باد کے ستون ماہی مراتب، مورچھل، آفتاب گیری اور مہتاب گیری اور ذوالفقاری تلواروں سے سجائے جاتے۔ بارہ دری پانچ بجے شام کے بعد خواتین کے لیے کھولی جاتی۔ بارہ بجے رات کو ''بی بی کے علم'' پر ایک نیا سہرا چڑھایا جاتا، جس کی سواری اب روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار ہوجاتی۔ تمام علموں پر گل پوشی اور گلاب پاشی کی جاتی۔ خواتین علموں پر سے بادام، بتاشے، کاجو اور چاندی کے پھول نچھاور کرتیں۔ یہ جلوس بارگاہِ حسین کی طرف بڑھ جاتا۔ راستے میں دوسرے علم اس میں شامل ہوتے چلے جاتے۔ خواتین کو چوحلّہ محل کے پاس بیٹھنے کو کہا جاتا۔ دوسرے علم بارگاہِ حسین پر صبح تین بجے پہنچتے۔ نواب خود دھتی اور نذر پیش کرتا اور اس کے بعد تین دوسرے عزاخانوں کی زیارت کو جاتا۔ گلپوشی اور گل پاشی کے بعد کچھ علموں پر سونے کی دھتیاں چڑھائی جاتیں اور اس کے بعد ''اللہ علم'' باہر لایا جاتا۔ نیز علم، ایک اونٹ پر آگے بڑھ رہا ہوتا۔ تمام علم بارگاہِ حسین لائے جاتے۔ چار بجے صبح معارفوں کی آواز کے ساتھ جلوس اپنی مسافت شروع کرتا۔ نشان (علم) ہاتھی باقاعدہ فوج کے ساتھ جامع مسجد پہنچتا۔ ان کے ساتھ 'علی غول، وغیرہ بھی ہوتے۔ جلوس میں آگے اونٹ، بینڈ، نوبت، تمبو، تاشہ، دف، بگل، معارفہ، بانسری اور روشن چوکی ہوتی۔ سب سے آخر میں نواب اور شاہی خاندان کے لوگ ہوتے، ہاتھی، وقائع نگار اور نقارے ہوتے۔ ساڑھے چار بجے تمام علم، ممتاز الامراء

کے مقبروں پر پہنچتے جہاں فوج سلامی دیتی۔علموں کو نواب کے آباواجداد کی قبروں سے مَس کیا جاتا۔
۱۰محرم آٹھ بجے صبح خواتین چومحلّہ محل میں جمع ہوتی تھیں۔ بارگاہِ حسین پر اونٹوں ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں کھڑی کی جاتیں۔تمام علم چومحلّہ محل پر لائے جاتے اور پھر دوبارہ بارگاہ حسین پر واپس جاتے اور ایک تخت پر لٹا دیے جاتے۔ ہر طرح کی موسیقی بند کردی جاتی، ان پر پھول چڑھائے جاتے اورنواب سینے پر ہاتھ باندھے انھیں سلام پیش کرتا۔ فاتحہ ہوتی، اس کے بعد مرثیہ خوانی اورنوحہ خوانی ہوتی۔ اس کے بعد آثارشریف کی زیارت ہوتی جن میں امام حسینؑ کی تسبیح، حضرت حسینؑ کا موئے مبارک اور حضرت حسینؑ کا ایک خط جو کوفی رسم الخط میں کھال پر لکھا ہوا ہے، شامل تھے۔ بارگاہِ حسین میں نشان کا ہاتھی داخل ہوتا۔ بہت سی طوائفیں بال کھولے مرثیہ خوانی کرتیں۔ جلوس فوجی افراد کے ساتھ اپنا سفرشروع کرتا اورفوج کے لوگ فوجی کھیلوں کی نمائش کرتے۔نواب منبرعلم کے مقام پر واپس آتا اور اماموں سے متعلق بہت چھوٹی تصویریں (منی ایچر پینٹنگس) دیکھتا۔ اس کے بعد تمام آثار شریف چاندی کے بکس میں واپس رکھ دیے جاتے۔ اب بہت سے دوسرے علم بارگاہ حسینی میں آنے شروع ہوجاتے۔ یہ دھتی اور شربت لوگوں کو پیش کیا جاتا۔ آج کی تاریخ میں خواتین کے لیے قلعے پر انتظام کیا جاتا تھا۔علم جن کے ساتھ فوج اور موسیقی کے ساز ہوتے تھے اُن کے پیچھے نواب چلتا تھا۔ تین دن تک شاہی مطبخ بند رہتا تھا۔ضرورت کے مطابق سارا کھانا ۹ محرم کو ہی تیار کرلیا جاتا تھا جو روغنی روٹی، پراٹھے، خمیری پھلکے، کلچے، نان، باجرے کی روٹی، شیرمال، گاؤزبان، گاؤدیدہ، نان خطائی، باقر خانی، بگھاری مرچ، بگھارے بینگن، اموٹے کی بھاجی، امباڈا بھاجی، کھٹی دال، بیسن، کریلا، میٹھا کاشی پھل، دہی کی کڑھی، حلوہ سوہن، آملہ مربّہ، گاجر حلوہ، بادام نوز، آمہ مربّہ، دم کے روٹ، برفی، جلیبی ٹکلیاں، کھجور، چونگے اور بٹی وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک بجے نواب پھر بارہ دری میں پہنچ جاتا تھا۔ ان کا شربت سب میں تقسیم کیا جاتا تھا۔
نواب 'سگِ حسینؑ' کا سوانگ بھر کر کتے کی طرح قبولی کھاتا تھا۔ جلوس نوحہ خوانی اور نگاڑوں کی آواز سے شروع ہوتا تھا۔ سب سے آگے منبر کا علم اور دوسرے علم نکالے جاتے تھے۔ جو سب سے بعد میں آتا تھا وہ بی بی کا علم ہوتا تھا۔ جتنے لوگ وہاں موجود ہوتے تھے وہ بہ آواز بلند روتے تھے اور ہائے ہائے حسین، کے نعرے بلند کرتے تھے۔ دھتی اور سہروں کو دوبارہ درست کیا جاتا تھا اور شربت پلایا جاتا تھا۔ پورے راستے میں علم جگہ جگہ رُکتے تھے اور کچھ دیر کے لیے آرام کرنے حیدرمحل پر قیام

کرتے تھے۔ نگاڑوں کی آوازوں کے ساتھ اللہ علم کا جلوس شروع ہوتا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے علم ہوتے تھے۔ نواب اور عام لوگ علموں کی سلامی کے لیے ننگے پیر تیز تیز قدم بڑھاتے تھے۔ کچھ مخصوص خواتین کو پترانت تالاب پر حاضر ہونے کی اجازت ہوتی تھی جہاں تمام علم پانی میں لٹادیے جاتے تھے۔ الگ الگ ٹولیاں مرثیہ پڑھتی تھیں۔ نواب اور اس کے خاندان کے لوگ گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ جلوس میں جھنڈے کے ساتھ توپیں بھی شامل ہوجاتی تھیں۔ اب اس جلوس میں ہالوں کا تعزیہ، شاہ جھنڈا، بڑا پنجاعلم، بڑے امام علم، بھی شامل ہوتے ہیں۔ آخر میں شام کے وقت یہ سب تالاب کے کنارے پہنچ جاتے تھے جہاں حسینی جھنڈا لہرا رہا ہوتا تھا۔ وہاں دو خیمے اور شامیانے نصب ہوتے تھے، نگاڑے اور نوبت بج رہی ہوتی تھی۔ اس کے بعد سارے علم یہی عمل انجام دیتے۔ سب پہلے خیمے میں لٹادیے جاتے اور لوگ انھیں مَس کرکے سلامی دیتے، بگل کی آواز کے ساتھ ہر طرح کی موسیقی اور ساز خاموش ہوجاتے تھے۔ توپیں داغ کر سلامی دی جاتی تھی۔ نوحہ خوانی، فاتحہ خوانی کے بعد تمام علم کھول دیے جاتے۔ بی بی کا علم حیدر محل میں رہتا۔ تمام علموں کو پہلے عرقِ گلاب، پھر دودھ، پھر پانی سے صاف کیا جاتا تھا۔ پھر ان پر پھول چڑھائے جاتے تھے اور عطر لگائے جاتے تھے۔ ایک بار پھر فاتحہ اور گُل پوشی ہوتی تھی۔ تمام بکسوں کو الوداع الوداع کے نعروں کے ساتھ بارگاہِ حسینی میں واپس لے جایا جاتا تھا۔ اس کے بعد حاضری کا کھانا پیش کیا جاتا تھا جس میں نان، قورمہ، روٹ، چنگے، گنج کے پیالے اور بتی وغیرہ شامل ہوتا تھا۔ اس کے بعد دودھ کا شربت پلایا جاتا۔ روشنیاں اتار لی جاتی تھیں مگر عرب مرفس کھیلتے رہتے تھے۔ رات کو بارہ بجے مزعفر سے مدارات کی جاتی تھی۔

گیارہ محرم کو صبح نو بجے حیدر محل میں مجلسِ عزا برپا ہوتی تھی جس میں مجلس اور مرثیہ خوانی ہوتی تھی، شام کو تابوتوں پر پھول چڑھائے جاتے اس روز بہت سے گوسائیں عاشورخانے میں آتے تھے۔ صوفی قسم کے لوگ ایک بہت اونچا علم بارگاہِ حسینی میں لاتے تھے جس میں پیڑوں کی ہری ہری شاخیں اور نارنگیوں اور بتاشوں کے ہار لٹکے ہوتے تھے۔ نواب انھیں بہت اچھی نذر پیش کرتا تھا۔

بارہ محرم کی صبح شاہی مطبخ قرآن کی تلاوت کے ساتھ کھلتا تھا۔ فاتحہ کے بعد کھچڑی پیش کی جاتی تھی۔ بارگاہِ حسینی پر ایک بار پھر فاتحہ خوانی ہوتی تھی، اس وقت کسی قسم کی موسیقی نہیں ہوتی تھی۔ لکڑی کا گلال بادہٹا کر پھول چڑھائے جاتے تھے۔ حضرت غوثِ اعظم اور امام زین العابدین کی فاتحہ ہوتی تھی۔ مٹھائی تقسیم ہوتی تھی اور اس کے بعد موسیقی کی اجازت ہوجاتی تھی۔ تمام تابوت نعمت خانۂ حیدر

محل میں رکھے جاتے تھے۔ سلام کے بعد الوداع نوحے کے انداز میں پڑھی جاتی تھی اور لوگ سینے کا ماتم شروع کردیتے تھے۔ فاتحہ کے بعد تمام علموں کو ایک کمرے میں مقفل کر کے مہر بند کردیا جاتا تھا۔ اس مخصوص مجمع کی بریانی اور بڑ ہانی سے مدارات کی جاتی تھی۔ عاشور خانوں کی چابیوں کی نواب کو واپسی عزاداری کے دنوں کے اختتام کی اطلاع سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد 'دہم، دستم، اور چہلم، کی رسوم حیدر محل میں ادا ہوتی تھیں جن میں سوانگ کے مظاہرے مرثیہ خوانی روضہ خوانی اور دعوت وغیرہ شامل ہوتی تھی۔

انسانیت پر کربلا کے احسانات

انوار محمد عظیم آبادی☆

کربلا کا سانحہ تاریخ اسلام ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کا ایک مشہور و معروف واقعہ ہے۔ کربلا میں محرم الحرام ۶۱ھ/۶۸۰ء کی دس تاریخ تک کیا ہوا؟ ان باتوں کی ایک ایک تفصیل تواریخ واقعہ و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہے اور یہ کہنا غلط یا مبالغہ نہیں کہ اس خودفراموش دنیا نے اگر آج صدیوں سے یکساں، شدت اثر کے ساتھ کربلا کو یاد رکھا ہے اور اس کی اہمیت و افادیت کا مسلسل اعتراف کیا ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ کربلا اور دین و انسانیت میں بہت ہی گہرا اور اٹوٹ رشتہ پایا جاتا ہے۔

کربلا کے واقعہ کا اصولی اور تاریخی سبب، وہ ہے جسے امیر معاویہ کے اعلان خلافت کے ساتھ ہی اقتدار اعلیٰ کے ''اصولوں میں ایک بڑی تبدیلی آجانا'' کہتے ہیں کہ امیر معاویہ سے پہلے خلافت انتخابی تھی، لیکن انھوں نے اپنے لڑکے یزید کو جانشین بنا کر خلافت کو موروثی کردیا۔ بہ الفاظ دیگر ان کے ایسے اقدام سے خلافت و ملوکیت کا بنیادی فرق ہی جاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات دین و انسانیت کی حقیقی قدروں کے بموجب نہیں بلکہ سرتاسر اس کے منافی تھی چنانچہ حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن ابنِ ابی بکر نے باپ کے ذریعہ بیٹے کی اس جانشینی کو تسلیم نہیں کیا اور یقیناً ان کا یہ عمل، کسی اور بات کے لئے نہیں بلکہ صرف اور صرف دین و انسانیت اور حق و صداقت کے تحفظ ہی کے لئے تھا۔ اسی طرح کربلا کے واقعہ کا وقتی یا ہنگامی سبب یہ ہے کہ حضرت مسلم بن عقیل نے اہالیانِ کوفہ کی تائید پر بھروسہ کر کے حضرت امام عالی مقام کو کوفہ بُلا بھیجا۔ اس وقت حضرت امام مکہ معظمہ میں تھے۔ کوفہ والوں نے امام عالی مقام کی حمایت کا پورا پورا وعدہ کیا، لیکن اسی دوران یزید کے حکم پر، عبیداللہ ابن زیاد بصرہ سے کوفہ پہنچ گیا اور کوفہ کے باشندے اس سے ڈر کر اپنے وعدوں سے پھر گئے اور کوفیوں کی اس بھیانک غداری کے نتیجہ میں حضرت مسلم بن

☆ ہیرا بلڈنگ، عالم گنج (گھیرا) پٹنہ۔ ۷

عقیل شہید کر دیئے گئے۔ اثنائے راہ میں اگرچہ حضرت امام عالی مقام کو کوفہ والوں کا حال معلوم ہوا اور واپسی کے مشورے بھی ملے، مگر حضرت مسلم بن عقیل کے بھائیوں کے اصرار پر بہرحال یہ سفر جاری رہا اور ۲؍محرم الحرام کو دشت کربلا میں یہ حسینی قافلہ خیمہ زن ہوا۔ ۳؍محرم کو چار ہزار فوجوں نے اس قافلہ کو گھیر لیا۔ اس فوجی دستہ کی کمان عمرو بن سعد کے ہاتھوں میں تھی۔ قصہ مختصر ۷؍محرم الحرام سے اہلِ بیت کے لئے دریائے فرات پر پہرے لگادیئے گئے۔ حضرت امام حسینؑ نے یزید کے پاس دمشق جانے یا کفار سے جہاد کے لئے کسی اسلامی سرحد کی طرف نکل جانے، علاقۂ ثغر کا رُخ کرنے یا پھر مدینہ ہی لوٹ جانے کا موقع طلب فرمایا، لیکن ان کی کوئی بات منظور نہیں کی گئی اور گویا اس طرح حضرت امامِ عالی مقام اور ان کے رفقاء کو جنگ پر مجبور کر دیا گیا اور پھر بصورت شہادت کربلا کی مختصر سی جنگ کا انجام سبھی جانتے ہیں۔ بیشک بایں صورت اور بایں حالت نہ صرف تاریخی اسباب کے لحاظ سے بلکہ وقتی اسباب کے لحاظ سے بھی حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے کربلا میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے دین و انسانیت پر ہمیشہ کے لئے احسان ہی نہیں بلکہ احسانِ عظیم فرمایا ہے۔

تاریخ کربلا کے متذکرہ واقعات جب سامنے آتے ہیں تو ازروئے تجزیہ بعض صحابہ کرام کے عمل کی مثالیں دے کر اکثر وبیشتر کچھ ایسے نکات اٹھائے جاتے ہیں جن سے بادی النظر میں حضرت امام عالی مقام کا فیصلہ کسی ضدی اور خودسر انسان کا فیصلہ اور نعوذ باللہ حضرت امام عالی مقام کا یہ سفر محض ''خروج'' یعنی سفر بغاوت معلوم ہوتا ہے اور بدنصیبی یہ ہے کہ جب بات چلتی ہے تو اس موضوع پر ایک سے بڑھ کر ایک علمی وعقلی موشگافیاں ہونے لگتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی کو بھی حضرت امام عالی مقام کے اسلام اور انسانیت بداماں نظریے سے سرمُو اختلاف نہ تھا بس بات تھی تو اتنی تھی کہ اُس وقت کے حالات میں ''رخصت'' کی بھی گنجائش تھی اور ''عزیمت'' کا راستہ بھی بند نہ تھا بس فرق یہ تھا کہ ''رخصت'' پر نہ ثواب تھا نہ عذاب جبکہ ''عزیمت'' میں ثواب ہی ثواب تھا، چنانچہ کربلا کے مسافر نے اسلام و انسانیت اور حق وحریت کے تحفظ کی خاطر راہِ عزیمت پسند فرمایا، یزید کی بیعت سے انکار کیا اور دین و انسانیت کی بقا کے لیے کسی بھی ممکنہ سعی کو مصلحت پسندی کے نام پر موخر نہیں ہونے دیا۔ اس طرح ایک کھلے موقف کے ساتھ صرف نظریاتی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ عملی کاوشوں کو بروقت اہمیت دینے کے لحاظ سے بھی کربلا اور دین و انسانیت کے منور و مستحکم رشتے کو سمجھنا اور کربلا کے احسانات کا اعتراف کرنا چنداں دشوار نہیں۔ امام عالی مقام کے سفر کا حال

ہمیں معلوم ہے اور اس روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ کربلا کے مجاہد اعظم نے صرف تحفظ حق وصداقت اور آزادی و انسانیت کے نظریے سے ہی کام نہیں لیا، اصولی و عملی کاوش میں تاخیر کو ہی ناپسند نہیں فرمایا بلکہ اگر اس قسم کی کوشش سے، کسی طرح کی کوئی انسانیت مخالف غلط فہمی ہوسکتی تھی تو اپنے انداز کار اور اہتمام سفر سے حفظ ماتقدم کے طور پر اس کا دروازہ بھی بند رکھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دورانِ سفر، جیسا کہ واقعہ معلوم ومشہور ہے، قادسیہ کے مقام پر راستہ روکنے والے حُر کے لشکر کو اپنے مشکیزہ سے پانی فراہم کیا۔ پھر کربلا کے میدان میں جب اگلی صبح، لڑائی یقینی ہوگئی تو جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، عاشورہ کی رات امام عالی مقام نے، پردۂ شب میں، اپنے ساتھیوں کو نہ صرف یہ کہ چلے جانے کی بخوشی اجازت دے دی بلکہ چراغ بجھا کر گویا عملاً ایک گونہ فہمائش بھی کی۔ بلاشبہ یہ سب کچھ کربلا اور انسانیت کے متنوع اور مثبت رشتہ ہی کا اشارہ بلکہ روشن ثبوت ہے اور یقیناً یہ کربلا کے احسانات کی وہ دنیا ہے جس سے انسانیت وصداقت کی حقیقی قدریں کبھی منکر نہیں ہوسکتیں۔

کربلا کے واقعہ میں ''کرداروں کی بھیڑ'' نہ سہی لیکن مرد اور نسوانی کرداروں کی ایک خاص تعداد ضرور ہے اور بلاشبہ ان میں مختلف زاویوں سے حق پرستی اور انسان دوستی کی قندیلیں روشن نظر آتی ہیں۔ اس مقدس قافلہ میں بزرگ اور معمر صحابہ کرام بھی ہیں، تابعین عظام بھی ہیں، ممتاز ومنفرد مفسرین ومحدثین، اصحاب علم وورع اور شجاعان وقت بھی ہیں۔ ایسے کردار بھی ہیں جو ہمیشہ سے امام عالی مقام کے ساتھ تھے، ایسے کردار بھی ہیں جو ایک ہی ملاقات کے بعد وابستۂ عزم ہوگئے اور ایسے کردار بھی ہیں جو عاشورہ کی صبح رفاقت امام کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ کربلا کا دین و انسانیت سے جو رشتہ قائم ہوچکا تھا اور جو ہر صبح و شام زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتا چلا جارہا تھا اسے ہر عمر، ہر طبقہ اور ہر قسم کی نفسیات رکھنے والے بخوبی محسوس کرچکے اور بہ صمیم قلب ونظر قبول کرتے چلے جارہے تھے۔ البتہ جنھیں حضرت امام حسینؑ کی بات اور کربلا سے اسلام و انسانیت کا رشتہ قبول نہ تھا وہ کل بھی یزید کی طرف تھے اور آج بھی مختلف عنوان سے یزیدیت ہی کے طرفدار ہیں۔

بیشک حق و انصاف اور دین و انسانیت کی پرورش و بقا کے لحاظ سے غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کربلا کچھ اور نہیں، حق وصداقت اور دین و انسانیت کے معمار اساتذہ کی ایک ایسی درگاہ ہے جہاں سے حفظ انسانیت اور احترام انسانیت کا ایک سے بڑھ کر ایک سبق زبان حال و قال سے نشر

ہوتا رہا ہے۔ کسی شاعر کا لب ولہجہ مستعار لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کربلا میں، انسانیت کے لئے مرنے کی ادا اگر شبیر نے بتائی ہے تو انسانیت کے لئے جینے کی ادا بھی عابد بیمار سے ملی ہے۔ بیشک کربلا میں علی اکبر کی اذان نے انسانیت کو فلاح کی طرف پکارا ہے۔ یہاں حضرت عباس علمدار کا کردار اگر یہ بتاتا ہے کہ دین و انسانیت کے سچے ہادی کی مدد و رفاقت کا نام شرافت ہے تو اس شرافت کی علامت ہاتھوں کی محتاج نہیں بلکہ جذبوں سے ممتاز ہے اور یہ کہ انسان کی انسانیت کا تعاف از بس حق کی حمایت ہی میں ہے تو حضرت علی اصغر کا معصوم کردار، واقعات کے تناظر میں اپنی زبان بے زبانی سے یہ بھی بتادیتا ہے کہ کربلا کی جنگ نہ تو مسلمانوں سے تھی اور نہ ہی انسانوں سے بلکہ یہ جنگ دراصل حال و مستقبل کی ان طاقتوں سے تھی جن میں انسانی وجدان کا فقدان ہے، ایسا فقدان کہ وہ چھ ماہ کے بے زبان معصوم کا بھی خیال نہیں کرتے اور انسانی نسل کشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

کربلا کی عظیم درس گاہ انسانیت کے سب سے بڑے معلم، حضرت امام عالی مقام ہیں۔ دین و انسانیت اور تہذیب و ثقافت کی بقا و صیانت میں نسل، ملک اور زبان کی تفریق کو عملی اقدام سے ٹھکرانے کی کیا اہمیت ہے؟ اور حکمت وعدالت اور شجاعت وعفت کو اِن مقاصد کے لئے عالمگیر افراط وتفریط سے بچانا کس طرح لازمی ہوتا ہے؟ یہ محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ حضرت امام عالی مقام کی زندگی کے واقعات اور ان کی عظیم المرتبت شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارس کی شہزادی سے شادی کرکے جس طرح انسانیت کے وقار اوراس کی گوناگوں معنویت کے تحفظ کی خاطر زبان، ملک اورنسلی امتیازات کے پرخچے اڑادیئے، ان چیزوں کے مقابلے میں جس طرح جذبۂ محبت وانسیت کو مسخر کیا، جس طرح کربلا کے مسافر بن کر یعنی حجاز کی سرزمین کو چھوڑ کر بابل کی سرزمین کو عزت دی اور ایک خاص جغرافیائی رشتۂ اتحاد قائم کیا، جنگی اسپرٹ کو مٹایا، خانۂ خدا کو مرکز عسکریت بننے سے بچایا، عالم اسلام کو للچائی ہوئی ملک گیری کی نظروں سے محفوظ رکھنا چاہا، کعبہ کو امن کی مرکزیت دے کر، عالم کے فرقوں کو مطمئن کرنے کی سعی کی، وہاں سے ہجرت کیلئے فضا ہموار کی اور ہجرت کرکے قومی وملی تعمیر وتنظیم کے لئے راستہ بنایا اور بتایا کہ اسلام، مذہبی غلامی کے سوا ہر قسم کی آزادی کے لئے ہے، وہ ملک گیری اور ملوکیت کے لئے نہیں بلکہ انسانیت وصداقت اور خلافت کے لئے ہے اور اس کا ہدف ہر قسم کی دہشت پسندی اور دادائیت کا خاتمہ ہے وہ سب کچھ یقینی طور پر ساتویں صدی عیسوی کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ کچھ یوں ہی بقائے دین و انسانیت کے لئے

امام عالی مقام نے جس طرح تہذیب کے ستون چہار گانہ کو عملی توازن سے آشنا فرمایا، حکمت کو افراط وتفریط یعنی چالاکی اور جہل سے بچایا، عدالت کے وصف کو ظلم کرنے اور ظلم سہنے کی منزلوں سے دور رکھا، شجاعت کو تہور اور بزدلی سے بچایا، نہ تو کوئی ایسی ترکیب استعمال کی جو محض حوصلہ مندوں کی تاریخ شجاعت کا ایک ورق ہو، نہ کوئی ایسا راستہ اپنایا جس سے محض ارضیت کی بو آئے اور نہ ہی فیصلہ کے نازک سے نازک ترین وقت میں بھی کسی ایسے طریقہ کی تلاش کی جس سے عزیمت میں کوئی کمی دکھائی دے اور نہ ہی عفت کو کبھی نفس کشی یا نفس پرستی جیسی افراط وتفریط کی باتوں کا شکار ہونے دیا اور بحیثیت مجموعی یہ سب کچھ یقیناً یہ بتانے اور سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کسی طرح بھی کم نہیں کہ قہر مانِ کربلا کا کردار، تہذیب وتمدن، حق پرستی اور انسان دوستی کی قدروں کو بچانے اور حال ومستقبل میں مستحکم، مفید اور متوازن بنانے کے لئے کیسی احتیاط، کیسے خلوص اور کیسی ہوشیاری و پامردی سے مسلسل کام لے رہا تھا۔

بیشک کربلا نے، اپنے سرخیل آعظم کے کردار اور ان کی شخصیت کے حوالے سے دنیا کو واضح طور پر بتایا ہے کہ مفید دین و انسانیت علم حقیقی کس کو کہتے ہیں، عدالت کا اعتدالی راستہ اور عفت کی متوازن صورت عملی کیا ہے نیز یہ کہ بقائے انسانی کی خاطر کہاں تلوار اٹھانا ضروری ہے؟ کربلا کا واقعہ بلاشبہ تاریخ عالم میں، استحفاظ و انسانیت کے بے مثال معرکہ ہے۔ اگر یہ مذہبی واقعہ ہے تو کہنا چاہئے کہ اس کا رشتہ بصورت اسلام، انسانیت کے سچے مذہب سے ہے اور اس کے کردار مسلک انسان دوستی کا عملی وفکری نمونہ پیش کرنے والے ایسے کردار ہیں جنھیں ہمیشہ کے لیے محسنین انسانیت وصداقت کا مرتبہ حاصل ہے۔ کربلا میں نمازِ حسینؑ کا حال کون نہیں جانتا۔ یہ نماز صرف حق پرستوں کو عبادت کا ذوق ہی نہیں بخشتی ہے بلکہ ذرا وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کا یہ تاریخی سجدہ ہمیشہ کے لئے انسانیت کی آبرو بن چکا ہے۔ کربلا کا واقعہ اگر ایک تاریخی واقعہ ہے تو بیشک اس کا رشتہ زندگی اور تہذیب و اخلاق کی بلند و بالا قدروں سے ہی وابستہ ہے اور ان مخلصانہ کوششوں سے ہے جنھیں بقائے دین وآدمیت کی کارگر مساعی جمیلہ کا نام دیا جانا چاہئے۔ اسی طرح اگر یہ ایک سیاسی واقعہ ہے تو پھر کہنا چاہئے کہ یہ ایسی بلند مرتبہ سیاست پر مبنی ہے جس کے نزدیک انسانیت بہ حیثیت انسان برابر ہے اور جو انسانیت دشمن شخصی حکومت کے جبریہ نظام کو ہمیشہ کے لئے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے۔ یہ محض ایک خیالی توصیف نہیں بلکہ کربلا کی سیاست کے اس مفہوم پر

مقام بیضاء میں حضرت امام عالی مقام کے خطبہ کا ایک ایک لفظ گواہ ہے۔ بلاشبہ، شہ کربلا کے کرار نے سیاست تمدن کے باب میں جس طرح سوئی ہوئی قوم کو چونکایا ہے، سوئے ہوئے دل ودماغ میں صداقت و انسانیت کے جذبات کو جگایا ہے، غلامانہ تمدن و معاشرت میں دلیرانہ اور مردانہ روح پھونک دینے کی جو کامیاب اور سنجیدہ و برجستہ سعی فرمائی ہے، اس راہ میں انسانیت اور مذہب کی بقاء وحفاظت کے لئے جیسا بے مثال استقرار و استمرار دکھایا ہے، جیسی ثابت قدمی اور جیسے استقلال وصبر کا مظاہرہ کیا ہے، جس طرح وقت کے تناظر میں، سدا کے لیے ''آزاد اسلام'' کی تاریخ لکھ دی ہے اور جس طرح خاموش انقلاب سے دنیا کو جگایا ہے وہ تاریخ انسانیت کا ایک ایسا روشن باب یا بہ کلمات دیگر انسانیت پر کربلا کے احسانات عظیم کی ایسی کہانی ہے جو کبھی بھلائی نہیں جاسکتی۔

غم حسینؑ اور یادِ حسینؑ کا مرتبہ اور اس کی برکت وفضیلت اپنی جگہ، لیکن کربلا کا واقعہ بہرحال صرف رونے کے لئے نہیں بلکہ رونے اور رلانے سے کہیں زیادہ سیکھنے، سمجھنے اور عمل کی دنیا بسانے کے لئے ہے۔ بقائے دین و انسانیت کی خاطر حریت پسندانہ، مزاج اور ظلم کے خلاف مخلصانہ اور پرامن احتجاج کربلا ہی کی دین ہے۔ کربلا نے بشریت کو ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنا اور ذلت کی پست زندگی کے بجائے عزت کی شاندار موت مرنا سکھایا ہے۔ اور حقوق انسانیت و صداقت کی راہ میں مصلحت اور خوف سے بچنے کا مثالی درس دیا ہے۔ کربلا کے واقعات گواہ ہیں کہ مکتب حق و انسانیت کا پیرو کسی بھی مرحلہ میں اپنے اصولوں سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ وہ اسی کے لئے جیتا ہے، اسی کے لئے مرتا ہے اور اسی کے لئے اپنی نسل کی بقا و تحفظ کو اہمیت دیتا ہے۔ کربلا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ظلم برداشت کرنا، اصولوں سے انحراف کی صورتیں دیکھتے رہنا اور ان کے خلاف آواز نہ اٹھانا صرف دین سے غداری نہیں بلکہ انسانیت سے بھی بڑی غداری اور اس کی مسلسل پامالی کے مترادف ہے۔ مشرب اسلام و انسانیت کے ماننے والوں اور اس کے تقاضہ پر چلنے والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ پست ترین ماحول میں رہ کر بھی اپنی عالی ہمتی اور اپنے فرائض منصبی کو کبھی اور کسی حال میں بھی بھولتے نہیں ہیں بلکہ بہمہ صورت وہ حق و انسانیت کی بقا و فلاح کے لئے باطل کے چہرے سے سچائی کی جھوٹی نقاب اتار دینا چاہتے ہیں اور پیروان حق و انسانیت کے لئے اپنے کردار کا روشن نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک کرکے ان کے سرتن سے جدا کردیئے جاتے ہیں۔ وہ جنگ میں ظاہری مورچہ پوری طرح ہار جاتے ہیں لیکن ان کا خلوص اور ان کی مقصدیت انھیں ابدی فاتح بنادیتی ہے

اور ان کی یہ قربانی حق وصداقت، آزادی وحریت، امن و انسانیت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں نہایت ہی عظیم الشان اور بے بدل انسانی قربانی بن جاتی ہے۔

کربلا کی لڑائی اگر چہ کہنے کو محض چند گھنٹوں کی لڑائی ہے لیکن اس میں بہرحال دورائے نہیں ہوسکتی کہ کربلا نے راہِ دین و انسانیت میں ایک سے بڑھ کر ایک مثالیں قائم کی ہیں۔ کربلا اور امن و انسانیت کا رشتہ بہمہ لحاظ ابدی و لاینفک ہے۔ میدان کربلا میں اگر اعزہ و اقارب اور رفقائے سفر کی شہادت پر صرف صبر کا مظاہرہ ہی نہیں ہوا بلکہ شکر کے سجدے بھی بجالائے گئے ہیں تو وہ یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ حفظ دین و انسانیت کی راہ میں جان و مال کا خسارہ مصیبت نہیں بلکہ اگر مقبول بارگاہ ہوجائے تو ایک بڑی نعمت ہے اس میدان میں اگر حضرت امام حسینؑ بعض روایت کے بموجب خطبہ کے لئے اونٹ پر تشریف فرما ہوئے جو کہ اس دور میں ''امن و آشتی کی سواری'' تھی تو یہ بھی امن و انسانیت سے کربلا کے رشتہ کا ایک بین ثبوت ہے اور اگر یہ روایت متفقہ نہ ہو اور امام عالی مقام نے گھوڑے سے ہی کام لیا ہوتو اس سے نفس مطلب پر فرق نہیں آتا کہ اسے تو خطبۂ امام کے مضمون کا حرف حرف پوری طرح روشن کردیتا ہے۔'' تاریخ کامل ابن اثیر'' میں جو عبارت آئی ہے اس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے کہ فرمایا "وانا احق من غیر" یعنی انسانیت اور مذہب دشمن فضا کو بدلنے کا سب سے زیادہ حق میں رکھتا ہوں۔ سچی بات یہی ہے کہ امام عالی مقام نے خصوصیت کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کرکے انسانیت پر جو منت و احسان فرمایا ہے اور اس طرح کربلا نے انسانیت کی حفاظت و بقا کا جو پیغام دیا ہے۔ وہ یقیناً نافراموش شدنی ہے۔ کربلا نے دنیا کو سکھایا ہے کہ مذہب اور انسان دوستی کی راہ بقا میں یقین کی قوت سب سے بڑی قوت ہوتی ہے۔ جو نفوس عالیہ حق پسند اور انسانیت دوست ہوتے ہیں وہی اسمِ بامسمیٰ ہوتے ہیں۔ وہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ افراد کی کثرت اور مادی وسائل پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ ان کا بھروسہ اس ذات پر ہوتا ہے جس نے یہ کائنات بنائی ہے۔ بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے اور اسے اشرف المخلوقات بناکر دین و انسانیت کے تحفظ کی ذمہ داری سونپی ہے۔ واقعی یہ کربلا کے شہیدوں کا بڑا احسان ہے کہ وہ رہتی دنیا تک کے لئے ہمیں اپنے کردار سے روشن نمونہ دے گئے ہیں۔

کربلا کے صرف، مرد کرداروں کا ذکر نہیں بلکہ کربلا میں اور خصوصاً کربلا کے بعد، راہ انسانیت و صداقت میں عورتوں کا کردار بھی بہت ہی اہم نظر آتا ہے۔ انھوں نے حالت اسیری میں کربلا سے

کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک سینکڑوں میل کی طویل مسافت طے کی اور یزیدیت کو جس نے مورچہ جیت لیا تھا، جنگ ہارنے کا یقین دلا دیا۔ یزید کی بچی ہوئی حکومت ختم ہوگئی اور حسینؑ کی بچائی ہوئی انسانیت اور ان کا بچایا ہوا اسلام زندہ رہا۔ خواتین کربلا نے اپنے کردار سے ثابت کردیا کہ تحفظ انسانیت کی سرگرمیوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کا بھی اہم حصہ ہے۔ انسانیت اور انسان دوستی صرف مردوں کی جاگیر نہیں ہے اور وہ تہذیب سخت غلط فہمیوں کی شکار ہے جس نے انسان کا لفظ صرف مردوں کے لئے ہی مخصوص کررکھا ہے۔ کربلا کے بعد، خواتین کربلا نے جو کردار ادا کیا، بیشک اس کے نتیجے میں یزید اور یزیدی فوجوں کی انسانیت دشمنی بازار سے دربار تک عام ہوئی۔ گمراہ کن پروپیگنڈے سے متاثر ومرعوب ہوجانے والے دل و دماغ میں انسانیت کے جذبے جاگ اٹھے۔

بیشک داستان کربلا میں عورتوں کے انسانیت بداماں کردار کی اہمیت و اثر کے اعتراف سے انکار کا سوال ہی نہیں اٹھتا کہ کربلا میں مردوں کی شہادت کے بعد، اس بات کو ایک فوری زمینی حقیقت کے طور پر، عورتوں نے ہی اپنے کردار سے سامنے لایا ہے کہ حقیقی فتح مقصد کی فتح ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ کربلا کی کہانی صرف مردوں تک نہیں بلکہ عورتوں کے ذریعہ عورتوں تک پہنچی اور اس طرح پہنچی کہ خود یزید کی بیوی اس سے قطع تعلق پر آمادہ نظر آئی اور یزید کے بیٹے نے وقت آنے پر باپ کا تخت ٹھکرادیا۔ بظاہر وہ چند عورتیں تھیں لیکن دین و انسانیت کے تحفظ کی خاطر انھوں نے یزید کی بنائی ہوئی دنیا میں آگ لگادی، اموی حکومت نے انقلاب کی تعلیم دی، انسانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، یزید کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی دور کی اور جو ہزاروں کتابوں سے نہ ہوتا وہ انھوں نے اپنی روئیداد سفر سے عملاً کر دکھایا اور گویا کربلا اور انسانیت کی کہانی اس طرح عام ہوئی کہ اسے صرف موجودہ نسلوں نے ہی نہیں سنا بلکہ آنے والی نسلیں بھی کسی وقفہ کے بغیر، اسے نہ جانے کب تک اپنے اس پہلے مکتب میں سنتی رہیں گی جس کا نام ماں کی گود ہے۔

یہ انسانیت پر کربلا کا احسان نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کے بقا و تحفظ کی خاطر خواتین کربلا نے اپنے عزیز از جان رشتوں کی کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ اپنے شوہر، بھائی، بیٹے اور بھتیجوں کو میدان جنگ میں بھیجا، یکے بعد دیگرے ان سب کی شہادت کے بعد، بہ حالت اسیری ایک دوسرے انداز سے لڑائی کی کمان سنبھالی اور وقت کے ساتھ ساتھ مدینہ، کوفہ اور شام کی عورتیں دین و انسانیت کے تحفظ کی راہ میں امام عالی مقام کے مشن سے متاثر اور اس کی حمایتی نظر آنے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کمزوری

کا دوسرا نام ہے لیکن انسانیت اور دین کی صیانت کے باب میں خواتین کربلا نے اس مقولے اور اس مفروضے کو سرتاسر غلط ثابت کردیا۔ وہ کربلا اور اس کے معاً بعد، مردوں کی نفسیاتی قوت اور دشمن انسانیت یزیدیوں کے لئے نفسیاتی امتحان بن گئیں۔ دین و آدمیت کی خاطر یزیدیوں کی تلوار کا مقابلہ اگر مردوں نے کیا تو انسانیت پر خواتین کربلا کا یہ ابدی احسان ہے کہ انہوں نے حضرت زینب کی سربراہی میں یزید کے دربار کا سامنا کیا اور ایک بڑی مثال قائم کردی، یقیناً دین و انسانیت کی تاریخ کربلا کے نسوانی کرداروں کا یہ احسان بھلا نہیں سکتی کہ انھوں نے اس کی حفاظت و سربلندی کے لئے مصائب و آلام پر صبروضبط کی انتہا کردی، اپنے کسی عمل سے نہ تو جانبازوں کے لئے کمزوری کا کوئی نفسیاتی ماحول پیدا کیا اور نہ ہی ان کے رخصت ہوجانے کے بعد، ان کے مشن پر کوئی حرف آنے دیا بلکہ حوصلہ مندانہ شعوروتوازن کے ساتھ ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور اس کی معنویت اور مقصدیت ان کے درمیان بھی بخوبی مشتہر اور واضح کردی جو باطل پروپیگنڈے سے گمراہ یا مشکوک ہورہے تھے۔ بلاشبہ اس طرح بہ حیثیت مجموعی کربلا کے بلند مرتبہ نسوانی کرداروں نے جس انداز سے خدا ترسی، پرہیزگاری، خدمت گزاری، وفا شعاری، بے خوفی و بے غرضی، انسان دوستی اور صبرو استقلال کے جولا فانی نمونے پیش کئے ہیں وہ دین و انسانیت پر کربلا کے احسانات کا روشن اور موثر ثبوت ہیں۔

دین و انسانیت کی بقاء اور اس کے فروغ وتحفظ کے سلسلہ میں کربلا کے احسانات و اثرات کو اگر وسیع علمی وفکری اور سیاست عملی کے پھیلے ہوئے کینوس پر رکھ کر دیکھا جائے اور انسان دوستی اور اس سے متعلقہ مختلف النوع سیاسی و سماجی اور نظریاتی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ازروئے تواریخ و افکار سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ دین و انسانیت کے دشمن یزید اور اس کے حامیوں اور حواریوں کے رعب و دبدبے کی عام فضا جو اس وقت کے اسلامی ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ کم سے کم وقتوں میں ختم ہوئی اور اس کے خاتمہ میں کربلا کے نسوانی کرداروں کا حوصلہ خصوصیت سے کام آیا۔ اس طرح کربلا نے دین و انسانیت کی مخالفت اور معاندت میں ۶۱ھ/۶۸۰ء سے پہلے جو کچھ ہوا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے عوام وخواص تک پہنچادیا۔ تاریخ گڑھنے کی کوشش ناکام ہوئی۔ یزید کی خلافت نما ملوکیت کے راز کھلنے لگے اور یزید کا وہ شخصی اور سیاسی کردار بھی دنیا کے سامنے آگیا جس نے انسانیت کے بہی خواہوں کو تادیر غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا تھا، اس بات کا ثبوت دشمنان حسین کے بھیانک انجام سے ہی نہیں ملتا ہے بلکہ ان باتوں سے بھی ملتا ہے کہ یزید کے

خاندان میں اس کے بعد ہی حکومت ختم ہوگئی اور تھوڑی مدت کے بعد سہی بہرحال اموی حکومت بھی ختم ہوئی۔ بیشک اگر کربلا کا انسانیت دوستی سے موضوعاتی و مقصدی رشتہ نہ ہوتا تو اس نوعیت کے فیضان ہمارے سامنے نہ آتے۔

یہ محض ایک دعویٰ نہیں بلکہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کربلا نے دین و انسانیت کے حق میں ذہن سازی کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس نے ''آقائیت پسندی'' کا رجحان ختم کیا ہے۔ اس روش کا خاتمہ کیا ہے جسے ''من موجی رجحان'' کوتھوپنا کہتے ہیں۔ یہ امام حسینؑ اور شہیدان کربلا کا احسان ہے کہ انھوں نے یزید کے من مانے پن کا انجام دکھایا، انسانیت کو من مانے پن کی تباہی سے ہوشیار کیا۔ اور حصولِ مقصد کے لئے سنجیدگی، اصول پرستی اور ثبات قدمی سکھایا ہے۔ کربلا نے بتایا ہے کہ امن و آدمیت اور قوموں کی آزادی کے لئے مستحکم اور معتبر رویہ کس کو کہتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ مذہب کو، حکمرانوں کے استحصال کار طبقے اور استحصالی نظام کے تحفظ کی خاطر استعمال ہونے سے بچایا ہے بلکہ طفیلیت، خود پسندی، کیریرازم، کردارکشی اور لالچ کے خلاف سخت اور ثابت قدم رویہ اپنانے کی مثال بھی قائم کی ہے۔ کربلا نے فاشزم اور جارحیت کا قلع قمع کیا ہے، نازک ترین حالات میں بھی صنفِ نازک کو کئی بے معنی الزامی مفروضوں سے نجات دلایا ہے اور ائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے استعمال شدہ ذرائع کو عورتوں کے ذریعے ناکام بنایا اور ان کی طاقت کا احساس دلایا ہے، کربلا نے برسرِاقتدار قوت کی دہشت پسندانہ ڈکٹیٹرشپ کا خاتمہ کیا ہے۔ کربلا کے مابعد واقعات بتاتے ہیں کہ یزیدی دربار میں جو ایک قسم کی شادنیت پسندی پنپ رہی تھی اور دوسروں کی ہتک و نفرت کا جو پرچار ہورہا تھا، اس کا خاتمہ ہوا ہے اور مغروریت بداماں سماجی لفاظی کے حد سے زیادہ بڑھ چڑھ کر استعمال پر روک لگی ہے۔ کربلا نے جمہوری آزادی کا پیغام یاد دلایا اور اس کی بحالی کا راستہ کھولا ہے، انسانیت کو سیاسی غلامی سے نجات پانے کا ذہن دیا ہے، بین الاقوامی اختلافات اور مسائل و معاملات کو طاقت کے استعمال کی دھمکی سے نہیں بلکہ بات چیت سے دور کرنے یا حل کرنے پر آمادگی اور اس کے لئے آخری کوشش کی واضح مثال قائم کی ہے اور مذاکرات کی اہمیت وضرورت کا احساس دلایا ہے، بلاشبہ یہ سارے اثرات، انسانیت پر کربلا کے وسیع و وقیع احسانات ہی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کربلا کا یہ احسان یقیناً ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے نری سامراجیت اور شہنشاہیت کو پنپنے کا راستہ مسدود کردیا یہ اور زمانے کے فکری بحران، ذہن کے انتشار اور لامرکزیت کے ماحول میں، فکر

کے بکھراؤ اور الجھاؤ یعنی ''خواہشات'' سے فکر کی مرکزیت یعنی دین اور انسانیت کی طرف لایا ہے جو تہذیب افکار کی تاریخ میں بجائے خود ایک مثال ہی نہیں بڑی عمدہ مثال ہے۔ کربلا نے دہشت گردی اور دہشت پسندی کا راستہ بند کیا ہے، یزیدیت یعنی شیطنیت کے غرور کی شان کو خاک میں ملا دیا ہے۔ کربلا نے سکھایا ہے کہ دین کے پابند بنو، انسانیت کی پاسداری کو اپنا شعار بناؤ اور یہ سب نہ سہی تو کم سے کم دنیا میں آزادی پسند اور انسان دوست بنو اور بہرحال دوسروں کے ایسے غلام نہ بنو کہ اپنی ساری غیرت وحمیت کھو دو۔ بیشک کربلا کی معنویت مسلم ہے کہ کربلا نہ ہوتی تو حکومت کی اس شکل کو جواز مل جاتا جو موروثی اور مطلق العنان بادشاہت کہلاتی ہے۔ اسی طرح ''انفرادیت پرستی'' یعنی فرد کے حقوق کو مطلق قرار دینے اور اسے سماج کا مدمقابل بنا کر پیش کرنے کے نظریہ کو اسلامی تاریخ سے جواز مل جاتا، دولت کی حرص، غرور، خودغرضی، اجتماعیت کی مخالفت و ناقدری جیسی وہ برائیاں پھیلتیں جو انفرادیت کی باقیات ہیں۔ بیشک کربلا نہ ہوتی تو مجاہدین اسلام و انسانیت کے لئے اسلامی تاریخ میں بہ انداز خاص حوصلہ افزائی کے لئے کوئی عملی نمونہ نہ ہوتا، جہاد اور انسانیت وصداقت کی خدمتوں سے جان چرانے والوں کو تلاش سکون کا عمدہ بہانہ ہاتھ آ جاتا۔ اسلام اُسی وقت سے عرب میں محدود ہوجاتا، دین و آدمیت کے لئے تبلیغی عزم و ہمت ختم ہوجاتی، اظہار حق وحریت میں بے باکی رخصت ہوجاتی، کلیات اسلام اور علی الخصوص اسلام کے نظریۂ امن وحریت اور انسان دوستی پر پانی پھر جاتا۔ بیشک کربلا نہ ہوتی تو حسینؑ کا خاندان نہ لٹتا، ان کے جانباز ساتھیوں کا خون نہ بہتا، مگر انسانیت نوازی کے لحاظ سے، عوام کے دلوں سے دینی فکر وعمل کی وقعت ختم ہوجاتی، دین کی آبرو لٹ جاتی، انسانیت کی قدروں کا خون ارزاں و عام ہوجاتا۔ کربلا نہ ہوتی تو آج دنیا کا نقشہ ہی بدل چکا ہوتا، حق و صداقت اور دین و انسانیت کی آواز دبتی اور دبتی ہی چلی جاتی اور دین و انسانیت کی خدمت وحفاظت کے مواقع کو، مصلحت کے نام پر موخر کردینے کی مستقل روایت قائم ہوجاتی۔ بلاشبہ کربلا کے، دین و انسانیت پر احسانات، ہماری توقعات اور حدود شمار سے کہیں زیادہ ہیں مگر ان کے اعتراف کی حقیقی راہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کربلا کے پیغام حق و انسانیت پر صدق دل سے عمل کیا جائے۔

امروہہ میں عزاداری: تاریخی پس منظر اور صورت حال

سید غلام حیدر

امروہہ کو اگر 'امروہا' لکھا جائے تو کربلا کا ہم عدد (۲۵۳) ہوتے ہوئے وہاں کے عزاداروں کو ایک اور باعث افتخار خصوصیت حاصل ہوجاتی ہے اس لئے یہاں عزاداری کے بارے میں ۲۰۰۳ء میں راقم الحروف نے لکھا تھا:

''غالبًا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امروہہ کی آبادی کی پوری معاشی، سماجی زندگی عمومی طور پر، اور شیعہ آبادی کی خصوصی طور پر، محرم کے محور پر یا اس کے چاروں طرف گھومتی ہے...... عام طور پر شادیاں تک ذی الحجہ کے مہینے (کے آخری دنوں) میں ہوتی ہیں تا کہ......شرکت کے فوراً بعد...... باہر سے آئے ہوئے لوگ محرم میں بھی آسانی سے شریک ہوسکیں...... ان دس دن میں ایسے عزیز و اقربا سے ملاقات کی صورت پیدا ہوجاتی ہے جنہیں برسوں پہلے کبھی دیکھنا نصیب ہوا تھا''۔[۱]

یوں تو ہندوستان کے گوشے گوشے میں عزاداری کی جاتی ہے اور ہر ہر قریے تک میں اپنی مخصوص رسوم، پابندیاں اور ضوابط ہیں، اور ہر جگہ کے عزادار اپنے ہی طریقوں کے عادی ہیں، جو وحدت میں کثرت کا ایک غیر معمولی مظہر بھی ہے۔ مگر امروہہ کی عزاداری کی کچھ خصوصیات دوسری جگہوں سے قدرے مختلف محسوس ہوتی ہیں۔ نیچے بیان کی گئی اجمالی تفصیلات سے اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پروفیسر عزیزالدین کے اس بیان سے کہ:

''جہاں تک اس قصبے کا تعلق ہے، شمالی ہندوستان میں عزاداری کے سلسلے میں یہ لکھنؤ کے بعد اگلے درجے پر آتا ہے''۔[۲]

یہاں کی عزاداری کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

تاریخ واسطیہ (تاریخ امروہہ، مطبوعہ ۱۳۰۸ھ) میں باقاعدہ امام باڑوں کی تعداد ۵۰ بتائی گئی

۱۔ مطبوعہ کتابچہ بعنوان 'امروہہ کی عزاداری، اہمیت اور مستقبل کی فکر'، غلام حیدر ۲۰۰۳ء، ص ۲

۲۔ پروفیسر عزیزالدین حسین Medieval Towns-A Case stUdy of Amroha & Jalali 1995، ص ۲۳

ہے۔[1] جو ۲۷-۱۳۲۶ھ میں ۲۷ یا ۴۷ ہوگئی۔[2] یہ وہ امام باڑے ہیں جو قدیم ہیں اور شیعہ وقف بورڈ میں باقاعدہ رجسٹرڈ ہیں۔ ان میں وہ چھوٹے امام باڑے شامل نہیں ہیں جو بہت سی خواتین محرم کی چاند رات سے ۸ ربیع الاول تک پابندی سے اپنے گھروں میں سجاتی ہیں اور روزانہ وقت مقررہ پر نوحہ خوانی اور ماتم کرتی ہیں۔ مولانا محمد سیادت، موجودہ امام جمعہ و جماعت کے بیان کے مطابق امام باڑوں کی کل تعداد تقریباً ۱۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔[3] ایک قصبے کے چھوٹے بڑے ۳۱ محلوں میں رجسٹرڈ امام باڑوں کی اتنی بڑی تعداد غالبًا پورے ملک میں ملنا مشکل ہے۔

تاریخ

یہ قصبہ، جو اب کچھ عرصے سے ضلع میں تبدیل ہوکر 'جیوتبیا پھولے نگر' ہوگیا ہے، گوکہ اس سے امروہہ خاص کے نام، تہذیبی نقوش اور عام رہن سہن میں بہت کم فرق رونما ہوا ہے، دہلی سے شمال مغرب میں ۱۳۶ کلو میٹر کی دوری پر بڑی قدیم بستی ہے۔ محمود احمد عباسی نے مرادآباد گزیٹر کے حوالے سے[4]، اور پروفیسر عزیزالدین حسین نے امپیریل گزیٹر آف انڈیا (کلکتہ ۱۹۰۸ء) کے حوالے سے امروہہ[5] کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے بنسی خاندان کے راجہ جودھ نے جو ۴۷۴ ق م میں تخت نشیں ہوا تھا، آباد کیا تھا۔ سالار مسعود غازی نے ۱۱۹۳ء میں امروہہ کو فتح کرکے مسلمانوں کا تسلط قائم کیا۔[6] غیاث الدین تغلق (۱۳۲۵-۱۳۲۰) کے دور میں سہروردی سلسلے کے ایک بزرگ سید شرف الدین حسین شاہ ولایت (جن کی اولاد وہاں ابھی تک نقوی سید کی حیثیت سے آباد ہے) امروہہ تشریف لائے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اسے ایک 'چھوٹا خوبصورت شہر' ہے کہا ہے۔ سلطنت دور میں امروہے کا ذکر لگ بھگ متواتر نظر آتا ہے۔ مغل دور میں خصوصاً اس میں بڑے بڑے منصبدار اور جاگیردار ہوئے اور سید محمد میر عدل قاضی القضات جیسے عہدے پر فائز نظر آئے۔ بہت بڑی تعداد میں بڑی بڑی مافیہات اور جاگیریں عطا ہوئیں اور اس بستی میں علم و فضل، دولت و ثروت، شعر و سخن، تہذیب و تمدن کا چرچا رہا، جس میں عزاداری کا خصوصی دخل بعد کے شواہد سے صاف محسوس ہوتا ہے۔

۱- تاریخ واسطیہ، رحیم بخش ۱۳۰۸ھ، ص ۲۰ ۲- امروہہ کے عزاخانے (تاریخ تفصیل کوائف)، علی عباس نقوی، ص ۷-۱۵
۳- ایضاً، ص ۲۲ ۴- تاریخ امروہہ، محمود احمد الہاشمی العباسی، مطبوعہ ۱۹۳۰ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵، ص ۲۶
۵- پروفیسر عزیزالدین حسین، ص ۱۱ ۶- ایضاً، ص ۱۱ ۷- محمود احمد عباسی، ص ۳۶، ۳۵

عزاداری کی ابتدا

گوکہ کسی بنیادی ماخذ سے امروہہ میں عزاداری کی ابتدا کی کوئی تاریخ متعین کرنا ممکن نہیں ہے مگر موجودہ رسوم و روایات اور سینہ بسینہ منتقل ہونے والی عام روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امروہہ کی عزاداری کی جڑیں کئی صدیوں پیچھے تاریخ میں ملیں گی۔ عزاداری کے دو اہم ترین مظاہر، مجالس عزا اور جلوس عزا یعنی علموں اور تعزیوں وغیرہ کے جلوس میں سے جزو اول کی ابتدا بلکہ اس روایت کی مستقل موجودگی تو غالباً سید شرف الدین شاہ ولایت کے دور میں بھی رہی ہوگی چونکہ صوفیا حضرات اس قسم کی مجالس میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے اور شاہ ولایت خود دسویں امام حضرت علی نقی علیہ السلام کی نویں پشت میں تھے۔ بہرصورت جہاں تک جلوسوں یا عوامی اظہار کا سوال ہے وہ یقیناً بہت بعد میں شروع ہوا۔ امروہہ کی تاریخ سے متعلق دو تین پرانی کتابوں (تاریخ واسطیہ، تاریخ اصغری اور نخبۃ التواریخ) میں عزاداری کی ابتدا ایک درویش شاہ مسکین سے منسوب کی گئی ہے جنہیں ڈاکٹر امام مرتضی نقوی نے محمود احمد عباسی کے حوالے سے گیارہویں صدی ہجری کی شخصیت بتایا ہے، جو اورنگزیب عالمگیر کا دور (۱۰۶۶ تا ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء) تھا۔[۱] امروہہ کے سب سے قدیم "چاند سورج کے امام باڑہ" میں ایک قبر بھی انہی بزرگ سے منسوب ہے۔ چاند سورج کے امام باڑے (محلہ قاضی زادہ) امروہہ کے متعلق تاریخ واسطیہ نے لکھا ہے:

"یہ امام باڑہ قدیم ہے جو سید ناہر اور سید فیض کے نام سے مشہور ہے۔ یہ امام باڑہ عہد جلال الدین اکبر بادشاہ کا پایا جاتا ہے۔ اول امروہہ میں یہی امام باڑہ بنا ہوا تھا۔ زمانۂ ماضیہ میں کل شہر کے سادات و دیگر اشخاصِ مذہبِ شیعہ، مجتمع ہوکر اسی امام باڑے میں تعزیہ داری اور ماتم داری کرتے تھے"۔[۲]

علی عباس نقوی صاحب نے بھی اپنے شواہد اور زبانی روایات کی روشنی میں اس امام باڑے (ادارے) کی عمر ۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء سے (ہجری سال کے اعتبار سے) لگ بھگ پونے چار سو سال بتائی ہے جس کے لیے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کا حوالہ دیا ہے:

چون ناہر و فیضِ ذی مراتب این بیتِ عزا قیام دادہ
کل اہل محلہ بعدِ صد سال بنیادِ عمارتش نہادہ

۱- امروہہ کی عزاداری، مضمون ڈاکٹر امام مرتضی نقوی، ماہنامہ آج کل، دسمبر ۱۹۷۹ء ۲- منشی رحیم بخش، تاریخ واسطیہ، ص ۳۸۷

تاریخِ بنا بگفت ہاتف این بابِ نجات بر کشادہ[1]

۱۰۵۲ھ

ان بیانات سے اور امروہہ کے بزرگوں کی بیان کردہ روایات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امروہہ کے وہ مخصوص 'علموں کے جلوس' (جن کا ذکر بعد میں آئے گا) اسی دور سے شروع ہوگئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو صاحب تاریخ واسطیہ جنہوں نے امروہہ میں ہونے والی عزاداری اور امام باڑوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے وہ اس کا ضرور اظہار کردیتے۔

مجالس عزا

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ہندوستان میں عام طور پر عزاداری کے دو طریقے رائج ہیں۔ مجالس عزا اور تعزیوں اور علموں وغیرہ کے جلوس۔ دنیا کی تاریخ عزاداری میں ابتدائی اور بنیادی نکتہ مجلس عزا کا قیام ہے۔ ایسی روایات موجود ہیں کہ واقعۂ کربلا سے پہلے بھی جناب رسولؐ خدا، جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، اور حضرت علیؑ نے واقعۂ کربلا کا ذکر اور اس پر گریہ فرمایا ہے۔ بہرطور، مجلس عزا کے عنوان سے سب سے پہلی وہ مجالس ہیں جو اس سانحے کے ظہور پذیر ہونے کے بعد جناب زینب نے شام میں برپا کیں جن میں شروع میں صرف افراد خاندان اور پھر کچھ اور خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے بعد چوتھے امام، مظلوم کربلا حضرت امام زین العابدینؑ نے مردانی مجالس کی ابتدا کی اور پھر تمام ائمۂ معصومین، اور اس کے بعد لگ بھگ عام شیعہ گھرانوں، بہت سے غیر شیعہ حضرات، بلکہ غیرمسلم حضرات نے بھی اس سلسلے کو نہاں یا عیاں صورت میں جاری رکھا۔

امروہہ میں ہر چھوٹے بڑے امام باڑے میں اپنے اپنے مقررہ وقت پر محرم کی مجلسیں منعقد ہونا عزاداری کا لازمی جزو ہیں۔ ڈاکٹر امام مرتضٰی نے لکھا ہے کہ ۲۵ ذی الحجہ سے ۸ ربیع الاول تک ۷۲ دن مجالس کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جن میں ۲۵ سے رویت ہلال تک کے دنوں میں عام طور پر زنانی مجالس ہوتی ہیں[2]۔ ۱۰ محرم تک کی مجالس میں چھوٹے امام باڑوں میں محلے کے چند گھروں کے افراد شامل ہوتے ہیں جبکہ شہر میں لگ بھگ ایک درجن امام باڑے ایسے ہیں جہاں بڑی مجالس ہوتی ہیں اور ان میں خاصی بڑی تعداد میں مؤمنین شرکت کرتے ہیں۔ علموں کے جلوسوں کے اوقات کی پابندی کی وجہ سے ان مجالس میں، جو صبح نو بجے سے پہلے یا رات کو ہوتی ہیں، مجمع کافی ہوتا ہے لیکن دن

۱- علی عباس نقوی، ص ۱۳۱ ۲- ڈاکٹر امام مرتضٰی، مضمون آج کل، دسمبر ۱۹۷۹ء

کے باقی حصے میں جو مجالس ہوتی ہیں، ان میں اس لیے کم لوگ شرکت کرتے ہیں کہ علموں کے جلوس میں شرکت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

دس محرم کو دن میں بہت سے امام باڑوں میں مجالس ہوتی ہیں اور لوگ اعمال عاشورہ سے پہلے اور بعد میں، جہاں موقع ہوتا ہے، مجلس میں شرکت کرتے ہیں۔ روز عاشورہ کو چونکہ تمام امام باڑوں کی آرائش و زیبائش صبح ہوتے ہوتے بڑھادی جاتی ہے اس لیے امام باڑوں کے کم و بیش بے فرش و شامیانہ ماحول میں یہ مجالس بہت پراثر ہوتی ہیں اور ان اجڑے اجڑے امام باڑوں کو دیکھتے ہی خود بخود آنکھیں بھر آتی ہیں۔ نماز ظہر اور عصر کے درمیان مختلف امام باڑوں میں بہت سے معجزہ نما قدیم تبرکات کی زیارت اور ماتم ہوتا ہے جس میں ایک تسبیح کی زیارت، جس کے مختلف دانے سرخ ہوجاتے ہیں، خصوصی اہمیت رکھتی ہے اور شہر اور بیرون شہر کے مومنین بڑی تعداد میں اس کی زیارت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر سوزخوانی اور منبر پر بیان دونوں بے حد متاثر کن اور حزن افزا ہوتے ہیں۔

شب عاشور، اول وقت، شہر میں کئی مجلسیں شام غریباں کے عنوان سے ہوتی ہیں جن میں پورا ماحول کم و بیش بالکل تاریک ہوتا ہے۔ اعمال عاشورہ، تعزیوں، تربتوں، ضریحوں کے جلوسوں میں دن بھر شرکت، تبرکات کی زیارت سے پیدا ہوئی حزن و ملال کی کیفیت، فاقہ کشی کے بعد دن بھر کی تھکاوٹ اور واقعۂ کربلا کی جزوی تفصیلات کے تصور کے ساتھ دسویں رات کی نامکمل سی چاندنی میں یہ مجالس بے حد پُراثر ہوتی ہیں اور دل اتنا بجھا بجھا سا ہوتا ہے کہ طبیعت خود بخود مائل بہ گریہ ہوتی ہے۔

محرم کی مجالس میں تبرک ضرور تقسیم ہوتا ہے اور اس کی مالی ذمے داری محلے کے خاندانوں پر منقسم ہوتی ہے۔ دوسرے مسلکوں کے نسبتاً کم مایہ خاندانوں کے بچے خاصی بڑی تعداد میں ان مجالس میں شریک ہوتے رہے ہیں اور ان کی شرکت سے پیدا ہونے والے تھوڑے بہت غیر ضروری شور وغوغا کو ہمیشہ برداشت کیا جاتا ہے۔

چہلم تک اور ربیع الاول کے پہلے عشروں میں امروہہ میں بہترین مجالس ہوتی ہیں۔ ان کی چند خصوصیات میں، پورے ملک سے بلائے گئے بہت اچھے ذاکرین اور علماء کے علمی اور دینی خطابات، بڑی تعداد میں مومنین کی شرکت، تبرک کا تقسیم نہ کیا جانا وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر امام مرتضی صاحب نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں ان مجالس کی محلّہ وار تفصیلات دی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ

۱۱ محرم تا ۲۰ صفر گیارہ محلوں میں یہ مجالس ہوتی ہیں اور ہر مجلس میں سیکڑوں سے زیادہ مؤمنین شرکت کرتے ہیں۔ چونکہ ان مجالس کا ماحول خالص علمی، دینی یا ادبی ہوتا ہے اس لیے ان سے لوگ زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹ اور ۲۰ صفر کی لگ بھگ صبح تک مجلس، نوحہ خوانی اور ماتم میں گزرتی ہے۔

علموں کے جلوس کی ابتدا

گوکہ کسی ماخذ سے علموں کے جلوس کی ابتدا کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے پھر بھی پچھلی نسل کے بزرگوں کا خیال یہی تھا کہ اس کی ابتدا خود مسکین شاہ نے کی۔ گوکہ کچھ عرصے اس کی ابتدائی شکل غیر منظم اور غیر مستحکم سی رہی ہوگی مگر رفتہ رفتہ اس قدر مستحکم ہوتی چلی گئی کہ اب اس کی معمولی سے معمولی جزئیات بھی ایک پختہ روایت کی شکل اختیار کرچکی ہیں۔ متفقہ رائے یہی ہے کہ امروہہ میں تعزیوں کے جلوس سے قطع نظر جو کسی نہ کسی صورت میں اس سے پہلے بھی رہا ہوگا، علموں کا جلوس سب سے پہلے محلہ قاضی زادہ، مسکن و مدفن مسکین شاہ سے ۸ محرم کو شروع ہوا۔ امروہہ کے علموں کا جلوس تعزیوں کے عمومی جلوس سے خاصہ مختلف ہوتا ہے جس کا اندازہ نیچے دی ہوئی تفصیلات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

راقم الحروف نے ۲۰۰۳ء میں اپنے ایک کتابچے میں اس جلوس کے بارے میں مندرجہ ذیل تاثر قلمبند کیا تھا:

"اگر ہم پورے جلوس کے ایک ایک جزو پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اسے کچھ اس طرح منظم کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے کے ذہن پر اظہارِ غم کے باوجود کسی قسم کی ہلچل، گہما گہمی یا اضطراب و بے چینی کا تاثر نہ پیدا ہو بلکہ ایک خاموش مگر گہرے حزن و ملال کا اثر پڑے، کسی قسم کے تماشے یا ظاہر داری (شو) کی سی کیفیت پیدا نہ ہو"۔[۱]

علموں کا جلوس مندرجۂ ذیل حصوں پر مشتمل ہوتا ہے:

۱- اونٹوں کی قطار، ۲- پہلا ماتمی باجا، ۳- آرائش، ۴- حسینی باجا، ۵- علموں کی جوڑیاں، ۶- تخت، ۷- سلامی علم، ۸- ذُلدل، ۹- دورہ، ۱۰- رضا کاروں کی صف، ۱۱- پانی، طبی امداد کی گاڑی اور ایمبولینس

ان حصوں کے مختصر تعارف کے بغیر جلوس کی اس مجموعی کیفیت اور تاثر کو سمجھنا مشکل ہے جو اس

۱- غلام حیدر مطبوعہ کتابچہ ۲۰۰۳ء، ص ۲۶

سے مجموعی طور پر پیدا ہوتا ہے چونکہ ان میں بعض نام اب اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، ان اصطلاحوں کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- **اونٹوں کی قطار:** یہ کربلائی قافلے کی یاد تازہ کرتی ہے اور پندرہ بیس اونٹوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے آگے والے اونٹ پر ایک سیاہ عماری ہوتی ہے جو کربلا کے سفر کی ابتدا میں خواتین کے پردے کے انتظام کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے پیچھے اونٹوں پر جو بچے یا نوجوان بیٹھتے ہیں وہ دن بھر نان یا بسکٹ وغیرہ بطور 'توشہ' تقسیم کرتے ہیں۔

۲- **پہلا باجہ:** یہ دو تاشوں اور ڈھول پر مشتمل ہوتا ہے اور اسے پیشہ ور لوگ یا ان کے بچے بجاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب یہ عمل موروثی سا بن گیا ہے اور یہ لوگ اجرت سے زیادہ عقیدت کے جذبے کے تحت باجا بجاتے ہیں۔

۳- **آرائش:** امروہہ میں یہ لفظ محرم کے سیاق میں خالص اصطلاح بن چکا ہے اور کسی باہر کے شخص کے لیے پورے جلوس میں یہ سب سے زیادہ متاثر کرنے والا حصہ ہوتا ہے۔ اس میں کم سے کم دو یا تین روشن چوکیاں[۱] ہوتی ہیں اور جس محلے کی طرف سے یہ علم اٹھائے جاتے ہیں اس کی مالی کیفیت کے مطابق لگ بھگ بارہ سے بیس بائیس تک دوسرے خوبصورت عدد ہوتے ہیں جو دستکاری اور اظہار عقیدت کے بہترین نمونے ہوتے ہیں۔ ان میں ضریح نما تخت، پالکیاں، نالکیاں، گہواروں کی شبیہیں، پھولوں، یا تازی ہری گھاس سے بنے ہوئے تخت، بہترین خرادی دستکاری کے نمونے (جس کے لیے امروہہ صدیوں سے مشہور ہے) قیمتی کپڑوں اور کڑھائی، بنائی کے لاجواب نمونے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ روشن چوکی کے علاوہ ہر تخت کو کم سے کم دو، چار یا اس سے زیادہ کہار اٹھاتے ہیں۔

روشن چوکی ان میں سب سے بھاری عدد ہوتا ہے۔ اس میں دو افراد ایک یا دو مخصوص تالوں کی نوبت بجاتے ہوئے اور ایک شخص نفیری پر کسی پُرسوز نوحے کی معروف دھن بجاتے ہوئے پورے شہر میں گشت کرتے ہیں۔ کسی ایک روشن چوکی میں رکھی ہوئی دیگ سے پلاؤ تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱- روشن چوکی: وہ چار آدمیوں کا گروہ جو دولھا یا بادشاہ کی سواری کے ساتھ نفیری بجاتے ہوئے .....نوشہ کے قریب چلتا ہے۔ (فرہنگ آصفیہ)، ایک قسم کی باجے والوں کی چوکی۔ (نوراللغات)

امروہہ میں اسے غیر معمولی موٹائی کے دو بانسوں پر رکھ کر مضبوط جسم والے کم سے کم بارہ کہار کندھوں پر اٹھائے لیے چلتے ہیں۔ روشن چوکی کو مضبوط لکڑی کا شش پہل یا ہشت پہل ایک تخت کہا جاسکتا ہے جس میں نیچے پائے اور اوپر چھ یا آٹھ محراب داروں والی لکڑی کی دیواریں ہوتی ہیں جن پر اتنے ہی پہلوؤں کا ایک کلس دار گنبد ہوتا ہے۔ اسے لکڑی کے نازک خرادی کام سے مزین بھی کیا جاتا ہے۔

۴-**حسینی باجا:** اس میں دو تاشے کئی ڈھول اور کئی جھانج ہوتے ہیں اور دس دس، پندرہ پندرہ بجانے والے دو رویہ آگے بڑھتے ہیں۔ اس باجے کی دو یا تین مخصوص تالیں ہیں صرف انہی کو بجایا اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ اب اس میں یہاں تک نزاکت پیدا ہو چکی ہے کہ کس جگہ، اور امام باڑے میں جلوس کے داخلے اور واپسی کے وقت کون سی تال بجائی جائے گی۔ یہ بات بالکل طے ہے اور اس سے سرِ مو فرق ممکن نہیں ہے۔ گو کہ حسینی باجا بجانے والے عام طور پر بالکل موسیقی ناشناس افراد ہوتے ہیں مگر بچپن میں لگ بھگ ہر بچہ اسے سیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور دس بارہ برس کی عمر تک اکثر نوخیز اس میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ متواتر اور چشم دید روایات بتاتی ہیں کہ اب سے سو سوا سو برس پہلے تک یہ باجا بھی پیشہ ور میراثی وغیرہ (جو یہاں کے متمول افراد کی 'رعیت' کہے جاتے تھے) بجاتے تھے۔ کسی بات پر ان بن ہوئی تو شیعہ عزاداروں نے تاشے اپنے گلوں میں ڈال لیے، کچھ بعد میں معافی تلافی پر پہلا باجہ انہیں واپس کر دیا گیا مگر یہ اہم 'حسینی باجا' اپنے پاس ہی رکھا گیا۔

۵-**علم:** امروہہ میں خاص جلوس کے علم صرف دو طرح کے ہوتے ہیں ایک 'پھریرے کا علم' اور دوسرا 'تلواروں کا علم'۔ پھریرے کا علم ایک اونچی چھڑ اور سفید چادر سے بنایا جاتا ہے اور چادر پر خون سے مشابہ رنگ کے چھوٹے بڑے چھینٹے دے دیئے جاتے ہیں۔ کچھ دور سے دیکھنے پر لگتا ہے جیسے سفید چادر پر تازے خون کے دھبے پڑے ہوں۔ اوپر ایک چھوٹی سی سوکھی مشک اور تیر بھی باندھا جاتا ہے اور سب سے اوپر بھالے جیسی دھات کی ایک چمک دار 'بوری' (پھل) ہوتی ہے۔ یہ علم حضرت عباسؑ علمدار کے علم کی شبیہ ہوتا ہے۔ 'تلواروں کا علم' پانچ چھ میٹر اونچی ایک مضبوط چھڑ ہوتی ہے جس کے اوپری سرے پر ایک کمان (کمنٹھا) بندھی ہوتی ہے۔ کمنٹھے کے دونوں سروں پر دو تلواریں لٹکی ہوئی ہیں۔ کمنٹھے کے بیچ میں دو تیر ایک دوسرے پر 'کراس' رکھ کر باندھ دیے جاتے ہیں۔ سب سے اوپر ویسی ہی چمکدار 'بوری' ہوتی ہے جیسی پھریرے کے علم پر ہوتی ہے۔ یہ پچھلے دور کے ہتھیاروں کی شبیہ ہے۔ جلوس میں ان دونوں علموں کی کئی کئی جوڑیاں آگے پیچھے قطار میں ہوتی ہیں۔

۶-**تخت:** اصل میں یہ تربت یا قبر کی شبیہ ہوتی ہے جسے امروہہ میں 'تخت' کہا جاتا ہے۔ اس پر سفید چادر منڈھ کر اس پر خون جیسا رنگ چھڑک دیا جاتا ہے اور سرہانے کی طرف ایک عمامہ رکھ دیا جاتا ہے۔ اسے چار افراد کندھوں پر اٹھائے ہوتے ہیں اور یہ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ جب اسے گھروں میں خواتین کی زیارت کے لیے لے جایا جاتا ہے تو اسے محلے کے سات آٹھ سال کے بچے اپنے

کندھے پر اٹھاتے ہیں، مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو ان کی زندگی اور صحت وسلامتی کے لیے اس کے نیچے سے نکالتی ہیں اور شیعہ حضرات سے زیادہ سنی حضرات اور کچھ ہندو حضرات بھی بڑی عقیدت سے یہ عمل انجام دیتے ہیں۔

۷- **ذُلذُل:** یہ خوبصورت، صحتمند، بالکل سفید گھوڑا ہوتا ہے۔ امروہہ میں بیک وقت دو یا تین گھوڑے، جنہیں لوگ منت کے طور پر نذر کرتے ہیں، مستقل پالے جاتے ہیں اور ایک اچھا گھوڑا پالنے کے تمام لوازمات عقیدتمندی کے ساتھ پورے کیے جاتے ہیں۔علموں کے لیے ذُلذُل کو ایک سرخ رنگ چھڑکی ہوئی چادر، ایک عمامہ، تمام ساز اور زیور وغیرہ سے سجایا جاتا ہے۔کبھی کبھی اس کے ایک طرف تلوار اور ڈھال بھی لٹکائی جاتی ہے۔ ۲۵ ذی الحجہ سے گھوڑے پر صرف ایک چادر ڈال کر تمام امام باڑوں، ڈیوڑھیوں اور صحنوں میں گشت کروائی جاتی ہے تاکہ دوران جلوس اسے لگ بھگ ۱۵۰ مختلف جگہوں پر جانے، چھوٹے چھوٹے دروازوں میں داخل ہونے، ایک دو سیڑھیاں پھلانگنے، پتلے پتلے موڑوں میں مڑنے اور گھومنے کی عادت ہوجائے۔ عام طور پر یہ گھوڑے اتنے نرم مزاج ہوجاتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے، جوان میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں، انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ راقم الحروف کی لگ بھگ ساٹھ پینسٹھ سال کی یاد میں کوئی قابل ذکر حادثہ نہیں ہوا۔ البتہ ایک گھوڑا بوڑھا اور بیمار ہوکر جب ۱۱ محرم کو مرا تو اس کے مردہ جسم کو شہر میں گشت کے بعد دفن کیا گیا۔

۹- **دورہ:** یہ لفظ ان عزاداروں کے لیے ایک اصطلاح بن گیا ہے جو علموں کے جلوس میں شرکت کرتے ہیں۔ امروہہ میں محرم کے تمام جلوسوں میں شامل تمام عزادار، خواہ کسی حیثیت کے ہوں، ننگے سر اور ننگے پیر اور بہت سے لوگ سیاہ کرتے وغیرہ میں ملبوس ہوتے ہیں، صرف بہت بوڑھے لوگ، بیمار یا مولوی حضرات کسی قدر احساس خفت اور عذر خواہی کے انداز میں بہت معمولی سے چپل پہنے بالکل پیچھے یا ایک کنارے پر چلتے ہیں۔ پورے شہر میں ان دنوں میں 'میر صاحبان' کی یہ شناخت بن چکی ہے کہ وہ ننگے سر اور ننگے پیر نظر آتے ہیں۔شہر کے عام لوگوں پر اس کا ایک عجیب سا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ فوج کے کرنل، ایئر فورس کے پائلٹ، بڑے بڑے رؤسا، مشہور شخصیتیں (جیسے کمال امروہوی، صادقین آرٹسٹ، رئیس امروہوی، جون ایلیا مرحومین وغیرہ) شہر میں ننگے پیر، ننگے سر نظر آتے ہیں۔ اس روایت میں جما دینے والی سردی، شدید تپتی بھنتی گرمی، اچھی بری سڑکیں، اور برسات کی کیچڑ اور گندگی کوئی فرق پیدا نہیں کرتیں۔

دروہ، جس کی تعداد خصوصاً صبح و شام کے وقت تین چار ہزار اشخاص سے بھی تجاوز کر جاتی ہے وہ پانچ سے سات آٹھ عزاداروں کی علاحدہ علاحدہ صفوں پر مشتمل ہوتا ہے جس کا ہر شخص بائیں ہاتھ سے اپنے بائیں ساتھی کی کمر پر کرتے یا شیروانی کو پکڑے رہتا ہے تاکہ صف کی تنظیم قائم رہے۔ آج بھی کچھ بزرگ کمر پر کالا یا ہرا رومال باندھے نظر آجاتے ہیں جو کچھ عرصے پہلے تک محرم کی لباس کا ایک جزو مانا جاتا تھا۔ اس طرح عزاداروں کی سیکڑوں صفیں ایک دوسرے کے پیچھے ایک خاص درمیانی فاصلہ بنائے آگے بڑھتی ہیں جن میں جوان، بوڑھے، بچے اور بزرگوں کی گود میں بہت چھوٹے بچے شامل ہوتے ہیں۔ ان صفوں میں آگے کی ایک یا دوصفوں میں بہت بلند آوزوں والے کچھ نوجوان اور بزرگ ایک بہت آسان فارسی نوحے کے مختصر سے مصرعوں کو اونچی آوازوں میں پڑھتے ہیں جس کے جواب میں دورہ کا ہر شخص، حسینؑ، حسینؑ حسینؑ کہتا ہے۔ اس طرح ایک منٹ میں کم سے کم دس مرتبہ ہر مصرعے کے بعد ایک مقررہ وقت کے ساتھ 'حسینؑ حسینؑ حسینؑ' دہرایا جاتا ہے۔ نوحے کے کچھ مصرعے اور ان کے جواب نیچے دہرائے جارہے ہیں:

۱- شہید کربلا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۲- رئیس کربلا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۳- امیر کربلا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۴- راکب دوش مصطفیٰ حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۵- حامیِ دین مصطفیٰ حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۶- فدیۂ دین مصطفیٰ حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۷- عاشق کبریا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۸- بے مونس و آشنا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۹- تشنۂ کربلا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ
۱۰- کشتۂ خنجر جفا حسینؑ	حسینؑ حسینؑ حسینؑ

میرے خیال میں ۳ محرم سے ۸ محرم تک روزانہ گیارہ بارہ گھنٹے کے جلوس میں اوسطاً دو ڈھائی ہزار افراد کے منھ سے جتنی بار حسینؑ کا نام لیا جاتا ہے، شاید اتنا پوری دنیا میں پورے محرم میں نہ دوہرایا جاتا ہو۔

جب جلوس شہر کے لگ بھگ سو امام باڑوں میں سے کسی امام باڑے پر پہنچتا ہے تو کچھ مقررہ عمل بیک وقت انجام دیئے جاتے ہیں۔ 'سلامی علمؑ' کو منبر سے مس کر کے امام باڑے کو سلامی کی روایت پوری ہوتی ہے۔ چونکہ اس ماتم کا طریقہ عام ماتموں سے کافی مختلف ہوتا ہے اس لیے اس کی تفصیل مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔ محلے کے بچے، نوجوان، جوان، اور ادھیڑ اور شہر کے ماتم دار تیزی سے ایک حلقہ بنالیتے ہیں اور بائیں ہاتھ سے اپنے ساتھی کی کمر پر کپڑے کو پکڑ لیتے ہیں۔ محلے یا شہر کے سوزخواں کسی مرثیے کا پُرسوز بند پڑھتے ہیں۔ اس پر ماتم کرنے والے تھوڑا جھک کر دوبار ہلکے ہاتھ سے ماتم کرتے ہیں، پھر سیدھے کھڑے ہوکر دوبار کچھ زور سے سینے پر ہاتھ مارتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک مقررہ توازن کے ساتھ مرثیے کے پہلے چار مصرعوں پر کچھ آہستہ ماتم کے ساتھ چلتا ہے۔ پھر جیسے ہی 'ٹیپ' کا پہلا مصرعہ اٹھتا ہے بہت زور سے ماتم شروع ہوتا ہے مگر پہلے دو ہلکے ہاتھوں کے لیے جھکنا اور زوردار ہاتھوں کے لیے سیدھے ہونے کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے۔ اب سوزخوانوں کی اونچی آوازیں بھی شدید ماتم کی آوازوں میں لگ بھگ ڈوب سی جاتی ہیں۔ چھٹے مصرعے کے آخری حصے تک بہت زور کا ماتم ہوتا ہے اور جیسے ہی چھٹا مصرعہ ختم ہونے والا ہوتا ہے کوئی بزرگ فوراً حسینؑ حسینؑ حسینؑ کہنا شروع کردیتا ہے اور ماتم ہلکا ہوجاتا ہے۔ اگلے بند کے پہلے چار مصرعوں تک ماتم پھر ہلکا ہوتا ہے اور ٹیپ پر پھر شدید ماتم ہوتا ہے۔ یہ ماتم اتنا سخت ہوتا ہے کہ دو یا تین بندوں میں ہی ماتم داروں کے سینے سرخ ہوجاتے ہیں اور کھال پر خون جھلکنے لگتا ہے۔

امام باڑے کے صحن میں یہ ماتم ہوتا رہتا ہے اور اس دوران تخت اور گھوڑا محلے کے زنانہ امام باڑوں اور مخصوص گھروں میں بوڑھوں اور معذور مومنین کی زیارت کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی بہت معذور بزرگوں کو چارپائی پر لٹا کر امام باڑوں میں زیارت کے لیے لے آتے ہیں۔ گھوڑا اور تخت اپنی مقامی گشت سے جیسے ہی اپنے مقررہ مقام پر پہنچتے ہیں، ڈنکے (تاشے) پر چوٹ پڑتی ہے، ماتم کرنے والے اور دوسرے لوگ تیزی سے صفیں بناتے ہوئے جلوس میں شامل ہوجاتے ہیں۔

اسی دوران بہت سے امام باڑوں میں عوام کے لیے چائے، شربت، نیاز نذر اور حاضری کے کھانوں وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، جس کی وجہ سے بہت سے بچے، نوجوان اور باہر سے آئے ہوئے لوگ کھانے یا چائے کے لیے اپنے گھر نہیں آتے، صبح نکل کر شام کو علم پہنچا کر ہی گھر لوٹتے ہیں۔

صدیوں کی طویل مشق سے اب یہ روایات نسلاً بعد نسلٍ ایک فطرت ثانیہ سی بن گئی ہیں اور جلوس کا سارا نظام ایک خودکار مشین کی طرح کسی ہدایت یا کمانڈ کے بغیر سکون سے برابر چلتا رہتا ہے۔ ہر تاریخ کے راستے، گلیاں، کوچے، موڑ اور اوقات دو ڈھائی سو سال سے متعین ہیں اور ان کی سختی سے پابندی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص کو ہندوستان کا وقت معلوم ہو تو وہ خواہ دنیا کے کسی کونے میں بیٹھا ہو یہ یاد کرسکتا ہے (اور فی الحقیقت یاد کرتا بھی رہتا ہے) کہ کس تاریخ کے علم اس وقت کس موڑ یا کس امام باڑے سے گزر رہے ہوں گے۔

دیرینہ روایات کی پابندی، صدیوں کے آپسی روادارانہ گہرے مراسم، بہت حد تک عقیدت اور اپنے شہر کی ایک دیرینہ مقدس روایت کے احترام کے قابل قدر جذبے کے تحت شہر میں آباد ہر فرقہ، ہر مسلک اور ہر مذہب کے لوگ محرم کی تمام رسوم میں مکمل تعاون دیتے ہیں اور ایثار وقربانی اور خاطر و مدارات کے بہت خوبصورت اور ہمت افزا نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر جلوس کے راستوں پر لوگ اپنی خوشی کی تقریبات، یہاں تک کہ ہندو حضرات اپنے دسہرہ وغیرہ کے جلوسوں کو اس وقت تک ملتوی کرنے کے لیے بہ خوشی تیار رہتے ہیں جب تک علموں کے جلوس ان راستوں سے پوری طرح نہ گزر جائیں۔ جگہ جگہ سنی المذہب حضرات، سبیلوں اور چائے کا انتظام کرتے ہیں۔ بہت سے غیر شیعہ حضرات شرکت بھی کرتے ہیں۔ ہندو حضرات جلوس گزرتے وقت اپنی دکانوں میں ادب سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بجلی کے پنکھوں کے رخ دورہ کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اپنے بالاخانوں اور سڑک کے کنارے اپنے رہائشی گھروں کے چھجوں کو واقف کار خاندانوں کی عورتوں کے لیے وقف کردیتے ہیں کہ وہ وہاں سے علموں کی زیارت کریں۔ غرض ان دس دنوں میں عام طور پر ایک تقدس واحترام کا ماحول پورے شہر پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

۳ تا ۱۰ محرم، تاریخ وار تفصیلات

امروہہ کی عزاداری میں پہلی اور دوسری محرم کو کوئی جلوس نہیں نکلتا، مگر صبح کو آنکھ کھلتے ہی نوبت اور نفیری کی آوازیں محرم شروع ہونے کی یاد دہانی کرتی ہیں۔ ہر امام باڑے میں صبح و شام اور اس وقت نوبت بجائی جاتی ہے جب وہاں علم آتے ہیں اور واپس جاتے ہیں۔ صدیوں سے نوبت بجانے والے خاندان نسلاً بعد نسلٍ اس روایت کو پورا کررہے ہیں۔

۳ محرم: گوکہ تمام شواہد سے یہ بات طے ہے کہ امروہہ میں علموں کا پہلا جلوس محلہ قاضی زادوں

سے ۸ محرم کو برآمد ہوا تھا اور ان کی تاسّی میں رفتہ رفتہ دوسرے امام باڑوں سے جلوس برآمد ہوئے، مگر موجودہ صورت یہ ہے کہ پہلا جلوس محلہ پچدرہ میں ولیا کے امام باڑے سے نکلتا ہے۔ اس کے بارے میں تاریخ واسطیہ کا بیان ہے:

''......عرصہ قریب چالیس سال کا گزرا کہ یہ امام باڑہ مسمی شیخ ولّی نے باستعانت و امداد سادات امروہہ تعمیر کرایا تھا۔ بعد چند سال کے اس کا انتقال ہوگیا تھا تیسری تاریخ کو اس امام باڑے کے علم اٹھتے ہیں''۔[1]

امروہہ کے ایک عالم دین مصنف ومحقق مولوی صفی مرتضی صاحب کا بیان ہے:

''...... اس کا اصلی نام ولی محمد تھا، قوم کا پٹھان...... معمولی آدمی اور غریب تھا۔ امام حسین علیہ السلام سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ مختلف تاریخوں میں نشان اور علم نکالتا تھا، مگر ۳ محرم کو جلوس ضرور نکالتا تھا۔ یہ جلوس بچوں اور اہل سنت کے عوام پر مشتمل ہوتا تھا۔ اپنی ساری کمائی عشرۂ محرم کے لیے محفوظ رکھتا تھا اور شہر میں بصورت غلہ چندہ بھی حاصل کرتا تھا جس میں سادات کا خاصہ حصہ ہوتا تھا...... اس کے انتقال کے بعد اس کی والدہ (کھونجی) جلوس نکالتی رہی۔ اس وقت تک یہ جلوس تمام تر اہل سنت پر مشتمل تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جلوس شیعوں کا ہوگیا''۔[2]

۴ محرم: محلہ مچھرہٹہ سے ۴ محرم کا جلوس نکلتا ہے اور امروہہ کی متفقہ روایات کے مطابق مولوی صفی مرتضی صاحب کا بیان ہے:

''...... یہ حرمت شاہ کا امام خانہ کہلاتا ہے۔ حرمت شاہ ایک عورت تھی جو قوم کی فقیر تھی اور اپنی مریدہ رجب شاہ کے ساتھ رہتی تھی...... چونکہ (یہ دونوں) عزاداری سید الشہداء کی شائق تھیں اس لیے سید جمال علی صاحب نے حرمت شاہ کے لیے یہ عزاخانہ تعمیر کیا جو صرف زنانہ امام باڑہ تھا......

اس حساب سے ۱۲۷۰ھ وہ پہلا سال ہے جس میں عزاخانے سے پہلا جلوس برآمد ہوا''۔[3]

اس کا مطلب ہے قمری سال کے اعتبار سے یہ جلوس لگ بھگ ۱۵۷ سال پرانا ہے۔

۵ محرم: محلہ سدّو سے ۵ محرم کو علم نکلتے ہیں۔ سدو کا محلہ امروہہ میں سب سے پرانی مسجد کی عمارت کی وجہ سے مشہور ہے جہاں معزالدین کیقباد (۹۰-۱۲۸۷ء) کے دور کی ایک مسجد کافی شکستہ حالت میں ابھی موجود ہے۔ پروفیسر عزیزالدین نے اس کا سنہ تعمیر ۱۲۸۷ء بتایا ہے[4]۔ ۵ محرم کے

۱- منشی رحیم بخش، تاریخ واسطیہ، ص ۱۹۳   ۲- علی عباس نقوی، ۶۳،۶۲   ۳- ایضاً، ص ۶۹-۱۶۸   ۴- پروفیسر عزیزالدین حسین، ص ۱۴

علم جس امام باڑے سے نکلتے ہیں اسے رفاقی سقے کا امام باڑہ کہا جاتا ہے۔ رفاقی اور اس امام باڑے پر علی عباس نقوی کے مندرجہ ذیل جملے کچھ روشنی ڈالتے ہیں:

''...... رفاقی رسول مقبولؐ اور ان کی آل پاک سے روحانی عقیدت کی بناء پر عزاداری امام مظلوم علیہ السلام میں عملی طور پر حصہ لینے کا آرزومند تھا...... رفاقی مذکور نے اپنے چھوٹے سے مکان کو عزاخانہ قرار دیا۔ اس نے اپنی برادری اور دیگر لوگوں کو اکٹھا کر کے ۵ محرم کو جلوس نکالا...... ۵ محرم کے اس جلوس کا آغاز ۱۲۴۰ھ میں ہوا تھا یہ ایک سو ساٹھ سال (۲۰۰۶ء میں ۱۶۶ سال) پرانا جلوس آج بھی سقوں کے علم و جلوس کے نام سے مشہور ہے''۔[۱]

اس کے بعد اس امام باڑے کے تمام اخراجات اور ذمہ داریاں امروہہ کے ایک بہت جانے پہچانے کمبوہ خاندان نے اپنالیں۔

۶- محرم، محلہ کالی پگڑی: مسماۃ نورن کا امام باڑہ 'امروہہ کے عزاخانے' کتاب میں دی گئی تفصیلات کے مطابق:

''مسماۃ نورن بنت عبداللہ زوجہ سردار خاں، شاہجہاں آباد سے آ کر سکونت پذیر ہوئیں...... ۱۲۲۲ھ میں وہ امام باڑہ بنوا کر بہ کمال عقیدت و احترام، عزاداری...... میں صبح و شام مصروف رہنے لگیں''۔[۲]

اسی امام باڑے سے ۶ محرم کے علم اٹھتے ہیں۔

۷ محرم: محلہ کٹرہ غلام علی، امام باڑہ سید مظہر علی خاں مرحوم

اس امام باڑے اور یہاں سے اٹھنے والے علموں کے بارے میں امروہہ کے عزاخانے میں دی گئی تفصیلات کے مطابق:

''سید مظہر علی خاں...... فرخ شاہ بادشاہ دہلی کے عہد سے احمد شاہ کے عہد تک بڑے بڑے مناصب اور عہدوں پر فائز تھے۔ یہ امام باڑہ انہی کا قائم کردہ ہے''۔[۳]

اس امام باڑے کو تقریباً دو سو سال پرانا بتایا گیا ہے۔ یہیں سے ۷ محرم کے علم نکلتے ہیں۔ اس علاقے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک عرصۂ دراز سے اس امام باڑے کے گرد و پیش زیادہ تر ہندو حضرات کی آبادی ہے، گنتی کے چند گھر شیعہ خاندانوں کے ہیں مگر یہاں کی تمام آبادی اس محلے

۱- علی عباس نقوی، ص ۵-۱۰۴ ۲- ایضاً، ص ۱۲۹ ۳- ایضاً، ص ۱۳۳

کے علموں اور دوسرے علموں کو بہت احترام اور تعاون دیتی رہی ہے جو امروہہ کی پوری بستی کی دیرینہ روایت رہی ہے۔

۸ محرم: محلہ قاضی زادہ، چاند سورج کا امام باڑہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا یہ امام باڑہ امروہہ کا قدیم ترین امام باڑہ ہے اور یہاں سے اٹھنے والے علموں کا جلوس امروہہ میں سب سے پہلا منظم جلوس ہے۔ امروہہ کی پچھلی سے پچھلی نسل کے ایک عالم اور محقق علامہ شفیق حسن نے اپنے شواہد سے یہاں سے علموں کے پہلی بار اٹھنے کا سال ۱۲۱۲ھ متعین کیا ہے۔[۱] چونکہ یہاں کے علم سب سے پرانے اور پہلے علم ہیں اس لیے اس میں سب سے زیادہ آرائش اور ان تمام پانچ امام باڑوں کے علموں کی ایک ایک جوڑی ہوتی ہے جہاں ۳ سے ۷ تک کے علم اٹھتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر کونے میں آباد امروہہ کے شیعہ اور بہت سے سنی حضرات، یہاں تک کہ پاکستان، آسٹریلیا اور مغربی ممالک میں سکونت پذیر امروہہ کے شیعہ حتی المقدور کم سے کم اس تاریخ کو امروہہ ضرور آتے ہیں یا آنے کی حسرت انہیں پورے دس دن اداس کیے رہتی ہے۔ جو لوگ دن کے ابتدائی حصے میں کسی مجبوری کے تحت شریک نہیں ہو پاتے وہ بالکل آخری حصے علموں کی واپسی میں شرکت کو بھی غنیمت تصور کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا تاریخی شواہد اور روایات کی روشنی میں کچھ دلچسپ حقیقتوں اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ علموں کے کل چھ جلسوں میں سے چار کی ابتدا صوفی قسم کے فقیروں نے کی، ایک خاتون امروہہ سے باہر کی تھیں، صرف ایک صاحب امروہہ کے سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امروہہ میں شیعہ سنی اور ہندو حضرات محرم کی رسوم کو اپنا آبائی ورثہ سمجھ کر اس میں شرکت کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بہت سی ذاتی وجوہات کی بناء پر ایک عرصے تک میں محرم میں امروہہ جانے کو ناغہ کرتا رہا۔ ایک موقع پر میرے مقررہ پان سگریٹ والے نے، جو سنی المذہب تھا، مجھ سے تنبیہاً کہا تھا: 'میاں! اب کی بار تم محرم میں امروہہ نہیں گئے؟ یہ اچھی بات نہیں ہے'۔

یوں تو 'حاضری' کے کھانوں کا سلسلہ کم و بیش ۳ محرم سے ہی شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ سلسلہ تاریخ بہ تاریخ بڑھتا جاتا ہے اور آٹھویں تاریخ کو تو شاید ہی کوئی محلہ ایسا بچتا ہو، جہاں شیعوں کی قابل شمار آبادی ہو اور وہاں ایک دو حاضریاں عوامی سطح پر نہ ہوتی ہوں۔ ۸ محرم سے ہی دوپہر کے بعد سے

۱۔ علی عباس نقوی، ص ۲۳-۱۲۲

مختلف امام باڑوں میں زنجیروں کے ماتم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو علموں کی واپسی تک چلتا ہے۔ زنجیروں کا ماتم ۱۰ محرم کو بھی ہوتا ہے۔ ۸ محرم کی بہت زیادہ گہما گہمی کے بعد شام سے ہی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے امروہہ سے محرم رخصت ہوگیا گوکہ اگلے دو دن بھی کافی پروگرام ہوتے ہیں اور مختلف محلوں میں چھوٹے چھوٹے مقامی جلوس نکلتے رہتے ہیں جن میں 'مقتی علم چڑھانا' نیاز نذر وغیرہ شامل ہیں۔

۹ محرم: بنیادی طور پر مجلسوں کا دن ہوتا ہے۔ آج کی مجلسیں نسبتاً تاخیر سے شروع ہوتی ہیں اور طویل ہوتی ہیں کیونکہ آج علموں میں شرکت کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ شام کو مغرب سے کچھ پہلے دربار کلاں کے امام باڑے سے نشانوں کی جوڑیاں برآمد ہوتی ہیں جن کے ساتھ مومنین چھوٹے چھوٹے گروپوں میں مناقب پڑھتے ہوئے چلتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس امام باڑے میں حضرت شہید کے نیزے کی 'بوری' اور تلوار کے تبرکات موجود ہیں۔ 'بوری' کو ایک نشان میں لگایا جاتا ہے۔ نشانوں کا یہ جلوس جگہ جگہ رکتا ہوا رات کے شروع حصے میں کنکوئی کے امام باڑے پہنچتا ہے جو ۱۱۸۰ھ کی تعمیر ہے۔[۱]

مغرب کے بعد سے لوگ الوداعی سلام کے لیے امام باڑوں کی گشت شروع کرتے ہیں۔ ہر امام باڑے میں روشنی کی جاتی ہے اور یہ اس وقت پوری طرح آراستہ ہوتے ہیں۔ عزاداروں کی ٹولیاں ایک ایک امام باڑے میں جاتی ہیں، نوحے پڑھتی ہیں، ماتم کرتی ہیں اور اگر بتیاں اور موم بتیاں جلاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ چونکہ لگ بھگ سو امام باڑوں کی گشت ہوتی ہے اس لیے یہ سلسلہ لگ بھگ صبح تک چلتا رہتا ہے۔

۱۰ محرم: عاشورہ محرم کی رسوم میں اعمال عاشورہ 'تربتوں' کے مختصر جلوس اور دوپہر بعد تعزیوں کے بڑے جلوس کم و بیش اسی انداز کے ہوتے ہیں جیسے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں ہوتے ہیں۔ امروہہ میں تعزیہ صرف ایک بنتا ہے جو محلّہ شفاعت پوتوں کا ہوتا ہے اور بہت اونچا اور بھاری ہوتا ہے۔ باقی محلوں کے امام باڑوں کی بہت خوبصورت ضریحیں اٹھائی جاتی ہیں۔ آس پاس کے کچھ گاؤں سے بھی تعزیے آکر شامل ہوجاتے ہیں اور یہ سب دوپہر سے شام تک شہر کے مقررہ راستوں سے گزرتے ہوئے اپنے امام باڑوں میں واپس ہوجاتے ہیں۔ جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے شروع رات میں شام غریباں کی مجلسوں کے ساتھ محرم کا یہ عشرہ ختم ہوجاتا ہے اور اگلے دن سے چہلم کے

۱۔ علی عباس نقوی، ص ۱۳۹

عشروں کی مجالس کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

لگ بھگ پچاس سال سے ان تمام امور کو منظم اور مرتب رکھنے کے لیے ایک تنظیم 'انجمن تحفظ عزاداری' پوری ذمے داری سے کام کر رہی ہے۔ اسی طرح روزانہ کے انتظامات کی دیکھ بھال اور اس سلسلے کی تمام مشقتیں اور پریشانیاں جھیلنے والے اور ہر وقت مدد کرنے والے با ہمت اور بے لوث افراد کی ایک انجمن 'رضا کاران' ہے۔ یہ لوگ راستوں کی صفائی ستھرائی، اوپر لگے ٹیلی فون اور بجلی کے تاروں سے علموں اور تعزیوں کے بچائے رکھنے، جلوس کی رفتار کو وقت کا پابند رکھنے، پانی کی فراہمی، فوری طبی امداد، ایمبولینس وغیرہ کا کام اتنی جاں فشانی اور مستعدی سے کرتے ہیں کہ جلوسوں میں کبھی کوئی رکاوٹ یا رخنہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس طرح امروہہ کی کل آبادی کی زندگی کے سماجی، معاشی، دینی اور عقیدتمندانہ رخ کا ایک مظہر یہاں کی عزاداری ہے جو کئی صدیوں سے امروہہ کے لیے ایک نعمت کی طرح سایہ فگن ہے۔

سادات گرویزی خدام و گدی نشینان حضرت سیدنا خواجہ معین الدین کے معمولاتِ عزاداری محرم الحرام

صاحبزادہ سید لیاقت حسین معینی ☆

نائب الرسول اللہ فی الہند پیرانِ پیر خواجہ خواجگان سیدنا معین الدین حسن چشتی المعروف بہ غریب نوازؒ کا مرکز ہر قوم و ملت بالخصوص جنوبی ایشیا میں ایک ممتاز و منفرد زیارت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔

نجیب الطرفین حضرت خواجہؒ کا اصل نام حسن جائے پیدائش سنجر (ایران) تھی ،نشوونما خراسان میں ہوئی۔اوائل عمر میں ہی یتیمی سے داغ اور منگولوں کے ظلم و ستم کا مشاہدہ قلب خواجہ پر اثر انداز تھا کہ اچانک حضرت ابراہیم قندوزی کی ملاقات اور ایک نگاہ کے ساتھ ایک نوالہ کھل نے قلب میں پنہاں سوز و گداز کو اجاگر کردیا۔ علائق دنیاوی کو راہ خدا میں تقسیم کر کے حصول علم کے لیے اس دور کی ممتاز دانشگاہوں، مذہبی ثقافتی مراکز سے خود کو سیراب کیا منازل سلوک کی تلاش میں رواں دواں بالآخر بغداد میں سلسلۂ چشت کے جید بزرگ حضرت خواجہ عثمان ہرویؒ کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ خدمت مرشد میں سالہا سال مجاہدے کیے، روحانی تربیت حاصل کی۔ بہت سے سفر کیے دوران طواف کعبۃ اللہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئے اور دربارِ مصطفوی سے مشائخ بحروبر کا طرۂ امتیاز اور ولایتِ ہند سے سرفرازی حاصل کی۔ اور بحکم سرکارِ مدینہ بہ جانب ہندوستان کوچ فرمایا۔

دورانِ سفر متعدد اولیائے کرام سے شرف ملاقات کیا اور بے شمار بزرگانِ دین کے آستانوں و مزارات پر حاضری دی۔ ہمدان رفرقان راصفہان ہرات رچشت رسبزوار رغزنی ر لاہور رسمانہ ر دہلی ر نارنول میوات ہوتے ہوئے ۱۱۹۰ کے آس پاس اجمیر القدس نزول فرمایا۔عام روایت کے مطابق دس محرم بروزِ عاشورہ یہاں پہنچے۔ آپ نے اپنی پاکیزہ زندگی، تعلیمات اور مثالی کردار سے عوام الناس کو متاثر کیا اور سلسلۂ چشتیہ کو فروغ دیا۔ آپ کی نگاہ میں طاعتِ عظمیٰ یہ ہے کہ" درماندگان را فریاد رسیدن وحاجت بے چارگان رواکردن و گرسنگاں راسیر گردانیدن" آپ کے نزدیک قرب حق

☆ گدی نشین خواجہ صاحب، درگاہ شریف اجمیر، ریڈر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،علی گڑھ

کی علامت ہے۔ ''اول سخاوتی چوں سخاوتِ دریا، دوئیم شفقتی چون شفقت آفتاب، سوئیم تواضع چون تواضع زمین'' پھر فرماتے ہیں چون ماز پوست بیرون آمدیم و نگاہ کردم عاشق و معشوق و عشق یکی دیدیم یعنی درعالم توحید یکست''۔

حبِ حسین کے سلسلہ میں یہ مشہور رباعی آپ سے منسوب ہے۔

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسینؑ　　دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ

سرداد، نداد دست در دستِ یزید　　حقا کہ بنائے لاالہٰ است حسینؑ

کچھ حضرات اس پر شک کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ رباعی حضرتِ خواجہ اجمیری کی ہے لیکن کلام خود بولتا ہے کہ کس کا ہے۔ آخری مصرعہ میں لاالہٰ (لاالہ) چشتیوں کا خصوصی وظیفہ ہے۔ اور اس کو شعر میں اس طرح خواجہ صاحبؒ کا ادا کر سکتے تھے۔ اس شعر سے نبی کریمؐ کی اس حدیث کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے کہ:

حسین منی و انامن الحسن: حسین مجھ سے اور میں حسین سے ہوں

علاوہ ازیں آپ کی پہلی شادی شہر کے مشہور سادات گھرانہ میں بحکم سرکارِ دو عالم اور بہ اشارۂ حضرت امام جعفر صادقؑ ہوئی۔ سید وجیہ الدین مشہدی جو کہ شہید میران سید حسین خنگ سوار کے چچا تھے ان کی دخترِ نیک آپ کے نکاح میں آئی۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ کی اہل بیت اطہار سے نسبت اور محبت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

اجمیر میں تارا گڑھ پہاڑ پر (گنج شہیدان و میران سید حسین شہید کا مزار) اور آس پاس کی پہاڑیوں پر اور دامنِ کوہ میں اڑھائی دن کے 'جھونپڑہ' اور درگاہ خواجہ کے آس پاس لاتعداد شہیدوں کے مزارات ہیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ خطہ شہداء کا مرکز و مسکن رہا ہے اور یہاں ماہِ محرم میں عزاداری اور دیگر مراسم ہوتے رہے ہیں۔

تاریخی شواہد کے اعتبار سے قدیم ترین حوالہ محرم شریف سے متعلق پندرھویں صدی کے نصف آخر کا ہے۔ ۱۴۵۵ء میں محمود خلجی نے اجمیر کو راجپوتوں سے حاصل کیا اور تب شیخ حسین ناگوری (اولاد صوفی حمیدالدین ناگوری) نے سالہا سال یہاں آستانۂ عالیہ اور خدام خواجہؒ کی خدمت کی۔ ان کے ایک خلیفہ شیخ احمد مجد شیبانی نے جو عالم دین بھی تھے لکھا ہے کہ ''بروز عاشورہ رنج وغم کا پیکر نظر آتے تھے اور یادِ شہدائے کربلا میں شربت تیار کرکے مٹکوں میں اپنے سر پر رکھ کر سادات (خدام) کے محلے

میں لے جاتے جہاں نوحہ خوانی میں شریک ہوتے''۔ لگتا ہے کہ سادات گردیزی اور خدام خواجہ صاحب، اپنے جد حضرت خواجہ سید فخر الدین گردیزی کے زمانے سے ہی جو خادم خاص اور عم زاد برادر خواجہ کے تھے اور ان کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے، ان کے زمانہ سے ہی یہ معمولات ادا کرتے رہے ہیں۔

دورِ مغلیہ میں بھی اکثر حوالے محرم شریف کے متعلق ملتے ہیں۔ مغل بادشاہوں نے جب درگاہ وقف کو مستحکم کیا تو آستانۂ عالیہ پر ہونے والی مختلف تقاریب و مجالس کے لیے روزینہ مقرر کیے۔ اور اس میں محرم شریف کے لیے ایک مخصوص رقم وقف ہوتی۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب نے دورانِ قیام اجمیر کچھ شوروغل سنا معلوم ہوا کہ صدے (علم و نشان) کا جلوس نکل رہا ہے (جو آج بھی ۷ محرم کو نکلتا ہے)۔ اورنگ زیب نے اس پر تنبیہ کے لیے کہا۔

یوم و شب عاشورہ کی تاریخی اہمیت اسلام میں واقعۂ کربلا سے قبل بھی تھی۔ انہی روز و شب میں اللہ تعالیٰ نے اکثر اپنے انبیائے کرام کو آفات و بلیات سے نجات دی تھی۔ ادائیگی نوافل، روزہ، تبدیلی غلاف کعبہ، کے مراسم انہی روز و شب میں انجام پذیر ہوتے تھے۔ واقعۂ کربلا نے اس دن کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔ اسی لیے صوفیوں خاص کر ہندوستان میں چشتیوں کے آستانوں اور خانقاہوں میں دونوں اعتبار سے اس دن کو اہمیت دی جاتی ہے۔

تقسیم ہند سے قبل اجمیر میں مختلف اقوام اپنے محلّوں میں تعزیہ داری کرتی تھیں اور امام باڑوں میں سوزخوانی۔ شہر میں گندیول شیخ زادوں، نبی کرانوں، لوہاروں، گھوسیوں، بنجاروں وغیرہ کے تعزیے یومِ عاشورہ پر نکلتے تھے۔ ان کے محلّوں میں ان کے اپنے امام باڑے تھے۔ تازہ گراج پر جہاں اب شیعہ حضرات آباد ہیں وہاں ماہِ محرم میں عزاداری اب بھی ہوتی ہے مگر ان سب میں نمایاں عزاداری سادات گردیزی خدام خواجہ کے محلّے نزد درگاہ ہوتی تھی جو اب بھی ہوتی ہے بلکہ اب تو صرف یہی اک جلوس تعزیہ محرم میں نکلتا ہے۔

تعزیہ داری کا یہ سلسلہ ان حضرات میں کب سے جاری ہے یہ بتانا تو مشکل ہے مگر کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب گوالیار کے مبارز خان المعروف سندھیا مراٹھے سردار نے ۱۷۵۵ میں اجمیر پر قبضہ کیا تو چونکہ اس کے اپنے علاقے میں تعزیہ داری میں وہ خود شریک ہوتا تھا، اس کے زیرِ اثر یہ روایت یہاں کے لوگوں میں بھی آئی۔ میر عظیم اللہ متولی درگاہ مقرر ہوئے۔ یہ خود بھی ایک

خادم خاندان سے تھے۔ انھوں نے موجودہ تعزیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور چند سال اس کو ذاتی رکھ کر، اس وقت کے خدام کی پنچایت کے حوالے کر دیا۔

تعزیہ تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اول تخت شریف، چوکور، کھلا مگر چہار طرف لمبے مینارے۔ دوسرا حصہ بنگلہ شریف کہلاتا ہے جو کعبہ کی شکل میں ہوتا ہے مگر اوپر سے کھلا ہوا اور چہار طرف چھوٹے مینار۔ آخری حصہ گنبد شریف، جو کم و بیش گنبد خضراء کی عکاسی کرتا ہے اور اس سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ تینوں حصوں کو یکجا کر کے مضبوطی سے اندرونی ''بند'' باندھے جاتے ہیں اور تخت شریف کے نیچے لمبے موٹے بانس کو لگاتے ہیں تاکہ کاندھا دینے میں زیادہ لوگ حصہ لے سکیں۔ معمولی بانس کی ''کھپچیاں'' تعزیہ کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس پر ابرک اور رنگ برنگی پنی کا استعمال ہوتا ہے۔ ماہِ ذی الحجہ سے محمود خلجی کے بنائے ہوئے بلند دروازے کے نیچے دالان اور صحن میں تعزیہ بننا شروع ہوتا ہے اور بعد میں اس کو جھالرہ کے کنارے آستانے کے جنوب میں واقع مقبرے میں (جسکو شاہ قلعی محرم امیر (عہدِ اکبری) نے اپنی تدفین کے لیے بنوایا تھا مگر وہ وہاں دفن نہ ہوسکا اور بعد میں اس میں نوابان رام پور نے حجروں کی توسیع کی) لے آتے ہیں اور ۷ محرم تک وہیں پر اس کو آخری شکل دی جاتی ہے۔

معمولات محرم الحرام

۱- ۲۹ ذی الحج یعنی چاند رات کو ''چوکی دھلائی'' کی رسم ہوتی ہے ایک چوکی و نیم (سفید غلاف مبارک مزار) آنا ساگر یا دیگر باؤلی میں دھوکر بعد نماز عصر لنگر خانہ آستانۂ عالیہ میں رکھ دیا جاتا ہے اور پھر اس مقام پر مرثیہ و سلام ادا کر کے نیاز و نذر شربت او رمٹھائی پر کی جاتی ہے۔

۲- یکم محرم تا ۷ محرم روزانہ بعد نمازِ عشاء مزار مبارک کے معمول پورے ہونے کے بعد چھتری دروازے کے باہر دالان، راستہ، اور نعل اکبری کے سامنے مجالس کا انعقاد ہوتا ہے جن میں اول سوزخوانی، منقبت و سلام کا ہدیہ شہدائے کربلا اور اہلِ بیتؑ کو پیش کیا جاتا ہے۔ بعد اس کے واعظ اپنی تقریر میں تاریخ اسلام اور شہدائے کربلا کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ رات ڈیڑھ بجے تک رہتا ہے۔ ان مجالس کے جملہ اخراجات برائے روشنی، شیرینی وغیرہ انجمن خدام سیدزادگان کے زیرنگرانی ہوتے ہیں۔ مرثیہ حضرت خدام خواجہؒ کے ہی لوگوں کی پارٹیاں پڑھتی ہیں جن کو انجمن کی

جانب سے مدعو کیا جاتا ہے۔ دورانِ مجالس پورے عشرے تک انفرادی طور پر خدام جماعت کے لوگ تقسیم شیرینی وتبرک وغیرہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

انیس و دبیر، جوش اور مقامی شعراء خاص کر خدام شعراء کے مراثی بڑے احترام وانہماک اور تکنیک کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں خاص کر وہ بند جن میں اہل بیت اطہار کی عظمت و شان بہادری، کردار، مظلومیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چھتری دروازے کے اندرونی حصے پر پردہ لگا کر خواتین کے لیے خصوصی انتظام ہوتا ہے۔

۳- چند سال سے احاطۂ نور کے روبرو درگاہ شریف میں ۷ اور ۸ محرم کو بعد نماز ظہر محفل و مجلس شہادت منعقد ہوتی ہے جس میں سلام اور منقبتیں پیش کی جاتی ہیں۔

۴- ماہِ محرم کی اول جمعرات کو ''نوچندی'' کہا جاتا ہے اس دن سید صاحب کے گھر نئے مٹی کے کونڈوں میں مٹھائی، پھل خشک میوہ جات وغیرہ بھر کر حضرت عباس علمدار کی نذرِ فاتحہ ہوتی ہے اور شربت پر امام عالیمقام کی نذر منجملہ اہلبیت و شہدائے کربلا کو ایصالِ ثواب ہوتا ہے عطر، ہری پتی، پھول موم بتی وغیرہ دستہ پر رکھی جاتی ہے۔

۵- ۵ محرم الحرام کو ''چھوٹی ریوڑی'' پر اور ساتھ میں ہرے کپڑوں میں سکہ باندھ کر رنگین کھبے پر نذر سید الشہداء کی جاتی ہے۔اس سکے والے ہرے کپڑے کو امام ضامن کہتے ہیں ۔اسی دن حضرت بابا فرید گنج شکر خلیفہ خواجہ قطب الدین کاکیؒ (خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ اجمیری) کا عرس ہوتا ہے مگر قوالی احترام شہدائے کربلا میں نہیں ہوتی صرف میٹھی کھچڑی پر باباؒ کی فاتحہ دلاکر درگاہ میں انکے چلّے کو کھول کر زیارت کرادی جاتی ہے۔ ۶ محرم الحرام کو صبح ۹ بجے بیگمی دروازہ احاطہ نور میں حسب دستور ماہانہ چھٹی شریف اور رسم شجرہ خوانی ہوتی ہے اور دعا کے بعد تبرک تقسیم ہوتا ہے۔

۶- ۷ محرم الحرام کو صدے (الم نشان) کا جلوس کئی حضرات نکالتے ہیں اسی دن بعد نماز عصر خدام سادات چھتری گیٹ سے نشان لے کر ڈھول تاشہ جھانجھ کے ساتھ امام باڑہ (اندرون) محلّہ نصب کرتے ہیں اور مختصر ہدیۂ سلام' مرثیہ پیش کرتے ہیں۔

اسی رات کو بعد نماز مغرب تعزیے پر مہندی چڑھائی جاتی ہے۔ دراصل اس رات کو تعزیے کو مکمل کر کے مقبرے میں رکھ دیا جاتا ہے اور رسم مہندی بیاد حضرت قاسم ابن حسن ادا کی جاتی ہے۔ ہر گھر سے خدام سادات کی تیار کردہ مہندی میں مالیدہ، مہندی موم بتی وغیرہ رکھ کر تعزیہ کے سامنے نذر

کر کے دعا ہوتی ہے اور منت ادا کیجاتی ہے۔ یہ سلسلہ دیر شب تک چلتا رہتا ہے یہ صاف ہندوستانی رسم ہے۔ ۸ محرم کو تعزیے کے تینوں حصوں کو پھر علاحدہ کر کے بعد ظہر مقبرے سے بلند دروازے کے پاس لے جایا جاتا ہے جہاں بعد عصر اسے دوبارہ یکجا کر کے آخری شکل دے کر بعد مغرب سہروں اور ہاروں پھولوں سے لاد کر آستانۂ عالیہ پر رکھ دیا جاتا ہے۔

۷- اسی شب میں بعد معمول آستانہ (۱۰ بجے سردیوں میں ساڑھے پانچ بجے) پہلی سواری تعزیہ کی اس مقام سے روانہ ہوتی ہے (آنے والی تینوں شبوں میں جلوس اسی وقت نکلتا ہے) سواری کے ساتھ ہی سوز خوانی کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اول شب سے ایک مقامی بزرگ کا سلام پڑھا جاتا ہے جو منکرِ تعزیہ تھے مگر ایک کرامت سے معتقد ہوئے۔

تری جناب میں کیونکر سلام ہو یا شاہ
کٹا کے سر کو کہے لاالہٰ الا اللہ

اس کے بعد خواجہ اجمیری کی رباعی شاہ است حسین، کچھ مرثیے اور آخر میں مرثیۂ ''رخصت کا زمانہ ہے حرم میں ہے سواری'' پڑھا جاتا ہے۔ قریب ۱۲ بجے تک جلوس لنگر خانہ گلی سے ہوتا ہوا چھتری گیٹ پر لے جایا جاتا ہے۔ ماتم سے قبل ''دیکھو تو کربلا میں عجب زلزلہ پڑا'' نظم پڑھی جاتی ہے ماتم ڈھول نقارہ بجا کر کیا جاتا ہے اور خادموں کی یہ جماعت ''حویلی متولی'' کی جانب کی جاتی ہے۔ محل کے چبوترے پر ہی ۹ محرم کو بعد عصر اطراف کے گھروں سے گھی روٹی شکر شربت لایا جاتا ہے اور فاتحہ نذر ہوتی ہے۔ اسی شب کو اسی انداز سے بعد معمول آستانہ ثار شریف یعنی تعزیہ کو چھتری دروازے سے امام باڑے لے جایا جاتا ہے اور نصف شب ماتم کے ساتھ رکھ دیا جاتا ہے۔ ''جنازہ شریف یا کربلا'' چھتری دروازے پر ہی رہتا ہے۔ اسی شب امام باڑے میں بعد ماتم پیڑوں پر نذر ہوتی ہے۔ سیدوں اور کچھ دیگر لوگوں کو منت کے تحت پھلوں اور سکوں میں تولا جاتا ہے۔ پاؤوں میں اور ہاتھوں میں چاندی سونے کی بیڑی اور ہتھکڑی پہنی جاتی ہے۔ یہ یاد امام زین العابدین اور منت بھی ادا ہوتی ہے۔

اسی شب ڈھائی دن کے جھونپڑے کے پاس ''ڈولہ'' نکلتا ہے اور سوزخوانی ہوتی ہے۔ اس وقت عجب کیفیت ہوتی ہے آس پاس مجالس ذکرِ حسینؑ ہوتی رہتی ہیں اسی شب میں خدام درگاہ شریف میں نوافل عاشورہ ادا کرتے ہیں اور دیگر عبادات کرتے ہیں۔

یومِ عاشورہ

دس محرم علی الصبح ساڑھے آٹھ بجے احاطۂ نور میں نزد جنازہ و کربلا شریف ''شہادت نامہ'' پڑھا جاتا ہے جس میں واقعات کربلا اور قربانی و شہادت حسینؓ کا پُرسوز تذکرہ ہوتا ہے اور مجلس میں گریہ و زاری ہوتی ہے۔ ساڑھے بارہ بجے اس کے ختم ہونے پر نزد جنازہ شریف چھتری گیٹ پر ''بشر'' مرثیہ پڑھا جاتا ہے جس میں شہادت علی اکبر اور دردِ امام حسینؓ کا ذکر ہوتا ہے۔

آستانہ عالیہ پر مجلس قل وعرس مجالس سبھی کا، خاتمہ دن میں ایک یا ڈیڑھ بجے ہوتا ہے۔ یہ مخصوص رسم اس درگاہ کی ہے۔ اس طرح یومِ عاشورہ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

رات میں تعزیے کی سواری امام باڑہ سے ہوکر خادم محلّہ لنگر خانہ گلی سے گزر کر مین گیٹ پر ۴ بجے پہنچتی ہے اس سے قبل یہ جلوس شہر کے باہر قبرستان جاتا تھا جہاں صبح تعزیہ سیراب کر دیا جاتا تھا۔ مگر اب حالات و تعمیراتِ شہر کی وجہ سے اس جلوس کو اندرونِ محلّہ ہی کر دیا گیا ہے ۱۲ بجے تعزیہ جب چھتری گیٹ پہنچتا ہے تب جنازہ شریف کی سواری اس کے آگے کر کے نوحہ پڑھا جاتا ہے۔ کربلا کے مسافر نہ آئے، بعد اس کے دیگر مراثی پڑھے جاتے ہیں۔ مین گیٹ پر ماتم کیا جاتا ہے اور ''منزل'' (چاروں طرف سے تین مرتبہ طواف) تعزیہ و کربلا شریف کو دی جاتی ہے اس کے بعد کمانی گیٹ سے نکل کر یہ جلوس سولہ کھمبا میں پہنچاتے جہاں تعزیے پر آخری سلام پیش کر کے پھر اس کو دو حصوں میں کر دیا جاتا ہے اور قبل از صبح جھالرہ میں سیراب کر دیا جاتا ہے۔ جنازہ شریف کو ڈھانک کر واپس حویلی لاتے ہیں اور آئندہ سال کے لیے رکھ دیتے ہیں اس وقت توشہ کی روٹی پر، (ایک خاص بسکٹ جو اس موقع پر بنتا ہے) نذر کر کے تقسیم کی جاتی ہے۔

تیجہ (تیسرے دن) ۱۲ محرم کو کھیر اور توشہ کی روٹی نذر کے بعد رشتہ داروں میں تقسیم کی جاتی ہے اسی شب آخری محفل چھتری دروازے پر ہوتی ہے جس میں مابعد کربلا کے واقعات کے بیان کے بعد دیر شب میں سلام نذر کے بعد فاتحہ ہوتی ہے۔ حال ہی میں گیارہ، بارہ محرم کی شب میں بزمِ منقبت ہونے لگی ہے وگرنہ اس سے قبل یہ رات خالی چھوڑ دی جاتی تھی تا کہ کئی روز کی شب بیداری کے بعد آرام ہو سکے۔

خصوصیات محرم سیدزادگان

۱- تیرہ دن یعنی ۱۳ محرم تک محفل قوالی موقوف رہتی ہے تا کہ چہلم تک ہونے والی مجالس و سوز خوانی ہوتی رہے اورمیلاد شریف بھی نہیں کیا جاتا ہے کہ یہ خوشی کا اشارہ ہے۔ اس دوران شادی بیاہ تو درکنار حج سے آنے والے حضرات کو بھی پھولوں کے ہار وغیرہ نہیں پہنائے جاتے ہیں، صرف عطر پیش کردیا جاتا ہے۔ دسویں اور بیسویں کے موقعہ پر مجالس کا اہتمام اور نذر نیاز کی جاتی ہے۔

۲- تعزیہ کی سواری میں از حد ادب اورخشوع وخضوع ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کندھا یا سواری دینے والے خدام خواجگان ہی ہوتے ہیں۔ برہنہ سر و برہنہ پا، باوضو، آس پاس کوئی بے ادبی یا گستاخی سامنے نہیں آتی۔ مشعل روشن رکھی جاتی ہے۔ اور مرثیہ خواں مرثیہ پڑھتے چلتے ہیں۔ تبرکاً لوگ کندھا دیتے ہیں اور مرثیہ خواں حضرات کو نذر۔

تعزیے کو عام طور پر ''آثار شریف'' کہا جاتا ہے اور اس پر چاروں طرف سے پھول، میوے، نوٹ اور سنہری کاغذوں کے سہرے اور ہار ڈالے جاتے ہیں۔ یہ سب عام طور سے خدام کرتے ہیں۔ مگر شہر کے دوسرے مسلمان بھی کرتے ہیں۔ سواری کے راستے میں جگہ جگہ چائے کافی شربت وغیرہ تقسیم ہوتا ہے۔ اہل ہنود حضرات بھی اس کے نیچے سے نکلتے ہیں کندھا دیتے ہیں اور ہار پھول پیش کرتے ہیں۔

چہلم تک اکثر وبیشتر گھروں میں مجالس ہوتی ہیں اور ''حلیم'' متواتر پکائی جاتی ہے اور عام دعوت ہوتی ہے۔

کچھ چھوٹے تعزیہ ازراہ عقیدت ومنت نئی نسل کے بچے بھی بناتے ہیں اور جلوس نکالتے ہیں ایک باورچی کا ''چاندی کا تعزیہ'' بھی لنگر خانے میں نکالا جاتا ہے اور سوز وسلام پیش کیا جاتا ہے۔ چہلم پر چھوٹے پیالوں میں بارہ اماموں کی نذر کھیر پر ہوتی ہے اسی روز ایک ''پھول پیالہ'' چوکور شکل کا نکالا جاتا ہے اور شب میں مراثی وسوز خوانی کے ساتھ سیراب کردیا جاتا ہے۔

اس طرح ایک عظیم صوفی مرکز پر اہل بیت اطہار، اولادِ رسولؐ و علیؑ و امامین امت شہدائے کربلا شہدائے سادات کی یاد تازہ کی جاتی ہے اور بے پناہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہرے کرتوں کے پہننے کا رواج عام ہے۔ عاشورہ تک زمین پر سونے کا بھی رواج ہے۔

اجمیر کے اکثر شعرا نے اہل بیت اطہار اور شہدائے کربلا کی شان میں قصیدے، منقبتیں سلام پیش

کیے ہیں۔ ان میں عبد الباری لعن کا سلام بہت مقبول ہے جو ہر مجلس کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

اے محمدؐ کے جگر پارے سلام
اے علی کی آنکھ کے تارے سلام
تونے اے دانائے رمزِ کائنات   دے کے جاں بتلادیا رازِ حیات
دستِ فاسق میں دیا تونے نہ ہاتھ   تا ابد اونچی رہے گی تیری بات
اے محمدؐ کے جگر پارے سلام

عزاداری محرم اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ☆

ہندوستان میں عزاداری کی بنیاد تیرھویں صدی عیسوی میں صوفیائے کرام نے ڈالی۔ صوفیاء عزاداری محرم اپنی خانقاہوں میں انجام دیتے تھے اور یہ عزاداری بہت سادہ طریقے پر مبنی تھی۔ وعظ ہوتا تھا اور پھر دس محرم کو علم و تعزیہ کا جلوس کربلا جاتا تھا۔ آج بھی صوفیاء کی درگاہوں میں عزاداری محرم ہوتی ہے۔ خواجہ غریب نواز کی درگاہ، اجمیر، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ، مہرولی، دہلی اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ، دہلی میں امام باڑے ہیں جہاں عزاداری محرم ہوتی ہے اور دس محرم کو جلوس کربلا جاتا ہے۔ خانقاہ اور امام باڑے کا مزاج یکساں ہے۔ دونوں کے دروازے تمام لوگوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں، چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ میرے جد اعلیٰ سید علی ہمدانی جنھوں نے ہندوستان میں کبرویہ سلسلے کی بنیاد ڈالی اور ایک کتاب ''مودۃ القربیٰ'' کے عنوان سے تحریر کی، انہیں کی نسل سے تعلق رکھنے والے میر کمال الدین ہمدانی نے جلالی ضلع علی گڑھ اتر پردیش میں کبرویہ سلسلے کی بنیاد ڈالی اور عزاداری امام حسینؑ کو فروغ دیا۔ سید شاہ خیرات علی نے ۱۷۷۴ء میں ایک امام باڑہ بھی تعمیر کیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔

دہلی کے سلاطین نے بھی عزاداری محرم کی بنیاد اپنے طور پر ڈالی۔ منہاج السراج نے طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ جب شمس الدین التمش (۱۲۳۶-۱۲۱۰) گوالیر کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا تو محرم کا چاند نظر آ گیا۔ التمش نے منہاج کو حکم دیا کہ اب دس محرم تک رات میں ان کو وعظ دینا ہوگا۔ اسی طرح کے اور شواہد اس دور کے تاریخی مآخذ میں ملتے ہیں۔ مغل بادشاہ بھی اہلِ بیت سے عقیدت رکھتے تھے اور عزاداری محرم کے فروغ کے لیے خانقاہوں اور درگاہوں کو مدد دیا کرتے تھے۔ دوسرے مغل بادشاہوں کے رقعات وغیرہ نہیں ملتے لیکن اورنگ زیب کے رقعات اور احکامات ملتے ہیں۔ اورنگ زیب کو اہلِ بیتؑ سے بڑی عقیدت تھی اور کیونکہ ائمہ بارہ ہیں لہٰذا اس نے اپنا وصیت

☆ شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

نامہ بھی بارہ نکات پر رکھا۔ اپنے رقعات میں سادات کے احترام کے سلسلے میں آیۂ کریمہ۔ قل لا اسئلکم علیه اجراً الاالمودة فی القربی کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اورنگ زیب نے تحریر کیا ہے کہ '' سادات سے محبت اور عزت کرنا ہمارے مذہب کا حصہ ہے اور ان سے نفرت اور دشمنی رکھنے والے کے لیے جہنم ہے''۔ مغل بادشاہ بابر سے بہادر شاہ دوم تک سب اہلِ بیت سے مودت کرنے والے تھے۔

۲۰۰۷ء میں ہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منانے جارہے ہیں۔ اس دوران محرم بھی آیا۔ اس سے متعلق دستاویزات بھی نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں Muting Papers کے نام سے موجود ہیں۔ یہ دستاویزات تعداد میں بیس ہزار ہیں جو تمام فارسی اور اردو زبان میں ہیں لیکن ہم نے ابھی تک ان کا مطالعہ نہیں کیا۔ میں ۱۸۵۷ کے فارسی و اردو دستاویزات پر کام کر رہا ہوں اور اس میں مجھے محرم اور امام باڑوں سے متعلق کچھ دستاویزات ملیں تو میں نے سوچا کیوں نہ اس پر ایک مضمون لکھ دوں تاکہ عام لوگوں تک یہ معلومات پہنچ سکیں۔ یہ دستاویزات اس دور کے نظام کی عکاسی کرتی ہیں۔

NAI Document No.73 - F.I. dated 20th May, 1857

ایک درخواست '' حضرت جہاں پناہ سلامت (بہادرشاہ) کے نام ہے کہ مغل بادشاہ اکبر دوم نے اپنے ششم جلوس میں ایک زمین تعمیر امام باڑہ کے لئے عشرت علی خاں ناظر کو دی تھی اور انہوں نے امام باڑہ تعمیر کرایا اور (وہاں) مجالس محرم ہوتی تھیں لیکن حیدر علی نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے حیدر علی کو برخاست کیا گیا۔ درخواست کنندگان میں نورالدین، خواجہ غلام علی، محمد بخش معمار اور سید حیدر حسین ہیں''۔

NAI-Document No.B, 130 F.185 dated 24th April, 1857

ایک حکم جاری ہوا '' بخدمت جمیع تھانہ دار صاحبان مہربان دوستان تھانہ داران شہر دہلی بعد سلام آنکہ اس وقت جرنیل طالع یارخاں صاحب بہادر کوتوالی میں تشریف فرما ہوئے کہ تم تاکیداً رقعہ بنام تھانہ داران شہر لکھ دو کہ محرم میں باجا بجنے نہ پاوے''۔ یہ حکم ظاہر کرتا ہے کہ محرم کی حرمت کی خاطر مغل بادشاہ نے اس طرح کا حکم جاری کیا۔

NAI- Ducoment No.B 102, F.103 undated

دراصل اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں محبت اہلِ بیت واضح طور پر تھی۔ مثال کے طور پر

شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں'' میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں''۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے' سر الشہادتین' لکھی۔ اس کتاب کی بنیاد پر بعض لوگ شاہ عبدالعزیز کو شیعہ تصور کرتے تھے۔ آپ کے درس میں مختلف لوگ آتے تھے آپ لکھتے ہیں'' حافظ آفتاب میرے درس میں شامل ہوتے تھے ایک روز حضرت علی کا ذکر شروع ہوا، میں نے حضرت علی کے مناقب بیان کرنے شروع کردیئے۔ اس روہیلہ پٹھان نے (مجھے) شیعہ سمجھ کر درس میں آنا موقوف کردیا''۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے ۹۰-۱۷۸۹ء میں تحفہ اثناء عشریہ لکھی۔ اس کے دیباچہ میں شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ'' اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اور جس زمانے میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس میں اثناء عشریہ کا غلبہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ یہ مشکل کوئی گھرایسا ہوگا کہ جس میں کوئی نہ کوئی شخص اس مذہب کو اختیار نہ کرچکا ہو یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو''۔ اسی طرح کی ایک دستاویز Mutiny Papers میں ملی ہے۔ مغل بادشاہوں کو اہل بیتؑ سے عقیدت تھی اور بہادر شاہ ظفر بھی اسی فکری روایت کا حصہ تھے۔ تو جس طرح شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے بارے میں خیال بنا کہ وہ شیعہ ہوگئے ہیں اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے لیے بھی عوام میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ بہادر شاہ نے شیعی مذہب اختیار کرلیا ہے''۔ حقائق آگاہانِ معارف دستگاہ، سالکانِ مسالک حقیقت، ناہجانِ مناہجِ طریقت حضرت علام نظام الدین وسید عبداللہ ومولوی محمد سالم وعلاؤ الدولہ سید محی الدین خاں وسید حسن عسکری ومیاں نیاز احمد صاحبان معلوم نمایند کہ تہمت ترک مذہب اہل سنت و اختیار شیعت بحضور بستہ ...... از راہ حسد برای بدنام ساختن حضور کردہ اند...... کہ این محض دروغ ولی اصل و بآناں کہ استفسار این امراز ایشان نمودہ باشند ازین معنی اطمینان خاطر نمودہ وہند بدین وسیلت تکذیب مدعیانِ این دعویٰ باطل نمایند''۔ بہادر شاہ سے متعلق ۱۸۵۷ء میں اس طرح کی افواہ پھیلانا ایک سیاسی چال تھی اور ہوسکتا ہے کہ ہمیں میں سے کوئی انگریزوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہو۔ ۱۸۵۷ء میں شاہ جہاں آباد کے زیادہ تر عوام جن میں ہندو مسلمان اور سنی و شیعہ سب شامل تھے، بہادر شاہ کے ساتھ تھے۔ لیکن تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو انگریزوں کے ساتھ تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش فوج کے کشمیری گیٹ کے اڑانے کے بعد برٹش فوج کو لال قلعے تک پہنچنے میں پانچ دن لگے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شاہ جہاں آباد کے عوام کی بڑی تعداد انگریزوں کے خلاف تھی۔

اس افواہ میں چال یہ تھی کہ اگر بہادر شاہ اس کی تردید نہیں کرتے تو سنی مسلمان ان سے علاحدہ ہوجائیں گے اور اگر بہادر شاہ تردید کرتے ہیں تو شیعی مسلمان ان سے علاحدہ ہوجائیں گے لیکن انگریز اور ان کے ایجنٹ اپنی چال میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ دراصل محبت اہل بیت تو اللہ کے حکم قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ کا جزو ہے۔ اس میں سنی و شیعہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔ محبت اہل بیت تو اجر رسالت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اس کے بغیر اسلام پر عمل ہی ممکن نہیں ہے۔

جب انگریز ۱۸۵۷ء میں مولوی کفایت علی کو سولی پر چڑھانے کے لیے لے جارہے تھے تو وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

کوئی گل باقی رہے گا نہ چمن رہ جائے گا پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا
نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں حشر تک نام و نشانِ پنج تن رہ جائے گا

ہندوستان میں عزاداری کی روایت اور مسلکی تنازعے

سیوان[1] (بہار) کا ایک خصوصی مطالعہ

پرویز نذیر☆

اس مقالے میں انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال میں عزاداری کی روایات خصوصاً اس سلسلے میں سنّی، شیعہ مسلکی ٹکراؤ کے حوالے سے، کچھ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان میں عزاداری کی روایت صرف شیعوں تک ہی محدود نہیں ہے، اسے بہت تقدس و احترام کے ساتھ سنّی لوگ بھی مناتے ہیں۔ ملک کے کچھ حصوں خصوصاً بہار، اتر پردیش گجرات، دکن وغیرہ میں عزاداری کے سلسلے میں نظر آنے والی جذباتی شدت قابل توجہ ہے اور اس نے کچھ عالموں (محققوں) کی توجہ کو مبذول بھی کیا ہے۔

بنو امیہ اور بنو عباس کی طرف سے ایذا رسانی کے ہراس (Persicution complex) اور بے جا جانبداری کے اپنے خیالی تصور (Perceived discrimination) کے تحت شیعوں نے دنیا کے مختلف حصوں کی طرف ہجرت کی۔

انہیں ہندوستان میں کسب معاش کے لیے بہترین سیاسی ماحول نظر آیا اس لیے یہ ایک ایک، دو دو کرکے یا گروہ کی شکل میں آہستہ آہستہ ادھر بڑھ آئے۔ یہ ہندوستان میں اس دور میں پھلے پھولے جب ایران میں صفوی خاندان کی حکومت تھی۔ اپنے ایرانی رشتوں کے اثر سے شیعوں نے جلد ہی، خصوصاً جنوبی ہندوستان میں، خود کو ممتاز حکمراں طبقے میں بدل لیا۔ یہیں بہمنی سلطنت کے انتشار کے بعد کئی شیعہ حکومتیں وجود میں آئیں۔[2]

گوکہ مغل زیادہ تر سنّی ہی تھے مگر ان کے درباروں میں سیاسی تقاضوں اور کسی حد تک ایرانی ثقافتی اثرات کی وجہ سے، شیعہ اثرات کا مرتب ہونا بالکل ناممکن بھی نہیں تھا۔ براؤن، ای۔جی۔ نے لکھا ہے:

☆ شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۔ سیوان شمالی بہار کا ایک ضلع ہے جسے سارن ضلع سے الگ کرکے ضلع بنایا گیا ہے۔ یہاں مسلمان آبادی کی تعداد کافی ہے۔ گوکہ ان میں سنیوں کی اکثریت ہے مگر بعض جگہ شیعہ بھی غالب حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ موجان مینن: این انٹروڈکشن ٹو شیعی اسلام، دی ہسٹری اینڈ ڈوکٹرائنس آف ٹولور شیعی ازم، ص ۱۲۰

''خواہ عقیدے، خواہ پالیسی کے تحت بابر نے شیعوں کے لیے کافی طرفداری کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں اس کی وسط ایشیائی رعیت میں بہت بیزاری پیدا ہوئی''۔[۱]

اپنی چھنی ہوئی ریاست فرغانہ کو دوبارہ حاصل کر لینے اور ہندوستان کو فتح کرنے کی جدو جہد میں ایران کے حکمراں شاہ اسماعیل نے بابر کی حمایت کی تھی۔ اسی اثر کے تحت اس نے اپنے دربار میں کچھ شیعہ روایات شروع کی تھیں۔[۲] ہمایوں اور اکبر کی مائیں، دونوں ایرانی النسل تھیں، ہمایوں جب ہندوستان سے نکلا اور اس کے بھائیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑا تو اس نے ایران کے شاہ عباس کے دربار میں ہی پناہ لی۔ اکبر کے دربار میں بھی بہت سے بااثر امراء جو کم عمر بادشاہ کے ذہن پر گہرا اثر ڈال سکتے تھے شیعہ تھے۔ بیرم خان بھی ان میں سے ایک تھا۔ ابوالفضل، اس کا باپ شیخ مبارک اور بھائی فیضی وہ ممتاز شخصیتیں تھیں جو اس کے دربار کی زینت تھیں۔

جس وقت اورنگ زیب کے دور میں دکن کی شیعہ سلطنتیں تیزی سے رو بہ تنزل تھیں۔ شمالی ہندوستان میں اودھ، جس کا مرکز لکھنؤ تھا، شیعی مراکز میں اہم ہوتا جارہا تھا۔ کچھ بعد میں یہ مرکز ترقی کر کے ان کلچرل مرکزوں کی حد تک پہنچ گیا کہ اس کی زندگی کے ہر شعبے اور رخ میں شیعیت کا عکس نظر آنے لگا۔ شیعہ سنّی مسلکی جھگڑے کبھی کبھی لکھنؤ میں پھوٹ پڑتے تھے۔

ان دو فرقوں میں جھگڑے کی جڑ سالانہ محرم کی رسومات ہوتی تھیں، جسے ڈونالڈسن نے شیعوں کی سب سے امتیازی اور سب سے زیادہ جانی پہچانی روایتوں میں سے ایک روایت کہا ہے۔[۳] ۱۰ محرم جسے عاشورہ بھی کہتے ہیں، جس دن یزیدی فوج کے ہاتھوں حسینؑ کی شہادت ہوئی، شیعوں کا اس سے گہرا عقیدتمندانہ تعلق پیدا ہو گیا۔ پوری دنیا میں، خصوصاً شیعوں میں محرم کے پہلے دس دن سوگ کے دن مانے جاتے ہیں۔ ابو بویہ کا معز الدولہ (۹۴۵ تا ۹۶۷ء) جو بغداد میں عباسیوں سے منحرف ہوا، اس نے ۹۴۵ء میں محرم کی روایات منانے کی ابتدا کی۔ جب محرم شروع ہوتا تھا تو ''بازار بند کر دیے جاتے تھے، قصائی اپنا کاروبار بند کر دیتے تھے، باورچی کھانا پکانا چھوڑ دیتے تھے، ٹنکیاں (Cisterns) (غالباً حمام) کا ساز و سامان ہٹا دیا جاتا تھا، گھڑوں پر نمدے کے ڈھکن ڈھک دیئے جاتے تھے، عورتیں بالوں کی لٹیں گرا دیتی تھیں، چہروں پر سیاہی لگالیتی تھیں، پھٹے پرانے کپڑے پہنتی تھیں، اپنے

۱۔ براؤن، ای۔ جی۔ اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا III، ص ۴۵۶، IV، ص ۶۴ ۔ ۲۔ ہولسٹر جے۔ این، سابقہ حوالہ (؟) ص ۱۲۷

۳۔ ڈونالڈسن۔ ڈی۔ ایم، دی شیعائٹ ریلیجن، ص ۲۷۷

چہروں پر طمانچے مارتی تھیں اور حسینؑ پر روتی تھیں۔'' [۱]

شیعیت کے فروغ کے ساتھ محرم کی روایات دنیا کے دوسرے حصوں میں پہنچیں۔ برطانوی ہندوستان محرم کے سلسلے میں سب سے اہم مرکز ہوگیا جہاں اس کی رسوم و روایات بڑے منظم انداز میں منائی جانے لگیں۔ کچھ اور بعد میں تو ان روایات کی شناخت لکھنؤ سے وابستہ ہوگئی اور یہ روایات بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ پورے ماہ محرم میں مجلسیں ہوتی تھیں جن میں حسنؑ اور حسینؑ کی وفات پر مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ (مجلس کے آخر میں تبرّا پڑھا جاتا تھا)۔ تبرّے کی سنّی مخالفت کرتے تھے، چونکہ ان کے نزدیک پہلے چار خلیفہ محترم تھے اور انہوں نے اسلام کی بہت خدمت کی تھی۔ ان اختلافات کے باوجود ہندوستان میں سنّی مسلمان بعض جگہوں پر جیسے دکن، بہار، اتر پردیش، بنگال میں شیعوں سے زیادہ محرم مناتے تھے، جو غالبًا ایران سے متاثر مسلمانوں کا اثر تھا۔ اسٹیٹس مین نے اطلاع دی کہ: ''دہلی میں مجلسوں میں شیعہ سنّی بلکہ ہندو بھی شرکت کرتے ہیں''۔ [۲] ہولسٹر نے لکھا ہے: ''اگر مجلس میں بہت سے شیعوں نے شرکت کی تھی تو ان سے زیادہ ہندو شریک تھے''۔ [۳] یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ محرم کی روایات میں مسلمانوں کے مختلف خیالات رکھنے والے لوگ شریک ہوتے ہیں، گو کہ یہ تعداد محدود ہے۔ بہار میں حسنؑ اور حسینؑ کو بہت محترم اور معزز مانا جاتا ہے۔ بے اولاد ہندو حسنؑ اور حسینؑ کے نام پر منت مانتے ہیں کہ اگر ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوگا تو وہ محرم میں 'پیک' کی خدمت انجام دے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ دربھنگا میں ہندو بڑی خواہش کے ساتھ محرم کی رسوم کو منظم کرنے کی ذمے داری لیتے ہیں۔ [۴] بڑودہ کے گیکواڑ اور گوالیار کے سندھیا محرم کی رسومات میں حصہ لیتے تھے اور ان کی سرپرستی میں مجلس ہوتی تھی۔ [۵]

بہرطور، سنّی شیعوں کے درمیان جھگڑے کی اصل جڑ وہی مدح صحابہ، یعنی پہلے تین خلفاء کی تعریف کرنا اور تبرّا یعنی شیعوں کی طرف سے ان پر عام لوگوں کے سامنے لعن کہنا ہی رہی ہے۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک جگہ جگہ یہ فسادات ایک مستقل سا سلسلہ بن گئے جس کے لیے یوپی کی حکومت کو اس صورت حال کا جائزہ لینے اور اصلاحی اقدامات تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل

۱۔ بخش۔ایس۔فدا، دی ریناسانس آف اسلام (Is. cul. II) ص ۴۲۳ ۲۔ دی اسٹیٹس مین، دہلی، اپریل، ۲۴۔ ۱۹۳۴
۳۔ ہولسٹر جے۔این، سابقہ حوالہ ۴۔ بی۔آئی۔آر، بنگال اینڈ اوڑیسہ ۱۹۱۱ء، ج V، ص ۲۵۲
۵۔ اومان۔جے۔سی، دی برہمنس، تھیسس، اینڈ مسلمس آف انڈیا، پارٹ Ch.I. III نیز دیکھیے مسلمین ان اودھ، ڈبلیو۔ایچ۔سیلمین کی کتاب، اے جرنی تھرو دی کنگڈم آف اودھ ان 1849-50 (OUP 1971)

کرنی پڑی۔ نتیجتاً ۱۹۰۹ء میں حکومت کو احتیاطی تدبیر کے طور پر مدح صحابہ اور تبرّا دونوں کو عوام میں کہنے پر پابندی لگانی پڑی۔ یہ پابندی تین موقعوں پر عائد کی گئی جس میں عام طور پر جھگڑے ہوتے تھے۔ یعنی عاشورہ، چہلم اور ۲۱ رمضان۔ ان تین موقعوں کے علاوہ اگر اس رسم کو ادا کیا جاتا ہوتا تو انتظامیہ سے پہلے سے اجازت لینی پڑتی تھی تاکہ نقضِ امن کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔

۱۹۳۵ء میں اس مسئلے نے اس وقت پھر سر ابھارا جب دو سنّی مسلمانوں نے عام لوگوں کے سامنے مدح صحابہ پڑھنی شروع کردی، بہرحال حالات کو بگڑنے سے اس طرح بچایا گیا کہ ان دونوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ پھر اسی سال سنّی مسلمانوں نے 'بارہ وفات' کا جلوس نکالنے کی اجازت مانگی لیکن حکام نے دونوں فرقوں میں بڑھتے ہوئے تناؤ کے مدّنظر اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد پھر یہ کوشش کی گئی کہ کسی قسم کی آپسی صلح و صفائی سے یہ مسئلہ دونوں فرقوں کے درمیان دوستانہ انداز میں طے کرکے اس تناؤ کو ختم کردیا جائے، مگر یہ کوشش ناکام ہوئی۔ آخر حکومت نے الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج السوپ (Allsopp) کی سربراہی میں ایک عدالتی انکوائری کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ اس مسئلے کا بغور مطالعہ کرے اور موجودہ حالات کی معلومات حاصل کرے۔

کمیٹی نے مدح صحابہ اور تبرّے پر پابندی کے احکامات کو جاری رکھنے کی سفارش کی۔ وقتی طور پر تو حکام فسادات کو روکنے میں کامیاب ہوگئے مگر ۱۹۳۹ء میں فسادات پھر شروع ہوگئے کیونکہ فریقین مطمئن نہیں تھے۔

۱۹۳۹ء میں یوپی کی حکومت نے مدح صحابہ اور بارہ وفات پر جلوس نکالنے کی اجازت دے دی۔ اس سے پھر پریشانیاں کھڑی ہوگئیں اور دونوں فرقوں کے درمیان پھر فسادات ہونے کے امکانات بہت واضح ہونے لگے۔ اس کے بعد سے یہ جھگڑے ایک مستقل سی صورت اختیار کرگئے اور ہر موقعے پر کچھ اموات بھی ہوجاتی تھیں۔ اس صورت حال میں کچھ اور اطراف سے سیاسی مداخلت نے حالات کو اور بگاڑا۔[۱] احرار، جو ایک سنّی قوم پرست (نیشنلسٹ) رجحان رکھتے تھے انہوں نے سنّیوں کی حمایت کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خاکساروں نے اس قضیے کا دوستانہ انداز میں فیصلہ کرنے کی

۱۔ دونوں فرقوں، خصوصاً شیعہ فرقے کے لوگ، اترپردیش کے مختلف علاقوں سے ان فسادزدہ علاقوں میں بڑی تعداد میں آنا شروع ہوئے تاکہ اپنے اپنے فرقوں کی مدد کرسکیں۔ دی اسٹیٹس مین، جولائی ۱، ۱۹۳۹ء ص ۱۰، دی اسٹیٹس مین، اگست ۱۸، ۱۹۳۹ء، اطلاع دی گئی ہے کہ لگ بھگ ۱۷۰۰ شیعوں نے اس سلسلے میں گرفتاری دی۔ دی اسٹیٹس مین، اگست ۲۹، ۱۹۳۹

پیش کش کی۔ ۱۹۴۵ء میں مدح صحابہ پر پابندی کو توڑنے کے سلسلے میں بتیس سنّی مسلمان گرفتار ہوئے۔[۱] جان ہولسٹر کا خیال تھا کہ ''مستقبل میں دونوں فرقوں کے صرف ان رہنماؤں سے کچھ امید کی جاسکتی ہے جنھوں نے متواتر صبر وتحمل سے کام لیا ہے اور ایک وقتی یا جزوی فتح کے مقابلے میں کل کی بہتری پر نگاہ رکھی ہے۔ صرف اسی روح اور جذبے کے ساتھ بڑی اکائیوں کی بہترین کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے''۔[۲]

۱۹۱۱ء کی مردم شماری سے ہمیں سنّی اور شیعہ مسلمانوں کا شمار بھی ملنا شروع ہوجاتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں آسام میں سب سے کم شیعہ تھے اور سب سے زیادہ پنجاب اور دہلی میں تھے۔ بڑودہ میں مسلمان آبادی میں شیعوں کا تناسب سب سے زیادہ تھا۔[۳] حیدرآباد، لکھنؤ، فیض آباد، جون پور، رامپور، امروہہ، احمد آباد، ہگلی اور مرشد آباد وغیرہ وہ چند جگہیں ہیں جہاں شیعہ کسی قدر زیادہ تعداد میں ہیں۔ اس لیے یہاں سنّی شیعہ فساد ہونے کا امکان زیادہ ہوسکتا تھا۔

شیعہ سنّی جھڑپوں کے علاوہ خود سنیّوں میں بھی جھگڑوں کی کچھ مثالیں نظر آتی ہیں۔ بہار میں سنّی بڑے جوش وخروش اور جذباتی ابھان کے ساتھ محرم مناتے ہیں۔ میرے آبائی وطن سیوان اور اس کے قرب و جوار کے اضلاع جیسے گوپال گنج، چھپرا وغیرہ میں جہاں زیادہ تر سنّی آباد ہیں، وہاں کے سنّی مسلمان محرم کی رسومات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ جب میں نے محرم کی اہمیت کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے بڑے جذباتی اور غمگین انداز میں جواب دیا کہ: ''یہ اسلام کا سب سے اہم واقعہ ہے اور یہ ہماری زندگی میں سب سے اہم حیثیت رکھتا ہے''۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ اسلام کے ستونوں (ارکان) جتنا اہم ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سیوان اور آس پاس کے علاقے میں کچھ گاؤں ایسے بھی ہیں جو عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ منانے سیوان نہیں آتے لیکن وہ محرم، یعنی عاشورہ منانے ہر سال بلا ناغہ آتے ہیں۔

جب میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ محرم آپ کے لیے کیوں اہمیت رکھتا ہے تو انھوں نے جواب دیا: ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ: ''ہمارے لیے اہل بیت سے زیادہ کوئی اور عزیز اور اہم نہیں ہے، کیونکہ انھوں نے اسلام کی عظمت کو بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں۔ اسی لیے وہ ہمارے لیے نمونہ بن گئے''۔

۱۔ دی ہندوستان ٹائمس، مارچ ۱، ۱۹۴۵ ۲۔ ہولسٹر، جان نارمین، سابقہ حوالہ، ص ۱۹۰ ۳۔ ایضاً، ص ۸۲۰

جب میں نے اتنے بڑے پیمانے پر محرم کے جلوس کو منظم کرنے کے لیے ذرائع کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ جب ہر گاؤں اس کو الگ منظم کرتا ہے تو اس کے بہت زبردست اخراجات ہوتے ہوں گے تو بتایا گیا کہ: ''ہم آپس میں چندہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں خاص طور پر عورتیں اتنی جذباتی ہوجاتی ہیں کہ وہ اپنے زیور تک چندے میں دے دیتی ہیں۔ اس کے لیے شہروں میں رہنے والوں، بلکہ غیر ملکوں میں رہنے والوں سے بھی چندہ لیا جاتا ہے۔ یہ پیسہ عام طور پر تعزیہ، سپر، دُلدُل، علم اور جلوس کو منظم کرنے میں خرچ کیا جاتا ہے''۔

بچپن میں میں نے خود یہ سب کچھ دیکھا ہے بلکہ اس کے بارے میں کچھ جانے سمجھے بغیر بڑے انہماک سے اس میں حصہ بھی لیا ہے۔ مجھے یاد ہے ہر شخص اس وقت یا علی یا حسین ایک خاص انداز میں دوہراتا تھا کہ اس سے خود بخود ایک غمگین سا ماحول بن جاتا تھا۔ یہ شیعہ ماتم سے بالکل مختلف ہے۔ ایسے گرم جذباتی ماحول میں جارحیت پیدا ہونے کے امکانات ہوجاتے ہیں، خاص طور پر جب اس میں اَنا، شناخت اور امتیاز کا جذبہ بھی شامل ہوجائے۔

شیعہ سنّی فساد سے بچنے کے لیے اور الگ الگ گاؤں میں رہنے ولے سنّی گروہوں میں، جو فرقہ وارانہ تشدد کے ویسے ہی شکار رہتے ہیں، ان کی آپسی چپقلشوں پر قابو رکھنے کی غرض سے انتظامیہ متواتر احتیاطی اقدامات اٹھاتا رہتا تھا۔ جیسے جلوس کے راستے مقرر کرنا، علاقے کے مقتدر اور جانے پہچانے لوگوں کی کمیٹیاں بنانا جن میں شیعہ، سنّی اور انتظامیہ کے افراد کے ساتھ ہندو بھی ہوتے تھے۔ یہ دیکھا گیا کہ عام طور پر جھگڑا اس اَنا پسندی کی وجہ سے شروع ہوتا ہے کہ کسی خاص گاؤں کا علم اور جلوس آگے رکھا جائے۔ جلوسوں کے راستے لگ بھگ طے ہوچکے ہیں۔ اِن میں ذرا سی تبدیلی بھی جھگڑے کا سبب بن جاتی ہے۔ پھر شناخت کا مسئلہ ہے، مثال کے طور پر مختلف گاؤں والوں کو اس بات پر جھگڑتے دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے علم کو پہلا اور بہترین مانا جانا چاہیئے۔ اس میں ذات پات کا شاخسانہ بھی کبھی کبھی نکل آتا ہے۔ یہ فساد عام طور پر تعلیم کی کمی یا جہالت کی وجہ سے اٹھتے ہیں۔ اس طرح بہار، بنگال اور اترپردیش میں سنّی مسلمانوں کے لیے عاشورہ کا دن ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے اور یہ وہ موقع ہے، جس میں شہیدوں کو یاد کرکے خراج عقیدت پیش کرسکتے ہیں جس سے انہیں ثواب ملے گا۔

محرم کو روایت کے ایک حصے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سیوان اور اس کے اطراف کے ضلعوں کے

کچھ گاؤں جیسے حسن پورہ، بالیٹھا، میر گنج، بربار یہ وغیرہ، جہاں عزاداری کے جلوس جس بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں وہ ایک طرح سے طاقت کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ میں نے بالیٹھا کے شمشاد صاحب سے اس طاقت کے مظاہرے کی بابت پوچھا تو وہ کافی جذباتی ہوگئے اور انہوں نے جواب دیا: ''ٹھیک ہے یہ غم کا موقع ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمیں ہمت و جرأت، بہادری، صدق دلی، لگن، دین سے محبت اور اسلام کے لیے قربانی کا جذبہ جس کا مظاہرہ اہل بیتؑ نے کربلا میں کیا، یہ سب کچھ بھی سکھاتا ہے، حالانکہ امام حسینؑ یزیدی فوج کی تعداد اور طاقت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے ہمیں بھی کسی مقصد کے تحت طاقت کا مظاہرہ کرتے رہنا چاہئے''۔

سیوان میں سنّی مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہ امام حسینؑ کی یاد میں بڑے جذبے اور جوش و خروش کے ساتھ عزاداری کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اتنے مقدس موقعے پر خود اپنے ہی فرقے کے درمیان تشدد اور جھگڑوں کی کیا وجہ ہے؟ ابوالحسن صرف جلوس کی تنظیم میں ہی بہت زیادہ منہمک نہیں رہتے بلکہ وہ پورے سلسلے کو شروع سے آخر تک منظم کرتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی تکرار یا تشدد پھوٹ پڑتا ہے تو ترجمان یا ثالث کی حیثیت سے انہی کی سب سے زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ انہوں نے میرے سوال کے جواب میں کہا: ''جذبات کی اتنی انتہا میں کچھ بھی ہونا ممکن ہے۔ جوش عقیدت ایک وجہ ہے''۔

اسی سوال کے جواب میں ایک مقامی اسکول کے استاد نے کہا: ''محرم کا جوش و جذبہ، غیر تعلیم یافتہ طبقے میں قابو سے باہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے آپس میں کلیش ہوتا ہے''۔

میں عزاداری کو منظم کرنے والے بہت سے لوگوں سے ملا۔ جب میں نے سوال کیا کہ بہار میں محرم اتنا مقبول کیوں ہے؟ تو ان کے جواب کم و بیش انہی خطوط پر تھے۔ پہلی بات یہ کہ محرم ہماری روایت کا حصہ ہے، دوسرے بریلوی اثر بھی اس کا ایک اہم عنصر ہے، تیسرے خوش حالی جو پیٹر و ڈالر کی دین ہے، چونکہ وسط ایشیا میں کافی تعداد میں لوگ اچھے پیسے کمارہے ہیں اور یہ لوگ محرم کی روایات کی تنظیم میں دل کھول کر مالی مدد دے رہے ہیں۔

ملک کے نوآبادیاتی دور میں شیعہ اور سنّی دونوں کی عزاداری روایات میں کچھ علامتی اہمیت بھی تھی۔ محرم خود ایک علامت ہے امام حسینؑ کی طرف سے برائی کی طاقتوں، ناانصافیوں اور سب سے زیادہ حق اور ناحق کے درمیان جنگ کی۔ امام حسینؑ نے اسلام کی حفاظت میں ابھرتی ہوئی باطل کی

طاقتوں اور خصوصاً خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دینے کے خلاف جنگ کی اور شہادت پائی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے مشہور شعر میں یہی کہا ہے:

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہندوستان میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں برطانوی حکومت کی ناانصافیوں اور غلط پالیسیوں کے خلاف ایک جد و جہد شروع ہوئی۔ برطانوی حکومت سے اس جنگ کے دوران غالباً محرم کا کچھ ورثہ متحدہ طور پر اپنایا گیا تھا۔ محرم کے جلوسوں میں بلاتفریق ذات، نسل اور مذہبی خیالات، معاشرے کے عام طبقے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایکتا کا ایک احساس پھولا پھلا۔ امام حسینؑ کے نام سے کم سے کم ایک نقطۂ اتحاد حاصل ہوا۔ اس نے عارضی طور پر مسلمانوں کے تمام مسلکوں اور ہندوؤں کو ایک پلیٹ فارم پر لے آنے کے لیے اتحادی طاقت کا کام کیا۔ یہ ملک میں برطانوی تسلط کے لیے ایک خطرہ بھی ثابت ہوسکتا تھا، اس اتحاد کا اظہار ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہو چکا تھا، اس لیے حکومت برطانیہ کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ مذہب، ذات پات، نسل اور مسلکوں کے نام پر اختلاف و نفاق کا بیج بودیں۔ یہ کام انہوں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ انجام دیا، جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ اور مسلکی فسادات میں نظر آتا ہے۔

محرم کی کچھ علامتی اہمیتوں میں ایک بہت خاص اہمیت کی حامل ''اکھاڑے'' کی روایت ہے جس نے بنیادی تربیتی میدان کا کام انجام دیا۔ اکھاڑے کی تیاری مہینوں پہلے سے شروع ہوجاتی تھی۔ یہ جنگ کے بڑے پرانے طریقوں، لاٹھی، بھالے، تلواروں وغیرہ سے لڑنے کی تربیت فراہم کرتی تھی۔ ان اکھاڑوں سے فوجی قسم کے کھیلوں میں تربیت یافتہ لوگ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے فرائضی شورش، اور برطانویوں سے وہابیوں کی جنگ میں محرم میں حاصل کیے تجربات کی بدولت ہی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ محرم کی علامتی اہمیت اور اس کے عملی، یا تجربے کے رخ سے برطانوی حاکم چونک گئے اور انہوں نے اپنی ''بانٹو اور راج کرو'' کی پالیسی کو بروئے کار لانا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلکی اور فرقہ وارانہ فساد کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ بیسویں صدی میں شیعہ سنی اور ہندو مسلم فسادات کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ یہ ٹکراؤ آزادی کے بعد بھی جاری رہے۔ لکھنؤ اور دوسری جگہوں پر ہوئے کچھ بہت سنگین فسادات کی رپورٹیں بھی

موجود ہیں۔ شیعوں اور سنیوں میں اس تناؤ کو کچھ کم کرنے کا واحد راستہ تعلیم ہی ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنی مشہور کتاب ''تحفہ'' میں جس کی تالیف ۱۷۸۹ء میں ہوئی تھی، شیعوں کی تاریخ اور عقائد اور تعلیمات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیعیت ہر سنی گھر میں سرایت کرگئی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ مشکل سے ہی کوئی گھر ایسا بچا ہوگا جس میں کچھ افراد شیعہ نہ ہوگئے ہوں اور اس دور میں بہت سے مسائل پر شیعہ سنی علماء کے درمیان بہت سخت مباحثہ چل رہا تھا۔ سنی شیعہ فرقوں میں اختلافات اتنی شدت اختیار کرگئے تھے کہ کبھی کبھی ایک فرقہ دوسرے فرقے کو دائرۂ اسلام سے خارج ماننے لگتا تھا۔ فتوؤں اور ملفوظات میں ہمیں شادی اور عام تعلقات کے بارے میں شیعوں کی حیثیت پر سوالات نظر آتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز انہیں خارج از اسلام تو نہیں سمجھتے تھے مگر وہ ان سے عام سماجی تعلقات سے گریز کو ترجیح دیتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کی کوششوں سے ان دو فرقوں کے درمیان تناتنی ضرور کم ہوئی۔[۱]

نتائج

شیعہ سنی ٹکراؤ کو روکا جاسکتا ہے اور دونوں فرقوں کو متحد کیا جاسکتا ہے۔ پہلے جدید سائنسی تعلیم کا شعور اور اس کے فوائد سے انہیں آگاہ کرکے اور دوسرے دونوں فرقوں کے لوگوں کو، جن میں علماء بھی شامل ہوں، (حقیقی) مذہبی تعلیم دے کر، جس میں مذہبی اعمال پر زیادہ زور دیا جائے۔ متنازعہ فیہ مسائل اور تاریخ کے وہ دور جن سے زیادتیوں کی ابتدا ہوئی ان پر بڑے ٹھنڈے دل اور سکون سے بحث و مباحثے کے ذریعے اختلافات و تضادات کا حل نکالنے کے کوشش کرنی چاہیئے۔ تیسرے حکومت اور انتظامیہ کو عزاداری کے مذہبی جلوسوں کے تئیں فراخدلانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ شیعوں اور سنیوں کو ترقیاتی امور، سماجی ترقی کے کاموں، مقامی انتظامیہ (لوکل باڈیز)، سرکاری منصوبوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہونچانا اور انہیں ان میں منہمک کیے جانے وغیرہ کو ترجیح دی جانی چاہیئے اور کم ترقی یافتہ اور پچھڑے ہوئے علاقوں میں اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ چوتھے دونوں فرقوں کی الگ الگ یا ملی جلی، ایسی غیر سرکاری تنظیمیں قائم کرنی چاہئیں جن سے ان کے سماجی حالات میں بہتری پیدا کی جاسکے۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیتی مراکز اور ایسے پرائیویٹ اسکول کھولنے چاہئیں جو معیاری تعلیم دیں اور ساتھ ہی مذہبی تعلیمی ادارے بھی قائم کیے جانے چاہئیں۔

۱۔ مشیرالحق، شاہ عبدالعزیز، ہز لائف اینڈ ٹائم، ص ۲۲-۲۱

سیتامئو ریاست میں محرم کی عزاداری

ڈاکٹر منوہر سنگھ راناوت☆

سیتامئو کے حاکم، جودھپور کے حاکم ''موٹاراجہ'' اُدے سنگھ کے خاندان سے ہیں۔ اُدے سنگھ کے چوتھے بیٹے دلیپت کو مغل بادشاہ شاہجہاں کی جانب سے جالور اور اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے رتن سنگھ کو ۱۶۵۶ء میں رتلام کی جاگیر ملی تھی۔ رام سنگھ اور شِو سنگھ اس کے وارث ہوئے۔ شیو سنگھ کے لاولد مرنے کی وجہ سے اس کا سوتیلا بھائی کیش داس رتلام کا حاکم بنا۔

۱۶۹۴ء میں کیشو داس کے افسران کے ہاتھوں ''امینِ جزیہ'' ناصرالدین مارا گیا۔ نتیجے میں اورنگ زیب نے رتلام کو ضبط کرلیا۔ کیشو داس پھر بھی شاہی خدمت پر فائز رہا۔ اس کے کام سے متاثر ہوکر اورنگ زیب نے ۱۷۰۱ء میں اسے رتلام کی جگہ تیت رود کا پرگنہ جاگیر میں دے دیا۔ تب اس نے تیت رود کے بجائے سیتامئو کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا اور اس طرح ۳۱/اکتوبر ۱۷۰۱ء کو کیشو داس کے ہاتھوں سیتامئو ریاست وجود میں آئی۔ اس کے بعد گج سنگھ، فتح سنگھ، راج سنگھ، بھوانی سنگھ، بہادر سنگھ، شاردل سنگھ اور رام سنگھ سلسلے وار سیتامئو کے حاکم بنے۔ راجہ رام سنگھ ریاستوں کی ہندوستانی یونین میں شمولیت کے وقت سیتامئو کا حاکم رہا تھا۔

اس وقت سیتامئو مدھیہ پردیش کے مندسور ضلع کی صدر تحصیل ہے۔ سیتامئو ریاست کی آبادی، ۱۸۸۱، ۱۸۹۱، ۱۹۰۱/اور ۱۹۱۱ عیسوی میں ۲۷۹۰۵، ۲۸۴۵۲، ۳۱۴۰۶، ۲۳۹۷۶ تھی۔ ان میں مسلم آبادی ۱۵۲۸، ۱۷۸۱، ۱۵۱۷، ۱۷۱۷، تھی۔ ۱۹۱۱ء میں سیتامئو کی مسلم آبادی ۱۰۶۹ تھی، ۱۹۷۱ء میں سیتامئو شہر کی کل آبادی ۸۰۳۵۲ تھی۔

مذہبی رجحان کی وجہ سے یہاں کے حکمراں شروع سے ہی معاشرتی روایات سے جڑے رہے۔ مذہبی تیوہاروں کے موقعوں پر وہ نہ صرف مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو مالی امداد دیتے تھے بلکہ خود بھی مختلف تقریبات میں شامل ہوتے تھے۔ سیتامئو ریاست چھوٹی ہونے کی وجہ سے یہاں مذہبی ہم آہنگی کا بھرپور ماحول تھا۔ اسی سلسلے میں امام حسین کا ماتم منانے کی روایت کو یہاں بیان کیا جارہا ہے۔

یکم محرم کو رات کے وقت قاضی باڑہ اور پان پُوریا محلے میں چوکی ڈھلتی ہے۔ قاضی باڑہ محلے

☆ ڈپٹی ڈائریکٹر نٹ ناگر شودھ سنستھان، سیتامئو

کا چوکی تالاب پر پہنچ کر دھوئی جاتی ہے۔ وہاں سے قصائی گلی ہوکر صدر بازار پھر لوہار گھائی ہوتے ہوئے امام باڑے آتے ہیں۔ کاغذی باڑے کے تعزیے کی تعمیر میں سیتامئو ریاست کی جانب سے مالی امداد دی جاتی تھی اس لیے وہ سرکاری تعزیہ کہلاتا تھا۔ امام باڑے سے پان پوریا کی چوکی چلتی ہے جو گنگا دھار یا بازار قصائی گلی ہوکر تالاب پر آتی ہے اور وہاں چوکی دھوکر فاتحہ ہوتی ہے۔ وہاں سے نہار گھائی اور صدر بازار ہوتے ہوئے پان پوریا امام باڑے آتے ہیں۔

۲ محرم کو رات میں لکھیرہ پنچایت اور کاگدی پورہ پنچایت کی چوکی ڈھلتی ہے۔ لکھیرہ پنچایت کے امام باڑے سے چل کر چوکی صدر بازار، قصائی گلی ہوکر تالاب پر آتے ہیں۔ فاتحہ ہونے کے بعد لوہار گھائی سے ہوکر لوگ امام باڑے چلے آتے ہیں۔ کاگدی پنچایت امام باڑے سے پوسٹ آفس روڈ ہوکر بھگور گیٹ، ویری ماتا چوکی ہوتے ہوئے لوہار چوک ہوکر تالاب پر آتے ہیں۔ چوکی ڈھلنے کے بعد فاتحہ ہونے کے بعد چوکی واپس امام باڑے لائی جاتی ہے۔

۳ محرم کو منصوری جماعت کے لوگ پنچایت (پنجارہ) پیر مدار گلی سے ہوکر صدر بازار ہوتے ہوئے، تالاب پر آتے ہیں۔ شاہ پنچایت (فقیر) امام باڑے سے مارکٹ گلی سے مٹھ گلی، صدر بازار ہوکر قصائی گلی ہوتے ہوئے تالاب پر آتے ہیں۔ یہاں فاتحہ ہونے کے بعد واپس امام باڑے آتے ہیں۔

۴ محرم کو حمال یونین کا نشان' دو ہرے جھنڈے' بھگور دروازے سے صدر بازار لوہاری چوک تک لے جایا جاتا ہے جہاں تبرک تقسیم کرتے ہیں۔

۵ محرم کو قاضی باڑہ پنچایت کے نشان نکلتے ہیں۔ بھگور گیٹ سے روانہ ہوکر لوہاری چوک ہوکر قاضی باڑہ امام باڑہ تک بینڈ باجے کے ساتھ عقیدتمند آتے ہیں۔

۶ محرم کو پان پور پنچایت نشان کا جلوس بھگور گیٹ سے شروع ہوکر صدر بازار، آزاد چوک، لوہاری چوک، گونگدھار بازار اور پان پوریا امام باڑے آتا ہے۔

۷ محرم کو مہندی کی رسم ہوتی ہے جسے سہرہ چڑھانا کہا جاتا ہے۔

شام کو بھگور گیٹ سے مہندی کا جلوس چلتا ہے جو معہ بینڈ باجے کے آزاد چوک ہوکر لوہاری چوک تک جاتا ہے پھر مہندیاں اپنے اپنے مقام پر واپس چلی جاتی ہیں۔

۸ محرم کو قاضی باڑہ پنچایت کا علم کا جلوس (دو شمشیریں لٹکا کر عالم بنائے جاتے ہیں) بھگور گیٹ، آزاد چوک، لوہاری چوک ہوکر قاضی باڑہ پنچایت جاتا ہے۔

۹ محرم کی شب گشت کی رات (قتل کی رات) کہلاتی ہے۔ سبھی پنچایتوں کے امام باڑوں پر شام کو چار سے پانچ بجے تک تعزیوں کی سجاوٹ کا کام پورا کرلیا جاتا ہے۔ منت ماننے والے ہندو اور مسلمان فرقوں کے لوگ نوٹوں کا سہرہ منت کے مطابق چڑھاتے ہیں۔ منتیں پوری ہونے پر لوگ محرم کے موقعہ پر چاندی کے ہاتھ، پیر، دل، گردہ وغیرہ بنوا کر چڑھاتے ہیں۔ بیمار لوگ جادو ٹونے کا اثر دیکھنے کے لیے تعزیے پر کچھے میں کورا کاغذ باندھتے ہیں۔ اسے ایک تاریخ کو کھولا جاتا ہے اور اس سے استخارہ کیا جاتا ہے۔

اسی دن رات کو ۸ بجے پان پوریا محلے کا تعزیہ سلاوت چوک سے اٹھتا ہے اور پان پور یا امام باڑے کے سامنے آتا ہے۔ دس بجے کے بعد یہاں سے جلوس چل کر گنگدھار یا بازار آتا ہے۔ سیدوں کے محلے سے شہیدوں کا تعزیہ چل کر پان پوریا امام باڑے کے یہاں 'مقام' لگا کر اس کے پیچھے چلتا ہے۔ لکھیرہ امام باڑے سے لکھیرہ کا تعزیہ پیچھے ہوجاتا ہے۔ صدر بازار کا تعزیہ لوہاری چوک میں ایک بجے تک آتا ہے۔ لکھیرہ کا تعزیہ پان پوریا کے پیچھے رہتا ہے۔ بھگور دروازے تک جاتے وقت ایک بار پان پوریا اور دوسرے مقام پر لکھیرہ پنچایت کا تعزیہ آگے رہتا ہے۔ قاضی باڑہ پنچایت کا تعزیہ امام باڑے سے قریب ۱۱ بجے اٹھتا ہے اور لوہاروں کی گھاٹی ہوتا ہوا پان پور کے تعزیے کا 'مقام' لگنے کے بعد قاضی باڑہ تعزیے کا مقام لگتا ہے۔ یہاں سے یہ کچھ وقت ٹھہرنے کے بعد روانہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے قاضی باڑہ کا تعزیہ، اس کے پیچھے لکھیرہ کا تعزیہ اور اس کے بعد پان پوریا کا تعزیہ رہتا ہے۔ سب تعزیے ناتھو لال تھانیدار کے دروازے تک آتے ہیں۔

تھانیدار کے دروازے پر چاروں تعزیوں کے پیچھے کا گڈی پورہ منصوری مقام لگتا ہے اور سب تعزیے کبھی آگے تو کبھی پیچھے رہتے ہیں۔ ان تعزیوں کے پیچھے شہیدوں کا تعزیہ رہتا ہے۔ قصابوں کا تعزیہ سب سے پیچھے رہتا ہے۔ یہاں سے سبھی کا جلوس چل کر آزاد چوک تک آتا ہے۔ آزاد چوک سے واپس اپنے اپنے مقام تک چلے آتے ہیں۔ صبح ٦ بجے سے قبل سب تعزیے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔

۱۰ محرم کو سلاوٹی چوک سے پان پوریا کا تعزیہ ۹ بجے صبح اٹھتا ہے۔ راستے میں شہیدوں کا تعزیہ شامل ہوتا ہے اور پان پوریا امام باڑے میں مقام لگتا ہے۔ وہاں سے جلوس چل کر گنگدھار یہ بازار آتا ہے۔ یہاں دونوں کا مقام لگتا ہے۔ ۱۱ بجے یہاں سے چل کر صدر بازار ہوتا ہوا لوہاروں کے

چوک میں ۲ بجے کے قریب مقام لگتا ہے۔ راستے میں پان پوریا کے تعزیے کے پیچھے لکھیروں کا تعزیہ آنے پر ان کا مقام لگتا ہے۔ اُن کے پیچھے شہیدوں کے تعزیے کا مقام لگتا ہے۔

قاضی باڑے کا تعزیہ ایک بجے امام باڑے سے چل کر لوہاری گیٹ دو بجے پہنچتا ہے، پان پوریا لکھیرہ اور شہیدوں کے مقام لوہاری چوک میں لگنے کے بعد قاضی باڑے کے تعزیے کا مقام بھی لوہاری چوک میں لگ جاتا ہے۔ یہاں سے پہلے قاضی باڑہ کا تعزیہ آگے چلتا ہے۔ پھر ان کے پیچھے لکھیرہ کا پھر پان پور کا، پھر شہیدوں کا، پھر قصابوں کا تعزیہ اٹھتا ہے۔ راستے میں منصوری پنچایت اور کاکذی پنچایت اور شاہی پنچایت کے تعزیے مل جاتے ہیں۔ پیر مدار علی سے یہ تعزیے پان پور کے تعزیے کے پیچھے چلتے ہیں اور ان کے بعد شہیدوں کا تعزیہ بھی ان کے پیچھے چلتا ہے۔ اس کے بعد شاہی پنچایت و ترشی پنچایت کے تعزیے رہتے ہیں۔ تھانیدار کے یہاں مقام ہوتا ہے۔ یہاں سے پھر چل کر تعزیے ایک کے بعد ایک آزاد چوک تک پہنچتے ہیں۔ یہاں پر تعزیہ داروں کا الگ الگ کمیٹیوں کی جانب سے استقبال کیا جاتا ہے۔ یہاں سے چل کر ایک کے بعد ایک تکھور گیٹ تک سبھی تعزیے رات کو ایک یا ڈیڑھ بجے تک پہنچ جاتے ہیں۔

۱۱ محرم کو چلنے والے محرم کے جلوس کے آگے ہندو عورتیں پانی کا چھڑکاؤ کرتی ہیں۔

۱۲ محرم کو اکھاڑے والوں کی طرف سے بھگوریا دروازے پر ایک جلوس بنایا جاتا ہے جو لوہاروں کی گھاٹی تک جاتا ہے۔ سبھی بھاگیدار اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ آخر میں تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ سبھی بینڈ باجے والے باہر سے آتے ہیں یہ اہتمام دس روز تک حضرت امام حسینؑ کی شہادت کی یاد میں کیا جاتا ہے۔

نوٹ: ۱- قاضی باڑے کے تعزیے کی سیتامئو ریاست کی جانب سے مدد کی جاتی تھی۔ اس لیے اسے سرکاری تعزیہ کہتے ہیں۔

۲- قاضی باڑے کے تعزیے کے سامنے مندر کے جھروکے سے سیتامئو کے حکمراں تعزیوں کی زیارت کرتے تھے اور اکھاڑے وغیرہ کا لطف اٹھاتے تھے۔

۳- گڑھ کے پاس تعزیہ آنے پر زنانے محل کی طرف بھی تعزیوں کا منھ کیا جاتا تاکہ رانیاں بھی زیارت کرسکیں۔

۱۲ محرم کو سوئم کیا جاتا ہے۔ مسجد میں کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ چنے اور میوہ ملا کر تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔

سوجی، شکر، میوہ، دودھ ڈال کر روٹ (ایک قسم کی روٹی) بنایا جاتا ہے۔ فاتحہ ہونے کے بعد روٹ ملنے والوں کو بھیجتے ہیں۔

۹ اور ۱۰ تاریخ کو بینڈ باجے کے ساتھ اکھاڑہ بھی رہتا ہے۔ دس دن تک منت والے فقیر بنتے ہیں اور ہرے کپڑے پہنتے ہیں اور پہلی تاریخ سے ۱۰ تاریخ تک لگاتار لنگر لٹاتے ہیں۔ جگہ جگہ سبیلیں بنتی ہیں جہاں شربت پلایا جاتا ہے۔ حلیم بنایا جاتا ہے۔ (سبھی طرح کی دالیں، گوشت، گیہوں ملا کر گھونٹ کر بنایا جاتا ہے)۔ یہ پروگرام ایک سے بارہ تاریخ تک رہتا ہے۔ ایک سے دس تاریخ تک دودھ کا شربت بنا کر بانٹا جاتا ہے۔

کتابیات

۱- سیتامئو سٹیٹ گزیٹر فائل، شری نٹ ناگر شدھ سنستھان، سیتامئو میوزیم میں ہاتھ کی لکھی کاپی

۲- سیتامئو سٹیٹ گیزیٹر کیپٹن سی ای لوارڈ ۱۹۰۸ء

۳- سیتامئو ایڈمنسٹریٹو رپورٹ

۴- سیتامئو سینس رپورٹ، میجر سی الوارڈ سپرنٹنڈنٹ آف سینس آپریشن، ان سنٹرل انڈیا ۱۹۱۱ء

۵- سیتہ مئو راج کا اتہاس ایڈیٹر ڈاکٹر منوہر سنگھ راناوت۔ ناشر: شری نٹ ناگر شودھ سنستھان

۶- سیتامئو راجیہ کا ساماجک آرتھک اتہاس، انیسویں شتابدی ڈاکٹر ریتا کوٹھاری کرت ناشر: شری نٹ ناگر شدھ سنستھان، سیتامئو

۷- سینسس آف انڈیا مندسوکر۔ اے۔ کے۔ پلڈ یا ۱۹۷۱ء

۸- رو یہ کار راجہ رام سنگھ کے

۹- رتلام کا پرتھم راجیہ، مصنف ڈاکٹر رگھو بیر سنگھ، ناشر راج کمل پرکاشن نئی دہلی

۱۰- جودھپور راجیہ کی کھیات حصہ۔۱، ایڈیٹر ڈاکٹر رگھو بیر سنگھ اور ڈاکٹر منوہر سنگھ راناوت، ناشر: پنچ شیل پرکاشن، نئی دہلی

جنوبی راجستھان میں داؤدی بوہرہ فرقے میں عزاداری محرم

ڈاکٹر ملکہ بوہرہ☆

اہل اسلام کے 'اسماعیلی شیعہ' فرقے میں داؤدی بوہرہ مسلک کا ایک اہم مقام ہے جو اسلام کے تمام اصولوں، روایتوں اور قوانین کو مانتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ''دعوت الحق''[1] کی طے کی ہوئی روایتوں، قوانین اور احکامات پر بھی عمل کرتے ہیں۔ وہ حق کے داعی کے سامنے میثاق (قسم) لیتے ہیں، جس میں اسلام کے اصولوں کو ماننے، ایمان پر قایم رہنے، انسانیت اور اصولوں کو برقرار رکھنے اور تمام گناہوں اور برے کاموں سے دور رہنے کی قسم کھلائی جاتی ہے۔

بوہرہ لفظ گجراتی کے 'وہورہ' یا 'وہورا' لفظ سے بنا ہے جس کا مطب ہے تجارت کرنا یا برتاؤ رکھنا۔ یہ نسل غیر ملکی نہیں ہے، یہاں کے راجپوتوں، برہمنوں، بنیوں کے اسلام قبول کرنے سے وجود میں آئی تھی، جو عام طور پر تجارت کرتے تھے۔ ہندوستان میں اس فرقے کی ابتدا گجرات صوبے میں ہوئی، اس وقت وہاں سدھ راج جے سنگھ (۱۰۴۳ سے ۱۰۳۴) کی حکومت تھی۔ 'مجلس سفینہ' نامی کتاب میں شیخ عبید علی سیف الدین نے بتایا ہے کہ ۴۶۰ ھ میں مصر میں امام مستنصر باللہ (۴۲۰ تا ۴۸۷ھ) کے پاس ہندوستان کے گجرات صوبے کے پاٹن مقام سے دو راجپوت روپ ناتھ و بالک ناتھ گئے تھے۔[2] امام نے انہیں اسلام کی تعلیم دی اور ہندوستان روانہ کیا۔ تب وہ گجرات میں کھمبات کی کھاڑی کے کنارے اترے۔ وہ ہندو سے مسلمان ہوئے تھے، اس لیے راجہ سدھ راج جے سنگھ سے بھاگتے پھر رہے تھے۔ انہیں پیاس لگی تو وہ ایک کھیت کی طرف چل پڑے۔ وہاں ایک کسان (کئی روایتوں میں مالی اور مالن بھی کہا گیا ہے) سے پانی مانگا تو اس نے کھیت میں موجود کنویں کو سوکھا بتایا۔ تب دونوں راجپوتوں نے، جو اب اسلام قبول کرنے کے بعد مولائی نصرُ الدین

☆ اودے پور

۱- دعوت الحق: اسے داعی مطلق بھی کہتے ہیں۔ سیدنا، آقا، مولی بھی اسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ... سردار۔ جسے غیب سے امام کی ساری طاقتیں ملی ہوئی ہیں۔

۲- پنڈیا رلونڈر، ڈی، گلیا کوٹ درشن، ص ۳۶، نیز (۲) نسیم سحر، محرم ۱۴۲۴، ص ۲، میں روپ ناتھ اور بالک ناتھ کو ناتھ پنتھی برہمن بتایا گیا ہے۔

اور مولائی عبداللہ کے نام سے پہچانے جاتے تھے، کچھ پڑھ کر اپنی کرامات سے کنویں میں پانی پیدا کردیا۔ یہ کرامت دیکھ کر مالی اور مالن نے اسلام قبول کرلیا، ساتھ ہی حق کے داعی کو 'میثاق' دیا۔ ہندوستان میں بوہرہ مسلک کو قبول کرنے والے پہلے عام لوگ یہی دونوں تھے۔[۱] ایک دوسری روایت کے مطابق یمن میں بوہرہ فرقے کے تیسرے داعی سیدنا حاتم بن ابراہیم (قدس اللہ روحہ) کے دور میں ان کی اجازت سے نائب مقرر ہوکر تین شخص مولائی احمد، مولائی عبداللہ، مولائی نورالدین ہندوستان کے کھمبات علاقے کی طرف تشریف لائے۔ اس وقت کھمبات کا شمار ہندوستان کی بڑی بندرگاہوں میں ہوتا تھا۔[۲] اس وقت کھمبات کی کھاڑی میں یمن، عراق، ایران افریقہ، امریکا وغیرہ ملکوں کے تاجر بھی تجارت کرتے تھے۔ جن کا تعلق ان تینوں مولائیوں سے تھا۔ انہیں کے اثر سے کھمبات، بناس کانٹھا، سابرکانٹھا، کھیڑہ سمیت جنوبی صوبوں کے تاجروں نے اسلام قبول کیا۔[۳] بعد میں وہی بوہرہ فرقے والے کہلائے۔

راجہ سدھ راج جے سنگھ کے وزیر بھارمل تھے اور بھارمل کے بھائی تارمل تھے۔ انھوں نے مولائی عبداللہ، مولائی نورالدین کی کرامات کے اثر سے اسلام قبول کیا۔ بعد میں راجہ جے سنگھ کے علاوہ اس کے کئی فوجیوں اور رعایا نے بھی اسلام قبول کیا۔ اس وقت برہمنوں کی جو جنوئی اتاری گئی اس کا وزن ۲۶۰ رتل تھا۔[۴]

سدھ راج جے سنگھ کے لیے 'رسالہ بحرالبدایہ'[۵] میں سیّدی کھوج بن ملک صاحب (جن کی قبر مبارک گجرات کے کھیڑہ ضلع کے کپڑونج تعلقے میں ہے) نے بتایا ہے کہ سدھ راج جے سنگھ کا دارالحکومت پاٹن تھا۔ انھوں نے مولائی عبداللہ کے ہاتھوں پر دین اسلام قبول کیا تھا۔ اور اپنی موت تک اسلام پر کامل رہے۔ انہیں ان کے محل کے احاطے میں ہی دفنایا گیا۔ اس بات کا مختصر ذکر قوم بواہر کی ایک تاریخ 'مراعات احمدی' کے صفحہ ۸۶-۸۷ پر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی راس مالا گجرات میں بھی اس کا ذکر ہے۔

سدھ راج جے سنگھ کی حکومت ۱۰۹۴ تا ۱۱۴۳ء (۴۸۷ تا ۵۳۷ھ) بتائی گئی ہے۔

بھارمل کے بیٹے یعقوب کو گجرات میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کی قبر مبارک پاٹن

۱- نسیم سحر، محرم ۱۴۲۴، ص ۲۳ ۲- نسیم سحر، ۱۴۲۴، ص ۳- نسیم سحر، ماہ رجب ۱۳۹۷ھ، ص ۳۴، ۳۵
۴- نسیم سحر، محرم ۱۴۲۴ء، ص ۲۳ ۵- ایضاً، ص ۲۵

میں ہے۔ تارمل کے بیٹے فخرالدین تھے جنھیں تبلیغ کے لیے راجستھان بھیجا گیا تھا۔ یہیں جنوبی راجستھان کے ڈونگر پور ضلع کے گلیا کوٹ قصبے میں بھیلوں سے ہوئی مڈبھیڑ میں انہیں اور ان کے بیٹے داؤد بھائی صاحب اور ان کے چار ساتھیوں کو شہید کیا گیا۔ ان سبھی کی قبریں گلیا کوٹ میں ہیں۔ موجودہ داعی ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین تارمل کے وارثوں میں سے ہیں۔ بھارمل کے وارثوں میں سیدنا عبدِ علی سیف الدین ہیں جن کی قبر مبارک سورت میں ہے۔[۱] اس طرح گجرات میں 'دعوت الحق' یا 'دعوتِ فاطمی' کی شروعات سب سے پہلے گجرات کے کھمبات، پاٹن وسدھ پور میں ہوئی۔[۲] مگر دعوت کی گدی کئی برس تک احمد آباد میں رہی۔ فی الحال یہ ممبئی میں ہے۔

دوسرے فرقوں کی طرح بوہرہ فرقے میں بھی کئی شاخیں ہیں جیسے داؤدی، بوہرہ داؤدی، سلیمانی بوہرہ، علیاء بوہرہ، میمن بوہرہ وغیرہ، ۹۸۰ھ کے آس پاس گجرات میں ہندوستان کے تیسرے داعی سیدنا داؤد بن قطب شاہ بن خواجہ بن علی بن یونس برہان الدین کے وقت میں سلیمان کی بغاوت ہوئی۔ اس وقت سلیمان کے ماننے والے سلیمانی بوہرہ کہلائے اور داؤد بن قطب شاہ کے ماننے والے داؤدی بوہرہ کہلائے۔[۳]

داؤدی بوہرہ فرقے میں اسلام کے ہجری کلنڈر کے مطابق آنے والے مہینوں میں تمام تیوہار، عرس مبارک وغیرہ مذہبی عقیدے اور باہمی میل جول کے ساتھ روایتی انداز میں منائے جاتے ہیں۔ محرم ایک ایسا تیوہار ہے جسے عزاداری کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ راجستھان کے جنوب میں میواڑ اور باگڑ میں بھی اسے غم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس حصے میں اودے پور، چتوڑ گڑھ، راج سمند، بانس واڑہ، ڈونگر پور، سلمبر وغیرہ آتے ہیں۔

عام مسلمان چاند کے مطابق رمضان کے روزے رکھتے اور عید کا تیوہار مناتے ہیں مگر داؤدی بوہرہ فرقے میں چاند نہ دیکھ کر ہجری کلینڈر میں درج تاریخ کے مطابق ہی سارے تیوہار وغیرہ منائے جاتے ہیں۔ ان میں محرم بھی شامل ہے۔ محرم ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ اسی ماہ سے نئے اسلامی سال کی شروعات ہوتی ہے۔ اسے بوہرہ فرقہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ مناتا ہے۔ اس موقع پر ذی الحجہ کی آخری تاریخ یعنی ۲۹ تاریخ کو عشا کی نماز کے بعد خدا کی حمد وشکر ادا کر کے آنے والے سال کے لیے خوشی اور کامیابی کی دعا کی جاتی ہے۔ فرقے کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں پڑوسیوں،

۱۔ نسیم سحر، ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ، ص ۲۱ ۲۔ نسیم سحر، ذی قعد ۱۴۲۴ھ، ص ۵۳ ۳۔ گلشن احمد آباد، ص ۲۲

رشتہ داروں اور جاننے والوں کو مدعو کرتے ہیں اور ایک بڑے تھال میں ۲۱، ۲۷، ۵۲، ۱۰۱ طرح کے پکوان سجا کر پیش کرتے ہیں۔ تھال میں نمک، خاک شفاء قرآن شریف، چاندی کا سکہ (جس پر اللہ یا پنجتن پاک میں سے کسی ایک کا نام نقش ہو) ناریل، دہی، طرح طرح کی مٹھائیاں، پھل، تلے ہوئے اور بھنے ہوئے گوشت کے پکوان، بھنے یا پکے ہوئے مچھلی کے قتلے، میٹھا پان وغیرہ رکھتے ہیں۔ کھانا کھانے سے قبل بسم اللہ کہہ کر نمک چکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہی کھانے کی شروعات کی جاتی ہے۔ نمک چکھنا اسلام میں سنت مانا جاتا ہے۔

محرم کی پہلی تاریخ ہجری سال کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اسے ہنسی خوشی کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ مگر دوسری تاریخ سے دس محرم تک کربلا (عراق) میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے خاندان کے لوگوں کو تین دن بھوکا پیاسا رکھ کر شہید کیے جانے کی یاد میں سوگ اور ماتم منایا جاتا ہے۔ اس دوران ۹ دنوں تک مسجدوں میں وعظ ہوتے ہیں۔ غم منانے، تبرک بانٹنے اور نیاز کی تیاریاں بوہرہ فرقہ دس دن پہلے سے ہی شروع کر دیتا ہے۔ مسجدوں کی صفائی اور رنگ روغن کا کام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رنگ برنگی پنیوں یا روشنیوں سے مسجد کو سجایا جاتا ہے۔ محرم کے دس دنوں کے وعظ کے لیے عامل صاحب کے تخت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مسجد میں قالینیں و جاز میں بچھائی جاتی ہیں۔ دس دنوں تک تبرک کی صورت میں شربت دودھ وغیرہ بانٹنے کے لئے اور شام کو نیاز کے کھانے کے لئے جماعت خانوں میں اناج اور دوسری چیزیں جمع کر کے رکھی جاتی ہیں۔ محلے میں جگہ جگہ سبیلیں بنائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے سبھی صوبوں میں جہاں جہاں بوہرہ فرقہ آباد ہے، وہاں وہاں وعظ کے لیے سیدنا کی جانب سے نمائندے کی شکل میں سیدنا کے گھرانے کے شہزادے بھائی صاحب، عامل صاحب وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔ وہی مسجدوں میں وعظ کرتے ہیں۔ جہاں سیدنا کے تشریف لانے اور وعظ کا اعلان ہوتا ہے وہاں خاص انتظام ہوتا ہے۔ اندرونی اور بیرونی ملکوں سے آنے والے فرقے کے لوگوں کے ٹھہرنے، کھانے پینے کا انتظام سیدنا صاحب کی جانب سے ہوتا ہے۔ سارا خرچ بھی وہی اٹھاتے ہیں۔ عارضی بینک اور دوا خانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ قوم کے اونچے طبقے کے لوگ اس کے لیے پاس جاری کروالیتے ہیں۔

ماہِ محرم کی دوسری تاریخ سے مسجدوں میں حضرت امام حسینؓ کی یاد میں وعظ کے سلسلے کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ غم حضرت امام حسینؓ کی طرف سے کربلا میں اسلام کو آباد (باقی) رکھنے کے لئے اپنے

۷۲ ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوجانے کے واقعے کی یاد کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت امام حسینؑ پیغمبر حضرت محمدؐ کے نواسے تھے وہ کسی بھی طرح سے بنو امیہ خاندان کے ظالم، شرابی حاکم یزید کی بیعت کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ یزید کی حکومت کے آگے سر جھکانے کے مقابلے میں اسلام کو زندہ و آباد رکھنے کے لئے شہید ہوجانا بہتر سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔

داؤدی بوہرہ فرقہ حضرت امام حسینؑ کی اسی یاد میں سادگی کے ساتھ اپنے روایتی لباس میں مردانہ جُبہ، پائجامہ، لمبا جامہ، پہن کر سر پر صافہ، یا ٹوپی پہن کر اور عورتیں برقع پہن کر مسجدوں میں جاتے ہیں۔ واعظ کا وقت صبح دس بجے سے دوپہر دو بجے تک ہوتا ہے۔ اس دوران سبھی مرد عورتیں مسجد میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر تخت پر بیٹھے بھائی صاحب یا جناب عامل صاحب سے وعظ سنتے ہیں۔

وعظ میں خاص طور سے اللہ اور اس کے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا، اولیاء وائمہ (حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت پیغمبر، پنجتن پاک، سیدناؤں و سیّدیوں) کے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں ان کی پیدائش، طرز زندگی، حسن اخلاق، ایمانداری اور اسلام کے لیے کی گئی ان کی قربانیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس دوران بیچ بیچ میں نوحے، مرثیے پڑھے جاتے ہیں، ساتھ ہی یا علی، یا حسن، یا حسین کہہ کر ماتم کر کے غم کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی مصیبتوں کو یاد کر کے روتے ہیں۔ اس کے بعد فوراً دوپہر کی نماز ظہر و شام کی نماز عصر ایک ساتھ ادا کرتے ہیں۔ نماز کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ مسجد سے باہر اور محلوں میں بنی سبیلوں میں شربت اور دودھ وغیرہ کا تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔

شام ۵ بجے سے رات ۸ بجے کے بیچ داؤدی بوہروں کی جانب سے جماعت خانوں میں نیاز (دعوت) کا انتظام ہوتا ہے۔ اس موقع پر پنجتن پاک، امام سید الشہدا پر درود وصلوٰات پڑھی جاتی ہے اور کھانے کی شروعات کی جاتی ہے۔ نیاز میں پہلے عورتوں اور بچوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ مرد بعد میں نیاز لیتے (کھاتے) ہیں۔ اس کے بعد مغرب وعشا کی نماز مسجدوں میں ایک ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ رات ۸ بجے کے بعد مسجدوں میں پھر مجلس کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس موقع پر امام حسینؑ اور ان کے ساتھ شہید ہوئے رفیقوں کے نوحے، مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی سبھی عزاداروں کو اس میں شریک ہوکر ماتم کرنے اور رونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس کے بعد تبرک کی شکل میں ناریل، شربت، دودھ، ملک شیک وغیرہ بانٹے جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ، تاریخِ طبری اور فتوحاتِ عاصم، کے مطابق ۶۱ ہجری میں محرم کی ۲ تاریخ کو حضرت امام حسینؓ نے اپنے سبھی ساتھیوں سے مشورہ کر کے کوفہ جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ کیونکہ وہاں امام حسینؑ کی جانب سے بھیجے گئے اپنے نائب مسلم بن عقیل ان کے دو کمسن بیٹوں محمد اور ابراہیم اور ان کے وفادار بوڑھے ساتھی ہانی بن غروہ کو عین وقت پر قتل کر دیا گیا تھا۔ کوفہ کے لوگ ان سے پھر گئے اور دمشق کے حاکم یزید کی طرف ہو گئے تھے۔ اس لیے مدینہ کے لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کو کوفہ نہ جانے اور کربلا جانے کا مشورہ دیا۔[1]

محرم ۶۱ھ میں حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں فرات ندی سے دور ایک ریگستانی میدان میں اپنا پڑاؤ ڈالا۔ ان کے ساتھ ان کے عزیز بیوی، بچے اور ۷۲ ساتھی تھے۔ دوسری طرف یزید کی فوج میں ہزاروں کی تعداد میں فوجی تھے۔ یزید نے اعلان کیا کہ جو کوئی امام حسینؑ کے ساتھیوں کے سر کاٹ کر اس کے پاس دمشق بھیجے گا اسے وہ تین ہزار درہم (دینار) کی رقم انعام کی شکل میں دے گا جبکہ حضرت امام حسینؑ کے سرِ مبارک کو کاٹ کر بھیجنے پر انعام کے طور پر دس ہزار دینار اور خراسان صوبے کا 'رے'' مُلک دیا جائے گا۔[2] حضرت امام حسینؑ یزید کے اتنے بڑے لشکر کی تیاری اور سر کے کاٹنے کے اعلان سے گھبرائے نہیں۔ تب یزید کو یقین ہوگیا کہ امام حسینؑ پر اس کی سختی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کسی طرح سے بھی اس کی بیعت قبول نہیں کریں گے تو اس نے فرات ندی اور اس کے آس پاس پانی کے تمام ذرائع پر ناکہ بندی کرنے کا حکم جاری کردیا۔ فرات ندی سے کچھ دور جہاں امام حسینؑ کا کارواں خیمہ لگا کر ٹھہرا تھا وہاں زبردست چوکی بٹھادی گئی۔ ساتھ ہی اس نے کارواں کو ندی کے کنارے سے ہٹنے کو کہا۔ ماہِ محرم کی پانچ تاریخ کو حضرت امام نے اپنا کارواں وہاں سے ہٹا دیا اور 'ہادیہ' نام کے اُجاڑ مقام پر خیمے گاڑے جہاں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ حضرت امام نے یہاں کنواں کھودا جہاں محرم کی پانچویں اور چھٹی تک پانی آیا پھر اپنے آپ بند ہوگیا۔[3]

حضرت امام حسین اور ان کے قافلے پر جب پانی بند ہوا اسے قیامت مان کر داؤدی بوہرہ فرقے کے لوگ محرم کی سات سے دس تاریخ تک خاص غم مناتے ہیں۔

محرم کی ۶ سے ۱۰ تاریخ تک داؤدی بوہروں کی جانب سے منعقد وعظوں میں پنجتن پاک کی شہادت کے بیان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ وعظ کے درمیان پنجتن پاک کے قافلے کے ایک شہید

۱۔ مولوی غلام حسین کٹھارے والا۔ سید الشہدا، حضرت امام حسینؑ، ص ۱۰۰ ۲۔ ایضاً، ص ۱۱۳ ۳۔ ایضاً، ص ۱۱۴

کی شہادت پہلے پڑھی جاتی ہے جس میں خاص کر حضرت امام حسینؑ کے شہزادے ہمشکل پیغمبر علی اکبر کی اور دوپہر کو دو بجے سے ڈھائی بجے کے بیچ حضرت محمد صاحب کی وفات کا ذکر ہوتا ہے۔

محرم کی سات تاریخ کو خاص سوگ مناتے ہوئے بوہرہ فرقہ کے لوگ زیادہ اچھے لباس نہ پہن کر سادگی سے رہتے ہیں۔ پہلے وعظ میں حضرت امام حسینؑ کے سوتیلے بھائی حضرت عباس علمدار کی شہادت اور دوسرے وعظ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دختر حضرت فاطمہ زہرا کی شہادت پڑھی جاتی ہے۔ ۸ تاریخ کو ہونے والے وعظ میں پہلے امام حسینؑ کے ننھے شہزادے حضرت علی اصغر اور بعد میں حضرت علی مشکل کشا کی شہادت پڑھی جاتی ہے۔ ۹ تاریخ کے وعظ میں پہلے حضرت امام حسنؑ کے شہزادے عبداللہ (دولہا قاسم) اور بعد میں حضرت امام حسنؑ کی شہادت پڑھی جاتی ہے۔

ان سبھی وعظوں کے درمیان بیچ بیچ میں نوحے مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ زور زور سے ماتم کرتے ہوئے سید الشہداء پر آئی مصیبتوں کو یاد کرکے رویا جاتا ہے۔ وعظ ختم ہونے کے بعد ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد سبھی لوگ مسجد سے باہر آتے ہیں۔ محلے میں جگہ جگہ بنی سبیلوں میں شربت، مِلک شیک، گرم دودھ، کافی وغیرہ تبرک کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ان سبیلوں میں خاص سجاوٹ کی جاتی ہے۔ سبیلوں کو بانس کے ڈنڈوں سے بنایا جاتا ہے۔ ان پر لال اور ہرے کپڑے کو لپیٹ کر کپڑوں کی جھالروں، رنگ برنگی پنیوں اور روشنیوں اور پنجتن پاک کی تختیوں سے سجایا جاتا ہے۔ وہاں ایک گولک بھی رکھی جاتی ہے۔ جس میں عزاداری کرنے والے اپنی حیثیت کے مطابق حضرت امام حسینؑ کے نام پر پیسے ڈالتے ہیں۔ انہیں پیسوں سے تبرک بانٹا جاتا ہے۔

سات، آٹھ سال قبل جنوبی راجستھان کے ان تمام ضلعوں میں عورتیں شام چار بجے کے قریب مجلسیں پڑھتی تھیں۔ یہ مجلسیں محلوں میں جگہ جگہ طے کیے گئے گھروں میں ہوتی تھیں۔ ان گھروں کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی جہاں کی عورت حال ہی میں بیوہ ہوگئی ہو اور وہ ساڑھے چار ماہ کی عدت[1] میں بیٹھی ہو۔ اسی کے گھر مجلس کی جاتی تھی۔ یہ مجالس دو محرم سے ۲۰ صفر (چہلم) تک ہوتی تھیں۔ آج کل عورتوں کی یہ مجلسیں دو محرم تک نہیں ہوتیں بلکہ ۱۱ محرم سے ۲۰ صفر (چہلم) تک ہوتی ہیں۔

۱- عدت۔ داؤدی بوہرہ فرقے میں کسی عورت کے شوہر کی موت پر وہ تیجے کی فاتحہ کے بعد سفید کپڑے پہن کر کسی کونے میں بیٹھتی ہے۔ اس زمانے میں وہ سب (خصوصاً ناک کا) زیور اتار دیتی ہے۔ پھر چاہے کوئی زیور پہنے نہ پہنے مگر ناک کا زیور کبھی نہیں پہن سکتی۔ عدت کے دوران سارے گھر کے دروازوں، کھڑکیوں پر سفید پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ وہ آسمان نہیں دیکھ سکتی اور اپنے بیٹے پوتے دھیوتے کے علاوہ کسی مرد کو نہیں دیکھ سکتی۔

دو سے ۹ محرم تک صبح وعظ کے علاوہ شام ۵ بجے کے قریب مغرب کی نماز تک جنوبی راجستھان کے اودے پور، ڈونگر پور، چتوڑ گڑھ، بانس واڑہ، سلمبر، وغیرہ میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے ۷۲ ساتھیوں کی یاد میں 'نیازِ حسین' ہوتی ہے جس میں گوشت سے بنے کھانوں کے علاوہ مٹھائیاں اور آئس کریم پیش کی جاتی ہے۔ ان پر صلوٰۃ پڑھی جاتی ہے۔

اس عوامی کھانے میں عورتوں اور بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد ہی مرد کھانا کھاتے ہیں۔ اس موقع پر مردوں اور عورتوں کو قومی لباس پہن کر آنے کا پابند کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مغرب وعشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ داؤدی بوہرہ فرقہ دونوں نمازیں ایک ساتھ ادا کرتا ہے۔

نماز کے بعد رات ۸ یا نو بجے مسجدوں میں پھر مجلسیں ہوتی ہیں۔ جن میں مرد، عورتیں اور بچے ایک ساتھ اپنے مخصوص لباس میں ادب کے ساتھ بیٹھ کر ماتم کرتے ہیں اور نوحے مرثیے پڑھ کر سوگ مناتے ہیں۔ دس محرم (عاشورہ) کی رات کو سبیلوں پر عامل صاحب بسم اللہ لکھتے ہیں۔ اس موقع پر شربت اور دودھ تبرک کی شکل میں بانٹا جاتا ہے۔

دس محرم کے روز حضرت امام حسینؑ کے قافلے کے لوگ کربلا میں بھوکے پیاسے رہ کر شہید ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی بھوک اور پیاس کو یاد کرتے ہوئے عزاداری منانے والے روزہ 'فاقہ' یا 'لاگھن' کی نیت سے کرتے ہیں۔ اس روز صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک وعظ ہوتے ہیں۔ وعظ میں عامل صاحب تخت پر بچھی گدی کو ہٹا کر صرف ایک کپڑا بچھا کر وعظ کرتے ہیں جس میں کربلا کے شہیدوں کے ذکر کے علاوہ خاص طور سے سیدنا قطب الدین شہید[۱] جن کی درگاہ احمد آباد میں ہے، ان کی شہادت پڑھ کر ماتم منایا جاتا ہے۔ ساتھ شہید ہوئے ساتھیوں کے بارے میں تقریریں ہوتی ہیں اور ان کا بھی غم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سیدی فخر الدین شہید[۲] جن کی درگاہ راجستھان کے ڈونگر پور

۱- سید قطب الدین شہید قدس سرہٗ کے ۳۲ ویں اور ہندوستان میں ۷ ویں داعی ہیں۔ آپ کے وقت میں داعی کی گدی احمد آباد میں تھی۔ تخت نشینی شوال ۱۰۵۴ھ کو ہوئی۔ ایک برس آٹھ مہینے دعوت کو سنبھالا، پھر شہید ہوئے۔ ان کا پورا نام قطب شاں قطب الدین تھا۔ پیدائش ۳۰ ذی الحج ۹۸۰ھ میں ہوئی۔ گلشن احمد آباد، ص ۲۶، نسیم سحر جمادی الآخر ۱۴۲۶ء، ص ۱۳ میں سیدنا قطب الدین شہیدؒ ... میں بتایا گیا ہے کہ جب دہلی میں مغل بادشاہ شاہجہاں نے اپنے بیٹے اورنگ زیب کو گجرات کی صوبے داری دی تو اورنگ زیب نے اپنے استاد عبدالقوی اعتماد خاں کے کہنے پر قاسم نام کے کسی شاہی عہدے دار کی قیادت میں سیدنا قطب الدین کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح انہیں (۱۶۴۶) ۲۷ جمادی الاول ۱۰۵۶ھ کو احمد آباد کے کرنج کے میدان میں شہید کردیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب سنی فرقے کا کٹر حامی تھا۔

۲- یہ بوہرہ فرقہ موجودہ داعی ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین کو اپنا داعی نہیں مانتا۔ یہ داؤدی بوہروں کی طرح ہی محرم مناتے ہیں مگر اس موقع پر کالے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کی عورتیں برقعہ نہیں پہنتیں بلکہ بوہرہ فرقے کی روایتی پوشاک گھاگھرا، بلاؤز اور اوڑھنی پہنتی ہیں۔ یہ لوگ میثاق نہیں دیتے۔

ضلع کے گلیا کوٹ قصبے میں ہے ان کی شہادت پڑھ کر ماتم منایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر زیارت حضرت امام حسینؑ کی خاص نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیدنا طاہر سیف الدین، ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین کی بھی دو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ ساتھ ہی 'وصیلے' اور ماتم کئے جاتے ہیں۔ عصر کی نماز سے پہلے انبیاء، اولیاء، ائمہ کو یاد کیا جاتا ہے اور دعوت الحق کے دشمنوں پر لعنت بولی جاتی ہے۔ جس میں سبھی عزادار ساتھ دیتے ہیں۔

شام چار بجے پھر دوسرا وعظ منعقد کیا جاتا ہے۔ مرثیہ پڑھنے والے مرد عامل صاحب کے گھر اکٹھا ہوتے ہیں۔ وہاں سے وہ انہیں مسجد تک لے جاتے ہیں۔ اس دوران وہ پورے راستے مرثیے پڑھ کر ماتم کرتے جاتے ہیں۔ اس موقع پر اودے پور میں داؤدی بوہرہ فرقے کے یوتھ فرقے کے لوگ ایک جلوس نکالتے ہیں اس میں وہ کالے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کی سبیلیں بھی کالے کپڑوں سے بنی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ گھوڑے، اونٹ وغیرہ کی سواریاں نکالتے ہیں۔ جن میں مرد تلوار، ڈھال، چھڑی، برچھی وغیرہ ہاتھ میں لے کر چلتے ہیں۔ ان کے ماتھے پر لگی ٹوپی پر زری زردوزی کے ورق سے 'یا حسینؑ'، یا علی، یا عباس، یا حسن وغیرہ لکھا ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی مرثیے پڑھتے ہوئے مسجد تک جاتے ہیں۔

شام چار بجے والے وعظ میں جو مغرب تک جاری رہتا ہے، عامل صاحب کربلا کے شہیدوں پر تقریریں کرتے ہیں۔ ان میں خاص طور سے حضرت مسلم بن عقیل، ان کے دوست ہانی بن عروہ، حضرت مسلم کے دونوں شہزادوں، حضرت حُر، ان کے بھائی مسائب، اُن کے فرزند علی، ذہیر بن حسان، حبیب ابن مظاہر، ذہیر بن قین، حضرت زینب کے دو فرزندوں عون و محمد، حضرت امام حسنؑ کے دو بیٹوں عبداللہ اور قاسم، وحضرت عباس علمدار اور ان کے بھائیوں، حضرت علی اکبر، حضرت علی اصغر اور حضرت امام حسینؑ کی شہادتیں پڑھی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ اس درمیان عزادار ''یا حسین، یا علی'' کہہ کر زور زور سے روتے ہیں اور ماتم کرتے ہیں۔ اس وقت مسجد میں ایسا غمگین ماحول ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی وہاں آ جائے تو اس ماحول کو دیکھ کر زار زار رونے لگے۔

مغرب کی نماز کا وقت ہونے پر مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد روزہ خاکِ شفا سے کھولا جاتا ہے۔ اس موقع پر افطاری (فاقہ شکنی) میں پالک اور روٹی کھائی جاتی ہے۔ مسجد میں پالک کی سبزی اور روٹی کے پیکٹ دیئے جاتے ہیں اور، چائے بانٹی جاتی ہے۔ اس کے بعد نیاز حسینؑ کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں حلیم، کدو کی سبزی اور روٹی پیش کی جاتی ہے۔

محرم کے ان نو دنوں میں اس فرقے کے لوگ سادگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ تزک بھڑک کے کپڑے نہیں پہنتے۔عورتیں میک اپ نہیں کرتیں نہ زیورات پہنتی ہیں۔تمام لوگ دنیاداری کے کاموں اور فضولیات سے دور رہتے ہیں۔ جنابت پر پابندی ہے۔ کئی گھروں میں ۹ روز تک ٹی وی پر پروگرام اور فلمیں نہیں دیکھی جاتیں۔ نہ گانے سنے جاتے ہیں۔ بوہرہ فرقے میں تعزیے نہیں نکالے جاتے لیکن تعزیوں کے لیے پوری عقیدت رکھی جاتی ہے۔لوگ حضرت امام حسینؓ کے نام پر چندہ دیتے ہیں۔' منوتی' دینے والے اپنے خرچ سے تعزیے بنواتے ہیں اور نکالتے ہیں۔

چہلم کا روز حضرت امام حسینؓ اور ان کے ۷۲ شہداء کے شہید ہونے کے ۴۰ دن پورے ہونے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس روز بھی فرقے کی مسجدوں میں صبح ۱۰ بجے سے دوپہر ۲ بجے تک وعظ ہوتا ہے۔شام چار بجے خواتین کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد چہلم کی نیاز کی جاتی ہے۔

محرم کے موقع پر ہونے والے تمام وعظوں میں بیان شہادت کے علاوہ ، اصولی زندگی، بھائی چارہ، انسانیت اور وطن کے لیے وفاداری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ساتھ ہی عالم انسانیت میں امن و چین قائم رہے اس کے لیے بھی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

عزاداریِ محرم کی روایت اور اس کے صوری پہلو

ڈاکٹر پشپا دلار☆

محرم اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ اسلام کی شیعہ شاخ میں محرم غم کے سلسلے کا سب سے اہم مہینہ ہے۔محرم کے مہینے کا پہلا دن اسلامی سال کا پہلا دن ہے۔ اس مہینے میں خصوصی طور پر شیعہ مسلمان معرکۂ کربلا کی یاد مناتے ہیں۔ اس یاد کا سلسلہ دس محرم کو اپنے عروج پر ہوتا ہے جسے عاشورہ محرم بھی کہا جاتا ہے۔ اصل میں (عرب کی پرانی تہذیب میں بھی) محرم میں جنگ کرنا منع تھا۔'محرم' لفظ 'حرام' سے بنا ہے جس کے کئی معنوں میں سے ایک معنی منع کرنے کے ہیں۔ اس مہینے کو اور مہینوں کے مقابلے میں سب سے محترم مانا جاتا تھا۔ یہ مہینہ شیعوں کے لیے اب بھی بہت محترم و مقدس ہے......کیونکہ اس میں امام حسینؑ کی شہادت ہوئی تھی۔ شیعہ رسولؐ اسلام کے نواسے امام حسینؑ کی، یزید کی فوجوں کے ہاتھوں شہادت کو غم کے ساتھ مناتے ہیں اور اس کا آخری نقطۂ عروج روز عاشورہ ہوتا ہے۔

سنہ ہجری کے پہلے مہینے میں عزادار یا سوگوار مرد عورت (الگ الگ) جمع ہوتے ہیں اور امام حسینؑ کی یاد تازہ کرنے کے پرسوز انداز میں نظم کے روپ میں ان کی شہادت کا حال پڑھتے ہیں اور ڈھول وغیرہ کی آوازوں کے ساتھ یا حسین کے نعرہ لگاتے ماتم کرتے اور روتے ہیں۔ کہیں کہیں جذباتی قسم کے ڈرامے بھی ہوتے ہیں جن میں کربلا کی جنگ کے منظر اور یزید کے سپاہیوں کے ہاتھوں حسینؑ کی شہادت کے منظر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ وقت شیعوں کے لیے انتہائی غم انگیز ہوتا ہے اور یہ لوگ اس عرصے کو پورے سوز اور سوگ کے ساتھ گزارتے ہیں۔ بہت سے مرد عزادار حسینؑ سے اپنی عقیدت کے اظہار اور ان پر پڑی مصیبتوں کو یاد کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوکر روایتی انداز میں ہاتھ سے سینے کا ماتم کرتے ہیں۔ ملک میں بہت سی جگہوں پر شیعہ لوہے کے بنے کسی ہتھیار سے اپنے جسموں کو زخمی بھی کر لیتے ہیں۔

☆ جے پور، راجستھان

لوگ دس محرم کو شہادتِ حسینؑ کی یاد کے دن کے طور پر مناتے ہیں۔ حق کے لیے اپنی جان قربان کردینا یقیناً آخری قربانی ہے اور قربانی کی آخری حد ہونے کی وجہ سے اس کو اتنا ہی احترام اور اعلیٰ درجہ حاصل ہے۔ اللہ نے ایک آیت میں شہیدوں کو زندہ کہا ہے۔ ''جولوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ کہو، نہیں! وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی طرف سے رزق پاتے ہیں''۔ (آل عمران ۱۶۹)

حقیقت میں محرم صرف دس دن غم منانے کا نام نہیں ہے۔ اس کا تعلق حسینؑ کے گہرے فلسفے سے ہے۔ مجلسوں میں مرثیہ خوانی اور عزاداری کا حقیقی مقصد صرف مسلمان ہونے کے دعوے یا اپنے آپ کو برائے نام حسینؑ سے وابستہ کرنے کا ہی نام نہیں ہے۔ اسلام اور حسینؑ سے رشتے کو زندگی کے ہر شعبے اور عمل سے ظاہر ہونا چاہیے۔

ماتم یا عزاداری سب سے پہلے سیدہ زینب ابن علی ابن ابی طالب نے اپنے بھائی امام حسینؑ، کے خاندان نبوت کے دوسرے بہت سے لوگوں اور صحابیوں کو بھوکا پیاسا کربلا میں شہید کردینے کے غم میں شروع کی تھی۔ عمر سعد نے پیغمبر محمدؐ کے خاندان پر پانی بند کرنے کے لیے بیس ہزار فوج لگائی تھی۔ ان فوجیوں میں بھی رسولؐ کے صحابی موجود تھے، بعض حافظِ قرآن بھی تھے اور راتیں عبادت میں گزارتے تھے۔ پیغمبرؐ نے حسینؑ کے بارے میں کہا تھا' جو حسینؑ سے محبت کرتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اور دوسری حدیثوں کے علاوہ پیغمبرؐ کی ایک حدیث یہ بھی ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ جنت میں جوانوں کے سردار ہیں۔' افسوس ہے کہ مسلم امت نے تمام حقیقتوں اور اقوال کو بھلا کر رسول کی بیٹی فاطمہ پر ظلم اور زیادتیاں کیں۔ اسی طرح اُنھوں نے علی ابنِ ابی طالب پر زیادتیاں کیں جن کے لیے رسول نے کہا تھا، ''اے علی میں اور تم موسیٰ اور ہارون کی طرح ہیں (صرف میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) ان کے لیے یہ بھی کہا تھا کہ'' میں علم کا شہر ہوں، علی اس کا دروازہ ہیں، جو اس کائنات کے بارے میں کچھ جاننا چاہے پہلے علی سے پوچھے پھر میرے پاس آئے۔''

دلیر خاتون زینب بنت علی ابنِ ابی طالب نے رسولؐ کے دفن سے پہلے ہی فاطمہ کو جو اذیتیں دی گئیں انھیں دیکھا تھا۔ اور اب انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں کربلا کی جنگ کے بعد رسولؐ کے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی اذیتیں دیکھ رہی تھیں، انھوں نے کربلا میں رسول کے خاندان کے تمام جوانوں کو کربلا کے میدان میں قتل کیے جانے میں یزید کے کردار کو بھی دیکھا تھا۔ انہی دلیر زینب نے کربلا کے واقعہ کے بعد ایک بڑے ہال کی مانگ کی جس میں عورتیں اور بچے بیٹھ کر اپنے مقتول

عزیزوں کا دل کھول کے ماتم اور گریہ و بکا کرسکیں۔ ماتم یا عزاداری کی ابتداء اُسی دن سے ہوئی۔ شیعہ، جو علی ابنِ ابی طالب کے معتقد ہیں اپنے رنج وغم کے جذبات کا اظہار ماتم اور عزاداری سے کرتے ہیں۔ شیعہ رسول کی نواسی کے اس عمل کی پیروی کرتے ہوئے اپنے رنج وغم کا مظاہرہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام امت مسلمہ تاریخ کو سمجھے اور انتشار کو چھوڑ کر متحد ہو جائے۔

اس شہادت عظیم کا حقیقی مقصد یہی تھا کہ ہر شخص میں جذبہ پیدا ہو کہ وہ صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنی ہر چیز خوشی سے اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کو تیار رہے۔

''یقیناً حسینؑ ایک مینارۂ نور ہیں اور حفاظت کی کشتی''

''یقیناً حسینؑ سے عقیدت و محبت ان لوگوں کے دلوں کو زندہ رکھتی ہے جو امام کی پیروی کرتے ہیں''۔

اس طرح ہر زندہ شخص غم کرتا ہے اور ہر شخص عزاداری کرتا ہے۔

محرم کے جلوس اور عزاداری کی روایت بھی اسی فلسفے سے تعلق رکھتی ہے، مجلس، مرثیہ اور تعزیے کے جلوس سب روایات سے تعلق رکھتے ہیں۔

تعزیہ، عربی لفظ ہے اور اس کے معنی رنج وغم اور ہمدردی کے اظہار (تعزیت) کے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اونچے اور عظیم الشان ڈھانچے (عمارت کے نمونے) بنا کر عظیم شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ تعزیہ داری، یعنی تعزیہ بنانے، سجانے اور ان کے ذریعہ اظہارِ غم کرنے کا طریقہ اس برِصغیر کا خالص دیسی انداز ہے۔

گنبد اور تعزیے کی ابتداء غالباً لکھنؤ سے ہوئی۔ خیال یہی کیا جاتا ہے کہ اس کا چلن آصف الدولہ کے دور سے شروع ہوا اور پھلا پھولا۔ کسی دکان دار نے بانس اور کاغذ سے ایک تعزیہ بنایا۔ اس دکان دار کی موت کے بعد میر باقر نے وہاں ایک امام باڑہ بنوادیا۔ وقت کے ساتھ یہ روایت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔

شاہد علی نقوی کی جلدی ہی منظرِ عام پر آنے والی تحقیق کے مطابق دہلی میں پہلا تعزیہ تیمور لے کر آیا۔ وہ ہر سال اپنی فوج کے ساتھ کربلا جایا کرتا تھا۔ اس سال جب وہ ہندوستان میں تھا یہ لوگ کربلا نہ جاسکے۔ سپاہی بے چین تھے۔ اس لیے تیمور نے انھیں کربلا کی درگاہ کا ایک نمونہ دیا جو خاکِ شفا یعنی کربلا کی مٹی سے بنایا گیا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے اسے دہلی کی سڑکوں پر گشت دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کے مقامی لوگوں نے تیمور کے جانے کے بعد اس نمونے/تعزیے کو یہیں چھوڑنے کی

درخواست کی جو اس نے منظور کرلی۔ بعد میں یہاں کے مقامی لوگوں نے تعزیے کے بنانے میں اور چیزیں بھی استعمال کرنا شروع کردیں۔

تعزیوں کا ابتدائی خاکہ اور ان کی اونچائی وغیرہ کو اندازاً طے کیا جاتا ہے۔ بہرحال ان کا کربلا کی عمارت سے مشابہ ہونا ضروری ہے اور اسے سونے کے رنگ کے ایک بڑے گنبد اور کم سے کم ایک جوڑ مینار سے مکمل کیا جانا چاہیے۔ یہ دونوں چیزیں اسلامی طرزِ تعمیر کی علامت ہیں۔

تعزیے کی بنیاد عام طور پر مربع یا مستطیل ہوتی ہے، ڈھانچہ لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو لوہے کے ذریعے بھی مضبوطی پیدا کی جاسکتی ہے۔ سامنے والے حصے میں بیچ میں ایک محرابی دروازہ ہوتا ہے۔ اس کے دائیں طرف ایک مزار کی چھوٹی سی شبیہ ہوتی ہے، جو اس مقام کی علامت ہے جہاں امام حسینؑ کی شہادت ہوئی تھی۔اس کا ایک اور جزو اندر کے طاقچوں کا ہوتا ہے جسے کاریگر 'محراب' کہتے ہیں۔محراب ایک طاق نما دروازہ (alcove) ہوتی ہے جسے مکہ میں نماز کی سمت معلوم کرنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔

اندرونی حصہ ایک خالی کمرہ سا ہوتا ہے جسے کارڈ، کاغذ وغیرہ کی پٹیوں سے بنے ایک جال سے گھیرا جاتا ہے۔ سجاوٹ، نقش و نگار پھول پتیوں اور جیومیٹری پر مبنی خطوط وغیرہ سے کی جاتی ہے، کبھی کبھی خطاطی کو بھی استعمال کرلیا جاتا ہے۔

تعزیہ عام طور پر ملے جلے رنگوں کا ہوتا ہے جن میں شوخ قرمزی ،نیلگوں، فیروزی، سرخ، ہرا، چاندی اور سونے کا رنگ شامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر کھلے کھلے رنگ تعزیے کے لیے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ سامنے کا حصہ کاغذ وغیرہ سے بہت زیادہ سجا ہوتا ہے۔ بیرونی آرائش کاغذ، پتنگ کے کاغذ، کارڈ بورڈ (گتا)، چمکدار کاغذ یا پنی وغیرہ سے کی جاتی ہے۔کبھی کبھی ہاتھ کی بنی کعبے یا مسجد نبوی کی تصویریں بھی مقامی پسند کے خیال سے لگادی جاتی ہیں۔

ممکن ہے کوئی اس پر حیرت کرے کہ تعزیہ (غم اور اظہار ہمدردی، سوگ کی علامت) اور اس کی چمک دمک دونوں ایک ساتھ کیسے؟ اصل میں یہ کاریگروں کی پسند کے معیار کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے ہاں سجاوٹ کو اس وقت تک مکمل ہی نہیں سمجھا جاتا جب تک اس میں سونے یا چاندی کا جزو شامل نہ کیا جائے۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ ۱۴۰۰ سال پرانی تاریخ کے ایک دردناک المیے کی یاد میں اتنا سجا سجایا ڈھانچہ بنایا جائے، ممکن ہے اس کے پیچھے تصور یہ ہو کہ امام حسینؑ کے مزار کو

خوبصورت اور آراستہ دکھایا جانا چاہیے۔ ایسے ہی جیسے ہم کسی قبر پر پھول یا گلدستے رکھتے ہیں۔

اسلامی طرزِ تعمیر میں قبروں پر مقبرے تعمیر کروانا بہت بعد کی چیز ہے۔ ہمارے برصغیر میں قبروں کو سجانے کی طرف مغل دور میں توجہ شروع ہوئی۔

۱۰ محرم کی رات کو یہ زرق برق شکلیں سمندر میں بہادی جاتی ہیں۔ اس کو ٹھنڈا کرنا کہتے ہیں۔ راجستھان میں کچھ تعزیے خالص سونے اور چاندی کے ہیں جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ تعزیوں کے بنانے میں عام طور پر چمکدار فیتے، گوٹا، جھالر، چمکیلے کاغذ وغیرہ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

نوٹ: اس کے بعد مقالہ نگار نے بہت سی تصویریں شامل کی ہیں اور مقالہ پیش کرتے وقت ان تصویروں کو اسکرین پر دکھایا اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے سمجھایا بھی تھا۔

عزاداری کی روایت
مسز میر حسن علی کے بیانات کی روشنی میں

سید علی کاظم☆

شیعہ اور سنی دونوں ماخذوں کی روایات کے مطابق رسولِ اکرم حضرت محمدؐ نے سانحۂ کربلا کی پیش گوئی کردی تھی۔ ان حدیثوں کی ناقل خود رسول اللہ کی ازواج تھیں۔

امام حسینؑ کی طرف سے یزید کی بیعت سے انکار کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے شاہ عبدالعزیز نے امام حسینؑ کی مکہ سے روانگی سے لے کر اُن کی شہادت تک کی تاریخ کو دہرایا ہے۔[1] نتیجتاً المیۂ کربلا کی یاد خود رسولِ خدا کی سنت ہے جسے سنی اور شیعہ دونوں بے حد قابل احترام اور مقدس ورثہ تصور کرتے ہیں۔ شہادت کے بعد مدینے میں مقیم رسول اللہ کے خاندان میں امِ سلمٰی وہ پہلی شخص تھیں جنھوں نے اپنے نواسے کا غم منایا۔ امام حسینؑ کے خاندان کے باقی ماندہ افراد کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا حقیقی اندازہ لگانا اور انہیں لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ جب یزید نے امام حسینؑ کے خاندان کو شام سے مدینہ واپس لوٹ جانے کا حکم دیا تو خود یزید کے محل کی عورتیں اس خاندان سے تعزیت دینے پہنچیں[2] ان تین موقعوں کو سانحۂ کربلا کو یاد کرنے اور اظہارِ غم کرنے کی پہلی مجلسیں کہا جاسکتا ہے۔ جب یہ خاندان مدینہ واپس پہنچا ہے تو پورا شہر گریۂ و بکا کرنے والوں سے پُر تھا۔ امام زین العابدین اور اُن کے جانشین اور دوست ایک لمحے کے لیے بھی اس سانحے کو بھلا نہ سکے۔ امام جعفر صادقؑ نے ہمیں یاد دلایا ہے کہ ''ہر دن روزِ عاشورہ ہے اور ہر زمین ارضِ کربلا ہے۔

تیرہویں صدی کے ہندوستان میں محرم کے اجتماع و رسومات مسجدوں، عوامی مقامات اور فوجی کیمپوں میں منعقد ہوتے تھے اور انہیں 'تذکرہ' (وعظ) کا ہی حصہ مانا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر طبقاتِ ناصری کے مؤلف منہاج سراج نے ان تذکروں کا ذکر کیا ہے جو اس نے مختلف موقعوں پر

☆ شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱- شاہ عبدالعزیز: سیر الشہادتین، لکھنؤ، ص ۲۸ تا .... ۲- طبری، ج ۱، ص ۳۸۴ تا ۳۹۰

فوجی کیمپوں میں کیے تھے۔[1]

عاشورہ کے جلوس اور عَلَم (اس علم کی شبیہہ جو امام حسین نے کربلا میں اپنے بھائی کو دیا تھا) سے ہندوستان کو سب سے پہلے سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی نے ۳۷-۱۴۳۶ میں متعارف کیا۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ان مغل شہزادوں نے جنہوں نے شیعہ مسلک قبول کرلیا تھا، یہ غلط تصور عام کیا کہ اُن کا جدِ اعلیٰ تیمور شیعہ تھا اور اسی نے ہندوستان میں تعزیوں کی روایت شروع کی تھی۔ اس تصور کی تصدیق کسی تحریری شہادت سے نہیں ہوتی۔ ۱۳۹۳ء میں بغداد فتح کرنے کے بعد وہ کربلا ضرور گیا تھا اور امام حسینؑ کے روزۂ مقدسہ کی زیارت بھی کی تھی۔[2] بابر نے اپنی تزک میں محرم کے سوگ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ گوالیار کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے عاشور کے واقعات (۱۵۲۸) کا ذکر تو کیا ہے مگر کسی قسم کی رسوم وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔[3]

ہمایوں کے دور میں عاشورہ کے اجتماع، جنہیں 'معارک' کہاجاتا تھا (جس کے لغوی معنی میدانِ جنگ کے ہیں) ضرور عام تھے۔ اکبر کے دور میں، ہندوستان میں مشہد میں امام علی رضاؑ کے روضے پر عَلَم بھیجے گئے۔ محرم منانے والے عزادار امام حسنؑ و حسینؑ کے ناموں کے نعرے لگاتے ہوئے آگ پر چلتے تھے۔ اس کا بڑا تفصیلی بیان، سی اینٹونی مانسرائے نے کیا ہے جو پہلے تین جیسوٹ مشنون کا ممبر تھا۔[4]

اودھ میں شیعہ نوابوں نے محرم کے سوگ کے دنوں میں سرکاری چھٹی کا اعلان کیا۔ قدیم شہر ایودھیا کے نزدیک فیض آباد، جسے اودھ کے ابتدائی نوابوں نے اپنا دارالسطنت بنایا تھا، شیعہ کلچر اور محرم کے سوگ اور مجلسوں کا نیا مرکز ہوگیا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد شجاع الدولہ مستقل طور پر فیض آباد میں مقیم ہوگیا اور فیض آباد کو اپنا دارالسلطنت بنا کر اسے ایک متمول شہر میں تبدیل کردیا۔ سوگ منانے کے لیے ''امام باڑوں'' کے نام سے علاحدہ عمارتیں بنوائی گئیں۔ ۱۷۷۵ء کا سال ختم ہونے سے پہلے چوتھا حکمراں آصف الدولہ لکھنؤ منتقل ہوگیا مگر اس کی ماں، شجاع الدولہ کی بیوہ، وہیں فیض آباد میں رہ کر شیعہ کلچر اور محرم کی رسومات کو فروغ دیتی رہی۔

عاشورہ اور چہلم منانے کی رسومات لکھنؤ کے لوگوں کی زندگی کا حصہ ہوگئیں۔ مسز میر حسن علی جنہوں نے ۱۸۳۲ء میں اپنی کتاب ''آبزرویشن آف دی مسلمانس آف انڈیا'' چھپوائی۔ ایک انگریز

۱- طبقاتِ ناصری، ص ۱۷۴ تا ۱۷۵، ۲۴۹ ۲- اے شوسیوا تعلیکچول ہسٹری آف شیعاز ان انڈیا ج ۱، ص ۴۶-۴۵

۳- بابر نامہ، ص ۶۰۷ ۴- جے۔ایس..... اور ایس۔اے بینرجی (ڈاکٹر) دی کمنٹری آف فادر مانسرائے (آکسفورڈ)، ۱۹۲۲، ص ۲۱ تا ۵۲

خاتون تھیں جنہوں نے حسن علی سے شادی کی تھی۔

مسز حسن علی نے محرم کے پہلے دس دنوں میں محرم کی تمام رسومات کو بیان کیا ہے۔ ''ہمیشہ محرم کے پہلے دن کا تصور کرتے ہی میری یادوں میں ایک اداس اداس سا گاؤں عام دنوں میں ایک گھنی آبادی والے شہر کی بے حد گہما گہمی اور ہل چل سے بالکل متضاد، شہر پر چھایا ہوا ایک پروقار سکوت اور خاموشی جیسے خیالات تمام دوسرے تصورات پر چھاسے جاتے ہیں۔ مگر متحرک اور جیتے جاگتے مناظر کا یہ عارضی سا ٹھہراؤ بہت دیر قایم نہیں رہتا۔ دوسرے دن کا تصور کچھ اس طرح ذہن پر ابھرتا ہے کہ بڑی تعداد میں گھوڑوں پر سوار، پالکیوں میں بیٹھے یا پیدل چلنے والے لوگوں کے گروہ کے گروہ سوگ کے طرح طرح کے لباسوں میں ملبوس، اپنے دوستوں ساتھیوں کے گھروں کی طرف شہر کی گلیوں اور چوڑی سڑکوں پر تیز تیز چلتے ہوئے بڑے بڑے ناموں سے منسوب امام باڑوں کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں تاکہ وہ جہاں جہاں حسنؑ اور حسینؑ کی یاد میں تعزیے رکھے گئے ہیں اُن کی زیارت اور انہیں سلام کرنے پہنچ جائیں۔

''لفظ تعزیہ حزن و ملال کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اصطلاحاً کربلا میں حسنؑ و حسینؑ کے چاہنے والوں اور معتقدوں کے بنوائے ہوئے روضوں کی شبیہہ ہوتی ہے۔ یہ تعزیہ بنوانے والوں کی مالی حیثیت، حکومت میں حاصل درجہ یا سرکار سے قربت وغیرہ کے مطابق خالص چاندی سے لے کر بانس اور کاغذ تک سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ اسے کربلا کے ماڈل کے عین مطابق بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور اسے کربلا کی اصلی عمارت کے انداز پر بنایا جاتا ہے۔''

''عام قسم کے تعزیے ۱۰ محرم کے جلوس میں بھیجے جاتے ہیں، اور آخر میں دفن کی رسومات کے ساتھ عام قبرستانوں میں دفن کردیے جاتے ہیں۔ ہر شہر کے باہر کئی کئی قبرستان ہوتے ہیں۔[۱]

جلوس کو بیان کرتے ہوئے مسز میر حسن علی کہتی ہیں:

''درگاہ کی سلامی کے لیے عَلَم لے جانے کے لیے علم چڑھانے والے امراء میں سے ہر ایک اپنے جلوس کو جس طرح منظم کرتا ہے، وہ بڑا شاندار منظر پیش کرتا ہے۔ ان کی تعداد، جو بے شمار ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے رئیس اور اُن کی کمترین رعایا کا کوئی فرد اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سجاوٹ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بہرحال وہ لوگ جو سب سے قیمتی ساز و سامان کا مظاہرہ کرتے ہیں انھیں عوام میں

۱- مسز میر حسن علی: آبزرویشنس آن دی مسلمانس آف انڈیا۔ لندن، ۱۸۳۲ء

زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس سے اُن کی حسینؑ اور حسنؑ کے لیے زیادہ عقیدت اور احترام کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ جلوس میں مجھے ایک شخص انتہائی سوگوار نظر آتا ہے، جو ایک سیاہ سا بانس اٹھائے ہوئے ہے۔ جس سے دو تلواریں جھول رہی ہیں جس کا یہ عَلَم ہے وہ خود یا اس کا نائب اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے اور دوسرے عزاداروں کا گروہ ہے"۔

"وہ دلدل (ذوالجناح) آیا۔ یہ اس گھوڑے کا نام ہے جو کربلا میں حسینؑ کے پاس تھا۔ اس وقت اس کی شبیہہ کے طور پر جو گھوڑا چنا گیا ہے وہ ایک خوبصورت سفید عربی گھوڑا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جانور اور اس کے سوار نے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ اس پر ایک خون آلود کپڑا پڑا ہے، پنڈلیوں پر سرخ رنگ لگا ہے اور چادر پر کئی جگہ تیر چبھے نظر آتے ہیں۔ خاندان کے دو بوگی گھوڑے کے چاروں طرف چل رہے ہیں، پھر ہر درجے کے خادم نظر آرہے ہیں، بہت سے پیدل سپاہی جو کبھی کبھی فائر کرکے جلوس میں ایک فوجی تاثر پیدا کر رہے ہیں۔

"میں نے ان پانچ دنوں میں محرم کے اور بھی کئی جلوس دیکھے ہیں یہ سب کم و بیش ایک ہی انداز کے تھے۔ کچھ جلوس دوسروں سے زیادہ شاندار تھے اور بہت غریب لوگ اپنے علموں کے جلوسوں میں ایک ڈھول سے زیادہ کچھ اور ساز و سامان شامل نہیں کر پاتے اور اُن کا مالک خود ہی عَلَم اٹھائے ہوتا ہے"۔[1]

مہندی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"ساتویں محرم کو مشعلوں کے ساتھ عام اظہارِ غم کیا جاتا ہے اور اسے مہندی کی رات، کہتے ہیں۔ اس کا مقصد اس شادی کی تقریب کی یاد دلانا ہے جس میں، اگر یاد کیا جائے تو واقعاتِ کربلا کے خاکے ہیں، قاسم کی چچازاد بہن حسینؑ کی چہیتی بیٹی سکینہ (فاطمہ) کبریٰ سے اس عظیم جنگ کی صبح کو رسمِ شادی ادا کی گئی تھی۔ چنانچہ اس مہندی کی رات کو جو رسوم انجام دی جاتی ہیں وہ اپنی تمام تفصیلات میں ہر طبقے میں شادی کی تمام رسوم کی بعینہ نقل ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اُس میں عام لوگوں میں پیسے بانٹنا بھی شامل ہے۔ عام لوگوں کی بھیڑ ایسے موقعوں پر تماشہ دیکھنے سے زیادہ اس انعام کے لالچ میں بڑی تعداد میں اکٹھی ہو جاتی ہے"۔[2]

دس محرم کا بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

"محرم کی رسوم کی ادائیگی میں سب سے زیادہ متاثر کن منظر آخری دن کا ہوتا ہے۔ اور تمام

۱- ایضاً، ص ۶۵ تا ۷۹ ۲- ایضاً، ص ۷۴ تا ۸۱

طبقوں کے طرزِ عمل، عام لوگوں کی جذباتی ہلچل، مرد عورت، ہر ایک چہرے پر گہرے تاثر کے نقوش کو دیکھ کر کوئی بھی عام مشاہدہ کرنے والا آسانی سے یہ اندازہ لگالے گا کہ محرم کے دنوں کے تمام پروگراموں کی فہرست میں آج کے دن کا رنج وغم زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

وہ آگے بیان کرتی ہیں:

''میں نے اعلیٰ طبقوں کی عورتوں کو 'مہندی کی رات' میں سرخ و سبز موم بتیاں اپنے ہاتھوں سے تعزیوں کے سامنے رکھتے دیکھا ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ اتنے پُرتقدس انداز میں اس عمل کے انجام دینے کی کیا وجہ ہے؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ خواتین کچھ خاص دعائیں اور منتیں کرتی ہیں جن کے لیے یہ 'تختِ ترحّم' کے لیے اپنے اماموں سے وسیلہ یا سفارش کی خواستگار ہیں۔ سرخ روشنی (موم بتی) حسینؓ سے منسوب ہے جو جنگ میں شہید ہوئے اور سبز روشنی حسنؓ سے منسوب ہے جو زہر سے شہید ہوئے۔ یہ رنگ اسی کی علامت کے طور پر چُنے گئے ہیں اور یہ خواتین اپنی منتوں کے حصول کے لیے ان ہی پر انحصار رکھتی ہیں اور اسی لیے یہ اپنے اماموں کے حضور میں مہندی کی رات میں یہ موم بتیاں روشن کرتی ہیں۔

''میں نے بتایا ہے کہ شرفاء اور امراء جو محرم کی رسوم ادا کر رہے ہوتے ہیں، عام طور پر دس محرم کی صبح ننگے سر ننگے پیر اپنے گھروں سے تعزیوں کے دفن کرنے کی جگہ یعنی کربلا تک پیدل جاتے ہیں خواہ انہیں کتنا ہی چلنا پڑے۔ شاید چار پانچ میل۔ جبکہ آگ برساتی دھوپ اُن کے سروں پر پڑ رہی ہوتی ہے۔ دسویں تاریخ اچھے مسلمان (شیعہ) بڑی سختی سے تیسری گھڑی (تیسرے پہر) تک پوری پابندی سے فاقہ کرتے ہیں اور پانی کی ایک بوند، یہاں تک حقہ تک ان کے منہ کو نہیں چھوتا، کیونکہ اُن کا یقین ہے کہ حسینؓ کی مصیبتوں کا سلسلہ تیسرے پہر تک چلتا رہا۔ یہ لوگ اس وقت تک ہر قسم کے تفریحی مشاغل سے خود کو باز رکھتے ہیں''۔[۱۰]

یومِ عاشور کے چالیسویں دن، جسے لکھنؤ میں چہلم کہتے ہیں، تعزیوں کے جلوس بھی بہت متاثر کن ہوتے تھے۔ گاؤں اور چھوٹے چھوٹے شہروں سے سوگوار لوگ کربلا کے شہیدوں کی یاد اور ان کا پرسہ دینے لکھنؤ آتے تھے۔ یومِ عاشورہ کی طرح دستکار اور ہر طرح کے فنکار الگ الگ اپنے تعزیے بناتے اور ان کے جلوس نکالتے تھے۔ ان کے تعزیے اُن کے اپنے اپنے مخصوص فنوں سے سجے ہوئے ہوتے۔

۱۰- ایضاً، ص ۹۰ تا ۹۳

ملک حقوق بشر کے موضوع پر اپنی کوئی متحد اور آخری رائے نہیں رکھتے ہیں علاوہ ازیں بعض اسلامی ممالک نے بعض قواعد حقوق بشر سے عدم اتفاق رائے کا اظہار کیا ہے بعض کا خیال ہے کہ قوانین کے ساخت کے علاوہ کلاً یہ نظام قوانین حقوق بشر ہی اسلام و شریعت کے خلاف ہے۔ اس کے برخلاف بعض اسلامی ممالک اس پر اپنی مثبت رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ان کے سیاسی مفاد کے مدنظر ہو۔ یہ معرکہ آرائی بتاتی ہے کہ جس طرح یوروپین ممالک میں مسلمانوں اور اسلام سے متعلق اختلاف رائے ہے اس طرح مسلمانوں میں بھی اختلاف نظریات کی بہتات ہے۔ اسلامی ممالک کے لئے خاصا مشکل تھا کہ قوانین حقوق بشر کے تشکیل کے وقت کلیدی کردار ادا کرتے لہذا اب انہیں چاہئے کہ وہ اقوام متحدہ کے قوانین کے مطابق یہ بتائیں کہ وہ اس کی تشکیل کے وقت ان کے ہمراہ نہیں تھے یا انہوں نے محض مصلحتاً صواب رائے کا اظہار کیا تھا۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں عالم گیر پیمانہ پر اسلامی بیداری نے آنکھ کھولی اور بہت ساری تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح کہ بہت سے اسلامی ممالک نے خارجی دباؤ کی بنا پر اس عضویت کو برقرار رکھا اور بعض اسلامی ممالک نے داخلی فشار و دباؤ کی بنا پر یورپ کی اندھی تقلید کو کنڈم کیا۔

انہوں نے صاف کہا کہ ہماری مشکل یہ ہے کہ حقوق بشر سے متعلق افکار جو مغربی گہوارہ میں پروان چڑھے ہیں انہیں اپنے معاشرہ میں لاگو نہیں کر سکتے جس میں عام طور پر ذمہ دار لوگ پائے جاتے ہیں۔

جناب مظفری نے آخر کلام میں کہا کہ مفکروں اور دولتمندوں کے اس دعوی کے پیش نظر جو کہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ حقوق بشر کا عالمی نشریہ، مغربی سند کے طور پر سمجھا جائے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے سارے تہذیب و تمدن ایک ایک نشریہ تیار کر کے ساری دنیا کے لئے اپنے نشریہ کو حجت قرار دے لینگے۔

حقوق بشر پر مغربی نقطۂ نظر عقلاء تاریخ اسلام کے یہاں انتہائی محدودیت و تنگ نظری کا شکار قرار پاتا ہے نتیجتاً اسلام کے تئیں سوء تفاہم پیدا ہوا ہے۔ در حالیکہ اسلام حقوق بشر کو کائنات پر حاوی قانون الٰہی کے شکل میں پیش کرتا ہے۔

اس جلسہ کے آخر میں دو افراد نے اپنے سوالات و شبہات جو اسی موضوع سے متعلق تھے جناب مظفری صاحب سے پوچھے، آپ نے ان کا جواب دیا۔

آخر میں پروفیسر شاہد مہدی، پروفیسر قاسمی اور پروفیسر جعفری نے مختصر الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

قابل ذکر بات ہے کہ آخر میں آقای مظفری کو ان کی خدمات کے سلسلے میں لوح یادگاری سے نوازا گیا۔

دوران جلسہ جناب محمد حسین مظفری نے اصل مقرر کی حیثیت سے جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کرتے
ہوئے ''حقوق الناس: اسلامی نقطۂ نظر'' کے موضوع پر گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا: ''بیشتر یوروپین
مفکرین مسلمانوں کی مخالفت میں حقوق بشر سے متعلق بین الاقوامی نظام کو جنسی و دینی لحاظ سے،
آزادی دین کی رو سے، احکام دیت و وراثت کے اعتبار سے دین اسلام کے قوانین حقوق سے بہتر
جانتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام نے بحسن وخوبی حقوق بشر کا تحفظ نہیں کیا ہے اس کے باوجود
ویسٹرن اسکالر کا ایک گروپ اس بات کا مدعی ہے کہ دین اسلام اور احکام شریعت، قواعد حقوق بشر سے
ٹکراؤ نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں بعض اسلامی ممالک اقوام متحدہ کے بنیان گزاروں میں ہیں اور اقوام
متحدہ کا منشور ان تمام ممالک سے تائید حاصل کرتے ہوئے امید کرتا ہے کہ وہ ممالک تحفظ حقوق بشر
میں کوشاں رہیں گے، فی الحال نوبت یہ ہے کہ تقریباً تمام اسلامی ملک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ تمام
اسلامی ملکوں میں صرف سعودی عرب ایسا ملک تھا جس نے اقوام متحدہ کے حقوق بشر کے بعض دفعات
پر تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ اس کی دفعیں اسلامی آئین کے مطابق نہیں ہیں اور یہ ملک تنہا ایسا ملک تھا
کہ جس نے اس پر اپنی مثبت رائے نہیں پیش کی تھی، اسی بنا پر اسلامی ممالک میں سے بعض اقوام
متحدہ کا جز ہونے کے بعد بھی حقوق بشر سے متعلق قوانین قبول نہیں کئے اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اس
کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔

آقای مظفری نے فرمایا کہ ان تمام استدلالوں کے برخلاف تعارض وٹکراؤ صرف بعض شرعی احکام
تک محدود نہیں ہے۔ شریعت کے ساتھ ان کی ظاہری شکل کی ناسازگاری سے بھی زیادہ اہم ٹکراؤ
محسوس کئے جاسکتے ہیں مگر بیشتر مفکرین نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔

انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ درحقیقت بہت سے اسلامی ممالک کے نمائندہ اور ڈپلومیٹ
ایسے ہیں کہ جو اپنے ملک کے فوائد کے لئے، یا عالمی معاشرے اور اپنے وقار کی بحالی کے لئے اقوام
متحدہ کا جز تو ہیں مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہاں رہ کر اسلام کا دفاع کرسکیں چنانچہ میرا خیال
ہے ''آہو نیو کاسہ'' نے صحیح کہا تھا کہ بیشتر اسلامی ممالک غرب کے حامی ہیں اور ابھی بھی سیاسی و
ثقافتی لحاظ سے خود کو اس کے تاثر سے آزاد نہیں کرسکے ہیں ان میں سے اکثریت ایسی ہے جس کی
روش زندگی غرب زدہ ہے۔

آقای مظفری نے گفتگو کے دوسرے حصہ میں کہا کہ فی زمانہ جائزہ بھی بتاتا ہے کہ تمام مسلمان

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مسئول خانۂ فرہنگ کا

جلسۂ الوداعیہ

بتاریخ ۸۶/۲/۲۷ شمسی بمقام شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ایران کلچر ہاؤس کے ڈائریکٹر جناب ایم۔ ایچ۔ مظفری کا جلسۂ الوداعیہ ''حقوق الناس: اسلامی نقطۂ نظر'' کے عنوان سے منعقد ہوا۔

اس نشست میں جناب مرتضیٰ شفیعی شکیب کلچرل کاؤنسلر، جناب ایم۔ ایچ۔ مظفری ڈائریکٹر ایران کلچر ہاؤس اور آقای مرادی کے علاوہ ہندستان کے معروف دانشوروں نے شرکت کی جن میں حجۃ الاسلام والمسلمین عالی جناب عقیل الغروی صاحب عالیجناب مولانا ذیشان ہدایتی صاحب، پروفیسر شاہد مہدی، پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر جعفری خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت ہوئی اس کے بعد زبان فارسی کے ایک استاد نے نعت پیغمبرؐ پیش کی اس کے بعد حجۃ الاسلام والمسلمین جناب مولانا عقیل الغروی نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے انعقاد جلسہ کے اہداف پر روشنی ڈالی اور فرمایا: ''یہ جلسہ جناب محمد حسین مظفری ڈائریکٹر ایران کلچر ہاؤس کی ناقابل فراموش خدمات کی قدردانی کے لئے منعقد ہوا ہے تاہم حقوق انسانی سے متعلق آپ سمیت دیگر مفکرین کے خیالات سے استفادہ کیا جائے گا''۔

آپ نے فرمایا مظفری صاحب کی خدمات وہ بھی اس مختصر سی مدت میں غیر معمولی حیثیت کی مالک ہیں، درحقیقت اس مختصر سے عرصہ میں آپ کے ذریعہ انتہائی مثبت اور فعال تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ بطور نمونہ اگر ہم ''راہ اسلام'' میگزین ہی کو لیں تو اندازہ ہوگا کہ اب یہ رسالہ پہلے سے زیادہ مفید اور پر از معلومات ہے اور اس نے تمام اسلامی نشریات میں اپنا خصوصی مقام حاصل کیا ہے۔

اپنی اختتامی گفتگو میں آقای غروی نے مظفری صاحب کو داد و دعا سے نوازتے ہوئے ان سے مستقبل میں اس قسم کی مزید خدمات کی آرزو کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عظیم امروہوی نے مظفری صاحب نے زحمت شاقہ کی سلسلے میں اشعار پیش کیئے۔

مورد تاکید میں قرار دیتا ہے اس کے بعد انہوں نے قرآن سے پہلے کی دو آسمانی کتابیں توریت و انجیل کے حوالہ سے پیروان پیغمبرؐ کی خصوصیات بیان فرمائیں۔آپ نے فرمایا کہ اسلام مخالف عناصر کی سازشوں پر اب پہلے سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ آپ نے رہبر معظم آیۃ اللہ خامنہ ای کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا اصل اتحاد اسلامی صرف یہی نہیں ہے کہ ہم اپنے بے سود اختلاف و انتشار نظریات سے کنارکشی کرتے ہوئے آپس میں میل محبت سے پیش آئیں بلکہ اصل وحدت اسلامی یہ ہے کہ ہم دشمنوں کے حیلے اور سازشوں سے محفوظ رہنے کی مل جل کر ہوشمندانہ تدبیر کریں۔

کلچرل کاؤنسلر نے اسلام کے جملہ فرق و مذاہب کے اقدار مشترک کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اصول و اساس دین اسلام ایک ہے پس جملہ علماء و محققین کا فریضہ یہ ہے کہ آپس کی فروعی اختلافات سے کنارہ کشی کرتے ہوئے دنیا کے سامنے دین اسلام کا وہ چہرہ لانے کی کوشش کریں جس کی تبلیغ پیغمبرؐ نے کی تھی اور اللہ کا وہ تعارف کرائیں جو اصل عقیدۂ اسلامی ہے کا تقاضہ ہے۔

غیر ازیں اس جشن میں چند شعرا نے بھی شرکت کی جن میں ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، جناب سردار پنچھی قابل ذکر ہیں، انہوں نے مدح رسالتمآب میں اشعار پیش کئے جسے حاضرین نے خوب سراہا۔

آخر میں ایران کلچر ہاؤس کے کاؤنسلر اور ڈائرکٹر کی جانب سے حفظ وقرأت کے مسابقہ میں اول دوم سوم آنے والے افراد کو انعامات تقسیم کیے گئے جن کی تفصیلات اجمالاً درج ذیل ہیں۔

قرأت

۱- قاری عبدالہادی ابن جناب بدرالدین، حیدرآباد

۲- قاری محمد معراج ابن جناب محمد اسحٰق، دہلی

۳- قاری بدرالدجی ابن شمس الہدی رحمانی، لکھنؤ

حفظ

۱- حافظ محمد فضل الرحمٰن ندوی ابن جناب محمد زین العابدین قاسمی، حیدرآباد

۲- حافظ محمد خالد ابن جناب عبدالقیوم، لکھنؤ

۳- حافظ محمد رضوان ابن عبدالواسع

یہ پروگرام رات کے گیارہ بجے تک چلا پھر مہمانوں کو ماحضر پیش کیا گیا۔

مجید کی ایک آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن انسانوں کے لئے اللہ کی طرف بھیجے ہوئے پیغام رحمت و کرامت کا نام ہے یہ صرف مومنین تک محدود نہیں بلکہ اللہ نے اس میں ہر قوم و ملت، رنگ و نسل کے آدمی سے خطاب کیا ہے، یہ ایک پیغام جس کے ابلاغ و اشاعت کا ذمہ آج کے اس پرآشوب دور میں قاریان وحفاظ گرامی کے سر ہے، انہوں نے مزید فرمایا کہ اول آنے والے افراد انشاء اللہ تہران میں منعقد ہونے والے حفظ وقرأت کے بین الاقوامی مسابقہ میں شریک ہونگے۔

اس کے بعد فتح پوری مسجد (دہلی) کے امام جمعہ جناب مفتی مکرم احمد نے عید میلاد النبیؐ کی مبارکباد اور خانہ فرہنگ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ''کوئی کتاب دنیا میں ایسی نہیں ہے جو حرف بہ حرف یاد کی جائے یہ صرف قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ جو پڑھنا نہیں جانتے وہ بھی اسے حفظ کر سکتے ہیں''۔ انہوں نے مسلمانوں کے مابین اختلافات کو ان کی عقب ماندگی کا سبب قرار دیا ہے اور کہا کہ ہمیں متحد ہونے کی ضرورت ہے۔

ان کے بعد حجۃ الاسلام جناب مولانا شیخ غلام مہدی صاحب قاضی شیعیان مدراس (تمل ناڈو) نے جلسہ سے خطاب کیا انہوں نے فرمایا کہ رسالتمآب نے اپنی ۲۳ سالہ پیغمبری میں محبت اور امن پسندی کے بنیاد پر تعلیمات اسلامی کو نشر کیا۔ انہوں نے آخر کلام میں اطلاع بھی دی کہ حکومت ریاست تمل ناڈو میں مسلمانوں کے حقوق سے متعلق مسائل میں دو الگ الگ شیعہ وسنی قاضی مقرر کئے ہیں۔

مولانا رفیق قاسمی (مدرس مدرسہ دارالعلوم دیوبند) نے کلمات مبارکباد کے بعد فرمایا کہ قرآنی تعلیمات اور سنت پیغمبرؐ کے سہارے نہ صرف مسلمان بلکہ تمام اہل جہان محبت آمیز اور پرامن زندگی جی سکتے ہیں۔

اس کے بعد جناب مرتضی شفیعی شکیب (کاؤنسلر ایران کلچر ہاؤس) نے اس جلسہ کے آخری مقرر کی حیثیت سے خطاب کیا انہوں نے ولادت پیغمبرؐ اور امام جعفر صادقؑ کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قاریان وحفاظ قرآن کریم کے درمیان منعقد ہونے والے اس جشن میں کچھ عرض کرنے کے لئے مناسب ہوگا اگر میں ایک ایسی آیت پڑھوں جو اتحاد بین المسلمین کی روح اور اثر کو بیان کرنے والی ہے۔ **محمد رسول الله و الذين معه اشدآء على الكفار رحماء بينهم** ...... الخ موصوف نے اس آیت کی تلاوت کرکے اس کی شرح بھی بیان فرمائی۔ انہوں نے فرمایا کہ جب اللہ پیغمبرؐ کے سچے پیروکاروں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو کفار کے تئیں ان کی سخت گیری کو ان کی رحم دلی سے پہلے

جشن عید میلاد النبیؐ، قدردانی ہفتہ وحدت اور تقسیم انعامات حفظ و قرأت مقابلہ

(۴ تا ۶ اپریل)

بتاریخ ۶ اپریل بروز جمعہ بوقت ۷ بجے شب ولادت پیغمبر اکرمؐ اور ہفتۂ وحدت مسلمین کی مناسبت سے ایران کلچر ہاؤس میں ایک جشن کا انعقاد کیا گیا۔

اس جشن میں کم وبیش تین سو ہندوستانی و ایرانی محبان رسول نے شرکت فرمائی علاوہ ازین ملک بھر سے مشاہیر قاریان کرام اور حفاظ گرامی بھی اس موقع پر موجود تھے، اول سے سوم درجہ حاصل کرنے والے حفاظ و قرا کو حسب مراتب انعامات سے نوازا گیا۔ اس پروگرام کا آغاز بھی ایران سے تشریف لائے مہمان قاری بہروز گل کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد ممبر پارلیمنٹ جناب شاہد صدیقی نے حاضرین سے خطاب کیا انہوں نے جشن عید میلاد پیغمبرؐ کے مبارک موقع پر اپنے مدعو کئے جانے کے سلسلے میں خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا: ''اسلام کی اوائلی صدیوں میں مسلمانوں نے صمیمیت قلبی کے ساتھ رسول اور قرآن کا اتباع کیا اسی لئے دنیا کے سامنے باعزت و باوقار تھے اور ہیں آج مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ اپنے بزرگوں کی اس روش کو فراموش نہ کریں۔

اس کے بعد ایران کلچر ہاؤس کے ڈائریکٹر جناب محمد حسین مظفری نے جملہ حاضرین کو عید میلاد النبیؐ کی مبارک باد اور ان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور بالخصوص مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ: ہفتۂ وحدت امام خمینیؒ (رہبر کبیر انقلاب اسلامی) کی یادگار ہے، جیسا کہ ان دنوں میں سارے عالم اسلام میں ولادت پیغمبرؐ کا جشن اور حفظ و قرأت قرآن کریم کے پروگرام کا انعقاد ہوتا ہے، ایران کلچر ہاؤس بھی مثل سالہای گذشتہ ۱۸۰ کی تعداد پر مشتمل قاریان و حفاظ قرآن کو مدعو کیا ہے جو کہ اس موقع پر منعقد ہونے والے مسابقہ میں شریک ہیں۔

انہوں نے فرمایا کہ یہ بھی قرآنی معجزہ ہے کہ سارے عالم اسلام میں انڈونیشیا سے ماریشس تک ایک قرآن دوسرے قرآن سے ایک حرف برابر بھی مختلف نہیں ہے۔ آخر کلام میں انہوں نے قرآن

بم اور اس کے نتیجے میں ہلاک ہونے والی ایک شہر کی کثیر جمعیت اس طرح سے کہ آج تک اس کی نئی نسلیں بھی اس سے متاثر ہیں ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہیں کہ یہ سب سے بڑے دہشت گرد ہیں، یہ ہمارے دین کا اصول ہے کہ اگر کوئی آپ سے جنگ کے درپے نہیں ہے، آپ کے دین و آئین سے مقابلہ نہیں کر رہا ہے اور آپ کو اپنے ملک سے باہر نہیں نکال رہا ہے خدا اس پر ضرور مہربان رہے گا چاہے وہ مسلمان نہ بھی ہو۔ میں اس موقع پر ایک پیغام دینا چاہتا ہوں کہ قرآنی مسابقات کا ہدف صرف یہ نہیں ہے کہ اسے یاد کرلیا جائے اور صرف اس کی تلاوت کی جائے بلکہ اہم ترین مقصد یہ ہے کہ اس کے پیغامات و مطالب کو نشر کیا جائے جیسا کہ اللہ نے رسول کو رحمۃ للعالمین قرار دیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں۔

اس کے بعد صدر جلسہ جناب سید علی تقوی امام جمعہ (شیعہ جامع مسجد، کشمیری گیٹ) نے مجمع سے خطاب کیا، آپ نے کہا کہ اللہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے قرآن کو مومنین کے لئے رحمت بنا کر نازل کیا جو ظالم ہیں ان کو یہ رحمت شامل نہیں ہے اللہ ہی مومنین پر رحمتیں نازل کرنے والا ہے اور نماز علامت مومن ہے اور نماز اس وقت تک درست نہیں جب تک کہ قرآن درست نہیں ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی قرأت درست رکھیں۔

ان کے بعد جناب آقای مرادی (ماہر ثقافت ایران کلچر ہاؤس) نے جمہوری اسلامی ایران کی قرآنیات سے متعلق آغاز انقلاب سے اب تک کی کارگزاریوں پر مشتمل رپورٹ پیش کی۔

اس کے بعد مرکزی جمعیۃ علماء کے جنرل سکریٹری جناب مولانا فضیل احمد قاسمی نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ قرآنی معجزات میں سے ہے کہ چھوٹے اور کم سن نوجوان زیادہ حافظ قرآن ہیں اور دوسرا اہم معجزہ یہ ہے کہ فی الحال دنیا بھر میں کسی بھی قرآن میں ذرہ برابر فرق و اختلاف نہیں ہے۔

دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیرمین جناب ڈاکٹر پرویز نے شرکت کی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں قطعات پیش کرنے کے بعد مسابقۂ قرأت اور ہفتۂ وحدت پر اظہار خیال فرمایا۔ آل انڈیا ائمۂ تنظیم کے صدر جناب مولانا محمد ہارون امام وخطیب کلاں مسجد نے بھی خطاب فرمایا۔

عید میلاد النبیؐ کی مناسبت سے منعقد ہونے والے اس مسابقہ کا افتتاحی اجلاس صبح دس بجے شروع ہوا۔ اس کے بعد تین روز تک مسابقۂ حفظ و قرأت قرآن کریم جاری رہا۔ اس سہ روزہ مسابقہ کی ترتیب و تدوین کے فرائض ادارہ دارالقرأت کے ناظم جناب حافظ و قاری محمد یاسین نے انجام دیئے۔

سہ روزہ کل ہند مسابقۂ حفظ وقرأت قرآن کریم
و
جشن عید میلاد النبیؐ

افتتاحی مراسم حفظ وقرأت

بتاریخ ۱۵ فروردین مطابق ۴ اپریل ۲۰۰۷ء صبح ۱۰ بجے حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفیٰؐ کی ولادت با سعادت کی مناسبت سے ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے ہال میں مسابقۂ حفظ وقرأت قرآن کریم کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تقریباً ۱۸۰ حفاظ وقراء نے شرکت کی۔

پروگرام کا افتتاح (ایران سے بحثیت جج تشریف لائے) جناب قاری بہروز یاری گل کی تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔حفاظ کے لئے بحثیت جج ایران سے حافظ عبدالغفور جوہری تشریف لائے۔ اور ہندوستان سے جج کے فرائض انجام دینے والے قاری محمد قربان قاسمی (اترانچل)، قاری محمد ارشاد قاسمی (مظفرنگر)، مولانا قاری محمد نظرعلی، (رامپور) تھے۔

ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر جناب محمد حسین مظفری نے خطبۂ استقبالیہ میں ولادت باسعادت رسول اکرمؐ و ہفتۂ وحدت کی مناسبت سے حاضرین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے حفظ وقرأت کے مسابقہ پر بھی روشنی ڈالی، آپ نے فرمایا: ''ہم آج کل بہت دشوار دور سے گزر رہے ہیں چنانچہ فرانس میں مقیم ایک مسلم دانشور جس کا نام 'محمد ارغون' ہے وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ایران کے اسلامی انقلاب سے پہلے علم دین مخالف مہم چھوٹے پیمانے اور محدود دائرے تک تھی لیکن انقلاب اسلامی ایران کے بعد ڈھیروں مراکز تحقیقات و مغربی یونیورسٹیاں دین اسلام اور اہل اسلام کے خلاف برسرپیکار ہیں اور وہ اپنے مقالوں و کتابوں کے ذریعہ اسلامی چہرہ کو مسخ کرنے کی فراق میں ہیں۔ جیسا کہ آپ سبھی قاریان و حفاظ قرآن کریم جانتے ہیں کہ خدا اپنی کتاب میں ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ: (اے رسول) ہم نے تم کو پیغمبر رحمت وعنایت بنایا ہے رسول لطف و کرم بنا کر بھیجا ہے اور وہ بھی صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر دور ہر زمانے کے اہل جہان کے لئے۔ یہ تعلیمات اور یہ اصول دنیا کے کسی انسانی قانون و دین میں نہیں مل سکتے پچاس سال قبل گرائے گئے

۶- پروفیسر مسعود عالم صدیقی	اسلام اور ہندوازم کے مابین مذہبی گفتگو
۷-پروفیسر سنگھاسن سنگھ	اسلام اور ہندوازم کے مابین گفتگو
۸- پروفیسر ساجد عابد	توحید اور اللہ کا جود
۹- پروفیسر مسعود انور علوی	ہندو اور مسلمانوں کے روابط پر ان کے عرفان کا اثر
۱۰-محمد اسرائیل خان	اسلام اور ہندوازم کے موضوع پر مذاکرات کے محصولات
۱۱- دکتر فاطمہ شہناز	اسلام اور ہندوازم میں انسانی حقوق
۱۲-حمید رضا نیا	اسلام اور ہندوازم میں موت کا تصور

دیجئے، تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور ہمارے لئے ہمارا دین ہے''۔ مدینہ میں بھی خاصی تعداد میں مسیحی رہتے تھے، یہودی پائے جاتے تھے، پیغمبر ان سے بھی وہی برتاؤ کرتے تھے۔ صوفیوں کا رویہ بھی یہی رہا ہے، انہوں نے ہمیشہ عالمی صلح و امن و آشتی کو اپنا شعار جانا جیسا کہ ہم قرآن کریم کی ایک آیت میں دیکھتے ہیں ''الصلح خیر'' صلح بہترین برخورد ہے۔

مولانا نے اپنی گفتگو کے دوران پیغمبر کا یہ قول بھی دہرایا: لوگ اللہ کے خانوادہ ہیں لہذا تمام مرد و عورت آپس میں بہن بھائی ہیں چنانچہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے انسان کے تکلیف کا باعث نہیں ہونا چاہئے پیغمبر نے اپنے اور دوسرے انسانوں کے بیچ قدر مشترک کو محسوس کرت ہوئے اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اس کے بعد ہندستانی پارلیمنٹ کی نمائندہ نرملا دیش پانڈے نے جملہ انسانی مذاہب کی باہمی مشابہت پر روشنی ڈالی، انہوں نے کہا آج بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندستان میں اسلام، جبر اور سختی کے ساتھ پھیلا جب کہ درحقیقت اگر ٹکراؤ اور مزاحمت کی صورت کو تاریخ میں دیکھا جائے تو صرف ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے بیچ تھی نہ کہ عام ہندو اور مسلمانوں کے بیچ۔ اسلام صوفیوں کی مدد سے ہندستان میں پھیلا چونکہ ان کا پیغام امن و عدالت و روشنی پر مبنی تھا۔

علاوہ ازیں انہوں نے فرمایا تمام مذاہب کا جوہر اور اصالت، معنویت ہے، فرق صرف اس کے آداب و رسوم، طریقۂ کار اور وظائف بندگی کا ہے۔ محترمہ نرملا دیش پانڈے نے دوران تقریر بابری مسجد کی طرف بھی اشارہ کیا اور کہا: پہلے بھی اس قسم کے اختلافات ہندو اور مسلمانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں مگر ہمیشہ یہ اختلافات بجائے جھگڑے و فساد کے گفتگو و مذاکرات سے حل ہوتے رہے ہیں۔

اس پورے دو روزہ سیمنار میں ہندستانی اور ایرانی مفکرین کے توسط سے تقریباً اٹھارہ مضامین پڑھے گئے جن کی تفصیلات حسب ذیل ہے:

۱- پروفیسر سنگھ	عدالت: عام سیکولر اتحاد
۲- پروفیسر غالب حسین	ملت ہندستان کی شناخت
۳- پروفیسر خان	ہندو اور مسلمانوں کے مذاکرات شاذّہ
۴- ڈاکٹر راماد وکالیا	عالمی مذاہب کے مابین گفتگو
۵- پروفیسر فاروقی	مذاکرات ادیان کی اہمیت: اصلی نقطۂ نظر

میں اپنے آخر کلام کو حافظ کی ایک بیت سے برکت بخشتا ہوں جو اسی سلسلہ میں ہے:

از صدای سخن عشق ندیدم خوشتر   یادگاری کہ در این گنبد دوّار بماند

میں نے اس کائنات میں سخن عشق سے زیادہ دل آویز چیز نہیں دیکھی جو کہ بطور یادگار باقی رہنے والی ہو۔

جناب آقای شکیب کے بعد عزت مآب جناب سوامی اگنی ویش نے مجمع سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کیااور اس کے بعد اپنے سفر ایران بالخصوص اصفہان ومسلمانان و دانشوران قم کے ساتھ ہوئی گفتگو کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ثقافتی جنگ مغربی نقطۂ نظر ہے اور عشق و عدالت ہمارا موقف۔

انہوں نے اپنی تقریر کے دوسرے حصہ میں کہا: ''میں ایران کو ''سرزمین آریا'' کی حیثیت سے جانتا ہوں جو کہ ہماری سرزمین پر بھی صادق آتا ہے، ہندوہ نام ہے جو فرنگیوں نے ہمارے ملک کو دیا ورنہ زمانۂ قدیم سے ہمارے ملک کو بھارت یا آریاورت کہا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ ہماری چار مقدس کتابوں ''ویدا'' اپنشاد میں بھی لفظ ہند نہیں ملتا ہے،بعض اس کے ہند نام ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ لفظ چور اور ڈاکو کے معنی میں ہے جب کہ آریا کے معنی شرافت و پاکیزگی اور اصالت کے ہیں''۔

سوامی اگنی ویش نے (جو کہ سماج میں خاصے فعال سمجھے جاتے ہیں) امریکہ کی چودھراہٹ کی بھی تردید کی، وہ فرماتے ہیں: امریکہ جو خود ہی ایٹمی ہتھیاروں کی شروعات کرنے والا ہے اور پہلا اور اکیلا ملک ہے جو اسے استعمال میں بھی لایا ہے، وہ اس وقت دنیا بھر سے ہتھیاروں کی ہوڑ سے دستبرداری کا متقاضی ہے حالانکہ امریکہ کو یہ بات جاننی چاہئے کہ جب تک وہ ایٹمی ہتھیاروں کا خاتمہ نہ کرلے، اسے دوسروں سے ایسا کرنے کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آخر کلام میں اگنی ویش صاحب نے کہا کہ آپس میں تفاہم کا مطلب اپنے فرق و امتیاز کو مٹانا ہے بلکہ ایک دوسرے کی انفرادیت و امتیازات کو محترم جاننا ہے مولانا وحیدالدین (جو سوامی اگنی ویش کے بعد کے مقرر تھے) نے آیات و احادیث پیغمبر کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی جہاں اہل اسلام کے علاوہ دوسرے معاشرہ کے افراد بھی ہوں وہاں وہ ان سے کیسا برتاؤ کریں، انہوں نے اپنی تقریر کے دوران کہا: اسلام کے بنیادی اصول و تعلیمات میں سے تالیف قلوب، صحت مند معاشرہ اور بہترین باہمی روابط کو فروغ دینا ہے چنانچہ اللہ پیغمبر سے یوں مخاطب ہے کہ ''اے پیغمبر مشرکین مکہ سے کہہ

مقصد اپنے دین وعقیدہ سے دست بردار ہوجانا ہے اور دوسرے عقیدہ کو قبول کرلینا ہے اور اس طرح یہ کہ اس سے مقصود صرف مختلف ادیان کی اقدار مشترکات کی شناخت ہے بلکہ اس گفتگو کی غرض و غایت (قطع نظر دیگر مذاہب کے تئیں احترام جتانے کے) یہ ہے کہ اصل دین کا تحفظ او راخلاقی اصولوں کی رعایت ہے او رانسانی حقوق مستحق تک پہونچ سکیں ان مقاصد کے ذریعہ حسب ذیل فوائد تک پہنچا جاسکتا ہے:

۵-۱- دیگر مذاہب کا دقیق تعارف حاصل ہوگا اور ان کو مفکرین و ان کے نظریات سے آشنائی ہوگی۔

۵-۲- مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اخلاقی، اجتماعی اور ثقافتی حیثیت کا اندازہ ہوگا۔

۵-۳- بعض نظریات پر متفق ہونے اور بعض مسائل پر نزدیک تر ہونے کے امکانات بڑھیں گے۔

۵-۴- اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہر پیرو دین و مذہب کے پاس اپنے مذہب کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی دلیل و برہان ہے گو کہ وہ دیگر افراد کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی مگر بہت سے الزامات و جھگڑوں کا خاتمہ ہوجائے گا یا کم ازکم الزامات اور بدگمانیاں کم ہوجائینگی۔

۵-۵- دیگر مذاہب اور افراد کے لئے وسعت نظری پیدا ہوگی، نتیجتاً سوئے ظن اور دشمن کے کم ہونے کے علاوہ آپسی میل ومحبت اور بھائی چارہ میں اضافہ ہوگا۔

۵-۶- ہر دین وصاحب دین کو سماج میں اس کا مناسب مقام مل جائے گا۔

۵- البتہ توجہ رہے کہ یہ گفتگو، مذاکراتی ہے اور مذاکرے اور ڈائلاگ ہمیشہ سوال و جواب اور تنقیدی نظریے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس رخ سے مدمقابل کی دلچسپی اور موضوع گفتگو کے دونوں پہلوؤں پر گہری نظر ہونا بنیادی شرائط میں سے ہے ورنہ ڈائلاگ، مونولاگ (طویل مباحثہ) ہوجائیگا۔

۶- آخر میں ہم یہ دلچسپ بات بھی جانیں جو حکما، فلاسفہ اور عارفین نے مذاکرات (Dialogue) کے سلسلہ میں کہی ہے، زمانۂ قدیم سے آج تک مغرب و مشرق میں مسئلہ عشق کتنی تاویلات اور تحولات سے گذر چکا ہے چاہے وہ عشق انسانی ہو یا عشق الٰہی۔ ہر سطح فکر کا آدمی اس موضوع پر بات کرتا ہے۔ اور عام انسان کے نزدیک اس سے دلچسپ کوئی گفتگو ہی نہیں ہے۔ بنیادی طور پر ڈائلاگ، مختلف خیالات عشق کے موضوع پر ہونے والی گفتگو میں نظر آتا ہے عشق اور سخن عشق کے بیچ کیا رشتہ ہے، ہمارے شعراء پر بھی یہ پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ سوال اور اس قسم کے بہت سے سوال بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اسلام اور ہندوازم اور اس قسم کی گفتگو سے پہلے ہمیں چاہئے کہ ہم اس قسم کے سوالات کا جواب اپنے پاس رکھیں، میں امید کرتا ہوں کہ انقلاب اسلامی ایران کے بعد کا یہ پہلا اجتماع ہے جس میں صاحب نظر ہندو مسلمان جمع ہیں امید کرتا ہوں اس قسم کے بہت سے سوالوں کا جواب ڈھونڈ نکالیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی نظریہ کے علاوہ دیگر مذاہب مثلاً اہل ہنود کا جواب بھی اس سلسلے میں خاصا مفید و روشنی بخش ہوگا لیکن میری نظر میں فی الحال، اہم یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو مسلسل رہے اس لئے کہ اس موضوع پر مسلسل اور منطقی گفتگو ہی ہمیں آپسی تفاہم اور خوشگوار رابطوں کا ماحول عطا کرسکتی ہے اور یہ رابطوں کی خوشگواری جو ہم زبان ہونے سے زیادہ اہم ہے اور بالخصوص اس دور پرآشوب میں بہترین ذریعہ ہے جس سے ہماری باہمی زندگی امن و عدالت سے ہم آغوش ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد جناب شکیب صاحب نے اپنے ذریعے کئے گئے سوالات کا حسب ذیل جواب دیا۔

۱- ''ایمان و بندگی'' اصل دین ہے، اگرچہ یہ اصالت، مختلف رنگ میں جلوہ نما ہوتی ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ و ایمان، تمام عالم انسانیت میں تہذیبی و ثقافتی فرق کے باوجود یکساں جذبہ کی طرح نظر آتا ہے۔

۲- ایسے نظریات کے برخلاف جس میں دو مختلف تہذیبوں کی گفتگو کو محال و غیر مفید جانا گیا ہے (مثلاً ہنٹنگٹن جو تہذیبی برتاؤ کے نظریہ کے مالک ہیں) (السدر مک اینٹائیر، فلسفی اسکات لینڈ، و لیوٹر) ایسی گفتگو ہونا اور مسلسل ہونا، آخری دو دہائیں میں اس قسم کے فرسودہ اور باطل نظریات کے بطلان پر بہترین دلیل قرار پائی ہیں۔ اس قسم کے نظریات رکھنے والے خود آپس میں ہی تناقض گفتگو کا شکار ہوتے ہیں اور لوگوں کی نظر مین خود کو غیر اعتباری قرار دیتے ہیں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

۳- پرانے تجربات، بالخصوص گذشتہ چند سال نشاندہی کرتے ہیں کہ علمی اور دینی گفتگو کا اجتماع اور مختلف ادیان کے بارے میں دانشور و مفکرین کے نظریات کی شکل میں اس کے محصولات، اور وہ بھی اگر پر امن ماحول میں ہو تو اس کے نتیجہ دو مختلف ثقافتوں کے رابطوں کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوسکتے ہیں، اور انسانی سماج کو ایک پر امن ماحول مل سکتا ہے جو اس پر آشوب دور کے پیش نظر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۴- یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ برخلاف اس کے کہ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ مختلف ادیان پر گفتگو کا

اور فرمایا کہ صوفیوں کی نظر میں ذات خداوندی سچائی و واقعیت کا ایسا مخزن و آئینہ ہے جو مختلف شکلوں میں خود کو پہنچواتا ہے، یہ وہ چیز ہے جسے ہندوازم بھی مانتا ہے، فی الحال ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے مذہبوں کو وحدت بخشیں اور تکبر ونخوت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام انسانوں سے محبت کے ساتھ دلی رابطہ کو پروان چڑھایا جائے۔

پروفیسر راؤ کے بعد جلسۂ افتتاحیہ کے صدر کی حیثیت سے ایران کلچر ہاؤس کے کاؤنسلر جناب مرتضی شفیعی شکیب صاحب نے مجمع سے خطاب کیا اور ''مذاکرات بین اسلام اور ادیان ایشیا (بالخصوص ہندو ازم)'' کے عنوان سے گفتگو کی اور یہ آیت پڑھی: وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔

ترجمہ: اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک امت قرار دیتا، وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تیرے رب نے رحم کیا اور اسی لئے انہیں پیدا کیا۔

مختلف دین اور بے شمار پیروان ایشیائی کے باوجود، گذشتہ چند برسوں میں ایران میں دین و مذاہب پر مذاکرات منعقد کرنے والوں نے عموماً دین الٰہی اور دین مسیح کو موضوع گفتگو قرار دیا ہے، ایشیائی دین و مذاہب کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

کیا یہ بے توجہی، دین اللہ اور دیگر ایشیائی ادیان کے مابین اصول و مبانی کے اعتبار قدر مشترک کے نہ ہونے کی بنیاد پر تھی یا ہرگز اس قسم کی گفتگو سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا؟

کیا واقعاً ایسا ہے اور ادیان الٰہی اور ایشیائی کے بیچ کوئی رخ قابل گفتگو و مذاکرہ نہیں ہے اور ہمیں چاہئے کہ دوسرے درجہ کی گفتگو یعنی تہذیبی اور تمدنی گفتگو کریں؟

یا اس کے برعکس امکانات ہیں، اگر ہیں تو کیا ہیں؟ ہمارا نظریہ کیا ہونا چاہیئے؟ فلسفی و کلامی؟ عرفانی؟ فرہنگی یا سیاسی؟ کیا موقع اور مخاطب کے پیش نظر ایک خاص نظریہ کو منتخب کیا جاسکتا ہے یا اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ بہرحال میں ایک ہی طرح کی گفتگو کی جائے گی؟

کیا اصولی طور پر دو مذاہب کے درمیان گفتگو اور مذاکرے کی ضرورت ہے؟ اس سلسلہ میں کیا کیا دشواریاں اور زحمات متوقع ہے؟ اچھا! اگر ایسا ممکن ہوسکا تو اس کے فوائد کیا کیا ہونگے؟ ہم سے پہلے والے مسلمانوں اور دیگر مذہب والوں کے تجربات اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں اور یہ مذاکرے کہاں انجام پائیں گے؟

''اے ہندستان، تو ہمیشہ شاد و آباد رہے چونکہ تیرے یہاں ہاتھی کے پیروں تلے کی چونٹی کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے''۔ اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ صائب تبریزی کی نظر میں اس وقت ہندستان میں کس درجہ پاس و لحاظ اور امنیت پائی جاتی تھی۔

آقای مظفری کے بعد ادارۂ مذاکرات تہذیب وتمدن کے صدر حجۃ الاسلام والمسلمین آقای سید محمد خاتمی کا پیغام پڑھا گیا۔

اس پیغام میں حاضرین کے خوش آمدید کے بعد، ہندستان میں دانشوروں ہندو ومسلمان کے مابین اسلام اور ہندوازم کے موضوع پر ہونے والے مذاکرات کو ایک خوش آئند قدم گردانتے ہوئے اسے لائق آفرین جانا گیا۔

نیز اس میں بتایا گیا کہ تمام ادیان الٰہی کی اصالت یکساں ہے عبودیت اس کی روح اور انسانی سماج میں صلح و آشتی اور عدل و انصاف کا قیام، سرانجام نجات وفلاح اس کا مقصد ہے۔

اس پرآشوب دور میں اس قسم کے مذاکرات کے علاوہ کوئی بھی اقدام آپسی بھائی چارہ کو فروغ دینے اور بغض وعداوت کو دور کرنے میں اتنا موثر ثابت نہیں ہوسکتا۔

آخر میں یہ پیغام ایران کلچر ہاؤس کے کاؤنسلر کی شکرگزاری اور حاضرین کے نیک مقاصد میں ان کی کامیابی کی دعاء پر پیغام ختم ہوا۔

آقای خاتمی کے پیغام کے بعد ''اتحادیہ ادیان برائے قیام امن'' کے صدر جناب ڈاکٹر ظفر محمود نے افتتاحی تقریر کی۔ موصوف نے دوران تقریر وحدت پرست ادیان بالخصوص اسلام اور ہندوازم کے مابین افہام و تفاہم پر تاکید کی چنانچہ انہوں نے اہل ہنود کی مقدس کتاب کے چند فقرہ دہرائے جن میں ان کے بقول وہاں ذات پیغمبر اور خانہ کعبہ مراد ہے، علاوہ ازیں ایک جگہ، برہما اور سرسوتی سے انہوں نے جناب ابراہیم اور ان کی بیوی مراد لیا۔

ڈاکٹر محمود نے یہاں تک کہا کہ کوئی بھی دین تنہا مکمل نہیں ہے ہندو ازم اور جین ازم میں امن پسندی، بودازم میں محبت، مسیحیت میں عشق و اسلام میں عدالت جیسے خصوصیات دکھائی دیتے ہیں لہذا ادیان نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے مکمل ہیں۔

ان کے بعد پروفیسر جناب راما کرشنا راؤ (صدر مجلس تحقیقات فلسفۂ ہندستان) نے مہمان افتخاری کی حیثیت سے تقریر کی انہوں نے فی زمانہ انسانی معاشرہ کی افسوسناک صورت حال پر اظہار خیال کیا

اپنے بیان کے دوسرے حصہ میں فرمایا کہ مذاہب کے بارے میں ہونے والے مذاکرات پر غالب نظریہ، تاریخی سچائیوں سے مطابقت نہیں رکھتا اس لئے فکر جدید کی ظہور پذیری سی چند صدی پہلے ہندستان میں مذاکرات بین مذاہب ملتے ہیں چنانچہ اکبر بادشاہ کے دور میں اس سلسلے میں اہم معلومات ملتی ہیں مگر چونکہ یہ اس مزاج کا پہلا مذاکرہ تھا لہذا نقائص و معائب بہرحال نظر آتے ہیں، چنانچہ اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

افسوس یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے مخالفین نے سیاسی مفاد کے لئے اس کو غلط ڈھنگ سے نشر کیا اور اس عظیم اقدام کو بے اثر بنانے کی کوشش کی۔ ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان مذاکرات کو منعقد کرنے والے اور اس میں حصہ لینے والے اس مسئلہ کی نزاکتوں سے مکمل طور پر واقف نہ تھے چنانچہ بسا اوقات ان کی گفتگو مباحثہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

سیاسی مخالفین یہ کہتے تھے کہ بادشاہ ''دین الٰہی'' کے نام پر ایک نئے دین کو متعارف کرا رہا ہے چنانچہ اس بدعت کی انجام دہی کے نتیجہ مین وہ خود بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ابوالفضل اور بدایونی کے دو مختلف رپورٹ سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے پروپیگنڈہ کے پیچھے ان کا کیا مقصد تھا ساتھ ہی یہ غلط فہمی بھی دور ہو جاتا ہے کہ وہ ''دین الٰہی'' کو دوسرے ادیان کے ساتھ مخلوط کرنا چاہتے تھے یا نہیں؟

آخر کلام میں انہوں نے فرمایا کہ مذاہب و ملل کے مذاکرات اس وقت ثمر آور ہوتے ہیں، جب ہر صاحب موقف اپنے مذہب کی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے گفتگو کرے، یہ خیال کرنا کہ ادیان پر گفتگو کے لئے ہمیں چاہئے کہ اپنی اپنی پہچان و علامت سے آزاد ہو کر گفتگو کریں، سراسر غلط فہمی ہے بلکہ اس قسم کی گفتگو اس وقت مفید ہوتی ہے جب ہر ایک اپنے دین کی شکل کو برقرار رکھتے ہوئے دوسروں کی فکری و فرہنگی معروضات کو سننے کا جذبہ رکھتا ہو، اگر ان چیزوں کا خیال نہ رکھا گیا تو گفتگو بے معنی ہو جائے گی۔

انہوں نے آخر میں صائب تبریزی کے ایک شعر پر اپنی بات تمام کی، جس سے اندازہ ہوتا ہے ہندستان کی تاریخ میں ایک دوسرے کی دینی و تہذیبی وراثتوں کا کس طرح پاس و لحاظ رکھا گیا اور ایک دوسرے کے وجود کا اعتراف کیا گیا ہے، صائب تبریزی کہتے ہیں:

سرہنر باد ہمن کہ از آرامیدگی　　　　درز ہر فیل بود مورد درسماع

دو روزہ بین الاقوامی سمینار پر خصوصی رپورٹ

''مذاکرات بین اسلام اور ہندو ازم''

اسلام اور ہندو ازم کے موضوع پر ہیبیٹیٹ سینٹر دہلی میں بتاریخ ۴ فروردین ۱۳۸۶ شمسی بمطابق ۲۴ مارچ ۲۰۰۷ء بروز شنبہ عالمی مذاکرات کا آغاز ہوا جو دو دن تک جاری رہا۔ جس میں ہندستان کے سربرآوردہ ہندو ومسلمانوں کے علاوہ ایران کلچر ہاؤس کے کاؤنسلر جناب آقای مرتضی شفیعی شکیب، ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر محمد حسین مظفری اور ڈاکٹر عبدالحمید ضیائی بھی موجود تھے۔

رسم افتتاح

آغاز سمینار میں ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر جناب مظفری صاحب نے جملہ شرکت کنندگان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ادیان و مکاتب کے سلسلے میں ایک یورپی گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ مختلف ادیان کا باہمی گفتگو کا تصور فکر جدید اور عہد نو کا نتیجہ ہے، اس گروہ نے تفکر بشری کے مبنی بر قیاس ہونے کو مذہبی تجمع کا سبب قرار دیا ہے چنانچہ قدماء، فکر وعلوم کی محدودیت کی بنا پر یہ خیال کرتے تھے کہ جو وہ جانتے ہیں بس وہ اور وہیں تک حقیقت ہے مگر عصر حاضر میں انسان اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اور محدود عقل وعلم کے سہارے حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا اور اس کے لیے مختلف نظریات کا جاننا اور سننا ضروری ہے تاکہ خورشید حقیقت سے دینی شعاع حاصل کر سکے، نتیجتاً مختلف مذاہب پر مذاکرات کا تصور پروان چڑھنے لگا ہے۔

یہ سلسلہ عہد حاضر کے مفکرین تک پہنچ جاتا ہے اور یہ جماعت، قدیم مفکرین پر اپنی جدید فکر ونظر کے پیش نظر تنقید کرتی ہیں اس کا خیال یہ ہے کہ دینی و اخلاقی مسائل کی اہمیت انفرادی شرائط اور خصوصیات معاشرہ سے مربوط ہیں اور دراصل یہ کبھی بھی ایسے امر مطلق کی حیثیت نہیں رکھتی کہ ہر شخص اس کو بآسانی درک کرلے بلکہ حساس و صاحب نظر ان حقیقتوں کو خود اپنے ذہن سے محسوس کرتا ہے چنانچہ انسانی فکر رسا سے بالاتر اس کا وجود نہیں ہے۔ لہذا ان مسائل کو نہ حق ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ باطل کہا جاسکتا ہے جب تک کہ اس پر دوسروں سے نظر خواہی نہ کرلی جائے۔ آقای مظفری نے

غلام علی آزاد بلگرامی نے صرف فارسی ہی میں اہم کتابیں اپنی یادگار نہیں چھوڑیں بلکہ ان کے گرانقدر علمی آثار عربی میں بھی ہمیشہ سے توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ڈاکٹر عباس صاحب نے آزاد کے ۱۵ عربی آثار کا ذکر کیا ہے اور ان کا اجمالی تعارف بھی کرایا ہے۔ آزاد کے عربی آثار میں ایک کتاب ''سبحة المرجان فی آثار هندوستان'' ہے۔ یہ ان کی معروف ترین کتاب ہے جو ۱۱۱۷ھ/۱۷۶۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، ہندوستان ہے۔ یہ چار فصلوں پر منقسم ہے۔ ان فصلوں میں آزاد نے ہندستان کی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کی تفسیروں اور احادیث نبوی میں ہندستان کا ذکر، ہندستان کے ۴۴ مسلمان علماء، فضلا اور ادبا کے احوال، ہندستانی صنائع و بدائع اور بعض ایسے صنایع بدائع جو خود مؤلف کے اختراع ہیں، اور چوتھی فصل میں نایکا بھید سے بحث کی گئی ہے جسے خود مؤلف نے ''فی بیان المعشوق و العشاق'' کا نام بھی دیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ بحث پر مشتمل ہے۔ خود آزاد نے اپنے اس کتاب کی تیسری اور چوتھی فصل کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو ''غزلان الہند'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔

آزاد کے عربی و فارسی میں علم وفضل، ان کی ادبی امور میں بالغ نظری، فارسی وعربی شاعری میں عالی استعداد، اور اپنے دور کے دیگر متداولہ علوم میں دستگاہ کے پیش نظر معاصر و بعد کے تذکرہ نگاروں نے آزاد کو: طالب علم منقح و بہ اکثر کمالات آراستہ (سفینۂ خوشگو) فاضل کامل و شاعر نامی (تذکرۂ حسینی) مرد فاضل و عالم (مجمع النفائس) درعلم صوفیہ ونظم ونثر عربی و تاریخ گوئی وفنون اشعار سرآمد ابنای روزگار (تحفۃ الشعرا) فضیلت وکمال بر ایشان ختم (مقالات الشعرا) درمیدان سخندانی و ملک معنی طرازی فرد است (تذکرۂ بی نظیر) در السنۂ متعددہ مصنفات دارد و در ہرفن سخن بیشتر مولفات دواوین عربی و فارسی او بین الجمہور سایر است وکلیات اونظماً ونثراً از فرط قبول در اکثر بلاد دایر (گل عجائب)

ڈاکٹر عباس صاحب کی اس کتاب سے آزاد کے ان تمام فضائل پر روشنی پڑتی ہے اور اس طرح ''احوال و آثار میر غلام علی آزاد بلگرامی'' ایک اہم کتاب ہے جو آزاد کی زندگی اور علمی و ادبی کارناموں کا ایک تحقیقی تعارف ہے۔ جو ہر لحاظ سے بڑی حد تک مکمل ہے۔

عباس صاحب نے آزاد کے فارسی شعرا کے تذکروں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے اپنے تذکروں میں اپنے جن مآخذ کا ذکر کیا ہے ان کی فہرست بھی دی ہے۔ یہ فہرست بڑی اہم ہے۔ اس کے مطالعہ کے وقت یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ اگر عباس صاحب نے یہ بھی ذکر کیا ہوتا کہ فہرست میں شامل مآخذ آیا آج بھی دستیاب ہیں یا نہیں، تو اس فہرست کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی۔

میر غلام علی آزاد کو فارسی تذکرہ نگاروں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ فارسی شعرا کے تذکرے ادبی تنقید میں نقش اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے شعرا کے کلام پر اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اشعار و طرز پر اظہار خیال کیا ہے۔ آزاد نے یہ کام دوسروں کی بہ نسبت زیادہ توجہ اور انصاف سے انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر عباس صاحب نے آزاد کی اس خصوصیت کو پوری طرح اجاگر کیا ہے۔ آزاد نے فارسی شعرا کے اپنے ایک تذکرہ ''سروِ آزاد'' میں شعرا کے احوال و آثار پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ اس کی ایک دو مثالوں سے آزاد کے تنقیدی رویّے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سلیم طرشتی نے صائب پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے سلیم کے مضامین و مفاہیم کا سرقہ کیا ہے۔ آزاد اس الزام کی تردید کرتے ہیں اور صائب کی دفاع میں کہتے ہیں:

بالغ نظر واقف ہیں کہ میرزا صائب بہت صاحب استعداد و قدرت مند شاعر تھے۔ ممکن نہیں کہ وہ دوسروں کے مال کو اپنا بنائیں۔ یہ جو مضامین میں اشتراک نظر آتا ہے، اسے توارد کہنا چاہئے۔ آزاد نے نظیری نیشاپوری کو عرفی پر ترجیح دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے کہ عرفی کا خاص میدان قصیدہ ہے اور نظیری نے غزل میں اپنے ہنر کی نمائش کی ہے۔ اسی طرح آزاد سراج الدین علی خان آرزو کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ: از شعرایِ حال و تازہ گویان خوش خیال است۔ اشرف مازندرانی کے متعلق لکھا ہے: طبع چالاکش معانی تازہ بہم می رساند و عجائب گلہا در جیب و دامن سامعہ می افشاند.....حرف بہ قدرت می زند۔ قدسی مشہدی کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے: مثنوی و قصیدۂ قدسی خوب است لیکن غزلش چندان رتبہ ندارد۔

شعراء کے کلام کے بارے میں آزاد کے یہ چھوٹے چھوٹے جملے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن سے شعرا کے کلام کو سمجھنے اور ان کے دور کے ادبی ماحول اور شعری اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر عباس صاحب نے آزاد کے یہ تنقیدی جملے ان کے تذکروں سے بحث کے دوران نقل کیئے ہیں اور آزاد کے تنقیدی رویوں کی اس طرح نشان دہی کر دی ہے۔

علمی کارناموں کے تقریباً تمام ہی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ عباس صاحب نے اپنی اس کتاب کے آخر میں جیسا کہ دستور ہے، اپنے سو سے زیادہ فارسی، عربی، اردو اور ترکی مآخذ کی فہرست دی ہے۔ یہ فہرست اس امر کا ثبوت ہے کہ عباس صاحب نے اپنی اس تالیف کی تکمیل میں تقریباً تمام ہی دستیاب مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ جو حضرات اس نوعیت کا کام انجام دیتے ہیں، خوب جانتے ہیں کہ مطلوبہ مآخذ کی تلاش، ان تک رسائی اور پھر ان سے مناسب استفادہ کوئی آسان بات نہیں، یہ جان جوکھوں کا کام ہے، کبھی کبھی ایک ہی مأخذ کو ایک ہی مطلب سے استفادہ کے لئے، کئی کئی بار دیکھنا پڑتا ہے۔ اقتباس کرتے وقت سہو ہوجانا، عام بات ہے، اس لئے مآخذ کی اس وقت تک ضرورت پڑتی ہے جب تک کتاب یا مقالہ چھپ نہ جائے۔ بعض اوقات کتاب کی اشاعت کے بعد بھی مختلف وجوہات سے ایک آدھ اقتباس میں غلطی نظر آجاتی ہے، اور پھر مأخذ سے رجوع کرنا پڑتا ہے تاکہ صحیح صورت حال معلوم کرلی جائے اور اگلی اشاعت میں اس غلطی کا اعادہ نہ ہو۔

ڈاکٹر حسن عباس صاحب نے آزاد کے احوال زندگی پیش کرنے میں تفصیل مگر احتیاط سے کام لیا ہے۔ آزاد اپنے دور کے مایہ ناز علمائے عربی و فارسی میں شمار ہوتے تھے اس لئے معاصر و بعد کے تذکرہ نویسوں نے آپ کے احوال زندگی لکھے ہیں۔ تذکروں کے علاوہ آزاد کے احوال بعض ایسی کتابوں میں بھی مرقوم ہیں جو بنیادی طور پر تذکرۂ شعرا نہیں ہیں، لیکن آزاد کی قدآور علمی شخصیت نے انہیں ان کے علم وفضل کا اعتراف کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر عباس صاحب نے تذکرہ نویسوں کے بیانات نقل کئے ہیں لیکن ان پر اپنی رائے بھی دی ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی بے نظیر تذکرہ نویس ہیں۔ اپنے دور میں عربی کے ممتاز شاعر تھے۔ آپ نے عربی میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نعت میں کچھ اس طرح فصاحت و بلاغت سے قصائد کہے ہیں کہ انہیں حسان الہند کہا جاتا تھا۔ اسی طرح ان کی فارسی شاعری بھی حسن بیان، معانی آفرینی اور ان کے بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ عوام میں بھی آزاد کی علم وفضل میں محبوبیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ بقول ہیگ (T.W.Haig):

''آزاد کی علم وفضل میں شہرت کا یہ عالم ہے کہ والدین اپنے بچوں کو ان کے مزار پر لے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے ہونٹوں سے ان کی قبر پر پڑے ہوئے قند کے دانے اٹھائیں، اور اس کی برکت سے علم کا ذوق پیدا کریں اور علم حاصل کرنے کے لئے ان میں توفیق و استعداد بھی پیدا ہو''۔

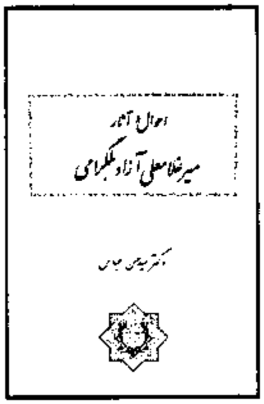

کتاب کا نام : احوال و آثار میر غلام علی آزاد بلگرامی

مؤلف : ڈاکٹر حسن عباس

صفحات : ۴۷۲

شائع کردہ : بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، تہران ۱۳۸۴ش

تبصرہ نگار : پروفیسر شریف حسین قاسمی

میر غلام آزاد بلگرامی ہندستان میں بارھویں صدی ہجری/ اٹھارہویں صدی عیسوی کے ان مایہ ناز فارسی اور عربی کے فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے علمی و ادبی کارنامے آج بھی توجہ اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن عباس صاحب آج کل بنارس ہندو یونیورسٹی میں فارسی کے استاد ہیں۔ انہوں نے تہران یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ڈاکٹریٹ کے لئے ان کے مقالہ کا یہی عنوان تھا۔ یہ کتاب ان کا یہی تحقیقی مقالہ ہے۔ عباس صاحب علمی و تحقیقی ذوق کے مالک ہیں۔ ان کے متعددو مقالات ان کے اس ذوق کے ترجمان ہیں۔ یہ محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں۔ کتابوں کی فہرست سازی میں بھی انہیں دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر عباس صاحب نے اپنی اس تالیف میں تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ ۴۷۲ صفحے کی اس کتاب میں مؤلف کے مختصر مگر جامع مقدمہ اور سالشمار زندگی آزاد کے علاوہ دس ابواب (فصل) ہیں جن کے درج ذیل عنوانات ہیں:

اوضاع سیاسی و اجتماعی و ادبی در قرن دوازدہم ہجری در شبہ قارہ، شرح حال آزاد، روابط آزاد با شعرا و امرای معاصر، شاگردان آزاد، آثار فارسی آزاد، مقام آزاد، آثار عربی، آثار منسوب بہ آزاد، مخالفان آزاد، آزاد از نظر تذکرہ نویسانِ روزگار خود۔

یہ عنوانات اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ عباس صاحب نے آزاد بلگرامی کی زندگی اور ان کے

دو آتشہ ہوگیا تھا۔

اس طرح کے اہم کردار اور ایسی حقیقتوں کے سامنے آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تاریخ کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہوتا تو تحریک آزادی کے سلسلہ میں ملت کے کسی بھی خدمتگزار کی حق تلفی نہ ہوتی، اور اس جمہوری نظام کی کوکھ سے فرقہ واریت نہ جنم لیتی۔

علاوہ ازیں اس کتاب میں تاریخ نویسی کی خاص زبان کے تقاضوں کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ کتاب ہر حقیقت پسند تاریخ دوست کے لئے انتہائی مفید اور معلوماتی ہوگی۔

سے آواز ملاتے ہیں ایسے میں اگر تاریخ اسے کسی خاص فرقہ و مذہب کے لوگوں کا حصہ قرار دے تو سراسر ظلم ہے چنانچہ جناب کے۔ ایم۔ ایس۔ خان نے اپنی اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وہ ناقابل فراموش کردار (جنہیں مورخین نے فراموش کرانے کی بھرپور کوشش کی) کا ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کو آزادی سے ہمکنار کرانے میں کسی ایک ملت کے افراد کا رول نہیں ہے بلکہ جملہ اقوام ملک بالخصوص مسلمانوں نے بھی اس میں عظیم کردار نبھایا ہے تاہم انہوں نے یہ راز بھی طشت از بام کیا کہ تحریک آزادی کی شروعات ۱۸۵۷ء میں نہیں بلکہ اس سے تین سو سال پہلے پندرھویں صدی میں کیرلا کے علما و مسلمانوں کے نعرۂ انقلاب بلند کرنے سے ہوئی تھی پھر اورنگ زیب نے ۱۶۶۸ء میں اسے جاری رکھا اس طرح یہ سلسلہ سراج الدولہ سے حیدر علی اور حیدر علی سے ٹیپو سلطان تک پہونچتا ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ ۱۸۵۹ء کے بعد یہ اس نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات سے جڑے جملہ حقائق کو بیان کرنے والی ہے یعنی اس طویل عرصہ میں جو کتابیں چھپی اس میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کی حق تلفی ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اللہ مولف کتاب کے زور قلم کو اور زیادہ کرے کہ انہوں نے انتہائی بے باکی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے مربوط وہ تمام چہرے آشکار کردیئے جو اب تک غیر معروف اور ناشناختہ تھے مثلاً انہوں پیرعلی خاں جو اب تک یا تذکرہ میں نہیں آئے تھے یا اگر کسی نے کہیں ذکر بھی کیا تو وہ سیر حاصل اور خاطر خواہ نہیں تھا۔

البتہ مولف کتاب جناب خان محمد صادق خان نے ان کے سلسلہ میں خاصی معلومات فراہم کردی ہے چنانچہ قاری کتاب کو مطالعہ کے وقت اندازہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق ایک انتہائی اہم باب اب تک صیغۂ راز میں تھا اس لئے کہ مولف نے جناب پیرعلی خان کی اس تحریک میں محض شرکت و شمولیت کے ذکر کو کافی نہیں جانا ہے بلکہ ان حقائق کی بھی نقاب کشائی کی ہے جو ان کی فعالیت کے پیچھے کارفرما ہیں جس میں قابل ذکر اور اہم ترین چیز ان کا میر عبداللہ کے رابطہ میں آنا ہے۔

مولف نے اس کتاب میں میر عبداللہ کے سلسلہ میں بھی انتہائی معلوماتی گفتگو کی ہے جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ میر عبداللہ عظیم آباد، پٹنہ کے سب سے بڑے رئیس اور صاحب اثر آدمی تھے۔

اس کتاب میں آپ پائینگے کہ پیرعلی خاں اور میر عبداللہ کے علاوہ ان دونوں کے فعال ساتھیوں کی ناقابل انکار انقلابی سرگرمیوں کی بدولت لوگوں میں جذبۂ حریت پسندی کتنا اور کس طرح

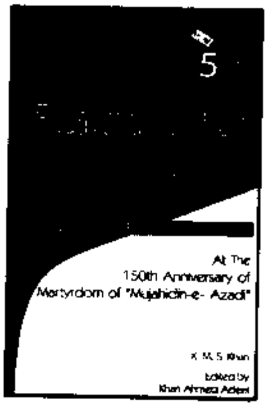

نام کتاب : Excavation of truth-Unsung Heroes of 1857 war of Independence

تالیف : کے۔ایم۔ایس۔خان

صفحات : ۱۳۸

ملنے کا پتہ : Kanishka Publishers, Distributors New Delhi- 110 002

تبصرہ نگار : مہدی باقر

دنیا کے کسی بھی ملک و معاشرہ کے تاریخی اوراق میں قید واقعات سے افسانوی گرد ہٹا کر حقائق دریافت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے حتی کہ مورخین و تاریخ داں حضرات بھی ایسا کرنے سے قاصر ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جہاں دانشمندوں کے اس طبقہ نے اپنے انتھک خدمات سے تاریخ کو محفوظ کرنے کا امر عظیم انجام دیا وہیں کسی بھی طرح کے مفاد و مصلحت کے پیش نظر تاریخ کے تئیں غیر دیانتدارانہ رویہ بھی انہیں ہاتھوں انجام پایا ہے۔ اسی غیرامانت دارانہ اور عدم منصفانہ طریقۂ کار کے سبب بہت سے تاریخ ساز افراد اور ان کی کارکردگی تاریخ میں اپنی جگہ نہ پاسکے۔

تاریخ نویسی کی اس مصلحت پسندانہ روایت کے برخلاف اگر کوئی حق پرستانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے مختلف تواریخ و شواہد کے درون سے مکمل سچائیاں نکال کر عام قاری تک پہونچادے تو اس نے نہ صرف فرض شناسی کا ثبوت دیا بلکہ اس نے انسانی و اخلاقی قدروں کا قد بھی اونچا کیا ہے۔

اسی روش تحریر کے مالک جناب خان محمد صادق خان نے اپنی کتاب Excavation of truth Unsung Heroes of 1857 war of Independence میں ان سچائیوں سے پردہ اٹھایا ہے جنہیں تنگ نظر تاریخ نگاروں نے اب تک سامنے نہیں آنے دیا تھا۔

ظاہر ہے کوئی ملک گیر تحریک کسی ایک خاص قوم و ملت کا کارنامہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے ملک میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگ حب الوطنی کو اپنا مسلک جانتے ہوئے ایک دوسرے کی آواز

پروفیسر عزیزالدین حسین صاحب نے اس کتاب میں اردو اور انگریزی میں مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں وہ بجا طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ مورخین نے وہ بیشتر مواد ابھی دیکھا ہی نہیں جس کا تعلق اس دور سے ہے۔ اور چونکہ اس مواد کا زیادہ حصہ اردو اور فارسی میں ہے اور جو شکستہ خط میں محفوظ ہے، اور اس کے پڑھنے والے مورخ اب تقریباً ناپید ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس عظیم پروجکٹ میں نہ صرف مورخ شامل ہوں بلکہ فارسی و اردو جاننے والے اور شکستہ خط کو پڑھنے کے قابل اشخاص بھی اس کی تکمیل میں حصہ لیں۔ اسی طرح ان دستاویزات کا ہندستان کے مختلف متعلقہ مراکز میں موجود ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے مورخ اردو اور فارسی سے واقف ہوں تاکہ وہ ان دستاویزات سے براہ راست استفادہ کرسکیں۔

یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ دستاویزات کا جو متن اس کتاب میں شائع ہوا ہے، اس میں بہت غلطیاں ہیں، بعض جگہ عبارت اسی وجہ سے غیر مفہوم ہے، دوسری اشاعت میں اس عیب کا رفع کرنا ضروری ہے۔

مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندستانیوں کا سامراجی طاقت کے خلاف غم و غصہ، اس طاقت سے جنگ کے لئے مختلف علاقوں میں ہندستانیوں کی تیاریاں، انگریزوں کا اول میں پسپا ہونا، پھر ان کا غالب آجانا، ہندستانیوں کی کوششوں کا ناکام ہونا، انتقامی کاروائی کے طور پر دہلی اور دیگر مقامات پر انگریزوں کا عمارات کو منہدم کرنا، دہلی کے لال قلعہ کی اندرونی شکل و صورت کو مسخ کرنے کی کوشش کرنا، اس افراتفری میں سماجی اور اخلاقی برائیوں کا عام ہوجانا، فرقہ وارانہ اتحاد قائم رکھنے کی غرض سے بہادرشاہ کا ۱۸۵۷ء میں بقرعید کے موقع پر گائے کے ذبیحہ سے روکنے کا حکم اور محرم میں باجا نہ بجانے کا حکم جاری کرنا، اس جنگ آزادی میں شرکت کے لئے ہندستانیوں کا انگریزی ملازمتوں سے کنارہ کشی کرنا، بادشاہ کا حکم جاری کرنا کہ بجائے ''حضرت جہاں پناہ'' کے انہیں ''غریب پرور'' کے لقب سے مخاطب کریں، حکیم احسن اللہ سے متعلق اہم اطلاعات، قلعہ سے بادشاہ کا خاص سامان چوری ہونا اس میں ان کا وہ صندوقچہ بھی تھا جس میں بادشاہ کی مہریں تھیں، مایوس کن حالات کے پیش نظر بادشاہ کا نواب جھجھر کو یہ لکھنا کہ میں حالات سے تنگ آگیا ہوں۔ تم مجھ کو کچھ اونٹ اور کچھ سوار فراہم کردو تو پہلے میں درگاہ قطب الدین بختیار کاکی پر حاضری دوں اور پھر وہاں سے مکہ چلا جاؤں اور باقی ماندہ زندگی وہیں گزاروں، ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ دریا گنج میں ایک جرنیلی اسپتال تھا۔ اس کے انچارج ڈاکٹر امام بخش تھے۔ اس میں ان ادویات کی فہرست دی گئی ہے جن کی اسپتال میں ضرورت تھی۔ ایک دوسری دستاویز سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس جنگ آزادی میں سکھ بھی شامل تھے اور انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ایک فتوی بھی ان دستاویزات میں شامل ہے جس میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ دہلی سے ایک رسالہ ''جہاد'' بھی شائع کیا گیا تھا جس کی قیمت چار آنے مقرر کی گئی تھی۔ راجاؤں اور نوابوں میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں سب سے زیادہ استقامت بلبھ گڑھ کے راجا ناہر سنگھ نے دکھائی۔ یہ آخر تک بہادر شاہ کا حامی و وفادار رہا۔ اس کی پاداش میں انگریزوں نے اسے بھی پھانسی دے دی۔

اسی نوعیت کی یہ دستاویزات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے حالات پر کافی کتابیں اور مضامین لکھے اور شایع کئے جاچکے ہیں، لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دستاویزات اور ویسی ہی دوسری دستاویزات کی روشنی میں اس دور کی تاریخ پر ازسرنو روشنی ڈالی جائے اور حالات کا دوبارہ جائزہ لیا جائے تاکہ زیادہ صحیح اور حقائق پر مبنی تاریخ کا علم ہوسکے۔

انصاف پسند مؤرخین نے اسے جائز اور وقت کی ایک اہم ضرورت بتایا ہے۔ اس موضوع پر بعض معاصر انگریز لکھنے والوں نے اس دور میں انگریز سامراج کے رویّے کی بہت مذمت کی ہے اور سامراجی طاقت کے ظلم وستم کے راز فاش کیئے ہیں۔ انگریزوں نے اس تحریک کی ناکامی کے بعد ہندستانیوں سے جو انتقام لیا وہ ایسا وحشیانہ تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ خود ہندستانیوں میں بھی بعض نے اس تحریک کی مذمت کی ہے اور بعض نے انگریزوں کا ساتھ دیا ہے۔

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین صاحب ہمدانی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ کے استاد ہیں۔ ان کے اہم مضامین اور دیگر تالیفات تاریخ سے ان کے تعلق خاطر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، ہندستانی تاریخ کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس طرح آج کے مورخین میں اپنے لئے ایک اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔

پروفیسر عزیزالدین حسین صاحب نے اپنی زیرتبصرہ کتاب میں ۱۸۵۷ء سے متعلق جو دستاویزات اردو اور فارسی میں محفوظ ہیں انہیں قرینے سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان دستاویز پر غالبًا ابھی تک کام نہیں ہوسکا تھا اس کی وجہ بقول پروفیسر عزیزالدین حسین: یہ عہد وسطی کے مورخین کا میدان نہیں اور جدید ہندستان کے زیادہ تر مورخین فارسی اور اردو سے نابلد ہیں۔ اسی طرح مصنف کا خیال ہے اور درست ہے کہ ۱۸۵۷ء پر بہت کام ہوا ہے، لیکن فارسی و اردو دستاویزات کا مطالعہ کیئے بغیر ہی ۱۸۵۷ء پر کتابیں لکھ دی گئیں۔ بہرحال اس سلسلے میں ولیم ڈالرمپل قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایک ٹیم بناکر ان دستاویزات کا مطالعہ کیا اور ایک کتاب The last Mugal the fall of a dynesty تالیف کی جو ۲۰۰۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔

ہندستان میں ۱۸۵۷ء سے متعلق فاسی و اردو دستاویزات اور دوسرے مآخذ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی، بھوپال، دہلی اسٹیٹ آرکائیوز، دہلی، کمشنرز ریکارڈز آفس، دہلی ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ہردیال لائبریری، دہلی، حسن نظامی کلکشن دہلی، اترپردیش اسٹیٹ آرکائیوز لکھنؤ و الہ آباد، مدھیہ پردیش اسٹیٹ آرکائیوز، بھوپال، بہار اسٹیٹ آرکائیوز، پٹنہ وغیرہ اور جو اضلاع ۱۸۵۷ کے ہنگامہ خیز حالات سے متاثر رہے، ان اضلاع کے ہیڈکوارٹرس کے متعلقہ دفاتر میں موجود ہیں۔ پروفیسر عزیزالدین حسین صاحب نے بھی یہ دستاویز ایسے ہی مراکز سے فراہم کی ہیں۔ اس کتاب میں ۱۵۰ ایسی دستاویزات انتخاب کی گئی ہیں جن سے ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے

معرفی کتاب

(تازہ ترین کتابوں کا تعارف)

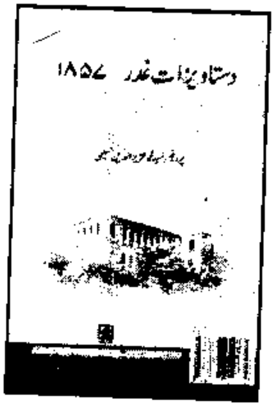

کتاب کا نام: دستاویزات غدر ۱۸۵۷

1857 Revisited

تصنیف : پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین

تصحیح : سر سید احمد خاں ۔ کلکتہ ۱۸۶۲ء

صفحات : ۳۲۹=۱۲۹+۲۰۰

قیمت : ۷۵۰ روپے

ناشر : Department of Research Support
Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi

تبصرہ نگار : پروفیسر شریف حسین قاسمی

ہندستان اس سال ۲۰۰۷ء میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ۱۵۰ سال پورے ہونے پر اس کی یاد میں بڑے پیمانے پر جشن منا رہا ہے۔ اس سلسلے میں چند پروگرام منعقد کیے جا چکے ہیں اور بعض دوسرے اہم پروگراموں کا انعقاد ہونا ابھی باقی ہے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ہندستان پر غاصبانہ قبضے کی داستان بڑی دردناک ہے۔ اس سال ہندستانیوں نے اس تسلط کے خلاف جو بڑے پیمانے پر تحریک چلائی وہ بھی نہایت اہم اور نتیجہ خیز رہی۔ حالانکہ ہندستانی اپنی اس کوشش میں بظاہر ناکام رہے لیکن بعد میں لڑی جانے والی کامیاب جنگ آزادی کے بیج ۱۸۵۷ء ہی میں بودیے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں اب متعدد کتابیں دستیاب ہیں۔ ہندستانیوں اور خود انگریزوں نے اس عظیم واقعہ کے گوناگوں پہلوؤں پر اظہار نظر کیا ہے۔ کچھ ہندستانی اور انگریز مصنفین نے اس تحریک کی مذمت کی ہے اور بعض

۱۹- کربلا میں عالم یہ ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ بیکس و تنہا کھڑے ہیں، چاروں طرف تلواریں، تیر اور خنجر وسنان کا ہجوم ہے۔

۲۰- امام حسینؑ جو حضرت فاطمہؑ کے دل کا چین ہیں اور دوشِ پیغمبر کے سوار، وہ نیزے کے زخم سے زمین پر غلطیدہ ہیں اور ان کے منہ سے خون جاری ہے۔

۲۱- اللہ کی پناہ کہ یزید، سعد اور شمر کے ظلم کی وجہ سے امام حسینؑ کے حلق کا خون خاک پر بہہ رہا ہے

۲۲- جب ظالم امام حسینؑ کے کشتہ پر خنجر چلاتا ہے تو آسمان کانپتا ہے، فرشتے روتے ہیں، زمین ہلتی ہے اور دنیا تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔

۲۳- جب امام حسینؑ دم آخر خنجر کے نیچے سے پانی طلب کرتے ہیں تو شمر ستم گار ان کو جاں سوز (دل دکھانے والے) طعنے دیتا ہے۔

۲۴- شاید ستمگر کے پہلو میں دل کے بجائے لوہا تھا کہ اس نے اہل حرم کو طوق و سلاسل پہنا کر ایذا دی۔

۲۵- ظالم کا لشکر داورِ محشر کے عدل و انصاف سے نہیں ڈرتا کہ تشنہ لبوں کے گلوں پر خنجر چلا رہا ہے۔

۲٦- امام حسینؑ ابنِ علیؑ حق کے راستے پر اس قدر ثابت قدم تھے کہ اگر اُن کے سر پر کوہِ گراں بھی گر پڑتا تو وہ راہِ حق سے جنبش کھانے والے نہ تھے۔

۷- یہ کیسے قہر کی بات ہے کہ پیغمبر کی اولاد پیاسی مر رہی ہے اور یزید بے حیا شیر و شکر کے جام پی رہا ہے۔

۸- ہمشکل پیغمبر حضرت علی اکبرؑ شہادت پاتے ہیں تو فرشتے غم سے بیتاب ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں ۔

۹- حضرت عباسؑ خیمہ کی طرف بڑی حسرت سے نظر کرتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ کاندھے پر لٹکی ہوئی مشک میں تیر لگا اور مشک کا پانی گر کر بہنے لگا۔

۱۰- حضرت زینب بنتِ زہراؑ کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ بیشک وہ ثانیٔ مریم ہیں اور ان کا عالم یہ ہے کہ زندان (قید) میں سر عریاں ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

۱۱- حضرت علی اصغرؑ کی طرف تیر چلانے والا (مرحلہ) کس قدر سنگ دل کہ بچے کو شربتِ شیریں پیش کرنے کے بجائے زہر کا تیر حلقِ نازک میں پیوست کر دیا۔

۱۲- حضرت امام زین العابدینؑ جو نسل سادات کی واحد بنیاد ہیں وہ مریض ہیں اور خستہ جان ہیں اور ان کے پاؤں زنجیر و سلاسل سے زخمی ہیں۔

۱۳- حسینؑ کے تمام رفیق اور عزیز دنیا سے پیاسے رخصت ہو گئے، الٰہی ان شہیدوں پر ہمیشہ ابرِ رحمت کی بارش ہوتی رہے۔

۱۴- اس صحرائے پر آتش میں کہ جہاں سورج کی گرمی سے مردانِ دلاور کی ہڈیوں کا روغن پگھل جائے وہاں حسینؑ کے ساتھیوں نے جنگ کی۔

۱۵- خدا عمر و بن سعد و یزید وخولی کو رسوا کرے جنہوں نے آلِ پیغمبر پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔

۱۶- جب غربت کے عالم میں کسی بیچارے پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو نہ پاؤں میں چلنے کی طاقت رہتی ہے نہ دل میں ستم برداشت کرنے اور صبر کرنے کی طاقت رہ جاتی ہے۔

۱۷- عمر سعد ایک ایسا سنگ دل ہے کہ شہیدوں کے تماشہ کے لئے سوار ہو کر آتا ہے اور اس کے گھوڑے کی گرد شہیدوں کے دہن پر گر رہی ہے۔

۱۸- حضرت فاطمہؑ کے تمام دل کے ٹکڑے اس طرح خاک پر پڑے ہیں جیسے باغ کے فرش پر لالہ و نسترن کے پھولوں کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔

ترجمہ نوحہ

در ماتم فرزند رسول، جگر گوشہ بتول، نور چشم مرتضیٰ،
حضرت امام حسین، شہید کربلا علیہ السّلام
تصنیف
حجت الاسلام مولانا سیّد مکرّم حسین صاحب قبلہ مجتہد، اعلی اللہ مقامہ
متوفّی (۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء)
حسب فرمائش
جناب مستطاب معلّی القاب سیّد امیر حیدر،
رئیس جلالی ضلع علی گڑھ

۱- آسمان ہر صبح شفق کی آنکھ سے دنیا پر خوں برساتا ہے اور زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور ہر لحہ مصیبت کا اظہار کرتی ہے۔

۲- مناسب ہوگا اگر روشن چاند سبزے کی طرح رنگین ہو جائے اور مناسب ہوگا کہ کہکشاں شبنم کی طرح اشک حسرت برسائے۔

۳- میں نہیں جانتا کہ یہ کیا قہر ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا آفتیں ہیں کہ زمین سے قیامت اٹھتی ہے اور آسمان سے بلا نازل ہوتی ہے۔

۴- جنّت میں حور و غلماں سینہ کوبی کر رہے ہیں اور سر ننگے ہیں اس لئے کہ ناموسِ پیغمبر پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔

۵- کفار بے کیش حرم امام حسینؑ کا ساماں لوٹنے کے لئے ان کے خیمہ میں داخل ہو گئے جس طرح کسی وادی سے گزرتے ہوئے قافلہ پر رہزن حملہ کرتے ہیں۔

۶- عجب بات نہ ہوگی اگر حضرت سکینہؑ کی فریاد سے اور اہل حرم کی آہ و زاری سے آسمان سے خدائے قہار و جبار کے قہر کی آگ لشکر یزید کے ظالموں پر نازل ہو جائے۔

مَعاذَالله از جور یزید و شمرِ بد گوهر
که خون حلق ابنِ مصطفی بر خاکدان ریزد
چو ظالم بر گلوی تشنهٔ سیّد کَشَد خنجر
فلک لرزد، مَلَک گرید، زمین جنبد، جهان ریزد
دمِ آخر شَه [مُضطَر] چو خواهد جرعهٔ آبی
سیه دل در جوابش طعنه‌های جانستان ریزد
مگر جای دل آهن بود در پهلو ستمگر را
که از طوق و سلاسل بر حرم بارِ گران ریزد
ز عدل داور محشر نترسد لَشکر ظالم
که آبِ گرمِ خنجر در گلوی تشنگان ریزد
حسین بنِ علی کز کوه ثابت‌تر قدم باشد
نجنبد از رهِ حق گر به سر کوهِ گران ریزد

چه قهر است این که اولادِ پیمبر(ص) تشنه لب میرد
یزید بی‌حیا شیر و شکر در کامِ جان ریزد
چو میرد نوجوان، هم‌شکل پغمبر(ص)، علی اکبر
ز بیتابی سرشک غم ز چشم قدسیان ریزد
ز حسرت سوی خیمه بنگرد عبّاس نام‌آور
چو مشک از دوش و آب از مشک، از تیر و سنان ریزد
چه می پرسی ز حالِ بنتِ زهرا ثانیِ مریم
به زندان با سرِ عریان سرشک ارغوان ریزد
چه سنگین دل که آبِ زَهر جای شربت شیرین
به حلق نازک اصغر ز تیر خونفشان ریزد
اساس نسلِ سادات آن مریض خسته جان تنها
به زنجیر و سلاسل خون ز پای ناتوان ریزد
رفیقان و عزیزان تشنه لب پیشِ خدا رفتند
الهی بر شهیدان ابرِ رحمت جاودان ریزد
در آن صحرای پرآتش که مردان دلاور را
ز تاب مهر روغن گشته مغز استخوان ریزد
خدا رسوا کند سعد و یزید و شمر و خولی را
که بر آل پیمبر(ص) از ستم کوهِ گران ریزد
نه پای رفتن و نی طاقت صبرِ ستم ماند
چو در غربت مصیبت بر سرِ بیچارگان ریزد
رسد بهر تماشای شهیدان سعد سنگین دل
غبارِ پای توسَن در دهان کُشتگان ریزد
به خون و خاک افتاده همه لَخت دل زهرا
چو برگ لاله و نسرین به فرش بوستان ریزد
حسین بن علی درمانده باشد بیکس و تنها
ز هر سُو ابر تیغ و خنجر و تیر و سنان ریزد
قرار جانِ زهرا، شهسوارِ دوشِ پیغمبر(ص)
به زخمِ نیزه غلطان بر زمین خون از دهان ریزد

نوحه

در ماتم فرزند رسول(ص)، جگرگوشهٔ بتول(س)، نورچشم مرتضی(ع) حضرت امام حسین شهید کربلا علیه السلام

تصنیف

حجةالاسلام مولانا

سید مکرّم حسین صاحب قبله مجتهد، اعلی الله مقامه

(۱۳۰۵ه‍/۱۸۸۷م)

حسب فرمایش

جناب مستطاب معلی القاب سید امیر حیدر

رئیس جلالی، ضلع علی‌گره

فلک هر صبح از چشمِ شفق خون بر جهان ریزد
زمین بر روی خود گردد مصیبت هر زمان ریزد

سزد گر ماه روشن، همچو رنگین سبزه‌رو گردد
سزد گر، همچو شبنم اشک حسرت کهکشان ریزد

نمی‌دانم چه قهر است این، ندانم کین چه آفتهاست
قیامت از زمین خیزد بلا از آسمان ریزد

به جنّت حور و غلمان سینه کوبانند عریان سر
چو بر ناموسِ پیغمبر(ص) بلایی ناگهان ریزد

به غارت بُردن رختِ حرم رفتند بدکیشان
چو در وادی، هجوم رهزنان بر کاروان ریزد

عجب نبود ز فریاد سکینه کز حرم خیزد
شرار قهر جبّار ازل از آسمان ریزد

نوحہ در ماتم فرزند رسول

حجۃ الاسلام مولانا سید مکرم حسین صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہ

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

حجۃ الاسلام مولانا سید مکرم حسین صاحب سادات عابدی ہمدان کے جید عالم تھے۔ آپ کے پدر بزرگوار جناب سید وارث علی تھے۔ آپ نے تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ آپ کو ریاضی، فقہ، طب اور علم رجال وغیرہ میں مہارت حاصل تھی۔ آپ فن شاعری میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ہفت بند محتشم کاشانی کے طرز پر ایک ہفت بند حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں بزبان فارسی نظم فرمایا اور فارسی زبان میں ایک نوحہ بھی تصنیف فرمایا۔ آپ کی تصانیف میں رسالہ در بحث نماز جمعہ، رسالہ در بحث طہارت، اختیارات، رسالہ نوروز اور نسب نامہ سادات جلالی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کے پاس ایک اہم ذخیرہ کتب تھا۔ آپ کی وفات نہم ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء ہوئی۔ آپ کی قبر امام باڑہ محلہ گڑھی کے دالان کے مشرقی حصہ میں واقع ہے۔ آپ کی تاریخ وفات جناب نواب جعفر علی خاں صفوی، رئیس شمس آباد، ضلع فرخ آباد نے نظم فرمائی۔ یہ قطعہ لوح مرقد منور کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔

جلالی وطن مجتہد نیک طینت　　حکیم آل طہ سراپا لیاقت
ز دارفنا سال بستم گرفتہ　　مکرم حسین آہ بحرِ کرامت

(۱۳۰۵ھ)

سید قدسی جمال، فاضل صاحب کمال　　آن کہ بہ نورش ہمان در حِکَم و فقہ و رای
آن کہ ز در باب علم یافتہ در باب علم　　ملکۂ ہر باب علم صد سند دلگشای
مجتہد عہد خویش پیشرو اہل کیش　　عدل وی از علم پیش، علم وی از خیر و رای
چاشت ز روز نہم بود ربیع دوم　　کز چمن دہر شد سوی جنان روگرای
درغمش از جانبین کرد ملک شور و شین　　وای مکرّم حسین، مجتہدالعصر وای

زندہ ہیں۔ شہید وہ ہے جو اس حالت میں ہے جب کہ وہ کسی سے جنگ نہیں کرسکتا اگر کرتا ہے تو مر کے بھی دشمن کو ہرا سکتا ہے، ظاہراً فاتح تو نہیں ہوتا مگر دشمن کے وقار و آبرو کو چھین لیتا ہے۔ شہید، تاریخ کا دل ہے، دل، جسم کے دیگر اعضا کو خون دیتا ہے۔ شہید اپنے خون سے مردہ سماج کو زندہ کرتا ہے۔[1]

ہم عاشورہ کی کیوں یاد مناتے ہیں اور پیرو اہل بیت کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں؟

امام حسینؑ کو سید الشہدا کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ ایک ظالم حکمراں کے ظلم کا نشانہ تھے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ واقعہ کربلا جب قاتلوں کو بیان کرتا ہے تو ظالمین مجرم اور عظیم گناہگار کے طور پر پیش کرتا ہے اور جب امام حسینؑ کا تذکرہ کرتا ہے تو انہیں ایک باہوش، با حوصلہ اور صاحب عزم مقدس کے طور پر متعارف کراتا ہے، پوری قوم مل کے یزید کے مقابلہ پر نہ آسکی انہوں نے اس کی خواہش کا اتباع کیا چنانچہ انحرافات اور بدعنوانیوں میں اضافہ ہونے لگا۔

ایسی صورت میں فرزند رسول امام حسین کا قیام نہ کرنا دین کے خاتمہ کی تائید کے مترادف تھا چنانچہ امام حسین پوری قوم کی ذمہ داری اپنے سر لی یہ عظیم سانحہ تھا جس میں امام حسین اسلامی دفاع جیسے مقدس مقصد کے تحت اٹھے اور ان کے ساتھ زمانے نے بہیمانہ برتاؤ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ ہر سال عالم اسلام میں قربانی امام حسینؑ کی یاد منائی جاتی ہے۔ یہ تذکرۂ غم کبھی کم نہ ہوگا چاہے جتنی بار دہرایا جائے جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا:

رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں میں کیا در مقصد نہ دینگے ساقی کوثر مجھے

دس محرم کے مراسم عزا آل رسول کی قربانیوں کی یاد دلاتے ہیں، یہ ہمیں مزید باہوش بناتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے آل رسول اور اسلام کا خاتمہ کرنا چاہا اور وہ لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہے مگر کچھ نہیں کیا، ان کا کردار بھی سامنے لاتا ہے۔

ہماری ذمہ داریاں

شہید مرتضی مطہری فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں ہم پر اہم ذمہ داری ہے بالخصوص عہد حاضر میں عاشورہ ہمارے لئے درس ہے جس سے ہم اخلاقی اور سماجی تربیت حاصل کرتے ہیں، ہمیں تحریفات سے مستقل نبرد آزما رہنا ہے''۔[2]

1- Am excerpt from jihad and Shadat, Dr. Ali Shariati

2- A Shwa. Popular Distortion and our responsibility Murtada Motahhari

اے اللہ، تیرے وجود کے سلسلے میں کوئی انسان کیا دلیل پیش کرے جب کہ اس کا وجود خود تیری ذات پر منحصر ہے، تو لاشریک ہے تاکہ تو انسانوں کی ہدایت کر سکے، تو دور ہو کے بھی سب سے بہت قریب ہے اندھی ہیں وہ آنکھیں جو تجھے نہیں دیکھتی مگر تو سب کو دیکھتا ہے، جس نے تجھے کھو دیا اس نے کیا پایا؟ اور جس نے تجھے پالیا اس نے کیا کھویا، بیشک جو تجھ ہٹ کے بھی خوش ہے وہ ناکام و لاشی ہے''۔

دوسری طرف ہم یزید کو دیکھتے ہیں جس کے باپ معاویہ، دادا ابوسفیان (پیغمبر کا سخت ترین دشمن) جو ہمیشہ پیغمبر کے مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا رہا اور اپنی اصلیت کو اپنی ایک نظم میں آشکار کر دیا۔

''بنی ہاشم نے سلطنت کے حصول کے لئے ایک ڈھونگ رچا ہے۔ ان کے اوپر نہ کوئی وحی آئی اور نہ کوئی الہی دین آیا''۔[1]

مسعودی لکھتا ہے کہ یزید ایک مسرت جو اور عیاش آدمی تھا جو شراب اور رجوئے میں سکون تلاشتا تھا یزید جیسے کو جو جواب امام حسین نے دیا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے''ہم اہل بیت رسول ہیں، رسالت کا منبع ہیں، فرشتوں کی آماجگاہ ہیں ہمارے ذریعہ اللہ نے خود اور اپنے دین کو پہنچوایا ہے جب کہ یزید ایک گناہگار شرابی ہے، جو بے گناہوں کا قاتل اور جرائم میں ملوث آدمی ہے، مجھ جیسا کبھی بھی یزید جیسے کی بیعت نہیں کرے گا''۔[2]

انقلاب امام حسین اسلامی تحریک ہے جو اسلام کے عظیم رہبر کی ذریعے عمل میں آئی۔ اسلامی اصول و قوانین کا مطالبہ تھا کہ امام حسین، امت کو اس بدترین صورت حال سے نجات دلائیں اور قوم کو منحرف کرنے والے حاکم کا سد باب کریں، جیسا کہ مدینہ چھوڑتے وقت خود امام حسین فرماتے ہیں:

''میں نے یزید کے خلاف بے وجہ اور متکبرانہ قیام نہیں کیا ہے بلکہ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح کی غرض سے اٹھا ہوں، میں دنیا سے برائیوں کو مٹا کر اچھائیوں کو عام کرنا چاہتا ہوں۔[3]

حسین میدان جنگ میں بحالت سجدہ قتل کئے گئے ان کا سر تن سے جدا کر کے نیزہ پر بلند کیا گیا تھا اور جب وہ دمشق پہونچا تھا تو اس پر پتھر برسائے گئے، اسے یزیدی قوموں نے روندا تھا۔

ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں''شہید یعنی حاضر (زندہ) وہ جنھوں نے سرخ رنگ کو سچائی پر مرنے کی علامت قرار دیا اور صرف اس لئے لڑے تاکہ اسلامی قدریں پامال ہونے سے بچ جائیں، وہ آج بھی زندہ ہیں اور حاضر و شاہد ہیں۔ وہ صرف خدا کی نظر میں نہیں بلکہ اس کی مخلوقات کی نظر میں ہر دور اور ہر خطہ میں

۱- ابن ماجہ، سنہ ۱۴۴ ۲- ابن جریر، تاریخ الامۃ والملک، ج ۱۳، ص ۲۱۷۴ ۳- سید ابن طاؤس، مقتل الحسین، ج ۱، ص ۱۱-۱۰

تک کہ غیر مسلم بھی واقعات کربلا کی سچائی سے انکار نہیں کرسکتے کہ امام حسین کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، ایک دوسرا مورخ جیورجی زیدان کہتا ہے کہ امام حسینؑ کی سروتن کی جدائی دل ہلادینے والا منظر تھا، یہاں تک کہ یزید بھی کانپ گیا تھا جب اس نے لاشۂ بے سر امام حسینؑ دیکھا تو اس نے محسوس کرلیا تھا کہ اس نے کتنا بھیانک جرم کیا ہے۔

عاشورہ کیا ہے؟

ماہ محرم ۶۱ ہجری بمطابق کم وبیش ۲۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو نہر فرات کے کنارے، کربلا نامی جگہ پر عراق میں واقعۂ عاشورہ ظہور پذیر ہوا، ایک کثیر تعداد پر مشتمل لشکر (جسے بنی امیہ کی حمایت حاصل تھی) سو سے بھی کم لوگوں کے خلاف اس مطالبہ کے ساتھ جمع ہوا کہ یہ لوگ خلیفۂ وقت کی بیعت کرلیں، اس مختصر گروہ نے مقاومت کی چنانچہ حالات نے جنگ کی صورت اختیار کرلی اور یہ سارے لوگ مارے گئے۔

ظاہر ہے کہ زمانے میں اب تک سیکڑوں جنگیں لڑی گئیں ہیں، تاریخ نے انہیں لکھا بھی مگر وہ بھلادی گئیں جب کہ ۱۰ محرم کو رونما ہوا واقعۂ کربلاء آنے والی نسلوں کے لئے تحریک بنا ہوا ہے۔ ہم اس مضمون میں امام حسین کے اہم عناصر کا جائزہ لیں گے۔

حسین کون ہے؟

اس مختصر گروہ کے سربراہ جو کربلا میں شہید کردیئے گئے، جو فرزندان علی ابن ابی طالب اور نواسۂ رسول تھے جو فاطمہ کے بیٹے تھے جس کے لئے پیغمبر نے کہا تھا: ''حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں، پروردگار تو اس سے محبت کر جو حسین سے محبت کرے۔[۱]

۵۰ھ میں امام حسن کی شہادت کے بعد امام حسین اہل بیت میں سب سے باعظمت تھے، انہوں نے امام حسن کے صلح نامہ کا پاس ولحاظ رکھا جب کہ آپ کے بعض معتقدین نے اس کی مخالفت بھی کی۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اس لئے نہیں کہ ان کا سیاسی دائرہ وسیع ہوجائے بلکہ انہوں نے لوگوں کی دینی و انسانی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے۔ خدمات انجام دیں چنانچہ لوگ بھی ان کے علم، شرافت اور ایمانداری کی بنیاد پر انہیں دوست رکھتے تھے دعائے عرفہ میں آپ کے نظریات کی گہرائی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس مثال میں آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اللہ کے صفات کس طرح ذکر کیئے ہیں؟

فرماتے ہیں:

امام حسین گاندھی جی کی نظر میں

حامد رضا نیا

تاریخ بتاتی ہے کہ فرزند رسول حضرت امام حسین کے ذریعے کیا گیا قیام عاشورہ عالم انسانیت میں کتنی اہمیت کا حامل ہے۔

امام حسینؑ کی شخصیت کے سلسلے میں کہی گئی باتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہندوستانی جنگ آزادی کے سربراہ مہاتما گاندھی کا قول خصوصی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ انہوں نے اپنی مادر گیتی ہندوستان کی جنگ آزادی کے لئے خدائے حریت حضرت امام حسینؑ سے سبق لیا ہے اور ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا کہ ہم حضرت امام حسینؑ کا اتباع کریں، علاوہ ازیں گاندھی جی نے کہا کہ ساتویں صدی میں امام حسینؑ اور ان کے بہادر ساتھیوں کی شہادت تاریخ انسانیت کا عظیم سانحہ ہے چنانچہ ہر سال ماہ محرم میں مسلمان اپنے امام کی شہادت کی یاد مناتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

امریکن مورخ واشنگٹن ارونگ نے کہا: ''میں شہادت امام حسین کے سلسلے میں بہت زیادہ تو نہیں کہہ سکتا، کربلا ایک عظیم سانحۂ تاریخ اسلام ہے، ظلم کی اس سے بڑی مثال کہیں نہیں ملتی، گو کہ حضرت علیؑ کا قتل عالم انسانیت کے لئے بڑے غم کی بات تھی مگر امام حسینؑ کی شہادت انتہائی دل فگار تھی۔ آج بھی آدمی اس کے تصور سے لرز اٹھتا ہے، یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا''۔ ارونگ کہتا ہے کہ قیام امام حسینؑ کے اثرات ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، امام حسینؑ یزید کی منشا کے مطابق اپنی زندگی بچانے کے لئے خود کو اس کے سپرد کرتے ہوئے بیعت بھی کر سکتے تھے مگر اسلامی رہنما ہونے کی حیثیت سے انہوں نے کبھی بھی اسے خلیفہ تسلیم نہیں کیا، انہوں نے اپنے آپ کو کسی بھی طرح کی انہونی کے لئے تیار رکھا تا کہ دین کو بنی امیہ کے چنگل سے آزاد کرایا جا سکے، مجھے یقین ہے امام حسین کی روح ہمیشہ ہمیش کے لئے باقی رہنے والی ہے۔

''میں آپ کا احترام کرتا ہوں، اے بزرگوار! اے بہادری اور قربانی کے روشن سبق''۔

ماہر علوم مشرقیات اڈورڈ براؤن نے کہا کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی دل غم کربلا کو محسوس نہ کرتا ہو یہاں

ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو جلد ہی شائع ہوجائے گی اور آخر میں میں جناب کرنل سید جرار احمد صاحب کی شکرگزار ہوں کہ جنہوں نے محرم سے متعلق بہت سی مفید باتیں مجھے بتائیں۔

حوالہ جات

مندرجہ ذیل کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۱- راہی معصوم رضا: آدھا گاؤں (اردو ناول)، نئی دہلی

2- Syed Taqi Husain: Our Heritage, 2000 New Delhi

3- Shiaism, Lucknow, 1955

4- Ghaffari, Salman: Shiaism or original Islam, Tehran, 1971

5- Thorton :Gazetter vol.39 of Ghazipur District, Gazetteer of the united provinces of Agra and oudh, Allahabad, 1915

۶- عبدالرحمن صدیقی: تذکرہ مشائخ غازی پور، انیس پبلیکیشنز، صدمنزل مچھر ہٹہ، غازی پور، یوپی

7- Varun, D.P.: Ghazipur Gazetteer, Allahabad 1982

8- Yasin, Mohammad: A social History of Muslim India, Lucknow 1605-1748

9- Rizvi, Syed Athar Abbas : A Socio-Intellectual History of Isna Ashari Shias in India, Munshiram Manohar Lal Publications ltd. New Delhi, 1986

عزاداری کے سلسلہ میں اہل ہنود کی عقیدت اور ان کا تعاون یقینی طور پر گاؤں کے شیعہ حضرات کو حاصل ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ اس کے دادا مرحوم سید محمد صاحب جو کہ گاؤں کے مشہور حکیم تھے۔ ان کے زمانہ میں بھی گاؤں کے پنڈت، ٹھاکر اور یادو لوگ باقاعدہ مجلس میں آتے تھے اور فرش پر انہیں بڑی عزت کے ساتھ بٹھایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ تھوڑا کم ہوا ہے لیکن ابھی بھی وہ لوگ موجود ہیں جن کا عقیدہ امام مظلوم پر ہے۔ اس بات کی دلیل نونہرہ گاؤں کے ایک امام باڑہ ہے، جسے سید احمد مرحوم صاحب کے امام باڑے کے نام سے جانا جاتا ہے، وہاں آج بھی چاندی کا ایک تعزیہ رکھا ہوا ہے جسے ایک گپتا ذات کے فرد نے ہدیہ کیا تھا نمبر دار صاحب کے امام باڑہ میں۔ اسی طرح چاندی کے کئی علم ہندو حضرات کی طرف سے چڑھائے گئے تھے۔ غم حسینؑ کی یہ تاثیر ہے کہ ہر قوم اس غم میں اپنا تعاون صدق دل سے پیش کرنے کے لئے آگے آگے نظر آتی ہے۔

گنگولی گاؤں کے محرم کا ذکر میں نے ابھی کیا لیکن مجھے ایک بڑی اہم خبر گنگولی کے چہلم کے بارے میں معلوم ہوئی ہے کہ اس گاؤں میں اب سے ۵۰ سال پہلے امامؑ کا چہلم منائے جانے کا چلن نہیں تھا۔ ایک انصاری برادری کی شخصیت منظور احمد صاحب نے اس کی شروعات کی اور بڑی عقیدت کے ساتھ وہ امام کے چہلم کا اہتمام کرنے لگے۔ دھیرے دھیرے اس میں ترقی ہوتی گئی اور لوگ اس میں اپنا تعاون دینے لگے۔ اس سال گنگولی میں اس چہلم کی گولڈن جوبلی منائی جائے گی، جس کے لئے بڑے پیمانے پر انجمن کی جانب سے اہتمام ہو رہا ہے۔

آخر میں کہوں گی جوش ملیح آبادی نے ٹھیک ہی کہا ہے:

موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر وبہہ جائے گا
ہاں! فقط نام حسینؑ ابن علیؑ رہ جائے گا

نوٹ: اس مقالے کو لکھنے میں مجھے متعدد حضرات سے تعاون حاصل ہوا، جن میں سے بعض حضرات سے میں نے براہ راست بات چیت کر کے اور بعض سے ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ کر کے معلومات حاصل کیں۔ مجھے اپنے والد محترم جناب سید علی عابدی اور چچا جناب تقی حسینی صاحب سے بہت مدد ملی۔ یہ دونوں حضرات گاؤں کے بزرگ ہیں اور ماشاء اللہ ہر سال محرم کرنے کے لئے گاؤں تشریف لے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے وطن آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ پارہ کے محرم کے بارے میں مجھے احمد عباس حسینی پاروی سے معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ سادات پارہ پر

گاؤں میں پانچ مردوں کے لئے اور تین عورتوں کے لئے مخصوص امام باڑے اور دو امام باڑے مرد و خواتین دونوں کے لئے ہیں۔ یہاں کی قدیم انجمن ''انجمن حسینیہ'' ہے جس کے ذمہ گاؤں میں برآمد ہونے والے تمام جلوسوں کی اور زنجیر و آگ پر ماتم کی ذمہ داری ہے۔ اس گاؤں میں غازی پور کے دوسرے گاؤں کی طرح مجالس میں تحت الفظ کا زیادہ چلن ہے۔ گنگولی کے محرم کے بارے میں سید احمد ہادی عرف مظہر صاحب اور راہی معصوم رضا کے ناول 'آدھا گاؤں' سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مظہر صاحب نے بتایا کہ اہل ہنود کی اچھی خاصی تعداد محرم کی عزاداری میں اپنا تعاون پیش کرتی ہے، جس میں مجالس میں شرکت سے لے کر دوسرے تمام کام شامل ہیں۔ اس گاؤں کی آبادی کو بھی دو حصوں یعنی اتر پٹی و دکھن پٹی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان دونوں محلوں میں بڑے شان سے عزاداری کی روایت کو نبھایا جا رہا ہے۔

گنگولی میں یوم عاشورہ کا جلوس سہ پہر کو برآمد ہوتا ہے جو کہ مقامی کربلا میں پہونچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ جلوس محلہ تکیہ سے شروع ہوتا ہے اس جلوس کی خاص بات یہ کہ یہ جلوس تب تک آگے نہیں بڑھتا جب تک دوسرے گاؤں سے سنّی حضرات کے تعزیے نہ آ جائیں۔ یقیناً یہ بھائی چارے کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ یہاں شامِ غریباں کی مجلس کے ساتھ یومِ عاشورہ کا اختتام ہوتا ہے اور لوگ دوسرے دن یعنی ۱۱ محرم وطن سے واپسی کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔

آخر میں ارزانی پور گاؤں کا مختصراً ذکر پیش کرنا مقصود ہے۔ جہاں پر عزاداری محرم کے ابتدائی پروگرام یعنی ۲۸ رجب کے جلوس کا جسے 'سفر مدینہ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اہتمام ہوتا ہے یہ جلوس امام حسینؑ اور ان کے اس قافلہ کی روانگی کی یاد تازہ کرتا ہے، جب حسینؑ نے ولید گورنر مدینہ سے انکار بیعت کے بعد اختیار کیا تھا۔ قرب و جوار کے تمام گاؤں کے لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں۔ جس میں مجلس برپا ہوتی ہے اور جلوس برآمد کیا جاتا ہے۔ جلوس میں اونٹوں پر عماریاں، علم وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام بہت دنوں سے منعقد ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور اس میں دن بہ دن ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ جو بھی وہاں تشریف لاتا ہے اس کے طعام کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس طرح یہ گاؤں محرم میں بھی عزاداری کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جہاں تک مجالس کے بعد طعام کا سوال ہے، وہ میرے وطن یعنی نونہرہ میں بھی پورے دس دنوں تک دوپہر و شب دونوں وقت ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح گنگولی میں دوپہر کے وقت زیادہ تر مجالس کے بعد حاضری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

نے مجھے بتایا کہ یہ منتی مجلس چندریکا یادو، چندر لالہ، پھیکو اور ایک ہریجن خاتون ننکی دیوی کی طرف سے ہوتی ہیں۔ ننکی دیوی کو امام سے ایسی عقیدت ہے کہ وہ ہر مجلس میں شریک ہوتی ہے کیونکہ پارہ میں مردانی مجالس کے ساتھ ساتھ زنانی مجلس کا بھی کافی چلن ہے۔ یہ دوسری قوموں سے جڑے ہوئے وہ لوگ ہیں جو عزاداری کی روایت کو باقاعدہ نبھا رہے ہیں۔ ننکی دیوی کو امام باڑہ سید حسین اصغر صاحب سے اس قدر عقیدت ہے کہ وہ ہر شب جمعہ امام باڑہ کی چوکھٹ پر شمع و اگر بتی روشن کرتی ہیں۔ یقیناً یہ امام حسینؑ کے غم کی کشش ہے جو ہر قوم کہتی ہے کہ ''ہمارے ہیں حسینؑ''۔[۱]

حسین پور

حسین پور میں بھی محرم کے دنوں میں زنانی ور مردانی مجلسوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ لیکن مغرب کے بعد اس گاؤں میں زنانی مجلس کا چلن نہیں ہے، شب عاشورہ یہاں جلوس بھی برآمد نہیں ہوتا۔ صرف عاشورہ کے دن بعد نماز ظہر تعزیہ وعلم کا جلوس، کربلا کی طرف جاتا ہے۔ اس گاؤں کے محرم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بھی شیعہ و سنی حضرات مل جل کر عزاداری کرتے ہیں اور سنّی حضرات باقاعدہ مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ یہاں جب مجلس کا اہتمام ہوتا ہے اور اُس کے لئے جو بھی تبرک تیار ہوتا ہے، صاحب خانہ اس میں سے پانچ حصہ تبرک نکال لیتا ہے اور بعد مجلس اس تبرک کی نیلامی ہوتی ہے جو کہ سب سے زیادہ بولی لگاتا ہے اسے یہ تبرک رقم لے کر دے دیا جاتا ہے۔ اور اس رقم کو انجمن کی آمدنی میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ اس رقم سے انجمنِ عباسیہ جلوس کا اہتمام اور متعلقہ انتظامات کرتی ہے۔

گنگولی

بہت سی نامور شخصیتوں کا آبائی وطن گنگولی ہے۔ جن میں میر محمد علی گنگولوی، راہی معصوم رضا صاحب مرحوم، پروفیسر مونس رضا صاحب مرحوم، پروفیسر سید مہدی رضا، سید احمد رضا، پسرانِ سید شبیر حسین مرحوم اور سید شبیر حسین مرحوم کے علاوہ سید شاہد مہدی صاحب اور نفیس غازی پوری کے نام قابل ذکر ہیں یہ گاؤں شہر غازی پور سے ۲۷ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جہاں پر سادات حضرات کی آبادی تقریباً ۳۰۰ کے آس پاس ہے، جو محرم کے دنوں میں اپنے وطن محرم کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس

۱- احمد عباس حسینی، سادات پارہ غازی پور یوپی۔ تاریخی پس منظر عزاداری اور اہم شخصیات، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

پارہ

پارہ ضلع غازی پور کی ایک قدیم بستی ہے جسے قطب الدین کے صاحب زادے، دوست محمد، نے بسایا تھا اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام محمد پور رکھا تھا، یہ وہ نام ہے جو کچہری کے کاغذات میں اب تک موجود ہے۔ وقت گزرا اور اب پارہ ہوگیا ہے۔ اس گاؤں میں ہر قوم و ملت کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی گھر گھر سے صدائے حسینؑ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یہاں کی عزاداری قدیم عزاداری میں شمار ہوتی ہے۔ دستور قدیم کے مطابق مجلس کی ابتداء سوز خوانی سے ہوتی ہے، جسے سید آفاق حسین صاحب وہمنوا اپنے مخصوص انداز میں ادا کرتے ہیں۔ ان کا منفرد انداز قرب و جوار میں بھی مشہور ہے۔ عشرۂ محرم کے دنوں میں سید حسین اصغر صاحب، میر ناظم صاحب، فیروز علی صاحب مرتضائی بی بی کے امام باڑے میں شب و روز مجالس کا سلسلہ رہتا ہے۔ ساتویں محرم کو میر فیروز صاحب کے امام باڑے سے علم کا جلوس برآمد ہوتا ہے۔ جس میں سید آفاق صاحب ہر امام باڑے اور چوک کے قریب مرزا دبیر کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔

شب عاشور تمام عزاخانے ہر خاص و عام کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ہر قوم کے لوگ زیارت کرتے ہیں اور شمع و اگر بتی جلاتے ہیں۔ یہ طریقہ پورے ہندوستان میں رائج ہے۔ شب عاشورہ پارہ میں ذوالجناح کا جلوس بھی برآمد ہوتا ہے۔ جلوس کے پیچھے پیچھے بستی کے دوسرے عقیدت مند لوگ بھی چلتے ہیں جو میر ناظم صاحب کے امام باڑہ پر پہنچتا ہے۔ آفاق صاحب مونس لکھنوی کے قدیمی مرثیہ کے دو بند اس موقع پر پڑھتے ہیں۔

مومنوں مرنے کو میدان میں جاتے ہیں حسینؑ — بیبیاں روتی ہیں ہتھیار لگاتے ہیں حسینؑ
منھ سے منھ پیاسی سکینہ کو لگاتے ہیں حسینؑ — اشک خوں چشم مبارک سے بہاتے ہیں حسینؑ
چاند سے جسم میں کپڑے ہیں کفن کی صورت — نگہ یاس سے تکتے ہیں بہن کی صورت

پارہ سے دو کلومیٹر دور شمالی حصہ میں واقع نظام پور گاؤں کے پٹھان حضرات کپڑے کا بنا ہوا تعزیہ لاکر اس جلوس میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے بعد جلوس کربلا کی طرف گامزن ہوتا ہے اور تعزیہ دفن کرنے کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

پارہ گاؤں میں محرم کے دس دنوں کے اندر کچھ متی مجالس کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں سنّی حضرات اور اہل ہنود بھی شامل ہوتے ہیں۔ بزرگ محترم جناب احمد عباس حسینی عرف معصوم صاحب

لوگ رخصت ہوجاتے ہیں۔

نونہرہ کے محرم میں اہلِ ہنود اور سنّی مسلک کے لوگوں کا بھی اہم تعاون ہوتا ہے۔سنّی حضرات میں حنفی لوگ یہاں عزاداری محرم کرتے ہیں اور چوک پر تعزیہ بھی رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی دو انجمنیں بھی ہیں جو سات محرم، نومحرم اور روز عاشورہ اور شب عاشورہ میں عزاداری کا اہتمام کرتی ہیں اور گشت کرتی ہوئی ماتم کرتی ہیں۔

جن میں انجمن ملت اسلامیہ اور ''عباسیہ'' نوحہ و ماتم کرتی ہوئی چوپال کا گشت کرتی ہیں۔سنی حضرات کے لئے نوحہ و سلام شیعہ حضرات لکھ کر دیتے ہیں، جن میں سید اظہار احمد صاحب و مسلم صاحب کا نام درج کیا جاسکتا ہے۔سنی حضرات کی طرف سے جلوس میں ماتم کرنے والے لوگوں کے لئے چائے کا اہتمام بھی جگہ جگہ کیا جاتا ہے۔

ہندو حضرات بھی گاؤں کی عزاداری میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور رات بھر جاگ کر ماتمی جلوسوں کی زیارت کرتے ہیں۔ اور مظلومیت امام حسینؑ پر اپنے غم او رغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔شیعہ حضرات کے جلوس جو شب عاشور برآمد ہوتا ہے، ماتمی دستوں سے ہندو حضرات کی طرف سے ان نوحوں کی فرمائش ہوتی ہے جو ہندی یا پھر بھوجپوری میں ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر اس نوحہ کی

جیون میں سماجاتے ہردیہ میں جگہ پاتے
شبیر مدینہ سے گر ہند میں آجاتے

یہ نوحہ خاص طور پر جہاں ہندو حضرات کی آبادی ہوتی ہے، وہاں پڑھا جاتا ہے۔ روز عاشورہ کا ایک خاص واقعہ جو اس گاؤں میں انجام پذیر ہوتا ہے۔ اس کا یہاں ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ جب صبح کے وقت جلوس چلہر کی کربلا کی طرف جاتا ہے تو راستہ میں ہندو حضرات کے مکان پڑتے ہیں جب علم وتعزیہ وہاں سے گزرتا ہے تو اُن کے گھروں کی لڑکیاں اور عورتیں ایک صاف ستھرے لوٹے میں پانی لے کر آتی ہیں اور علم وتعزیہ کے سامنے اسے انڈیل دیتی ہیں اور ہاتھ جوڑتی ہیں جب اُن سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں تو وہ بیان کرتی ہیں کہ انہیں اپنے بزرگوں سے یہ پتہ چلا ہے کہ امام صاحب کے چھوٹے چھوٹے بچے کربلا میں پانی کے بغیر تھے۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو امام صاحب کے بچوں کو پانی تو پلا ہی دیتے۔ یقیناً یہ حسینؑ مظلوم سے محبت کا جذبہ اور مظلومیت حسینؑ کی دلیل ہے جسے ہر سال ہم نونہرہ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں دیکھتے ہیں۔

سات محرم کی شب میں جلوس عزاء برآمد ہوتا ہے، جس میں زنجیر کا ماتم ہوتا ہے، جس کے لئے مخصوص نوحہ:

مومنوں عباس وفا کر گئے

بھائیوں کو شہ پہ فدا کر گئے

بڑے جوش و خروش کے ساتھ انجمن عباسیہ کے صاحبان بیاض، سید شاداب حسین عرف لاڈلے صاحب اور کیفی عابدی صاحب، پڑھتے ہیں۔ اسی طرح شب عاشورہ میں بھی جلوس عزاء برآمد ہوتا ہے جو پورے گاؤں کا گشت کرنے کے بعد بنگلہ کے امام باڑہ میں اختتام پذیر ہوتا ہے، جہاں آگ پر ماتم بھی برپا ہوتا ہے۔

روزِ عاشورہ بیشتر تعزیے دفن ہونے کے لئے کربلا میں لے جائے جاتے ہیں۔ پورب محلہ کا تعزیہ چاہر کی کربلا میں دفن ہوتا ہے اور ہر تعزیہ کو عزاخانے یا پھر چوک سے اُٹھانے کے قبل مرثیہ کے چند بند پڑھے جاتے ہیں۔ صبح کے وقت جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر" اور سہ پہر کے وقت تعزیہ اٹھاتے وقت "حضرت کو بعد ظہر عجب اضطرار تھا"۔ کے چند بند ہر عزاخانے میں پڑھے جاتے ہیں اور پھر کربلا کی طرف جلوس روانہ ہوتا ہے۔ عصر کے وقت فاقہ شکنی مرحوم سید شبیر حسین صاحب کے دروازہ پر چربن (بھونا ہوا چاول، مسور کی دال، چنا، مٹر) اور چاء کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر شام غریباں، کی مجلس عزاخانہ میں الگ الگ بھی ہوتی ہیں اور ایک مردانی مجلس کا بنگلہ پر اہتمام ہوتا ہے۔

اس گاؤں میں عشرۂ مجالس اور تمام دوسرے کاموں میں خواتین کا بھی برابر کا حصہ ہوتا ہے، مردانی مجالس کے ساتھ زنانی مجالس بھی دن میں اور شب میں منعقد ہوتی ہیں جن میں سوزخوانی، تحت اور ذاکری کے لئے مختلف خواتین تعاون کرتی ہیں۔ ذاکری کرنے میں پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی صاحبہ، سیدہ خورشید حسینی صاحبہ، فضہ حسینی صاحبہ اور مجھ ناچیز کو بھی یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔ کچھ خواتین ایسی بھی ہیں جو ذاکری کتابوں سے پڑھ کر کرتی ہیں۔ ذاکرین میں جناب سید امیر عباس حسینی، سید اظہار حسین صاحب اور سید احمد حسن صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ کچھ لوگ سوز و سلام پڑھتے ہیں اور تحت کی ادائیگی کے لئے جناب مسلم خاں صاحب کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ اس طرح پورے دس محرم تک مجالس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے اور گیارہ سے چودہ محرم تک لوگ اپنی اپنی جائے ملازمت پر لوٹ جاتے ہیں۔ اس طرح نونہرہ جو دس بارہ دنوں کیلئے آباد ہوتا ہے، پھر خالی ہو جاتا ہے۔ گھروں میں تالے لگ جاتے ہیں اور مقامی لوگوں سے اگلے سال محرم میں آنے کا وعدہ کر کے

جن میں عشرۂ محرم کی مجالس برپا ہوتی ہیں۔ نونہرہ کے سادات کے مورث اعلیٰ جنہیں دادا خدا بخش کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کا مزار بھی یہاں موجود ہے، اس کے علاوہ تین کربلائیں بھی جو کہ کافی قدیم ہیں، یہیں موجود ہیں، ایک کربلا جو کہ پورب محلّہ کے حضرات کی سرپرستی میں ہے، وہ چلہر کی کربلا کے نام سے مشہور ہے، دوسری کربلا پیارے پور کی کربلا، کے نام سے جانی جاتی ہے جسے نمبردار صاحب سید امیر حسن کی دادی صغرا بی بی نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور کربلا اسی کے قریب ہے جسے مظفر میاں کی کربلا یا محسن میاں کی کربلا کے نام سے جانا جاتا ہے، اس وقت یہ کافی بوسیدہ حالت میں ہے۔

ایک روضۂ حضرت عباسؑ ابھی حال ہی میں جناب مولانا شیخ رضوان صاحب قبلہ کے تعاون اور مالی امداد سے مسجد سے ملی ہوئی جگہ پر تعمیر ہوا ہے۔ جہاں کبھی رضوان صاحب کا آبائی مکان ہوا کرتا تھا۔ اِس طرح یہ روضہ اب جلوس و ماتم کا ایک اہم مرکز بھی بن گیا ہے۔ عشرۂ محرم کی مجالس میں آج بھی کچھ اہم تاریخوں کی مجالس جن میں سات محرم آٹھ محرم اور نو محرم کی مجالس خاص طور پر قابل ذکر ہیں، تحت خوانی سے جڑی ہوئی ہیں۔ نمبردار صاحب کے امام باڑہ میں سات محرم کی قدیم مجلس میں بعد مجلس ذوالجناح برآمد ہوتا ہے، جسے محترمہ رضیہ اہلیہ سید علی صاحب نے پندرہ سال قبل قائم کیا تھا، یہ مجلس بڑے شاندار پیانہ پر انجام پاتی ہے، جس میں میر انیسؔ کا مشہور مرثیہ:

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں، سن سن کے بلاغت میری

پڑھا جاتا ہے، اس طرح اس امام باڑہ میں آٹھ محرم کی مردانی مجلس میں میر واحد کا مشہور و معروف مرثیہ:

اے قلم دامنِ کاغذ پہ گہر ریز ہو پھر — اے سخن منتظم نظم دل آویز ہو پھر
اے خرد غیرت شبریز سُبک خیز ہو پھر — اے زباں صورت شمشیر علی تیز ہو پھر
ڈھنگ ضرب اسد حق کا نظر آجائے — معرکہ خیبر و خندق کا نظر آجائے

پڑھا جاتا ہے۔

کرنل سید جرار احمد صاحب یا پھر سید اظہار صاحب اپنے مخصوص انداز میں یہ مرثیہ پڑھتے ہیں۔ اس مرثیہ کا آدھا حصہ سہ پہر کی مجلس جو کہ امام باڑہ حسینیہ میں منعقد ہوتی ہے، وہاں پڑھا جاتا ہے۔

سکینہ(س) باپ اور چچا کا ذکر کر کے خود بھی روتی رہیں اور چھوٹے بچوں کو بھی آبدیدہ کرتی رہیں''۔
تاریخ کی روشنی میں پہلی مجلس عزاء اہل بیت کی رہائی سے قبل زندان شام میں منعقد ہوئی، پھر کربلا میں، جابر ابن عبداللہ انصاری کو پہلی بار زیارت قبر حسینؑ کا شرف حاصل ہوا۔[1]
حسینؑ کی پہلی ذاکرہ (حضرت زینب(س) بنت علیؑ) اس خوش اسلوبی سے مجلس کا انعقاد کر گئیں کہ اس دور میں بھی اس کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر عشرۂ محرم میں ہر معتقد عورت شمعیں جلا کر فرش ماتم کو بچھاتی ہے اور اپنے بچوں کو کربلا کے واقعات ضرور سناتی ہے۔ ذکر حسینؑ کی کھلی آزادی آل بویہ کے دور اقتدار میں محبان اہل بیت کو حاصل ہوئی اور معز الدولہ نے کھل کر شیعت کا اعلان کیا۔ عباسی خلیفہ بویہی سلطان کا تابع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں بعض خلفاء بھی حب اہلبیت کے قائل ہو گئے تھے۔
دس محرم ۳۵۲ھ کو منصور دوانیقی اور متوکل کا بغداد ایک سوگوار فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو شخص گھر سے نکلتا وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے۔ ایک جلوس سیاہ پوشوں کا شاہراہ سے گزر رہا تھا اور اس جلوس کی قیادت اس دور کا سلطان معزالدولہ دیلمی کر رہا تھا۔ یہ جلوس فاطمہ(س) کے لال اور عترت رسول پر ہونے والے مظالم کی یاد میں نکالا گیا تھا۔ مجلسوں کے ساتھ باجماعت ماتم کی ابتداء اسی جلوس سے ہوئی۔[2]

غازی پور کے گاؤں میں عزاداری

ضلع غازی پور کے وہ گاؤں جہاں شیعہ حضرات کی بستی ہے وہاں عزاداری کا ایک عام چلن پایا جاتا ہے تقریباً تمام گاؤں میں لوگ محرم کے موقعہ پر وطن آنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ یہاں پر میں چند گاؤں میں عزاداری محرم کی روایت اور کچھ نمایاں پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہوں گی۔

نونہرہ گاؤں

نونہرہ غازی پور سے ۱۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، یہی گاؤں میرا آبائی گاؤں اور میری جائے ولادت ہے۔ اس گاؤں میں شیعہ حضرات کی تعداد کم و بیش ۳۰۰ کے آس پاس ہے۔ اس گاؤں میں بلا تفریق مذہب و ملت محرم کی مجالس، جلوس عزاء اور سبیل کا اہتمام ہوتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے یہاں شیعہ حضرات کی اچھی خاصی تعداد تھی مگر اب بہت کم رہ گئی ہے۔ اس گاؤں میں کئی قدیمی امام باڑے ہیں، جن میں حکمن بی بی کا امام باڑہ، حیدری بی بی کا امام باڑہ، نمبر دار صاحب کا امام باڑہ، حسینیہ امام باڑہ، بنگلے والوں کا امام باڑہ، اور اس کے علاوہ یہاں اور بھی بہت سارے امام باڑے ہیں

۱۔ علی حسین رضوی، تاریخ شیعیان علی، کراچی، ۲۰۰۱، ص ۴۸۷ ۲۔ ایضاً

"Azadari which means the practice of mourning, occupies a unique place in the life of a Shia. It is mainly concerned with the mourning and condolence congregates in the month of Muharram to commemorate the tragedy of Karbala. Orators address the gatherings on the excellance of Shia faith and the divine significance of the martyrdom of Imam Husain and his seventy two companions------ In India, not only Shias but also a large number of Libral Sunni Muslims specially Hanfi school and a good section of the Hindu population, mainly in rural areas, keep Tazias and observe mourning in one form or the other. A number of Hindu rulers such as those of Gwalior and Jaipur, observed Moharram with reverence which strengthened the emotional harmony between their Hindu and Muslim subjects. The devotees seeks the blessing of 'Saint Martyr', on this occassion and recite dirges. Big processions are taken out during the ten days of Moharram throughout India .... So the Shias the tragedy of Karbala is too poignant to be commemorated lightly. So, they observe Moharrum by mourning, weeping and wailing beating of chests and holding Majlis (condolence congregation) in which the events of Karbala are narrated. Mourning Procession with Tazia and proceed to the local Karbala through out India. [۱]

واقعہ کربلا ۶۱ھ بمطابق ۶۸۰ء میں رونما ہوا۔ پسماندگان اہلِ بیت رسول قید سے رہا ہوکر جب واپس مدینہ پہنچے تو لوگ گروہ در گروہ امام زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ مظلوم کی زبانی واقعات کربلا سنیں۔ اس اثناء میں جناب ام کلثوم (دختر حضرت علیؑ) نے اپنے دردناک اشعار پڑھے۔ "مدینة جدنا لاتقبلینا" کی پہلی ذاکرہ والدہ ماجدہ حضرت عباسؑ جن کا نام فاطمہؑ کلابیہ اور لقب ام البنین تھا۔ وہ مدینہ کی عورتوں میں واقعات کربلا بیان کرتی تھیں اور امام زین العابدینؑ اور دوسرے ائمہ بھی واقعات کربلا بیان کرتے رہے اور انہیں اپنے اصحاب کو سناتے رہے۔ علی حسین رضوی اپنی تصنیف ''تاریخ شیعیان علیؑ'' میں لکھتے ہیں: پہلی مجلس میں عورتوں میں زینب(س) و ام کلثوم(س) اپنا تعارف کراتی رہیں اور واقعات کربلا بیان کرکے عورتوں کو رلاتی رہیں اور زندان پر کھڑے ہوکر

1- Nadeem Hasnain & Sheikh Abrar Husain: Shias and Shia Islam in India: A study of society and culture, Harnam publications, New Delhi, 1988

کرتے، ماتمی لباس میں لوگوں کی بھیڑ ہر طرف رواں دواں نظر آتی تھی۔ اس دور میں مختلف حیثیت کے لوگ مختلف چیزوں کے تعزیئے بناتے تھے۔ چاندی سے لے کر لکڑی اور کاغذوں تک کے تعزیئے بنتے تھے۔ عام طور سے تعزیئے کربلا میں دفن کردیئے جاتے مگر قیمتی تعزیوں کو واپس لاکر امام باڑوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ یہ تمام دستور آج بھی غازی پور ضلع میں قائم ہے۔

غازی پور کے تاریخی تعارف کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم عزاء، عزادار اور عزاداری جیسے تصوارت کو بھی سمجھ لیں۔ ان الفاظ کے لغوی معنی کچھ اس طرح ہیں۔

عزا (ع) اسم مذکر (۱) صبر پر مصیبت (۲) ماتم پرسی، پرسا، سیاپا۔

عزاء۔ (ع۔ مذکر) ماتم پرستی (عزی۔ صابر ہونا) [۱]

عزاء دار (ف) صفت۔ ماتم داری، سوگوار، سوگی، ماتمی، میت کے غم اور سوگ میں رہنے والا، میت کا غم کرنے والا۔

عزاداری (مونث) ماتم کرنا، عزاخانہ (مذکر) ماتم خانہ وہ گھر جہاں مرثیے پڑھے جاتے ہوں یا تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ [۲]

مجالس (ع) مجلس کی جمع لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مونث

انجمنیں۔ انجمن کی جمع۔ [۳]

سید علی شرف الدین الموسوی علی آبادی عزاداری کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ حرکات وسکنات، کلمات وخطبات جو عزادار بن کر حسینؑ کیلئے عزاداری کے عنوان سے صادر ہوتے ہیں۔ جیسے تقریریں، اشعار، مرثیہ سوز وسلام، سیاہ پوشی، اظہار حزن و ملال، شبیہ سازی، غرضیکہ وتمام مظاہر جن سے عزاء اور غم حسینؑ میں اپنے اندوہ ملال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ نیز مظلوم کربلا پر ہونے والے ظلم و ستم پر احتجاج کرتے ہیں اور یکجہتی کا اعلان کرتے ہیں''۔ [۴]

ڈاکٹر ندیم الحسنین و شیخ ابرار حسین نے اپنی اہم تصنیف Shias and Shia Islam in India:A Study of Society & Culture میں عزاداری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، (جلد سوم)، مکتبہ حسن سہیل لاہور، ص ۲،۱۷، ۱۹۹۸ء

۲۔ خواجہ عبدالمجید: جامع اللغات (جلد دوم) اردو سائنس بورڈ لاہور، ص ۱۳۹۶

۳۔ مولوی نورالحسن نیر نوراللغات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹، ص ۱۱۸۷

۴۔ سید علی اشرف الدین موسوی علی آباد: اصول عزاداری، دار الثقافۃ اسلامیہ، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۶

فنِ تعمیر میں مسجدوں اور مقبروں کے بعد امام باڑوں کا ہی اہم مقام ہے اور یہ اضافہ نواب فضل علی کے مذہبی انہماک اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ ان کے زیرِ سرپرستی شہر غازی پور کی عیدگاہ سے متعلق ایک امام باڑہ تعمیر ہوا جس کے وسیع صدر دروازہ پر ایک پتھر نصب ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے۔

مکان خوشتر از فردوس اقدس ۔۔۔ بہ معنی کعبہ و بیت المقدس
بنای ایزدی گلشن سرایی ۔۔۔ برائے درد دل دار الشفایی
کہ نواب زمان فضلِ علی خان ۔۔۔ مراور آباد تابع جشنِ دوران
بنام سید الشہداء بنا کرد ۔۔۔ زمین را زان سبب رشک آسماں کرد
چو دل در فکر تاریخش گہر سفت ۔۔۔ بنای دینی فضل علی گفت

(شیخ کلیم اللہ زاہدی، غازی پوری)

ترجمہ: یہ وہ مکان ہے جو بمعنی کعبہ و بیت المقدس جنت سے بہتر ہے۔ درد دل کے لئے دارالشفاء ہے اور سب سے بہتر اب کریم کی عنایت ہے۔ اس لیے کہ نواب فضل علی خاں نے اس کو آباد کیا اور جشن دوراں کے طابع کیا۔ اس کو سید الشہداء کے نام سے تعمیر کیا اس وجہ سے یہ زمین و آسمان پر باعث رشک بن گیا۔ جب میں اس کی تاریخ میں متفکر ہوا تو بنائے دینی فضل علی سے اس کی تاریخ ظاہر ہوئی''۔

ایام محرم میں یہاں امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا، قندیلیں اور لال ہری شمعیں، روشن ہوتی تھیں۔ روشنی و کارچوبی کے کام کی چمک دمک، سونے اور چاندی کے علموں اور پنجوں کی جگمگاہٹ اور اُن کے پٹکوں کی سجاوٹ زردوزی کے کام پر کرن کی جھالروں کی زیبائش اور درودیوار کی آب و تاب سے امام باڑے بقعۂ نور بن جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ہندو پاک کی تقسیم تک جاری رہا۔

مختلف فرمانرواؤں نے بھی امام باڑے بنوائے اور روسا و عمائدین نے بھی بہت سے امام باڑوں کی تعمیر کروائی۔ ان تمام امام باڑوں میں ماتم برپا ہوتا تھا اور عزاداری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ادھر محرم کا چاند نمودار ہوا کہ صفِ عزا بچھ گئی۔ عزاداری کا سلسلہ پہلی محرم سے شروع ہوتا تھا اور ۱۰ویں محرم تک چلتا تھا۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی خواتین اپنی چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور زیورات اتار دیتی تھیں۔ لوگ سیاہ و سبز رنگ کے لباس پہن لیتے تھے، جگہ جگہ مجلس عزاء منعقد ہوتی تھی، گھر گھر تعزیہ داری ہوتی، مختلف قسم کے جلوس نکلتے تھے، لوگ مجلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتے اور تعزیوں کی زیارت

کے فرمان کے مطابق ہندوستان میں الگ الگ ضلع قائم ہوئے تو غازی پور بھی ایک الگ ضلع کی حیثیت سے قائم ہوا۔ اس وقت ضلع کی سرحدوں میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ پہلے اس میں پورا ''بلیا'' شاہ آباد کا ''چوسا'' بنارس کا نرون'' اور اعظم گڑھ کا سگڑی، گھوسی، مئو اور محمد آباد کا علاقہ شامل تھا، پہلے ہی سال نرون بنارس میں ملادیا گیا اور خان پور غازی پور میں لے لیا گیا۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۳۲ء کو سگڑی، گھوسی، مئو اور محمد آباد اعظم گڑھ میں شامل کردیئے گئے۔ ۱۸۷۹ء میں بلیا بھی ایک الگ ضلع کی حیثیت سے قائم ہوگیا۔

مذکورہ بالا انقلاب زمانہ کے نشیب و فراز کو جھیلتا ہوا غازی پور رواج زمانہ کے مطابق عزاداری اور تعزیہ داری میں بھی اپنا کردار نبھاتا رہا اور ضلع کی مختلف شیعہ بستیاں اپنی اپنی استعداد کے مطابق فرض قومی ادا کرتی رہیں، اور آج بھی بدستور جاری و ساری ہے۔ غازی پور کی شیعہ بستیاں جہاں عزاداری و محرم کا چلن ہے ان میں تاج پور، کامون پور، بھور، مانڈ، جلال آباد، ظہور آباد، چاون پور، گنگولی، ہونڈرہی، حسین پور، زنگی پور، دیوکھٹیا، محمد پور، غازی پور، شہر، صدرم بکھئی پور، چلبلیا، سادات، ممبوئیں، درس پور، محمد پورکسم، نٹرواں اور درگاتھان وغیرہ ہیں سادات کے میرتقی حسین جو ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پاکستان منتقل ہوگئے تھے، نہایت ہی عقیدت کے ساتھ مجلس وعزائے حسینؑ برپا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن صدیقی اپنی تحقیقی تصنیف بعنوان'' تذکرہ مشائخ غازی پور، کے صفحہ ۱۴۵ پر تحریر کرتے ہیں کہ'' نواب فضل علی کے دور میں ضلع غازی پور میں اہل تشیع کو زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ جگہ جگہ امام باڑے تعمیر ہوئے اور عزاداری کی بنیادیں قائم ہوئیں۔ زیادہ تر مقامات پر شیعہ مسجدیں اور چوک وجود میں آئے۔ خصوصاً زنگی پور، نونہرہ، پارہ، گنگولی، دیوکھٹیا، گھونسی، جلال آباد، تارج پور، ڈیہمہ، بحری آبادی، سادات، چلبلیا، وغیرہ جہاں سادات کی کثیر تعداد تھی، اس کا کافی عروج ہوا''۔

غازی پور کے مختلف مقامات پر شیعہ اور سنی زمینداروں نے اس کو وسعت دی اور اس میں جو تزک و احتشام اور جوش وخروش پیدا کیا، وہ اس سے قبل نہیں تھا۔ لیکن متذکرہ دور میں اسے منانے والوں میں صرف اہل تشیع یا سنی ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ سماج کے دوسرے طبقے بھی عزاداری و محرم مناتے تھے، عزاداری و ماتم کرنے والوں کے لئے ہر فرقہ کے لوگ سبیلیں لگاتے اور شربت کا انتظام کرتے۔ نواب فضل علی خاں کے دور میں شاید ہی کوئی بستی ایسی ہو جہاں دو چار قابل ذکر امام باڑے موجود نہ ہوں۔ ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کو عزاداری سے کتنا شغف تھا۔ اسلامی

اس علاقہ کو سید مسعود نے بسایا تھا۔ ہندی زبان میں جو کتابیں منظر عام پر آ ئیں ان کی تعداد چار ہے۔ جس میں کرشنا نند کی ''غازی پور کا سنسمرن'' اودھیش نارائن سنگھ کی ''غازی پور جدید اتہاس کی روشنی میں'' ڈاکٹر سرجو تیواری کی ''غازی پور کی اتیہاسک دھرا'' اور ڈاکٹر شیو منگل رائے کی ''غازی پور کا اتیہاس'' شامل ہیں۔

سید سالار مسعود غازی چوتھے امام زین العابدین علیؑ ابن امام حسینؑ کی نسل سے تھے اور مسلک جعفری پر ان کا عقیدہ تھا۔ اسی لئے ضلع کے مختلف علاقوں میں شیعہ بستیاں عالم وجود میں آئیں۔ ۱۳۹۴ء سے ۱۴۷۶ء تک غازی پور، جون پور کے مشرقی سلطان کے ماتحت رہا۔ جون پور کے یہ سلطان بڑے بااثر تھے۔ انہوں نے اپنا سکہ بھی چلایا۔ ان کے سکے سید پور بھتری کے آثار قدیمہ میں پائے گئے ہیں۔ مشرقی سلطان کو لودھیوں نے ہرایا اور غازی پور لودھیوں کے زیرنگیں آ گیا۔ ۱۵۲۷ء میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغل سلطنت قائم کی۔ اس دور میں بہار کے افغان سردار بہت بااثر ہوگئے تھے اور غازی پور افغانوں اور مغلوں کی لڑائیوں کا محاذ جنگ بنا رہا۔ اکبر کے زمانہ تک تھوڑے ردوبدل کے ساتھ غازی پور بہار کے افغانوں کے ماتحت رہا۔ ۱۵۶۱ء میں خان زمن نے شیر شاہ کو شکست دی۔ اب افغانوں کا اثر غازی پور سے ختم ہوگیا، لیکن ۱۵۶۵ء میں خان زمن نے اکبر سے بغاوت کردی اور مارا گیا۔ اکبر کے زمانہ میں غازی پور بہار سے نکل کر صوبہ الہ آباد میں شامل ہوگیا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت تک غازی پور کے ساتھ جونپور، بنارس اور چنار کی سرکاریں اودھ کے نواب سعادت علی خاں کے قبضہ میں آ گئیں۔ اودھ کے نواب نے ۱۷۳۸ء میں ایک مقامی باشندہ عبداللہ، کو غازی پور کا حاکم بنایا۔ انہوں نے شہر میں متعدد خوبصورت عمارتیں اور مساجد بنوائیں۔ چالیس کھمبوں کا چہل ستون بنوایا جو اب آثار قدیمہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جلال آباد اور قاسم آباد میں قلعے بنوائے اورکئی مساجد و امام باڑے بھی تعمیر کروائے۔

۱۷۴۴ء میں یہ عہدہ نواب فضل علی کو ملا۔ لیکن اس میں اپنے باپ کی کوئی خوبی موجود نہ تھی جس کے سبب وہ کئی بار معزول بھی ہوا۔ آخر میں جب وہ اودھ کا مقررہ ٹیکس نہ دے سکا تو اس نے بغاوت کا اعلان کردیا، جس کے سبب شجاع الدولہ نے اپنے معتمد راجہ بلونت سنگھ، کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ فضل علی مقابلہ کی تاب نہ لاکر پٹنہ بھاگ گیا اور ۱۷۵۷ء میں نواب شجاع الدولہ نے بعوض آٹھ لاکھ روپے سالانہ ٹیکس راجہ بلونت سنگھ کو حاکم مقرر کردیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۷۶۴ء کو شہنشاہ شاہ عالم ثانی

سیاحوں جیسے فاہیان، ہیون سانگ کا غازی پور میں آنا معلوم پڑتا ہے۔ ایک عام روایت غازی پور کے حوالہ سے یہ ہے کہ راجہ گادھ کی نگری گادھی پوری ہے۔ تاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ اس بے بنیاد روایت پر سب سے پہلے جنرل کنگھم نے اپنی کتاب "The Ancient Geography of India" میں مہر لگانے کی کوشش کی۔[۱] زیادہ تر مورخ اس کی تردید کرتے ہیں کہ یہاں کبھی بھی گادھی پوری نام کی کوئی بستی تھی۔ اے فیوہر کے مطابق ''ہندو طبقہ کے کچھ دانشوروں نے بہت سی ایسی بے بنیاد روایتوں کو جنم دیا ہے جن کا کوئی وجود نہ تھا جیسا کہ راجہ گادھ اور ان کی گادھ پوری کے متعلق رائج کیا گیا ہے۔[۲]

میمائرز آف غازی پور کے مصنف ولیم اولڈھم نے غازی پور کا نام امیر سید مسعود بن جلال الدین کے خطاب ''غازی'' پر ہونا لکھا ہے۔ اسی طرح غازی پور گزیٹیر کے مصنف آر۔نیول نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔ غازی پور ملک السادات غازی کے خطاب یعنی سیدوں کے سردار نے اپنے نئے خطاب کے ملنے پر اس مقام کا نام غازی پور رکھا۔[۳]

غازی پور کے نام اور اس کی بنیاد سے متعلق مسلم تاریخ دانوں اور دانشوروں نے بھی اپنا تعاون پیش کیا جو مختلف تصانیف اور دستاویز کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے غازی پور کے سادات، شیوخ، علماء فضلاء، فوجدار، منصب دار، صوبیدار، جاگیردار وغیرہ کے بارے میں معلومات ''نسب نامہ السادات غازی پور سے ملتی ہے جو بادشاہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت ۱۶۹۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کے قبل ایک دوسرا تاریخی و خاندانی قلمی مسودہ بادشاہ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں پرگنہ بھتری اور اس کے اطراف و جوانب کی ''تاریخ سادات بھتری اور رسالہ'' از بہاء الدین عاملی'' ہے۔ یہ تینوں قلمی نسخے لندن کی لائبریری میں موجود ہیں (انڈیا کیٹلاگ نمبر ۴۰۴۸)۔ ان کے علاوہ سید مرتضیٰ علی کی ''کاشف الظلمات السادات غازی'' سید میر محمد علی گنگولوی ۱۷۳۸ء کی ''بیان الانساب السادات غازی پور'' سید غلام حسین پاروی ۱۸۳۵ء کی ''تذکرۃ الانساب سادات غازی پور'' اور مولوی بنارسی کی ''تذکرۃ الاعلیٰ'' وغیرہ میں غازی پور کا نام اور اس کی بنیاد پڑنے کی وجہ تفصیل سے درج ہے۔

انگریز و مسلم تاریخ دانوں و دانشوروں کی طرح غازی پور کے ہندو مصنفین کی بھی یہی تحقیق ہے کہ

۱- جنرل کنگھم، دی انشیئنٹ جاگرافی آف انڈیا ص ۵۰۲-۵۰۳

2- Oldham W: North Western Provinces' Historical and statistical, memoir of Ghazipur District, Allahabad 1870, Tenant Right and Auction Sales in Ghazipur and the provinces of Benares, Allahabad 1873.

3- Nevill, H.R. Ghazipur Gazetter, Allahabad, 1909

اتر پردیش کے ضلع غازی پور میں عزاداری کی روایت

ڈاکٹر عذرا عابدی☆

دولت غم شبیر کی جس دل کو خدا دے   کیا لے وہ زمانے سے زمانہ اسے کیا دے
کیا ان کو مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں   شبیر کی مادر جنہیں جینے کی دعا دے
(وفا حیدر آبادی)

دانشوروں کا ایک حلقہ قدیم غازی پور کی تہذیب و تاریخ کو سنہرے دور سے تعبیر کرتا ہے۔ غازی پور کا مختلف ادوار پر مبنی مطالعہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ ایک داستان نہیں ہے، بلکہ اپنے عہد کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تاریخی اقدار کی آئینہ دار اور عہد قدیم سے دورِ جدید تک کی تہذیب کا تاریخی عکس ہے۔ ضلع غازی پور کی تاریخ کا علم جب سے ہوسکا، اس وقت سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک کا زمانہ قدیم غازی پور میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ غازی پور کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی آمد کے آغاز کا زمانہ وہ ہے جب سید سالار امیر مسعود غازی علوی بن سید سالار ساہو اور اپنے سپہ سالار ملک مروان اور ان کے رفقاء کو سلطان محمود غزنوی نے تبلیغ و اشاعت کی مہم پر بھیجا تھا۔ بحوالہ تاریخ المنوال و وایہلہ ''بزمانۂ سید سالار مسعود غازی ملک افضل بغرض فتح بنارس و ملک علوی نائب ان کے و ملک طاہر بمقام مئو و ملک مروان بمقام شادی آباد، غازی پور آئے۔ مزاران کے ان مقام پر ہیں''۔[۱]

جب کہ بادشاہ محمد بن تغلق کے عہد ۱۳۳۰ء میں غازی پور کے فاتح کی حیثیت سے امیر سید مسعود کو ملک السادات غازی ترمزی بن امیر سید جلال الدین کی آمد بغرض سرکوبی راجہ ماندھا تا چکوہ غوث پور میں ہوئی ۔ فتح و کامرانی کے بعد بادشاہ تغلق نے امیر مسعود ترمزی کو مُلک السادات خان کے خطاب سے نوازا۔ اس لقب پر غازی پور کی بنیاد رکھی۔[۲]

غازی پور کی قدیم تاریخ و تہذیب کو حقیقی معنوں میں سمجھنے کے لئے خاطر خواہ تاریخی اسناد موجود نہیں ہیں۔ قدیم غازی پور کے دستیاب مآخذ و مواد میں آثارِ قدیمہ میں سے ہے، نقوش، غیر ملکی

☆ لکچرر شعبۂ سماجیات، جامیہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۱- مولانا عبدالسلام مبارکپوری، تاریخ المندوال و وائلہ، ج ۲، ص ۹۱   ۲- سید امان اللہ، نسب نامہ السادات غازی پور (قلمی) ۱۶۹۲ء

بیگمات کی سرپرستی میں محرم منانے کے سلسلے میں فیض آباد لکھنؤ سے مقابلہ کرتا تھا اور مجالس اور جلوسوں میں نئی نئی اختراعات اور رنگ و رونق میں اضافہ کرتا تھا۔ حکومت برطانیہ کے ہاتھوں اودھ کے الحاق کے بعد مسلمان تعلقداروں کا طبقہ اور ہندو تعلقداروں کے مسلمان اعلیٰ کارندے اور نوابین و بیگمات اودھ کی وراثتوں کے حقدار، جنہیں وثیقہ دار کہا جاتا تھا، یہ سب اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق ماتم کی رسمیں پوری کرتے تھے۔